سیّد بادشاہ کا قافلہ

آباد شاہ پوری

جامعہ بیت العتیق (رجسٹرڈ)

کتاب نمبر ________

سیّد بادشاہ کا قافلہ

برِ صغیر میں رُوح پرور دینی جذبوں اور کفر و باطل
کے ساتھ جانگسل تصادموں کی داستانِ لازوال

آباد شاہ پوری

البدر پبلی کیشنز ○ ۲۳ راحت مارکیٹ اُردو بازار لاہور

☆ نام کتاب — سیّد بادشاہ کا قافلہ

☆ مصنف — آ بادشاہ پوری

☆ ناشر — عبدالحفیظ احمد

☆ اشاعت — اکتوبر 2009ء

☆ مطبع — علی اعجاز پرنٹرز' لاہور

☆ ہدیہ — -/300 روپے

ISBN 969-400-079-3

اِنتساب

مُجاہدینِ راہِ حق کے نام جنھوں نے
ہر دَور میں حق کا پرچم بلند کرنے کے لیے
اپنی زندگیاں کھپا دیں اور جو آج بھی اللہ
کا کلمہ بلند کرنے کی خاطر دُنیا بھر میں باطل
سے نبرد آزما ہیں۔

مُصنّف

مصنف علمی دُنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے آج تک جو کچھ لکھا ہے اس میں فکر کی گہرائی اور مطالعہ کی وسعت دونوں خوبیاں نظر آتی ہیں۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب، کہنہ مشق اور بالغ نظر عالم اور انشا پرداز ہیں۔ (پروفیسر عبدالحمید صدیقی مرحوم)

○

آباد شاہ پوری دلِ بیدار، لالے کی آگ کو تیز کرنے والا نفسِ گرم، اندھیروں میں راہ دکھانے والا دماغِ روشن اور رہوارِ وقت کے ساتھ چلنے والا قلم رکھتے ہیں۔ (نعیم صدّیقی)

○

آباد صاحب کا طرزِ تحریر بہت خوبصورت، بڑا دِلآویز ہے .... کہانی لکھنے کا ڈھنگ خُوب جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ تاریخ اور کہانی کا سنگم کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اُن کے یہاں دونوں عنصر ایک دوسرے سے مدغم ہو گئے ہیں۔ (میرزا ادیب)

○

اُن کی اوّل و آخر وفاداری صرف اور صرف اس نظریۂ حیات سے ہے جسے اسلام کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ ان تمام اہلِ قلم سے مختلف نظر آتے ہیں جو منڈی کی 'طلب' دیکھ کر ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور جن کا مقصدِ زندگی حصولِ زر کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ (پروفیسر محمد سلیم)

○

مبدأ فیض نے آباد شاہ پوری کو نظر کی گہرائی دونوں سے نوازا ہے اور اُس کے ساتھ ہی ان کے پہلو میں دلِ دردمند بھی ودیعت کیا ہے۔ حُسنِ نظر، عمقِ نگاہ اور دردِ دل نے زندگی کے اعلیٰ مقصد اور خلوص سے معمور ایمان سے جِلا پا کر ان کی تحریر و نگارش کو عجب تابناکی بخش دی ہے۔

(لالہ صحرائی)

○

منازلِ شوق

چوتھی منزل: چمرکنڈ ۳۷۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

بانگِ رحیل

یہ ایک عظیم تحریک کے قافلۂ شوق کی داستانِ جلیل وجمیل ہے۔
برِّصغیر پاکستان و ہند کی پہلی اسلامی تحریک کے قافلے کی داستانِ لازوال۔
اُن رُوح پرور دینی ولولوں اور کفر و باطل کے ساتھ جانگسل تصادموں اور رنج ومحن کی داستانِ جانگداز جس کے اوراق بالاکوٹ کی شہادت گاہ سے اندرونِ مُلک کے قید خانوں اور انڈمان کے وحشت ناک جزیروں تک پھیلے ہُوئے ہیں۔
تقریباً سوا سو برس کے عرصے پر محیط ایک ایسی داستان جس کو جنم دینے والا ایک ایک لمحہ ایمان افروز ہے اور جذب وشوق کی کائنات لیے ہُوئے۔

سید احمد شہیدؒ اور اُن کی تحریک پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، ان لکھنے والوں میں اپنے بھی ہیں اور بیگانے بھی۔ قارئین زیرِ نظر کتاب کو ان تمام کتابوں سے مختلف پائیں گے۔ وہ کتابیں زیادہ تر تحقیقی اور علمی و تاریخی انداز میں لکھی گئی ہیں جن میں تحریک کے بعض کارکنوں کی ذاتی اور خاندانی یادداشتیں بھی ہیں، مَیں نے اُن سب سے مدد لی ہے، لیکن یہ کتاب نہ علمی ہے اور نہ تحقیقی۔ مَیں نے اس تحریک کو تحریک ہی کی حیثیت سے دیکھا ہے اور اُن ولولوں اور جذبوں کو زبان دینے کی کوشش کی ہے جن سے اس تحریک کے رہنما اور چھوٹے بڑے کارکن سرشار تھے۔ پھر جن کٹھنائیوں سے اُنھیں گزرنا اور مصائب و ابتلا کی کٹھالی میں تپنا پڑا اُنھیں الفاظ کے پیکر میں ڈھالنا چاہا ہے۔ مَیں اپنی اس کوشش میں

کس حد تک کامیاب رہا ہوں اس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھ ہے۔ مَیں صرف یہ عرض کروں گا کہ زوال پذیر اسلامی ہندوستان میں برپا ہونے والی اس عظیم تحریک کے شب و روز کو فن اور ادب کے قالب میں ڈھالتے ہُوئے میری یہ کوشش رہی کہ تاریخ کے چہرے پر ذرا بھی خراش نہ آنے پائے کہ تاریخ کو ادبی انداز میں پیش کرتے ہُوتے یہ حادثہ عموماً رُونما ہو جاتا ہے۔

مواد کے اعتبار سے بھی اس کتاب کا دامن قدرے وسیع نظر آئے گا۔ اب تک لکھی جانے والی کتابوں کے ساتھ ساتھ نئے مآخذ بھی میرے سامنے رہے ہیں۔ مثلاً تیسری منزل میں مَیں نے ان دستاویزات سے بھی استفادہ کیا ہے جو پہلے مصنّفین کے سامنے نہیں آئی تھیں اور اگر آئی تھیں تو اُنھوں نے شاید اُنھیں غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا حالانکہ اُن کے بغیر پٹنہ کے آخری مقدّمے کے بھرپُور خد و خال سامنے نہیں آتے۔ اس طرح یہ وہ اضافہ ہے جو آپ کو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملے گا۔ یہی صُورت چوتھی منزل کی ہے۔ تحریک کے آخری دور پر صرف مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے قلم اُٹھایا ہے مگر وہ بھی ۱۹۴۳ء کے واقعات تک تحریک کے آخری قائد کا تذکرہ اُنھوں نے کچھ ایسے انداز میں کیا ہے گویا وہ زیادہ اہم شخص نہ تھے۔ مَیں نے اخبارات اور ذاتی یادداشتوں میں مدفون مواد کی مدد سے اس دَور کے تحریکی پہلو کو بھی بھرپُور انداز میں پیش کیا ہے۔ یُوں اس تحریک کی ۱۹۴۷ء تک کی داستان مکمل ہو گئی ہے۔ ایک ایسے انداز میں کہ اُس کے عظیم الشان کام اور اُس کے کارکنوں کی عظمتِ کردار کے اَن مٹ نقوش اپنی پُوری تابندگی کے ساتھ اُجاگر ہو سکیں۔

اس تصنیف سے میرا مقصد مسلمان نوجوانوں خصُوصاً اُن تحریکوں کے کارکنوں کو فکر و نظر اور کردار و عمل کی تربیت کا گراں بہا سرمایہ بہم پہنچانا ہے جو خالص کتاب و سُنّت کے اسلام کو سربلند کرنے کی جدّ و جہد کر رہی ہیں۔ دنیا نے کامیابی اور ناکامی کے جو پیمانے بنا رکھے ہیں اُن کے مطابق یہ تحریک بے شک ناکام رہی، لیکن اللہ کے نزدیک یہ پیمانے بالکل مختلف ہیں۔ بسا اوقات دنیا والے جس کو کامیابی کہتے ہیں اللہ کے پیمانے اُسے صریح ناکامی اور خُسران قرار دیتے ہیں اور بندگانِ دنیا جسے ناکامی سے تعبیر کرتے

ہیں اللہ کی میزان میں وہ اتنی بڑی کامیابی ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں دنیا کی لغت میں بیان کردہ ساری کامیابیاں اور کامرانیاں ہیچ اور سراپا گھاٹا ہیں۔ اللہ کے پیمانہ کامیابی و ناکامی میں یہ تحریک ایک کامیاب ترین تحریک تھی۔ اُس کے کارکنوں نے کتاب و سُنّت کی خالص تعلیمات کو پھیلانے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی بے لوث جدّ و جہد کی، اپنے گھربار، اہل و عیال، برادری، پھلتے پھُولتے کاروبار، شاندار کیریئر، راحت و آرام اور دُنیا کے مفادات اور اس کی دلچسپیوں اور رنگینیوں کو تج کر غربت و مہاجرت کی زندگی اختیار کی، مصیبتیں اور سختیاں سہیں، ایک بار اللہ سے جو عہد باندھا اُس سے مُنہ نہ موڑا، اپنی زندگیاں حق کی راہ میں وقف کر دیں اور جانوں کی قربانی دے کر اخلاص و للّٰہیت حُسنِ کردار و عمل اور صدق و وفا کا ایک ایسا باب رقم کیا جس کی تابانیوں سے آج بھی اس راہ کے راہرو فیضان حاصل کر سکتے ہیں۔

آباد شاہ پوری

۶ رمئی ۱۹۸۱ء

پہلی منزل

مشہدِ بالاکوٹ

۶ رمئی ۱۸۳۱ء

تاریخ کا مسافر دریائے کنہار کے مغربی کنارے سرنگوں بیٹھا ہے۔ پہاڑ کی دو متوازی دیواریں شمالاً جنوباً چلی گئی ہیں۔ کنہار ان دیواروں کے درمیان کوئی آدھ میل چوڑے خلا میں پیچ و خم کھاتا محوِ سفر ہے۔ شوریدہ سری کے عالم میں کبھی وہ مشرقی دیوار سے جا ٹکراتا ہے اور کبھی مغربی دیوار سے۔ دریا جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے دائیں بائیں سے کئی برساتی نالے پہاڑوں سے اتر کر اس سے ہم آغوش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شمال میں جہاں دریا وادیٔ کاغان سے گزرتے، اپنی راہ میں آنے والی ایک عظیم دیوار میں سے راستہ بناتے ہوئے نئی وادی میں قدم رکھتا ہے، وہاں اونچے پہاڑ کے نشیب و فراز پر آباد بالاکوٹ اور گرد و نواح پر سکوتِ مرگ طاری ہے۔ سورج دن بھر ایک خونچکاں المیے کا نظارہ کرنے کے بعد پہاڑ کی اوٹ میں غائب ہو چکا ہے اور وادی میں اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے۔ بالاکوٹ کے در و دیوار سے اٹھنے والے شعلے اور دھوئیں کے مرغولے دم توڑ چکے ہیں اور اب فضا دھرتی کے سینے سے اٹھنے والی آہوں سے دھواں دھواں ہے۔ تاریخ کا مسافر محسوس کرتا ہے کہ یہ آہیں نیزوں کی تیز نکیلی انیاں ہیں جو اس کے سینے میں پیوست ہوئی جاتی ہیں۔ تاریخ کے کتنے ہی دردناک منظر اس نے دیکھے ہیں، ان مناظر نے اس کا دل سنگِ خارا میں بدل ڈالا ہے، وہ بڑا ہی کٹھور دل ہے، لیکن کچھ منظر ایسے بھی ہیں جنہیں دیکھ کر یہ کٹھور دل موم کی طرح پگھل جاتا ہے اور خون آنکھوں سے بہہ نکلتا ہے۔ آج ایسا ہی ایک منظر اس کے سامنے ہے۔ اس کا دل لہولہو اور جگر قاش قاش ہے،

اشکوں میں ڈوبی ہوئی نگاہیں کنہار کے خون رنگ پھرے پر جمی ہیں۔ کبھی کبھی اٹھتی ہیں اور مٹی کوٹ گاؤں کے دامن میں بلند و پست پہاڑی کھیتوں پر جا پڑتی ہیں جو مٹی کوٹ نالے سے لے کر ست بنے نالے سے پرے تک چلے گئے ہیں۔ ان کھیتوں میں لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی ہیں۔ اُن غریب الدیار اہلِ جنوں کی لاشیں جو رائے بریلی کے ایک خدا پرست مردِ درویش سید کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے حق کا کلمہ بلند کرنے اُٹھے تھے۔

یہ سید پچھلے سترہ برس سے برِصغیر کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی اُمتِ مُسلمہ کی دم توڑتی ہوئی زندگی میں رُوح تازہ پھونکتا رہا تھا۔ یہ بزرگ ہستی جہاں بھی گئی بہارِ جاودانی اپنے جلو میں لے کر گئی۔ اُس نے شب و روز کی اَن تھک جدّوجہد کے بعد زہد و تقویٰ، صدق و اخلاص اور قربانی و ایثار کے ایسے پیکر تیار کیے جن کی نظیر صحابہ کرامؓ کے بعد بہت کم ملتی ہے۔ وہ درویش صفت عظیم لوگ جو میدانِ شوق کے شہسوار تھے اور دُنیا میں دینِ حق کی عظمت و سربلندی اور آخرت میں نجات اور غم و حُزن سے پاک ابدی زندگی بسر کرنا جن کا پیغام اور نصبُ العین تھا۔ پھر وہ ان اہلِ جنوں کو لے کر کالے کوسوں کی مسافتیں طے کرتا لق و دق ریگزار سے گزرتا، پہاڑ پھلانگتا، وادیاں قطع کرتا، مسافرت اور موسم کی سختیاں اور صعوبتیں سہتا برِصغیر کے اِس گوشے میں پہنچا اور ایک ایسی اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈالنے کی تگ و دو میں لگ گیا جو برِصغیر میں زوال پذیر اُمتِ مُسلمہ کا مرکزِ قوت بن سکے، جہاں مُسلمان اللہ کے منشا اور اسلام کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر آزادی کے ساتھ زندہ رہ سکیں، جہاں اسلامی نظام اور اسلامی معاشرے کا ایک ایسا نمونہ وجود میں لایا جا سکے جس کو دیکھ کر دُنیا کے دوسرے معاشرے اس نظام کو اپنانے کی طرف مائل ہوں جہاں انسان کے بنائے ہوئے قوانین کی نہیں، اللہ کے قانون کی حکمرانی ہو اور جہاں سے پورے برِصغیر کو اس رنگ میں رنگنے اور اُسے بڑھتے ہوئے انگریزی سامراج کے چنگل سے بچانے کی جدّوجہد کا آغاز ہو سکے۔ لیکن اُمّت نے کفر کے ہاتھ سے نہیں ہمیشہ اپنوں کے ہاتھ سے گھاؤ کھائے، ہمیشہ اپنوں ہی نے اُسے چرکے لگائے۔ سید احمدؒ اور ان کے ساتھی اپنوں کا چرکا کھا کر لہولہان چند روز پہلے یہاں پہنچے تھے اور پھر اپنوں ہی کی بے وفائی

• پر سکھ فوج نے انھیں آگھیرا اور برصغیر میں اُمید و رجا کی اُبھرتی ہوئی آخری کرن موت کے گھاٹ اتر گئی۔

فضا دھواں دھار ہے ... تاریکی پھیل رہی ہے۔ اس تاریکی میں بالاکوٹ ہی نہیں، برِصغیر میں مسلمان قوم کا مستقبل بھی لپٹتا جا رہا ہے۔ بالاکوٹ خاموش ہے، سرحد کے کوہ و دمن خاموش ہیں، برِصغیر کے مسلمانوں کی صدیوں کی تاریخ سینے میں آہیں دبائے خاموش ہے۔۔۔ لاشیں دُور دُور تک بکھری ہوئی ہیں۔ یہ انسانیت کا وہ عطر ہے جو سیّد شہیدؒ نے چمنِ ملت کے لالہ و گل جمع کر کے کشید کیا تھا۔ انھی لاشوں میں اس مردِ حق بین و حق مست کی اپنی بے سر لاش بھی ہے۔ سر کٹ کر دُور پڑا ہوا ہے۔ یہ وہ عظیم انسان تھا جس نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی، ایک اضطراب اور بے قراری کی آگ میں تڑپتا اور پگھلتا رہا۔ اُس نے دیکھا برِصغیر کا مسلمان معاشرہ، دینی، اخلاقی اور سیاسی ہر پہلو سے زوال کی راہ پر تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ انگریزوں کے چنگل دراز ہوتے جا رہے ہیں۔ غلامی کی رات اُمڈتی چلی آتی ہے۔ مشرقی ساحل سے سرہند کی سرحد تک کے علاقے پر انگریزوں کا سامراجی سایہ پھیل چکا ہے۔ پادشاہِ ہندوستان کی سلطنت عملاً لال قلعے تک محدود ہو چکی ہے۔ جنوبی اور وسطی ہندوستان میں مرہٹوں کی مار دھاڑ جاری ہے۔ ادھر سکھ شمال میں دریائے ستلج سے پشاور تک کے علاقے میں عذاب کا کوڑا بنے مسلمانوں پر برس رہے ہیں۔ پورے برِصغیر میں جہاں کہیں کسی آزاد ریاست کا جزیرہ ہے وہ بے بال و پر، یا تو انگریزوں کے رحم و کرم پر ہے یا سکھ غارت گروں کی جولان گاہ۔

ایسی حالت میں یہ مردِ درویش اُٹھا۔ اُس نے پہلے نواب امیر خان کو حق اور مسلمانوں کی حمایت و دفاع پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اس عہدِ زوال میں جب ہر طرف تاریکی طاری تھی، روشنی کی کرن اور ابھرتی ہوئی قوت تھے، لیکن جلد ہی انگریزوں نے اس شاہین کو ٹونک کی ریاست دے کر زیرِ دام کر لیا۔ سیّد احمدؒ کو امیر خاں کے لشکر سے نکلنا پڑا۔ اب انھوں نے ملّتِ اسلامیۂ ہند کے سرنگوں ہوتے پرچم کو خود سربلند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ رائے بریلی سے دہلی، شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادے اور جانشین، شاہ عبدالعزیزؒ

کی خدمت میں حاضر ہوتے تو تنہا تھے۔ پھر ان کی آواز پر درد مند دل لبیک کہتے گئے اور قافلہ بنتا چلا گیا۔ اللہ نے اپنے اس مخلص بندے کے عمل و کردار میں عجب تاثیر بخشی تھی۔ ایک مرتبہ جو شخص فیضِ صحبت اُٹھا لیتا اس کی زندگی بدل جاتی، ایمان و ایقان کے نور سے دل جگمگا اُٹھتے، بدعتوں اور مشرکانہ عقائد سے لوگ تائب ہو جاتے اور اتباعِ سُنّت ان کی زندگیوں کا رنگِ امتیازی بن جاتا۔ وقت کے بڑے بڑے مشائخ اس صحبت سے فیض یاب ہو کر پکار اُٹھتے: اگر ہم سیّد صاحب کی بیعت کیے بغیر مر جاتے تو بُری موت مرتے۔ یہ قافلہ اپنے سالار کی سرکردگی میں جن راہوں سے گزر گیا، اپنے پیچھے روشن و تابندہ نقوش چھوڑ گیا —— آج یہ عظیم انسان اپنے ساتھیوں سمیت خاک و خون میں غلطاں مٹی کوٹ کے دامن میں دھان کے کھیتوں کے درمیان شہادت کی نعمتِ ابدی کا خلعت پہنے پڑا ہے۔ اس مردِ حق کی شخصیت عجیب شخصیت تھی۔ مجسّم شریعت اور سراپا اتباعِ سُنّت، ظاہری فضائل اور باطنی مراتب کا دلکش مرقع ہر وقت خشیتِ الٰہی سے لرزہ براندام، اخلاص اور سوز و دردمندی کی تصویر جس کو دیکھ کر خدا یاد آجاتا۔ جس کی صحبت میں دل دُنیا سے سرد ہو جاتا، آخرت کی فکر قلب و ذہن پر چھا جاتی، عبادت اور ذکر کا ذوق جِلا پاتا، رضائے الٰہی کی طلب اور راہِ حق میں جدّ و جہد اور شہادت کی آرزو اس طرح بے چین کر دیتی کہ آدمی گھر بار، اہل و عیال، وطن ہر وہ شے چھوڑ کر راہِ حق میں نکل کھڑا ہوتا جس کے لیے دنیا کے بندے جیتے اور مرتے ہیں۔

یہ مردِ شہید جن دنوں امیر خاں کے لشکر میں ہُوا کرتا تھا محبتِ الٰہی کے تقاضے کا احساس اکثر ایک رُباعی کی صورت میں اس کی زبان پر آجاتا تھا۔

اے آنکہ زنی دم از محبّت
از ہستیٔ خویشتن بہ پرہیز
برخیز و بہ تیغِ تیز بنشیں
یا از سرِ راہِ دوست برخیز

اُس نے محبّتِ الٰہی کے جوش میں اپنی ہستی کو مٹا دیا، راہِ دوست پر چلتے ہُوئے تیغِ تیز کی رفاقت اختیار کی اور آج محبّت کا وہ تقاضا پورا کر دیا ہے جو اُسے ہر آن مضطرب اور بے قرار

رکھتا تھا۔ فَعَاشَ سَعِیْدًا وَّمَاتَ شَھِیْدًا۔ اس کی زندگی سعادت سے بہرہ مند تھی اور موت شہادت کی موت۔

○

وہ ست بنے نابے کے پار شاہ اسمٰعیلؒ اپنے لہو میں نہائے حیاتِ جاوداں سے ہمکنار۔ للّٰہیت، فداکاری، بے نفسی اور حمیّت اسلامی کے ایسے نقوشِ جمیل ثبت کیے پڑے ہیں جو دعوت وعزیمت کی تاریخ میں شب تاب ہیروں کی طرح ہمیشہ چمکتے دمکتے رہیں گے۔ دہلی کے اس خاندان کے چشم وچراغ اور فردِ فرید جو طلائے ناب اور ہمہ آفتاب تھا۔ برِ صغیر ہی میں نہیں عرب وعجم میں بھی دُور دُور تک جس کے علم وفضل کا سکّہ رواں تھا۔ بڑے بڑے عُلماء، صُلحاء، مشائخ اور سلطنت کے اعیان واکابر جس کے آستانے پر حاضری کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے، جس کا ہر فرد اپنی جگہ کتاب وسُنّت کا بحرِ بے پایاں تھا جس کی طرف علم کے پیاسے اپنی پیاس بُجھانے سمرقند وبخارا اور ایران وعرب سے کھنچے چلے آتے۔ شاہ ولی اللہؒ کے پوتے، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے بھتیجے اور شاہ عبدالغنیؒ کے مایۂ ناز فرزند، اپنے عظیم خانوادے کی عظیم روایات کے امین، حافظِ قرآن وحدیث، معقول ومنقول کے امام، زاہد وعابد، عالی ہمّت، اولوالعزم، جری اور شجاع، ذہین وفطین، حُسنِ عمل کے پیکر، غیرتِ حق کے مظہر، مصاف وسجّادہ کے شہسوار، دلوں کی کایا پلٹ دینے والے خطیب، ان افراد میں سے ایک جنھیں مادرِ گیتی صدیوں میں جنم دیتی ہے۔

اپنے خاندان کے بزرگوں میں اس لحاظ سے امتیازی مقام رکھتے تھے کہ اُن حضرات کا دائرۂ عمل مدرسہ وخانقاہ میں بیٹھ کر کتاب وسُنّت کی تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف اور وعظ وارشاد تک محدود تھا۔ یہ صاحبِ عزیمت مردِ حق اس دائرے سے باہر نکلے اور ہر اس مقام پر پہنچے جہاں کتاب وسُنّت کی تعلیمات اجنبی اور حق کی آواز بیگانہ تھی، جہاں جاہلیت کے اندھیرے طاری تھے فسق وفجور کا بازار گرم تھا، مسلمان معاشرے میں دین کے نام پر مشرکانہ رسوم، بدعتیں اور ضلالتیں راہ پا چکی تھیں۔ انھیں یہ تصوّر شب وروز مضطرب اور بے چین رکھتا کہ قیامت کے روز معصیت، فسق وفجور اور شرک وبدعت میں ڈوبے ہُوئے لوگوں نے ان کا دامن پکڑ لیا کہ اسمٰعیل تم نے کتاب وسُنّت کے نُور سے بہرہ یاب ہونے کے باوجود ہمیں حق کا راستہ نہ دکھایا

اور اندھیروں میں بھٹکتے رہنے کے لیے چھوڑ دیا تو وہ کیا جواب دیں گے۔ یہی اضطراب انھیں ان مقامات اور گلی کوچوں میں بھی لے جاتا، مقدس و پاکباز لوگ جن کے تصور ہی سے شرماتے ہیں۔ قرآن وحدیث کے احکام کھول کر بیان کرتے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے میں کسی ملامت کرنے والے کی پروا کرتے نہ کوئی خوف وخطر دل میں لاتے۔

سید صاحب کی بیعت سے پہلے بھی علم و عمل کے میدان میں مقام بلند رکھتے تھے، ایک اجتماعی تحریک کے ساتھ وابستگی سے گویا ان کی خداداد صلاحیتیں کندن بن کر چمک اٹھیں۔ وہ سراپا جدّوجہد بن گئے انھوں نے احیائے دین اور ردِّ بدعات کے لیے دن رات ایک کر دیے، خدا کی راہ میں جہاد اور خلقِ خدا کی ہدایت پر راحت و آرام قربان کر دیا۔ تبلیغی دوروں اور سفرِ حج و ہجرت میں ہزاروں بندگانِ خدا ان کے وعظ و ارشاد سے ہدایت یاب ہوتے۔ سید بادشاہ نے پرچم جہاد بلند کیا تو یہ مردِ حق آخر دم تک صفِ اول میں رہے۔ وہ سید صاحب کی جماعتِ حق پرست کا دماغ بھی تھے اور سپہ سالار بھی۔ جنگ اور مصالحت کی گفتگو میں سیدِ شہیدؒ کے مشیرِ خاص تھے۔ اکثر جنگی منصوبے انھی کے ذہنِ رسا کا شاہکار ہوتے۔ کئی جنگوں میں مجاہدین کی کمان کی۔ جنگِ شنکیاری میں مختصر سی جمعیت کے ساتھ سکھوں کے بھاری لشکر کی صفیں الٹ دیں۔ جنگ مایار میں چار گنا فوج کو شکست دی، جنگِ زیدہ میں مقابل فوج چودہ گنا تھی، لیکن انھوں نے ایسا جنگی منصوبہ بنایا کہ اُسے شکست فاش ہوئی۔ کمزور سے قالب میں ایسی توانا اور شجاع رُوح تھی کہ لوگ ہیبت کھاتے۔ ایک مرتبہ ایک درّانی سپاہی نے کسی خاتون کا مال چھیننے کی کوشش کی۔ اُس نے شاہ صاحب کا نام لیا تو سپاہی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی جم کر کھڑے رہتے، نہ تو میدان سے ہٹتے اور نہ مورچے میں پناہ لیتے ـــــ اور اس آخری جنگ میں بھی وہ کھلے میدان میں پڑے ہیں، گولی ان کی پیشانی میں لگی ہے جس سے ان کا نُورانی چہرہ گُل رنگ ہو گیا ہے۔

○

اور وہ شاہ اسماعیلؒ سے ذرا دُور ارباب بہرام خان اپنے خُون میں آغشتہ پڑے ہیں پشاور کے قریب مشہور مقام تہکال کے رئیس اور خلیل خیل قبیلے کے فرزندِ جلیل، مجسّم صدق و اخلاص سیّد بادشاہ ہجرت کر کے سرحد پہنچے تو ارباب خدمت میں حاضر ہوتے اور حق کی راہ

میں متاعِ زندگی نثار کر دینے کا عہدِ وفا باندھا۔ اس عرصے میں نفاق کے طوفان اُٹھے، بے وفائی کی آندھیاں اُمڈیں، حق پرستی اور وفا شعاری کے کتنے ہی دعویداروں کے قدم پھسل گئے، لیکن اس مردِ وفا کیش نے ایک بار جو سید بادشاہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا، تو دمِ آخر تک صدق و وفا کی ریت برقرار رکھی۔ سید شہید نے پنجتار سے ہجرتِ ثانیہ کا فیصلہ کیا تو اعلان فرما دیا کہ راہ دشوار اور منزلیں کٹھن ہیں، کچھ خبر نہیں کل کا سُورج کس حال میں طلُوع ہو، جو اصحاب قافلے سے الگ ہونا چاہتے ہیں خوشی سے جا سکتے ہیں؛ ایسا نہ ہو کہ سفر کی صعوبتوں اور حالات کی ناسازگاری کا سامنا ہو تو کہنے لگیں سیّد نے ہمارے ساتھ فریب کیا، ہمیں پیش آمدہ مشکلات و مصائب سے بے خبر رکھا۔ ارباب بہرام خاں اس اعلان پر رو پڑے۔ انھوں نے الگ ہو جانے کے لیے سید بادشاہ کا دامن نہیں تھاما تھا۔ اہل و عیال اور بھائی بند ساتھ تھے۔ ارباب نے ان سے کہا آپ لوگ چاہیں تو واپس چلے جائیں، مَیں تو حضرت کے ساتھ رہوں گا ــــــ اور وہ آخر وقت تک حضرت کے ساتھ رہے۔ آج جب سکھوں نے یورش کی اور سید صاحب میدان میں نکلے، تو ارباب ان کے جلَو میں تھے اور پھر جان کی قربانی دے کر اُس عہد کا آخری تقاضا پورا کر دیا جو ارباب نے سید بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہُوئے اپنے اللہ سے باندھا تھا۔

ارباب کی زندگی کا ہر پہلو کشش انگیز تھا۔ سید صاحب امیرالمؤمنین ہی نہیں، شیخِ طریقت بھی تھے، مُرید شیخ کے آگے دم مارنے کو بھی حبطِ اعمال کا باعث سمجھتے ہیں، کسی امر میں اختلاف تو کجا، کیا مجال کہ شیخ کے چہرے کی طرف بھی آنکھ اُٹھا کر دیکھ جائیں، لیکن ارباب بڑے صاف گو تھے۔ ذرا بھی کوئی بات کھٹکتی برملا زبان پر لے آتے۔ ہجرتِ ثانیہ کے موقع پر سید صاحبؒ کی اہلیہ کے لیے پالکی کا انتظام کیا گیا تھا کہ وہ حالتِ خاص میں تھیں، ارباب بہرام خاں کو یہ بات مساواتِ اسلامی کے خلاف نظر آئی۔ سید صاحب کو اطلاع ہُوئی تو انھوں نے حقیقتِ حال بیان کی اور فرمایا یہ صُورت نہ ہوتی تو اس کے لیے بھی گھوڑے ہی کی سواری کا انتظام کیا جاتا۔ ان کے اہلِ خانہ میں سے کسی کو ایسا عذر ہو تو ضرور پالکی کا انتظام کر دیا جائے گا۔

اخلاص کی آن بان یہ تھی کہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تو پورے اہل و عیال کے ساتھ اور اپنا سارا مال واسباب، ہتھیار، گھوڑے حتیٰ کہ اہلیہ کے قیمتی پارچے تک نذر کر دیے۔ سید صاحب نے دو گھوڑے اور دو تلواریں رکھ لیں، باقی تمام اشیا واپس کر دیں۔ ارباب ہسید صاحب کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن تھے۔ ان کی رائے بڑی بے غرض اور ان کے بے لوث قلب کا مظہر ہوتی۔ باقاعدہ بیعتِ امامت منعقد ہو چکی تو سید صاحبؒ نے سرحدی خوانین اور دوسرے اصحاب الرائے کو طلب فرمایا۔ مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا کہ جہاد کا آغاز کس مقام سے ہو۔ ارباب نے بے تکلف عرض کیا: "ہم سب غرض مند ہیں۔ میں پشاور سے نکلا ہوں میرا جی چاہتا ہے پہلے پشاور فتح ہو۔ محمد خاں جمعدار اٹک سے نکلا ہے وہ اٹک چاہتا ہے۔ ناصر خاں پکھلی پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ اس کا فیصلہ ہندوستانی بھائیوں پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ حق کی راہ میں جدوجہد کرنے یہاں آئے ہیں، اپنی کوئی ذاتی خواہش اور غرض نہیں رکھتے۔ وہ جو فیصلہ کریں گے پورے اخلاص پر مبنی ہوگا۔ ہم اس فیصلے پر بے چون و چرا عمل کریں گے۔"

سید صاحبؒ نے سرحد میں جتنے معرکے لڑے ان سب میں ارباب نے نمایاں کردار ادا کیا۔ بعض معرکوں میں کمان بھی کی۔ سکھ مقامی افراد کی مخبری کے نتیجے میں خفیہ راستے سے بالاکوٹ، پر چڑھ آئے تو جنگ کا وہ سارا منصوبہ تلپٹ ہو گیا جو سید صاحبؒ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے تیار کیا تھا۔ اب بالاکوٹ آنے والی ایک ایک پگڈنڈی پر مقابلہ کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ارباب بہرام خاں کی رائے تھی کہ ہمیں سکھ لشکر کے کیمپ پر حملہ کر دینا چاہیے، لیکن پل توڑا جا چکا تھا۔ ارباب نے عرض کیا پل راتوں رات بن سکتا ہے، مگر سید صاحب اس وقت کسی اور عالم میں تھے فرمایا: "ارباب! اس بات کو چھوڑیے، جو کچھ ہونے والا ہے، یہیں ہو کر رہے گا۔" ارباب کنایے کی گہرائیوں میں پہنچ گئے۔ انگشتِ شہادت سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا:

ایں سرور راہِ خدا تعالیٰ حاضر است

اور اب ارباب! اللہ کی راہ میں جان نچھاور کیے سرخرو پڑے ہیں۔

○

وہ بالاکوٹ کے نشیبی محلے میں بہت سے دوسرے شہیدوں کے ساتھ شیخ محمد اسحاق

گورکھپوری کی لاش پڑی ہے۔ معمولی پڑھے لکھے آدمی تھے، قرآنِ کریم کی بھی چند ہی سورتیں آتی تھیں، لیکن رُوحانی مدارج اور زہد و اخلاص کی ایسی رفعتوں پر سرفراز تھے کہ سید بادشاہ نے انھیں خلعتِ خلافت سے نوازا تھا اور سید صاحب کی جماعت کے ممتاز افراد میں شمار ہوتے تھے۔ پہلے شاہ عبدالعزیزؒ کے دستِ بابرکت پر بیعت کرنے کے لیے خدمت میں حاضر ہُوئے تھے۔ وہ اس وقت چراغِ سحری تھے۔ فرمایا: "ہمارے خلیفہ سید احمد حج سے آجائیں تو ان کے ہاتھ پر بیعت کریں"۔ وہ دِن شیخ صاحب نے بڑی بے چینی میں کاٹے۔ سید صاحب حج سے واپس آئے تو والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ راتے بریلی پہنچے اور اپنا ہاتھ اس مردِ حق پرست کے ہاتھ میں اس طرح دیا کہ وہ کٹ گیا، لیکن پھر پیچھے نہ ہٹا۔ بیعت کر کے اور خلعتِ خلافت پہن کر وطن لوٹے تو ایسے حالات دامن گیر ہو گئے کہ دوبارہ خدمت میں حاضر نہ ہو سکے اور سید بادشاہ جہاد کے لیے سرحد روانہ ہو گئے۔ انھیں خبر ملی تو ماہیِ بے آب کی طرح بے تاب ہو گئے۔ بیوی بچوں کو خدا کے حوالے کیا اور نکل کھڑے ہُوئے، عظیم آباد سے ہوتے دہلی شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں پہنچے۔ وہاں سے چار رفیقوں کے ساتھ فقیرانہ لباس پہن کر روانہ ہو گئے اور سکھوں کی حکومت سے گزرتے ہُوئے قافلۂ شوق سے جا ملے۔

سرحد میں جتنی لڑائیاں لڑی گئیں ان میں سرفروشی و جاں نثاری اور جنگی بصیرت کے جوہر دکھائے۔ مایار کی جنگ میں بُری طرح زخمی ہُوئے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں اور لڑنے کے قابل نہ رہے۔ اپنی رفل اور تلوار دو غازیوں کو دے دی اور کہا یہ خدا کا مال ہے، آپ کو امین سمجھ کر دیتا ہُوں، اُمید ہے ان کا پُورا پُورا حق ادا کریں گے۔ اس جنگ میں شیخ محمد اسحاق ایک ایسی ایمان افروز کیفیت سے دوچار ہُوئے جس کا تذکرہ وہ اکثر بڑے سرور آگیں انداز میں اپنے بعض ساتھیوں سے کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ شہید کو قتل کے وقت صرف اتنی تکلیف پہنچتی ہے جیسے چیونٹی نے کاٹ لیا ہو۔ شیخ محمد اسحاق فرماتے: "صادق و امین صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش زخموں سے چُور تھا، لیکن مجھے کانٹا چبھنے سے زیادہ تکلیف نہ ہُوئی"۔

شیخ انگلیاں کٹ جانے سے بندوق یا تلوار چلانے کے قابل نہ رہے تھے۔ اس کے باوجود جہادِ راہِ حق کی جو زندگی اختیار کی تھی اُس سے دستبردار نہ ہُوئے۔ سید بادشاہ ان سے

غیر جنگی خدمات لیا کرتے۔ بالاکوٹ کی جنگ میں انھیں گنڈاسا دے دیا گیا۔ سکھوں نے یورش کی، تو دل میں شوقِ شہادت جاگ اٹھا۔ جنگ کے آغاز ہی میں بائیں بازو پر گولی لگی۔ دایاں بازو پہلے ہی بیکار تھا اب بایاں بھی بیکار ہو گیا۔ وہ یہ کہہ کر واپس بالاکوٹ چلے آئے کہ میں تو اب صرف دُعا کے قابل رہ گیا ہُوں۔ خُون زیادہ بہہ جانے سے بے ہوش ہو گئے۔ سکھوں نے فتح کے بعد بالاکوٹ کو آگ لگا دی اور انھیں اور دوسرے معذور لوگوں کو قتل کر ڈالا۔

سید بادشاہ کی جماعت کا ہر فرد اپنا ایک رنگِ خاص رکھتا تھا۔ شیخ محمد اسحاق کا خصوصی رنگ ان کا جیتا جاگتا ہر وقت چوکنا رہنے والا جذبہ احساس اور اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے شدید محبت تھی یہی محبت انھیں اپنے گھر بار سے نکال کر ہزاروں میل دور کھینچ لائی تھی، ان کی راتیں رکوع و سجود میں گزرتیں اور دن اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی تگ و دو میں۔ بایں ہمہ کبھی کبھی انھیں اپنی زندگی میں کارفرما جائز بشری جذبات بھی بُری طرح کھٹکنے لگتے۔ ایک مرتبہ شاہ اسماعیلؒ نے وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ (اور جو لوگ ایمان لائے انھیں سب سے زیادہ محبت اللہ سے ہوتی ہے) کی تفسیر بیان فرمائی۔ ایک تو موضوع ہی ایمان افروز تھا اس پر شاہ اسماعیلؒ ایسے عالم و خطیب کا بیان دِلوں کو لذّتِ شوق سے بہرہ ور کر گیا، لیکن شیخ محمد اسحاق پر اس کا اثر مختلف ہُوا۔ ان کے احساس کے تار جھنجھنا اُٹھے، دِل کی گہرائیوں سے ایک بے آواز ہُوک بلند ہُوئی اور آنکھوں سے سیلِ اشک بہہ نکلا۔ کھانا پینا ترک کر دیا، بس گُم صُم آنسو بہاتے رہتے۔ شاہ صاحبؒ کو خبر ملی تو بُلوا بھیجا۔ دریافت فرمایا: "یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟" عرض کیا: "مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے، ہر وقت اُس کا خیال رہتا ہے اور یہ صورت وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ کے منافی ہے۔" شاہ صاحب نے پُوچھا: "کیا اس وقت بھی یہی کیفیت تھی جب آپ وطن میں تھے؟" جواب دیا "اُس وقت تو یہ حالت نہ تھی، لیکن اب خیال دِل سے جاتا ہی نہیں ہے۔" شاہ صاحب نے پھر سوال کیا: "کیا آپ بیوی کی محبت کے جوش میں کارِ جہاد چھوڑ کر وطن جا سکتے ہیں؟" کہا: "ہرگز نہیں، مجھے اپنے دِل پر اتنا قابو ہے کہ یہاں مصائب اور شدائد کے طوفان بھی اُمڈ آئیں، خوشی خوشی جھیل لُوں گا، لیکن وطن کا قصد نہ کروں گا۔" شاہ صاحب نے فرمایا: "پھر اطمینان رکھیے، آپ یقیناً وَالَّذِينَ

اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ کے گروہ میں شامل ہیں۔

شیخ محمد اسحاق کے قلب و ذہن سے اضطراب کی پھانس نکل گئی، تب کہیں جا کر انھوں نے کھانا کھایا۔

○

وہ سامنے شیخ بلند بخت حق کی راہ میں سر فدا کیے پڑے ہیں۔ وہ فی الواقع بلند بخت نکلے۔ ایک مردِ مومن کے بخت کی بلندی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے وقف کر دے، اس راہ میں آنے والی ہر مصیبت اور صعوبت کا خندہ پیشانی سے سامنا کرے، حتیٰ کہ اپنی جان تک نثار کر دے۔ شیخ بلند بخت سردھنہ میں فوج میں ملازم تھے۔ سید بادشاہ عمومی تبلیغی دورے پر میرٹھ ہوتے ہوئے سردھنہ پہنچے، تو قصبے کے دوسرے اصحاب کے علاوہ شیخ صاحب اور ان کے ساتھیوں نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ شیخ کی زندگی پہلے عام فوجیوں کی طرح یکسر لاابالی زندگی تھی، سید بادشاہ کے فیضِ صحبت سے ان کی کایا ہی پلٹ گئی۔ اللہ کے رنگ میں رنگ گئے، نوکری چھوڑ دی، سید بادشاہ کا دامن پکڑا تو مرتے دم تک نہ چھوڑا۔ سید بادشاہ جہاد کے لیے روانہ ہوئے تو گھر بار چھوڑ کر ان کے جلو میں ہو لیے۔ حق کو اپنانے کی اس استعداد سے سید صاحب بے حد متاثر ہوئے۔ شیخ فنونِ جنگ میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کی اس صلاحیت سے سید بادشاہ نے سرحد کی جنگوں میں بھرپور فائدہ اٹھایا۔ انھیں اہم ذمہ داریاں سونپیں جسے انھوں نے پورے اعتماد اور کامیابی کے ساتھ نبھایا۔ غازیوں کو قواعد اور چاند ماری سکھانے کا کام انھی کے سپرد تھا۔ ہمیشہ راہِ عزیمت پر گامزن رہے۔ دشمن کے آگے کبھی فروتنی کا اظہار نہ کیا۔

سمہ کے خوانین نے سید بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے کے بعد غداری کی اور مجاہدین کے لہو سے ہولی کھیلی تو ان دنوں شیخ بلند بخت امب کے قلعہ دار تھے۔ اس المناک حادثے کی خبر سن کر انھوں نے کسی بھی پریشان کن صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کی پوری تیاری کر لی۔ مفسدوں کے حوصلے بڑھ گئے تھے، وہ جانتے تھے کہ شیخ اور ان کے ساتھیوں کو کہیں سے مدد نہیں پہنچ سکے گی۔ سردار پایندہ خاں نے انھیں الٹی میٹم دے دیا کہ ہمارے

علاقے خالی کر دو۔ شیخ کے پاس بہت کم غازی تھے، لیکن اُنھوں نے جواب میں کہلا بھیجا "ہم سید بادشاہ کے حکم کے بغیر ایک انچ زمین بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ جنگ کرنا چاہتے ہو، تو شوق سے کر دیکھو۔" پایندہ خاں نے اپنا لشکر دریا کے مغربی کنارے پر پہنچانا شروع کر دیا۔ اب خطرے میں تھا۔ شیخ بلند بخت نے فوراً دفاعی اقدامات کیے۔ سامانِ رسد کا انتظام کیا، گڑھی کے تین اطراف میں توپیں نصب کر دیں، (چوتھی جانب دریائے سندھ تھا) پایندہ خاں پچیس روز سر پٹکتا رہا، لیکن مشرقی سمت کی خاربندی کے بیرونی حلقے میں ایک مرتبہ آگ لگانے کے سوا کچھ نہ کر سکا اور ناکام و نامراد لوٹنے پر مجبور ہو گیا۔

نصب العین کا عشق شیخ کی رگ و پے میں رچا ہوا تھا۔ اس عشق کے آگے ان کی نگاہ میں دُنیا اور اُس کی تابانیاں کوئی شے نہ تھیں جس زمانے میں سید بادشاہ اور ان کے ساتھیوں پر سرحد کی زمین تنگ ہو گئی تھی اور شیخ بلند بخت امب میں پایندہ خاں کی ترکتازیوں کا ہدف بنے ہوئے تھے انھیں کرپلیاں کے سکھ سردار نے تحریص و ترغیب کا دام بچھا کر پھانسنے کی کوشش کی۔ ایک خط میں غازیوں کی بہادری، امانت اور وفاشعاری کی مدح و توصیف کی اور پیش کش کی کہ غازی ہمارے پاس آجائیں تو ہم انھیں عزت کی ملازمتیں دیں گے۔ شیخ نے جواب میں جو کچھ کہلا بھیجا اُس کے ایک ایک لفظ سے ان کے صدق و اخلاص اور نصب العین کے ساتھ گہرے لگاؤ کی حدت پھوٹی پڑتی ہے۔

"اپنے سردار سے کہہ دو" شیخ نے دو ٹوک جوابی پیغام دیا "ہم امیرالمؤمنین کے فرمانبردار ہیں، حضرت کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنا وطن کافروں سے جنگ کرنے کے لیے چھوڑا ہے۔ ہمیں نہ مُلک مطلوب ہے نہ مال اور نوکری۔ ہم مریں گے تو امیرالمؤمنین کے ساتھ اور زندہ رہیں گے تو ان کی معیت میں۔ ہم قادرِ ذوالجلال کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ پایندہ خاں اور اُس کے لشکر کی کیا حقیقت ہے؟ اگر رنجیت سنگھ اپنی سپاہ لے کر آجاتے تو ہم اس سے بھی خوف نہیں کھائیں گے۔ ڈر موت کے خوف سے جنم لیتا ہے، ہم اپنی جانیں خدا کی راہ میں قربان کر چکے ہیں، سو ہمیں کاہے کا ڈر ہے؟ ہماری طرف، آئندہ اس قسم کا کوئی پیغام نہ بھیجا جائے۔"

شیخ صبر و استقامت کا پہاڑ تھے، دِل میں ہر دم تمنائے شہادت کروٹیں لیتی رہتی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی شیخ علی محمد بھی سید بادشاہ کے قافلے میں تھے۔ شیخ بلند بخت پھتربائی کی مہم پر گئے ہوئے تھے کہ ان کے پیچھے بھائی فوت ہو گئے۔ شیخ بلند بخت کو مہم سے واپسی پر ستھانہ میں یہ المناک خبر ملی۔ شیخ کے چہرے پر غم کی گھٹا سی چھا گئی اور گرد و پیش پھیلی ہوئی خاموشی میں ڈوب سے گئے۔ تاہم یہ فطری ردِ عمل صرف چند لمحے رہا، پھر ان کا چہرہ چمک اُٹھا اور بولے: "الحمد للہ ہمارا بھائی جو مُراد لے کر آیا تھا وہ پوری ہو گئی۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے۔"

——— اور آج شیخ بلند بخت کی یہ دُعا بارگاہِ الٰہی میں قبول ہو چکی ہے۔

○

وہ شیخ امیر اللہ ہیں۔ انھیں سید بادشاہ کی دعوتِ حق و سعادت تھانہ بھون سے کھینچ لائی تھی۔ بڑے ہی شجاع اور دلیر تھے۔ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن دعوتی زندگی کے ماحول نے ان کی مخفیہ صلاحیتیں اجاگر کر دی تھیں اور اچھا خاصا وعظ کہہ لیتے تھے۔ جہادِ راہِ حق سے پیچھے رہ جانے والوں کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے۔ بیٹا پیچھے وطن میں تھا۔ اُسے بھی انھی لوگوں کے زمرے میں شمار کرتے۔ ایک مرتبہ خط لکھوایا: فلاں باغ بیچ ڈالو، اُس کی قیمت میں سے آدھی رقم اپنی والدہ کو دے دو تاکہ انھیں گزر بسر میں تکلیف نہ ہو، باقی رقم لے کر یہاں آجاؤ، اس حکم کی تعمیل میں تساہل ہُوا تو لشکرِ اسلام کے پہنچنے پر اس کی جو سزا ہو گی، وہ نہ تو چھوڑی جائے گی اور نہ اس میں کمی ہو گی، قیامت کے دِن جو سزا ملے گی وہ اس کے علاوہ ہے۔

تمام جنگوں میں شریک ہُوئے، اتفاق ایسا کہ کبھی خراش تک نہ آئی۔ بڑی حسرت سے کہا کرتے: "یہاں آئے تو کیا حاصل ہُوا؟ ابھی تک نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔" جنگِ مایار میں ان کی ران اور دایاں بازو بُری طرح زخمی ہُوئے۔ فتح کے بعد زخم کی پٹی ہونے لگی تو نُور بخش جراح نے مزاحاً کہا: "شیخ صاحب! آپ ہمیشہ کہتے تھے کہ ابھی تک نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ کہیے اب پھوٹی کہ نہیں؟"

فرمایا: "الحمد للہ، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔"

جنگِ مایار میں نکسیر پھوٹنے کی حسرت پوری ہُوئی اور آج وہ تمنا بر آئی جو ان کے دل میں اُس روز پیدا ہُوئی جب انھوں نے سید بادشاہ کی بیعت کی تھی اور راہِ جہاد میں قدم رکھا تھا۔

وہ میرزا احمد بیگ پنجابی ہیں۔ ان دو اڑھائی سو بہادر پنجابی جوانوں میں سے ایک جنھیں ایک مرحلے میں تنخواہ پر رکھا گیا، لیکن پھر بدلتے ہُوئے حالات کی وجہ سے اس منصوبے پر عمل نہ ہو سکا اور فیصلہ ہُوا کہ ان لوگوں کو تنخواہ ادا کر کے رخصت کر دیا جائے۔ سیّد صاحب نے، انھیں رخصت کرتے ہُوئے خطاب فرمایا اور جہاد کے فضائل بیان کیے۔ ارشاد ہُوا: جو لوگ نوکر ہو کر جہاد کرتے ہیں ان میں سے کوئی میدانِ جنگ میں کام آتا ہے تو اگرچہ وہ بھی شہادت کے خلعت سے نوازا جاتا ہے تاہم ان لوگوں کے مرتبہ و مقام کو نہیں پہنچتا جو خالص اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے جہاد کرتے ہیں۔ ہمارے بھائی کھاتے پیتے اور خوشحال گھروں کے تھے، کئی بیش قرار نوکریاں چھوڑ کر آئے۔ کتنوں ہی نے جاگیریں، زراعت اور تجارت چھوڑ دی، اب اللہ کی خاطر ہمارے ساتھ رہتے اور فاقے اور مصیبتیں سہتے ہیں، خوش وخرم اور راضی برضائے الٰہی ہیں اور قضا و قدر کے فیصلے پر صابر و شاکر زندگی گزارتے ہیں۔ آپ حضرات بھی اسی طرح ہمارے ساتھ رہیے۔ جو کچھ ہم کھاتے اور پہنتے ہیں آپ بھی وہی کھائیے اور پہنیئے، ہمارے دوش بدوش اللہ کی راہ میں جدوجہد کیجیے، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہمیں قدرے فراغت نصیب ہو گی تو ہم آپ لوگوں کو مزید اتنا کچھ دیں گے کہ وہ نوکری سے زیادہ پڑے گا، البتہ اس کا ہم ابھی سے اقرار نہیں کرتے کہ کل کوئی ہم سے مطالبہ کرے۔"

سیّد صاحبؒ کی پُر اثر تقریر نے دِلوں میں ہلچل مچا دی۔ میرزا احمد بیگ بول اُٹھے: "حضرت مَیں رضائے الٰہی کی خاطر حاضر ہُوں، تنگی ترشی ہر حال میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔" تیس چالیس اور اصحاب نے بھی یہی فیصلہ کیا۔ باقی لوگ گھروں کو چلے گئے۔ میرزا احمد بیگ اس جماعت کے امیر مقرر ہُوئے۔ میرزا تمام لڑائیوں میں شریک رہے۔ بعض اہم مہموں میں نمایاں حصّہ لیا اور آج وہ اس آخری جنگ میں اپنا سر دے کر راہِ حق و ہدایت پر چلتے ہُوئے عہد و وفا کی تاریخ میں ایک حسین و تابندہ نقش کا اضافہ کر چکے ہیں۔

○

وہ حافظ مُصطفٰے ہیں۔ بڑے شجاع اور صاحب تدبیر و دانش تھے۔ تمام جنگوں

میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ انتظامی صلاحیتوں سے مالا مال تھے۔ سمہ کے خوانین کی غداری کے بعد پایندہ خاں نے امب اور گرد و نواح کے علاقے پر دھاوا بولا تو اُس وقت حافظ صاحب چھتر بائی کے قلعہ دار تھے۔ پایندہ خاں نے محاصرہ کرلیا جو چالیس روز جاری رہا۔ لیکن حافظ صاحب نے ایسے مستحکم دفاعی اقدامات کیے کہ وہ گڑھی سر نہ کرسکا۔ اس دوران میں اُس نے حافظ صاحب کو دامِ تحریص کا شکار بنانے کی کوشش کی، نوکری کا لالچ دیا۔ انھوں نے اس کی پیش کش اُس کے مُنہ پر ماردی اور جو جواب دیا اس سے ان کی شانِ استقامت، صدق و اخلاص اور جہاد فی سبیل اللہ کے ذوق و شوق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ پایندہ خاں کے پیغامبر کے ہاتھ کہلا بھیجا:

"میں حضرت امیرالمؤمنین کا فرماں بردار ہُوں۔ ان کے حکم کے بغیر گڑھی خالی نہ کروں گا۔ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کرنے آئے ہیں، نوکری کے لیے نہیں۔ نوکری تو وہ شخص کرے گا جو مال و دولت کا طلب گار ہوگا۔ ہم خدا کی راہ کے طالب ہیں" ——— اور آج انھوں نے وہ گوہرِ مقصود پالیا ہے جس کی طلب میں وطن اور گھر بار چھوڑا تھا۔ خالص اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہُوئے وہ اُس منزلِ بلند پر پہنچ گئے ہیں جس سے بلند تر منزل اور کوئی نہیں، جہاں زندگیٔ جاوید اور رضوانِ الٰہی ہے۔

وہ منشی محمدی انصاری ہیں، سیّد صاحب کے ان خوش بخت اور سعادت مند نوجوانوں میں سے ایک جو بالکل عنفوانِ شباب میں اللہ کی راہ میں گامزن ہُوئے اور اپنی بے داغ جوانی اور حسین و پاکیزہ سیرت و کردار کے ساتھ جوانی ہی میں اس راہ میں گردن کٹادی میر منشی اُنتیس تیس برس کے تھے جب سیّد صاحب کے ہاتھ پر اُس وقت اپنے پُورے خاندان اور اعزہ کے ساتھ بَیعت کی، جب سیّد صاحب تبلیغی دَورے پر میرٹھ اور مظفر نگر سے ہوتے ہُوئے راج محل پہنچے۔ سیّد صاحب نے انھیں نکاح کرلینے کی ہدایت کی۔ اللہ نے انھیں ایک بیٹا دیا۔ سیّد صاحب ہجرت کرکے سرحد کی طرف روانہ ہُوئے، تو منشی صاحب ایک زبردست امتحان میں پڑ گئے۔ ایک طرف حق کی پکار اور سیّد صاحب کی معیت میں ہجرت و جہاد کا جذبۂ فراواں تھا اور دوسری طرف بچّے کی بے پناہ محبت۔ خود فرماتے تھے کہ بچّے کی

محبت دل میں اس طرح پیوست ہو گئی کہ ایک امتحانِ الٰہی بن گئی، تاہم اس کشمکش میں محبتِ الٰہی کا جذبہ غالب آیا، ان کی عزیمت اور قسمت میں لکھی ہوئی سعادت نے دنیوی بکھیڑوں کی زنجیریں توڑ ڈالیں، وہ ہر چیز سے منہ موڑ کر سید صاحب کی خدمت میں رائے بریلی پہنچ گئے اور ہجرت کا شرف حاصل کیا ـــــ اور آج وہ اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور اپنے پاک لہو میں ڈوبے رضوانِ الٰہی کو اپنے دامنِ رنگیں میں سمیٹے پڑے ہیں۔ سید بادشاہ انھیں "انصاری بھائی" کہا کرتے تھے۔ امیر المؤمنین کے دفتر کے انچارج تھے اور بے غرضی اور اخلاص کے پیکر۔

○

وہ مولوی احمد اللہ ناگپوری خلعتِ شہادت پہنے زندگیٔ جاوید کی سعادتوں سے بہرہ یاب پڑے ہیں۔ یہ مولانا عبدالحی کے عم زاد بھائی تھے۔ مولانا عبدالحی، شاہ عبدالعزیزؒ کے داماد تھے اور علم و عمل اور زہد و ورع کی انھی خصوصیات کے حامل جو ولی اللّٰہی خاندان کا طغرۂ امتیاز تھیں۔ سید بادشاہ کی جماعت کے سب سے بڑے ستون۔ سب سے پہلے انھی نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی اور انھی کی تحریک پر شاہ اسماعیلؒ نے سید بادشاہ کا دامن تھاما۔ مولوی احمد اللہ اپنے اسی عظیم بھائی سے ملنے سرحد پہنچے تھے۔ ان سے ملاقات تو قسمت میں نہ تھی کہ تین چار دن پہلے مولانا کا انتقال ہو گیا تھا، لیکن ملاقات کا یہی بہانہ خود مولوی صاحب کے مقدر کا تابندہ ستارہ بن گیا۔ مولوی صاحب سرحد آئے تو یہیں کے ہو رہے۔ سید بادشاہ کی بیعت کر لی اور رفیقانِ خاص میں شامل ہو گئے اور جہاد فی سبیل اللہ میں سرگرم حصہ لینے لگے۔ تیراندازی، نیزہ بازی، چابک سواری اور کشتی اور دوسرے فنونِ جنگ میں باکمال تھے۔ غازیوں کی فوجی تربیت کا کام جن اصحاب کے ذمے تھا، ان میں مولوی احمد اللہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے گولے ڈھالنے کی ایک فیکٹری بھی بنائی تھی۔ سید صاحب کی مجلسِ شوریٰ کے اہم رکن تھے اور ایک مرتبہ سید صاحب مرکز سے باہر تشریف لے گئے تو انھیں اپنا نائب بنا دیا تھا۔ سید صاحب کو ان پر اعتمادِ کامل تھا اور آج بھی زندگی اور موت کے اس تاریخی معرکے میں وہ اس اعتماد پر پورے اترے ہیں۔

وہ مولوی عبدالوہاب ہیں۔ سید صاحب نے انھیں رسد تقسیم کرنے کے کام پر

مامور فرمایا تھا۔ بڑے نظم کے ساتھ غلہ وغیرہ تقسیم کرتے۔ بعض اُوقات پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ غازی بیک وقت راشن لینے کے لیے پہنچ جاتے۔ یہ سب کو باری باری مقررہ پیمانے کے مطابق دیتے، چھوٹا ہوتا یا بڑا، عام سپاہی ہوتا یا افسر جس ترتیب سے لوگ آتے اُسی ترتیب کے ساتھ رسد وصول کرتے۔ ذرا بے ترتیبی روا نہ رکھتے۔ قرآن حفظ کرنے کا بڑا شوق تھا۔ کئی بار سید صاحب سے عرض کیا دُعا فرمایئے اللہ مجھے حفظ کی توفیق عطا فرمائے اور مَیں ایک بار تراویح میں پُورا قرآن آپ کو سناؤں۔ جو کام بھی کر رہے ہوتے۔ آہستہ آہستہ قرآن مجید پڑھتے رہتے۔ ان کی یہ دیرینہ تمنا پوری ہُوئی۔ ایک مہینہ چوبیس دِن پہلے اُنھوں نے تراویح قرآن پڑھ کر سُنایا تھا —— اور آج وہ دعوت وجہاد کی سرگرم زندگی گزار کر اپنے رب کے پاس سرخرو جا چکے ہیں۔

وہ مولوی نور احمد نگرامی ہیں، مورّخِ اسلام۔ سید صاحب کی صحبت سے ابتدا ہی سے فیض اُٹھاتے چلے آرہے تھے اور آپ کے شب و روز کے احوال قلمبند کرتے رہے تھے۔ جو کچھ سُنتے سید صاحب سے تصدیق کرا کے صفحۂ قرطاس کے حوالے کر دیتے۔ تمام جنگوں میں شریک ہُوئے اور آج اِس آخری جنگ میں دادِ شجاعت دیتے ہُوئے خلعتِ شہادت سے سرفراز ہو گئے ہیں۔ پہلے ایک گولی ان کے بازو پر لگی اور ہاتھ بیکار ہو گیا۔ قریب ہی ایک غازی محمد امیر خاں قصوری ایک پتھر کی آڑ میں کھڑے دشمن پر فائر کر رہے تھے، ان سے کہا بھائی مَیں تو بیکار ہو گیا، یہ میری چیزیں ہیں جو درکار ہوں لے لو۔ انھوں نے گولیاں لے لیں۔ مولوی نور احمد آہستہ آہستہ بالاکوٹ کی طرف بڑھے، لیکن ایک گولی اور لگی۔ وہ لڑکھڑائے، پھر زمین پر بیٹھ گئے اور ابدی زندگی سے ہمکنار ہو گئے۔

○

یہ تو صرف چند چہرے ہیں جنھیں تاریخ کے مسافر نے ان کے نمایاں خدوخال سے پہچان لیا ہے، ورنہ کفر و اسلام کی اس جنگ میں تین سو سے زائد مردانِ حق شہید ہُوئے ہیں اور ان کی لاشیں وادی و کہسار میں کھیتوں اور ڈھلوانوں پر جا بجا منتشر پڑی ہیں۔ اِن میں گمنام مجاہد بھی ہیں اور وہ اصحاب بھی جن کا نام تاریخ اپنے سینے میں محفوظ رکھے گی۔ ان

ہیں سے ہر ایک اسلامی غیرت وحمیّت کا امین، متّبع سُنّت، راہِ حق میں گرم جوش، سرفروش و جانباز، متقی و عبادت گزار، صبر و استقامت کا پہاڑ، سادہ و متواضع، خادمِ خلق، خدا ترس اور شوقِ جہاد کی منہ بولتی تصویر تھا۔

اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا ہے اور فضا میں افسردگی و غمناکی اور گمبھیر ہو گئی ہے۔ ہر طرف ایک سناٹا طاری ہے۔ جیسے گا ہے گا ہے سکھوں کے کیمپ سے اُٹھنے والے نغمے اور فتح کے شادیانے توڑ دیتے ہیں۔ انھیں رقصِ مسرت کرنا ہی چاہیے۔ انھوں نے ایک ایسی قوت کو ذبح کر ڈالا ہے جو ان کے لیے خطرناک چیلنج بن گئی تھی اور ذبح بھی ان لوگوں کے تعاون سے کیا ہے جن کو یہ قوت، عزت کی زندگی بخشنے آئی تھی۔ یہ لوگ آپس میں بٹے ہوئے تھے، بھائی بھائی کا دشمن تھا، اس نے ان کے اندر اخوت کی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اِن کی بستیاں اور شہر سکھوں کی غارت گریوں کا شکار ہو رہے تھے۔ وہ اِن کے مکانوں کو آگ لگا دیتے، اِن کے مردوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتے اور عورتوں کو پکڑ کر لے جاتے۔ یہ قوت اِن کے لیے ڈھال بنی۔ اِس نے سکھوں کو میدانِ جنگ میں بھی اور قلعوں میں بھی شکست دے کر اُن کی اُس ہیبت کا طلسم توڑا جس میں پنجاب اور سرحد کے مسلمان گرفتار تھے۔ اس نیکی کا صلہ اِنھوں نے یہ دیا کہ اسلام اور مُسلمانوں کے ان دشمنوں سے مل گئے۔ اور آج یہ قوت خُون میں نہائے پڑی ہے اور دشمن شاداں و فرحاں ہے۔ اور جو لوگ اس ذبحِ عظیم سے بچ گئے ہیں وہ زخموں سے چور، ٹوٹے دِلوں اور شکستہ اُمیدوں کے ساتھ بالاکوٹ کے پہاڑوں اور جنگلوں میں پھر رہے ہیں۔ اس افسردہ و غمگین فضا میں اچانک دُور کہیں اُلّو کی چیخ بلند ہوتی ہے۔ فضا اور سہم جاتی ہے۔ اُلّو کی ڈراؤنی چیخیں وقفے وقفے سے اُٹھ رہی ہیں اور بالاکوٹ کے باسی جو گرد و پیش کے پہاڑوں اور دیہات میں سر چھپائے بیٹھے ہیں دِل ہی دل میں لرز اُٹھتے ہیں۔ صبح جب وادی میں کفر و اسلام کے درمیان معرکۂ عظیم برپا تھا یہ لوگ اپنے گھروں کا سامان سروں پر لاد کر بالاکوٹ سے نکل گئے تھے۔ سکھوں نے حملہ کیا تو شہر کو آگ لگا دی۔ دِن بھر بالاکوٹ کی فضا میں شُعلوں کی زبانیں لہراتی اور دھوئیں کا زہر پھیلاتی رہیں۔ اب شُعلے سرد ہو چکے ہیں، رات بھیگتی جا رہی ہے، سکھوں کے کیمپ کے نغماتِ مسرت اور رقص و سرود کی محفلیں دم توڑ چکی ہیں۔ اَب فضا میں صرف اُلّو کا راج ہے۔ شاہینوں کی جب گردنیں اور پر کٹ جائیں، تو اُلّوؤں ہی کا دَور دورہ ہوتا ہے۔

قافلۂ شوق

نومبر ۱۸۲۶ء کے آخری دن تھے۔ پہاڑ برف کے اُجلے شفاف لبادے میں لپٹ چلے تھے اور خنک ہوا میں شمشیر کی تیزی آگئی تھی۔ ناگہاں فضا میں جذبات کی چنگاریاں چمکیں اور زندگی کے ٹھٹھرے ہوئے قالب میں آگ بھر گئیں۔ کوہ و دمن سے ابھرتی، بستی بستی کا سفر کرتی ہوئی یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی کہ سید بادشاہ پرچم جہاد لہراتے تشریف لا رہے ہیں ___ اور پھر گویا عزیمت مسکرانے لگی، حوصلے جاگ اُٹھے، رگوں میں سرسراتے ہوئے خوف کی جگہ فطری جوش و تہور رقص کرنے لگا۔ وہ ایک مدت سے سکھوں کے ہاتھوں گھاؤ پر گھاؤ کھاتے چلے آرہے تھے۔ ہزارہ تک کے علاقے پر تو کئی برس پہلے سے ان کے خونیں سائے چھائے ہوئے تھے۔ دریائے سندھ کے مغربی کنارے تک جگہ جگہ ان کی گڑھیاں اور قلعے بنے ہوئے تھے جہاں سے وہ نکلتے اور قتل و غارت کا بازار گرم کرتے سرحدِ آزاد میں دُور دُور تک چلے جاتے۔ ٹھیک آٹھ برس پہلے پشاور اور یوسف زئی کے علاقے بھی ان کے آگے سرنگوں ہو گئے تھے۔ صدیوں سے آزاد رہنے والے خوانین اب رنجیت سنگھ کو خراج ادا کر رہے تھے۔ اس ذلت و رسوائی کے باوجود جب ترنگ اُٹھتی سکھوں کے جتھے ان پر بلائے بے درماں کی طرح چڑھ دوڑتے، ہر طرف تباہی مچا دیتے اور اپنے پیچھے ایسی دہشت چھوڑ جاتے کہ مائیں اپنے ضدی بچوں کو ان کا نام لے کر ڈرایا کرتیں۔ ہمتیں اس قدر پست اور حوصلے پاش پاش ہو چکے تھے کہ ان کی دھاڑ کی خبر جہاں تک پہنچتی لوگ اپنا مال و متاع اور بیش قیمت اشیا اٹھا کر دُور جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے۔ جو بستیاں اور شہر ان کی غارت گری کا شکار ہوتے وہاں ایک مدت تک آہوں اور کراہوں کا دھواں اٹھتا رہتا۔ وہ مردوں کو تہ تیغ کر دیتے، عورتوں اور بچوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے جاتے۔ جلی ہوئی مسجدیں، تباہ شدہ کھیتیاں اور مکانات اور پٹوں سے محروم دروازے

اور در بچے اپنے مالکوں اور مکینوں کی بے چارگی کا نوحہ پڑھنے کے لیے پیچھے رہ جاتے۔ ہر دل مجروح اور ہر جسم داغ داغ تھا۔ کچھ زخم تو ابھی بالکل تازہ تھے۔ تین برس پہلے انھوں نے اس عذاب سے نجات پانے کی کوشش کی تھی۔ نوشہرے کے مقام پر خونریز جنگ ہوئی، لیکن شکست کھائی، سکھوں نے پشاور پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور پھر خیبر تک تباہی مچاتے چلے گئے۔ اس تباہی کے زخم ابھی تک رس رہے تھے۔

ایسے عالم میں سیّد بادشاہ اور ان کے مجاہدین کے ورود نے سارے علاقے کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔ ایک خلقت تھی کہ والہانہ اُمڈ پڑی تھی۔ مرد ہی نہیں عورتیں بھی اپنے شیر خوار بچے اٹھاتے اس درویشِ خدامست کی زیارت کے شوق میں کشاں کشاں چلی آتی تھیں جو مایوسی اور بے چارگی کے گھٹا ٹوپ اندھیاروں میں اُمید کا ستارہ بن کر ان کے افق پر نمودار ہوا تھا۔ سیّد بادشاہ جس قصبے اور گاؤں سے گزرے مرد و زن نگاہِ عقیدت راہ میں بچھائے کھڑے تھے۔ جذبات کے تلاطم کا عجیب رنگ تھا۔ اَللّٰہ کی کبریائی کے نغمے فضا میں بار بار ارتعاش پیدا کیے دیتے تھے۔ سیّد بادشاہ اُونٹ پر سوار تھے۔ اُونٹ کے زین پوش کی جھالر کا ایک ایک تار عورتوں نے تبرکاً توڑ لیا تھا، اُونٹ کی دُم کے بال تک نوچ لیے تھے، اُونٹ کے پیر جہاں پڑتے تھے عورتیں اُس جگہ کی خاک اُٹھا لیتیں اور برکت کے طور پر مُنہ اور آنکھوں پر ملتیں، بعض نے وہ خاک کپڑے میں باندھ لی تھی۔ سیّد بادشاہ مجاہدین کو جلو میں لیے مجسّم عجز و انکسار بنے، اُونٹ پر سر جھکائے چلے جا رہے تھے۔ اُن کا نُورانی چہرہ اور روشن ہو گیا تھا۔

سیّد بادشاہ نے تین دِن پشاور میں قیام کیا، وہاں سے چکنی ہوتے ہُوئے ہشت نگر کے علاقے میں پہنچے، پھر خویشگی تشریف لائے اور وہاں سے کُوچ کر کے ۱۸ دسمبر ۱۸۲۶ء کو نوشہرے میں پڑاؤ ڈالا۔ دریا کے پار بُدھ سنگھ لشکر لیے اکوڑے پر حملے کی تیاری کر رہا تھا جسے اکوڑے کے رئیس امیر خاں کا بھتیجا خواص خاں اپنے چچا کے خلاف چڑھا لایا تھا۔ امیر خاں نے ہشت نگر میں حاضر ہو کر سیّد بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور مدد کا طالب ہوا تھا۔۔۔ سیّد بادشاہ دینی روایات زندہ کرنے اُٹھے تھے۔ ہندوستان میں انھوں نے اپنے

دعوتی دَوروں میں کتنی ہی مٹی ہوئی سُنّتیں اور روایاتِ دینی زندہ کی تھیں۔ یہاں پھر ایک اسلامی روایت زندہ ہو رہی تھی۔ سکھوں کے ساتھ جنگ چھیڑنے سے قبل سید بادشاہ وہ اتمامِ حجّت کرنا چاہتے تھے جو صحابہ کرامؓ قیصر و کسریٰ کے درباروں اور جنگ کے میدانوں میں کیا کرتے تھے۔ صحابہؓ حق کی سربلندی کے لیے اُٹھے تھے، مُلک فتح کرنے کے لیے نہیں۔ وہ چاہتے تھے دُنیا کُفر کی جھلستی ہوئی دھوپ سے نکل کر اسلام کی خنک اور رُوح پرور چھاؤں میں آجائے۔ وہ جسم کی تسخیر کے نہیں رُوح کو مسخر کرنے کے قائل تھے؛ تاہم جنگ ان کے نزدیک ایک ناگزیر ضرورت تھی۔ کفر کا تسلّط بہرحال انھیں گوارا نہ تھا۔ اگر کُفر کے عَلمبردار اسلام کے آگے سرنگوں ہونے کو آمادہ نہ ہوتے تو پھر ان کے ہاتھوں سے اقتدار اور انسانی معاشرے کی رہنمائی کی باگ ڈور چھین لینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ سید بادشاہ کے پیشِ نظر بھی جنگ و جہاد کا یہی عظیم مقصد تھا، چنانچہ انھوں نے شریعت کے دستور کے مطابق رنجیت سنگھ کو ایک اعلام نامہ تحریر فرمایا جس میں اُسے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے اور اخوتِ اسلامی کے رشتے میں منسلک ہوجانے کی دعوت دی۔ بصورتِ دیگر مطالبہ کیا کہ ہماری اطاعت اختیار کرکے جزیہ دینا قبول کرلو۔ ۔ ۔ اگر دونوں میں سے کوئی بات بھی منظور نہیں تو پھر لڑنے کے لیے تیار ہوجاؤ، مگر یاد رکھو تمھیں شراب سے اتنی محبت نہ ہوگی جتنی ہمیں راہِ حق میں شہید ہونے سے ہے۔

نوشہرہ میں قیام کے یہ ابتدائی دن بڑے جذب و شوق کے دِن تھے۔ دنیاوی سروسامان کے اعتبار سے سید بادشاہ اور ان کے ساتھی تہی دامن تھے۔ خوراک تک کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا۔ ہندوستان سے جو روپیہ اور سامانِ رسد لے کر چلے تھے وہ کئی ماہ کے طویل سفر میں ختم ہوچکا تھا۔ مزید قافلے ابھی آنا شروع نہیں ہوئے تھے جن کے ہاتھ روپیہ پہنچنے کی توقع تھی۔ اخراجات کا سارا دارومدار اللہ کے توکّل پر تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ باورچی خانے کے برتن کسی ساہوکار کے ہاں رہن رکھ کر غلّہ لیا۔ بایں ہمہ پُورا لشکرِ اسلامی ایمان و یقین، صبر و توکّل، عزیمت و استقامت اور رضائے الٰہی کے جذبے سے سرشار تھا جس کا نفیس ترین پیکر سیّد بادشاہ تھے۔ مجاہدین رات گئے تک سیّد صاحب کی چارپائی کے گرد بیٹھے ہمہ تن

گوش بنے ارشادات سنا کرتے اور وہیں بیٹھے بیٹھے جہاں جگہ ملتی، بے تکلف سو جاتے۔ پچھلی رات کو سیّد بادشاہ اُٹھتے اور وضو کر کے نمازِ تہجّد ادا کرتے، لوگ بھی نماز پڑھتے، پھر دیر تک بارگاہِ الٰہی میں ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگتے رہتے۔ دُعا مانگ کر وعظ و نصیحت کرتے، یہاں تک کہ سپیدۂ سحر نمودار ہو جاتا۔ مؤذّن اذان پکارتا اور دن کی سرگرمیوں کا آغاز، پھر رکوع و سجود اور ذکر و فکر سے ہوتا۔ نوشہرے میں قیام کی پہلی رات اسی گریہ وزاری میں گزری تھی۔ اُس کی حلاوت مجاہدین مُدّتوں محسوس کرتے رہے۔ نمازِ تہجّد سے فارغ ہو کر فرمایا: "یہ قبولیتِ دُعا کا وقت ہے۔ مَیں جنابِ الٰہی میں دُعا کرتا ہُوں، تم سب مِل کر آمین کہو۔" پھر سر برہنہ ہاتھ اُٹھائے اور دُعا کی: "اے پروردگار، تو بڑا قادر و بے نیاز ہے۔ ہم سب تیرے ناچار و محتاج بندے ہیں۔ تیرے سوا کوئی ہمارا حامی و مددگار نہیں۔ ہم سب تیری رضامندی کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آتے ہیں، ہم سب پر اپنی رحمت کی نظر کر ... اے اللہ ہم بے سروسامان ہیں، ہمیں سامان عطا کر۔ تیری نگاہِ کرم کے محتاج ہیں، ہماری یہ احتیاج دُور کر ... ہم عیش و راحت کی زندگی تج کر تیری خوشنودی کی تلاش میں نکلے ہیں، ہمیں اپنی رضا سے نواز۔ دُنیا ہماری مطلوب و مقصود نہیں، ہم چاہتے ہیں تیرا کلمہ بلند ہو، باطل سرنگوں ہو اور حق کا بول بالا ہو ... اے اللہ ہماری مدد فرما۔" سیّد صاحب بار بار اس قسم کے جملے دُہرا رہے تھے اور مجاہدین آمین ... آمین کہہ رہے تھے۔ سیّد صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اور آواز رُندھ گئی تھی۔ مجاہدین پر بھی رقت طاری تھی جذب و شوق کی گرمی سے دِل پگھل رہے تھے اور آنکھیں اشکبار ی کر رہی تھیں۔ پچھلے پہر کے سنّاٹے میں گریہ وزاری کی آواز اور دُعا و مُناجات کے زمزمے سے پُوری فضا ملکوتی رنگ میں ڈُوب گئی تھی۔

معرکۂ اوّلیں

قاصد کو رنجیت سنگھ کے نام امن و سلامتی کا پیغام لے کر رُخصت ہُوئے چند روز ہی گزرے تھے کہ مخبر نے اطلاع دی، بُدھ سنگھ کا لشکر اکوڑے میں داخل ہو گیا ہے۔

اب فوری اقدام ضروری تھا۔ سیدصاحب نے احکام جاری کیے: "سب لوگ کمربستہ رہیں، کھانا وغیرہ دن ہی کو پکالیں اور شام سے پہلے پہلے کھا کر تیار رہیں"، کسی وقت بھی کوچ کے احکام مل سکتے تھے۔ سکھوں کے ساتھ پہلا معرکہ درپیش تھا۔ جاں سپاری اور سرفروشی کے اس معرکۂ اوّلیں کے نتیجے پر تحریک کے مستقبل کا انحصار تھا۔ دشمن کی تعداد سات ہزار سے اُوپر تھی اور مجاہدین صرف سات سَو تھے۔ پانچ سَو ہندوستانی اور دوسَو قندھاری جنھوں نے سیّد بادشاہ کے دستِ بابرکت پر اس وقت بَیعت کی تھی جب مجاہدین کا قافلۂ شوق کوئٹے کے راستے قندھار اور کابل سے گزرا تھا اور راہِ حق میں جدّوجہد کرنے کے لیے ان کے ساتھ ہو لیے تھے۔ مقامی لوگ شجاع اور جنگ جُو ضرور تھے، لیکن کس حد تک قابلِ اعتماد تھے؟ اس کے بارے میں ابھی کوئی تجربہ نہ تھا۔ اسی طرح مسلمانوں اور سکھوں کی افرادی طاقت کا تناسب ایک اور دس کا تھا۔ پھر جنگی سازوسامان کے اعتبار سے بھی سکھوں کو بالادستی حاصل تھی۔ پچھلے تیس چالیس برس سے وہ شمالی ہند کی سب سے بڑی قوّت بن چکے تھے۔ ایسی قوت جس نے ان کی جبلّی دہشت اور مذہبی عناد کے ساتھ مل کر بھیانک شکل اختیار کرلی تھی۔ عام مسلمان آبادی اُن سے بُری طرح مرعوب اور خوفزدہ تھی۔ سکھ فوج کی نقل وحرکت کو تباہی اور ذلّت ورسوائی کا پیش خیمہ سمجھتی اور مقابلے کے بجائے فرار کو ترجیح دیتی تھی۔

یہ تھے وہ حالات جن میں مجاہدین اس قوّت سے متصادم ہونے چلے تھے۔ ایسے عالم میں ہزاروں اندیشے دِل ودماغ میں راہ پالیتے ہیں، لیکن یہاں ایمان کی حرارت اور ذوقِ جنوں کے طفیل ایک عجب نشہ طاری تھا۔ سیّد بادشاہ نے شب خون مارنے کا فیصلہ کیا تھا مقصد یہ تھا کہ اصل اور مرکزی طاقت کو محفوظ رکھتے ہوئے دشمن پر ضربِ کاری لگائی جائے۔ ان کے سامنے دو اہم مقاصد اور بھی تھے ——— ایک تو مجاہدین، دشمن کے اندازِ جنگ سے باخبر ہوسکیں گے دوسرے ایک طرف مسلمانوں پر چھائی ہوئی سکھ قوّت کے ناقابلِ شکست ہونے کا طلسم ٹوٹ سکے گا، دوسری طرف سکھ خود اپنے کیمپ میں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگیں گے۔ لشکرِ اسلامی چار جماعتوں پر مشتمل تھا۔ نمازِ ظہر کے بعد سیّد بادشاہ نے

شوریٰ طلب کی اور شب خون کی منصوبہ بندی کی گئی اور پھر چاروں جماعتوں کو حکم ہوا کہ وہ اپنی اپنی جماعت سے بہت مضبوط و توانا اور چست و چالاک جوانوں کی فہرست بنائیں اور ان میں سے جن لوگوں کے پاس اچھے ہتھیار نہ ہوں وہ دوسرے بھائیوں سے لے لیں۔

فہرستیں مرتب کر کے سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دی گئیں۔ آپ نے ان کا جائزہ لیا، کچھ نام قلم زد کر دیے اور اُن کی جگہ نئے آدمی شامل کر لیے۔ جس شخص نے بھی سنا کہ اُس کا نام کاٹ دیا گیا ہے غم واندوہ کے مارے کٹ کر رہ گیا اور اپنی بدنصیبی پر کفِ افسوس ملنے لگا کہ کفر و اسلام کے پہلے معرکے میں شمولیت کی سعادت سے محروم ہو گیا ہے۔ عبدالمجید خان جہان آبادی انہی لوگوں میں تھے۔ اِن دِنوں انھیں بخار آتا تھا، اس لیے سید صاحب نے اُن کا نام خارج کر دیا تھا۔ انھیں پتہ چلا تو سخت مضطرب ہو گئے۔ بخار کی آگ میں تپ رہے تھے، مگر فوراً بستر سے اُٹھ کھڑے ہوئے، سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی "حضرت آپ نے میرا نام شامل نہیں فرمایا؟" ارشاد ہوا: "خان بھائی آپ بیمار ہیں، ہم نے آپ کا نام فہرست سے حذف کر دیا۔ دِل جمعی رکھیں، کچھ اور سبب نہیں ہے۔" عبدالمجید خان کی فرطِ حسرتِ شوق سے پلکیں بھیگ گئیں۔ کہنے لگے: "حضرت آج کافروں سے پہلا مقابلہ ہے، گویا جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز ہو رہا ہے، مَیں ایسا سخت بیمار نہیں ہوں کہ جا نہ سکوں۔ میرا نام مجاہدین میں ضرور داخل فرمائیں۔" ان کے جذبۂ ایمان سے سید صاحب از حد متاثر ہوئے اور آپ کا چہرہ چمک اُٹھا۔ ان کا نام فہرست میں درج کیا اور فرمایا: "اللہ آپ کے عزم میں برکت عطا فرمائے اور دین کی سربلندی کے جدّوجہد میں بیش از بیش حصہ لینے کی توفیق بخشے۔"

نمازِ مغرب کے بعد سید صاحب نے چھاپہ مار دستے کا معاینہ فرمایا اور اُس کی کمان اللہ بخش خان جماعت دار کو سونپی۔ اللہ بخش خان ان جوانوں میں سے تھے جن پر سید صاحب کی نگاہِ خاص تھی۔ وہ موراںئیں ضلع اناؤ کے باشندے تھے اور فوج میں سپاہی۔ اپنے تین ساتھیوں کے ہمراہ راستے بریلی کے زمانۂ قیام میں حاضر ہوئے اور بیعت کی۔ چاروں بڑے دراز قامت جوان تھے۔ اِن دنوں سید صاحب جہاد کی تیاری میں مصروف تھے۔ ان مضبوط د

توانا اور سرو کی طرح بلند جوانوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا: " ایسے جوان ہمارے کام کے ہیں، پیرزادے لوگ ہمارے کام کے نہیں "، کوچ کی تیاریاں مکمل ہو چکیں تو سید صاحب نے آخری ہدایات دیں۔ نمازِ عشا کے بعد مجاہدین دریا کے کنارے کی طرف بڑھے۔ سید صاحب بھی اپنے ساتھیوں سمیت چھاپہ مار دستے کے ساتھ کنارِ دریا تک گئے۔ پھر آپ نے دعا فرمائی: " اے پروردگار، قادرِ بے نیاز، اے کریم کارساز، بندہ نواز! یہ تیرے بندے عاجز و خاکسار اور ضعیف و ناچار ہیں، تیری ہی مدد کے اُمیدوار ہیں، تیرے سوا ان کا کوئی حامی و مددگار نہیں، یہ تیری ہی رضامندی اور خوشنودی کی طلب میں جاتے ہیں تو ہی ان کی مدد کر "۔ پورا لشکر آمین آمین کہہ رہا تھا، مگر اس طرح دبی آواز میں کہ محسوس ہوتا تھا شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ دعا و طلبِ مدد کا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ سید صاحب دامنِ مراد پھیلاتے گڑگڑا گڑگڑا کر دعا کرتے رہے اور لشکرِ اسلامی لذتِ شوقِ طلب میں ڈوبا آمین آمین! پکارتا رہا۔

دعا سے فارغ ہو کر سب لوگ آپس میں ملے۔ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے " بھائیو! کہا سنا معاف کرنا، اللہ تعالیٰ زندہ سلامت لائے گا۔ تو پھر ملاقات ہو گی اور اگر شہید ہو گئے تو اللہ نے چاہا ہم جنت میں ملیں گے "۔ آنکھیں نمناک تھیں اور دل شاداں و فرحاں۔ اب چھاپہ مار دستے کے مجاہدین باری باری سید صاحب کی دست بوسی کر کے کشتیوں کی طرف بڑھے۔ تین کشتیاں مچلتی ہوئی لہروں پر ہلکے ہلکے ہچکولے کھا رہی تھیں۔ تین پھیروں میں سب لوگ پار اتر گئے۔ سید صاحب کی تلقین کے مطابق سورۂ لِایْلٰفِ گیارہ گیارہ مرتبہ پڑھی، اور اکوڑے کا رُخ کیا۔

○

دریا عبور کرتے ہی مجاہدین، سکھ لشکر سے کوئی چار پانچ فرلانگ کے فاصلے پر ایک خشک پہاڑی نالے میں پہنچے یہاں امیرِ جیش اللہ بخش خاں نے ایک مقامی مجاہد کو سکھ لشکر کے احوال کی سُن گُن لینے بھیج دیا۔ سکھ فوجوں کا معمول تھا کہ جہاں کہیں پڑاؤ ڈالتیں دشمن کے ناگہانی حملے سے محفوظ رہنے کے لیے خار دار درخت اور جھاڑیاں کاٹ کر کیمپ کے

اردگرد سنگھر بنا لیتے تھے۔ اس سنگھر کے اندر سکھ سنتری رات بھر پہرہ دیتے۔ پہرہ بدلیا تو گھڑیالی گھڑیال بجاتا۔ رات کے لمحات رینگتے رہے۔ دُور فیروزی آسمان پر تاروں کا قافلہ اپنا سفر طے کرتا رہا۔ سکوت کا یہ عالم کہ ذرا سی آہٹ دُور دُور تک سُنی جاتی۔ مجاہدین دسمبر کی یخ سردی میں ساکت وصامت نالے میں بیٹھے مخبر کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر وہ آن پہنچا۔ اُس نے بتایا سنگھر کے فلاں طرف کے لوگ غافل ہیں۔ مجاہدین دبے پاؤں نالے میں سے نکلے اور سکھ لشکر کی طرف بڑھے جو اکوڑے سے باہر کھلے جنوبی میدان میں خیمہ زن تھا۔ آدھی رات ہو چکی تھی۔ ۲۰ جمادی الاول کا چاند اُفق سے اُبھر آیا تھا، لیکن گھرے بادلوں نے اس کا چہرہ چھپا دیا تھا۔ اس کی سیمیں کرنیں اس نقاب سے چھن چھن کر نکل رہی تھیں اور تاریکی کا سینہ چیرنے کی کش مکش کر رہی تھیں۔

مجاہدین سنگھر کے قریب پہنچے ہی تھے کہ گھڑیالی نے تین پہر پر تین گھڑیاں بجائیں۔ مجاہدین دم سادھے کھڑے تھے۔ گھڑیال کی آواز رات کے سناٹے میں چند لمحے سنسناتی رہی۔ آواز فضا میں تحلیل ہو گئی تو مجاہدین نے ذرا توقف کیا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے گھڑیال کے بجنے سے کہیں کوئی ہلچل تو پیدا نہیں ہوئی۔ پورا لشکر سکوتِ شب میں لپٹا ہوا تھا۔ مجاہدین اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے ہوئے سنگھر پھاند کر لشکر گاہ میں گھس گئے۔ ایک سکھ پہریدار نے تکبیر کی آواز سنتے ہی بندوق چلائی اور گولی شیخ باقر علی عظیم آبادی کے سینے میں لگی۔ زخم کاری تھا وہ زمین پر بیٹھ گئے اور پکارے: "بھائیو میرا کام تمام ہو گیا، کوئی بھائی میرے ہتھیار لے لے یہ اللہ کا مال ہے" —— اور پھر ان کی دم توڑتی ہوئی آواز بڑھتے ہوئے شور میں ڈوب گئی۔ وہ اس قافلۂ شوق کے پہلے شہید تھے۔

مجاہدین بجلی کی مانند سکھوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ایک ایک خیمے میں کئی کئی سکھ خواب نوشیں میں مست تھے۔ مجاہدین دس دس پانچ پانچ کی ٹولیوں میں بٹ گئے۔ کچھ لوگ خیموں کی طنابیں کاٹ کاٹ کر گرا رہے تھے، باقی تلواروں اور بندوقوں سے کام لے رہے تھے۔ کتنے ہی سکھ بیدار ہونے سے پہلے موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ بہت سے جاگے، لیکن صورتِ حال کو سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ تلوار یا برچھی کا لقمہ بن گئے۔ مجاہدین نے

جی بھر کر ارمان نکالے۔ ایک ایک آدمی نے ہاتھ سے پانچ پانچ دس دس آدمی مارے گئے۔ عبدالمجید خان جہان آبادی نے بخار کی کمزوری کے باوجود پندرہ آدمی مارے۔ زدو خورد میں اُن کی تلوار ٹوٹ گئی۔ مولوی امیرالدین ولایتی کے پاس دو تلواریں تھیں، انھوں نے ایک تلوار خان صاحب کو دے دی۔ اس تلوار سے بھی انھوں نے کئی سکھ قتل کیے، پھر خود بھی خلعتِ شہادت سے سرافراز ہو گئے۔

اس عرصے میں سارا سکھ لشکر اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور گھمسان کی جنگ چھڑ گئی تھی؛ تاہم مجاہدین کا پلڑا بھاری تھا۔ وہ بڑی پامردی سے دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ عبداللہ بسم اللہ نامی ایک مخنث نے اپنی برچھی سے سات سکھوں کو ہلاک کیا۔ امیرِ جیش اللہ بخش خان سورانوی، شمشیر خان جمعدار، غلام رسول خان، غلام حیدر خان، شیخ رمضانی، مرزا ہمایوں بیگ غرض ایک ایک نے اس آن بان سے جنگ لڑی کہ سکھ بدحواس ہو کر بھاگ نکلے۔ معاً سکھ گولہ انداز نے رن مہتاب[1] جلائی اور ڈور کھینچ کر اسے بلند کیا۔ ساری لشکر گاہ روشنی میں نہا گئی۔ سکھوں نے سمجھا تھا ہزاروں غازیوں نے دھاوا بول دیا ہے۔ اب جو دیکھا تو انکشاف ہُوا کہ وہ تو مُٹھی بھر ہیں۔ کہیں کہیں دس دس پانچ پانچ نظر آتے ہیں۔ وہ بھاگتے بھاگتے پلٹے اور بندوقوں کی باڑھیں مارنے لگے۔

سکھ سردار بُدھ سنگھ اکوڑے میں شب بسری کرتا تھا، شور و ہنگامہ سُن کر وہ بھی پہنچ گیا تھا۔ اب تک کے سارے ہنگامے میں دس پندرہ مجاہد شہید ہوئے تھے، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے میدان کا رنگ بدل گیا تھا۔ مجاہدین چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں سارے لشکر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک جگہ سمٹتے سمٹتے کئی شہید ہو گئے۔ امیرِ جیش اللہ بخش خان نے مجاہدین کو ساتھ لے کر سنگھر سے باہر نکلنے کے لیے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ شیخ ہمدانی اور علی حسن سکھوں پر پے در پے بندوقیں چلا رہے تھے، انھیں پیچھے ہٹتا دیکھ کر پکارے: "امیرالمومنین نے آپ کو ہمارا سردار بنا کر بھیجا ہے اور آپ دشمن کے مقابلے میں پیچھے ہٹتے جا رہے ہیں؟"

یہ محض ایک جذباتی جوشِ حمیت کا آوازہ تھا۔ شب خون کا مقصد پورا ہو چکا تھا

---

[1] رن مہتاب کو اُس زمانے کی سرچ لائٹ کہنا چاہیے۔

اور اب زیادہ دیر تک لشکر گاہ میں ٹھہرے رہنے کا مطلب اس حاصل شدہ مقصد کو ہاتھ سے کھو دینا تھا۔ صبح کاذب ہو چلی تھی، تاخیر کا ہر لمحہ تباہ کُن ثابت ہو سکتا تھا۔ دشمن واپسی کے راستے مسدود کر سکتا تھا۔ بے شک حق کی راہ میں جدّوجہد کرنے والوں کے لیے شہادت سے بڑھ کر کوئی تمنا نہیں ہوتی اور اس سعادتِ ابدی سے ہمکنار ہونے کا اس سے بہتر موقع اور کون سا ہو سکتا تھا؟ لیکن وہ چاہے خود کتنے ہی بلند مراتب سے نوازے جاتے، کافروں کے ساتھ پہلے ہی معرکے کا یہ انجام کہ ایک غازی بھی نہ بچتا، جہاں اہلِ ایماں کے لیے جو پہلے ہی سکھوں کی قوت سے مرعوب تھے، حوصلہ شکن ہوتا وہاں سکھوں کے حوصلے فزوں ہو جاتے۔ اللہ بخش خان نے بالکل صحیح قدم اُٹھایا تھا، لیکن جب دیکھا کہ اُن کے بہت سے ساتھی واپسی پر آمادہ نہیں ہیں، تو انھیں دشمن میں محصور چھوڑ کر جانا گوارا نہ کیا۔ وہ اپنے پچاس ساٹھ ساتھیوں سمیت پلٹے اور سکھوں پر حملے شروع کر دیے۔ سکھوں نے بھی پُوری قوت سے ہلّہ بول دیا۔ پہلے بندوقوں نے آگ اگلی، پھر تلواریں نیاموں سے نکل آئیں۔ مجاہدین نے دیوانہ وار حملے کر کے سکھوں کا ہلّہ ناکام بنا دیا، لیکن اللہ بخش خان اور اُن کے اکثر ہمراہی شہید ہو گئے۔ جو زندہ بچے ان میں سے ہر ایک زخمی تھا۔

یہ دیکھ کر باقی مجاہدین بھی آگے بڑھے، لیکن ایک دُور اندیش غازی اکبر خان نے جو خود بھی زخمی ہو چکے تھے، انھیں روکا اور پکار کر کہا: "بھائیو! آخری فیصلہ اسی میدان میں نہیں ہوگا۔ اب واپس چلو، انشاء اللہ ہم پھر لڑیں گے۔" یہ آواز سنتے ہی غازی ہر طرف سے سمٹ کر سنگھر کی طرف بڑھے۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے چند اور شہید ہو گئے۔ سنگھر سے باہر نکلے تو صبح نمودار ہو رہی تھی۔ سکھوں کو سخت زخم پہنچا تھا۔ اُن کے ایک ہزار سے زائد آدمی مارے گئے تھے۔ اُن کی سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ اُنھوں نے غازیوں کا تعاقب بھی نہ کیا۔ بلکہ سردار بُدھ سنگھ نے اکوڑے سے ہٹ کر موضع شیدو میں جا کر پڑاؤ ڈالا۔ وہ تو وہاں سے بھی ہٹ جانا چاہتا تھا، لیکن اٹک کے قلعہ دار نے روکا کہ اس طرح پُورا علاقہ غازیوں کی جولان گاہ بن جائے گا۔ غازیوں نے دریا کے

کنارے پہنچ کر صبح کی نماز پڑھی۔ سید صاحب نے صبح ہی سے غازیوں کی ایک جماعت دریا کے مغربی کنارے پر بھیج دی تھی کہ اگر دشمن غازیوں کے تعاقب میں چلا آرہا ہو تو اُسے روکیں اور چھاپہ مار غازی اطمینان سے دریا پار کرلیں۔ زیادہ تر غازی صبح ہوتے ہی پہنچ گئے تھے، باقی دو دو چار چار کی ٹولیوں میں عصر تک پہنچتے رہے۔ زخمیوں کو فوراً اسلامی لشکرگاہ میں پہنچا دیا گیا۔ غازیوں نے شام کے بعد دریا عبور کیا اور پھر رات گئے لشکر میں پہنچے۔ سب سے پہلے سید صاحب سے مصافحہ کیا۔ آپ نے شہدا کی مغفرت کے لیے دُعا کی۔ بعض غازی راستہ بھول گئے تھے، وہ جمعہ کے روز تک آتے رہے۔ اس جنگ میں ۳۶ ہندوستانی اور چالیس پینتالیس قندھاری غازی شہید ہوئے اور کل تیس چالیس غازی زخمی ہوئے۔

○

سکھوں کے ساتھ اس پہلے معرکے کے دُور رس اثرات نکلے۔ غازیوں نے جانبازیوں اور سرفروشیوں کی جو داستانیں رقم کیں ان کا دُور دُور تک چرچا پھیل گیا۔ ہر جگہ مسلمانوں کے حوصلے بڑھ گئے اور سکھوں کے ناقابلِ شکست ہونے کا جو طلسم ذہنوں پر چھایا ہوا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ سرحد کے خوانین اور رؤسا اب تک زیادہ تر تماشائی بنے ہوئے تھے۔ اُن کا خیال تھا یہ مُلّا اور پیرزادے ہیں، جنگ ان کے بس کا روگ نہیں۔ جس قوت کو ان کے بڑے بڑے لشکر سرنگوں نہ کرسکے اُس کا یہ چند سو غریب الدیار کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ یہ نہ تو اس علاقے کے نشیب و فراز سے واقف ہیں اور نہ دشمن کے مزاج اور جنگی صلاحیتوں سے باخبر۔ لیکن اُن کی یہ ساری خیال آرائیاں غلط ثابت ہوئیں۔ غازیوں نے اپنے جذبۂ ایمان اور عزیمت و شجاعت سے سکھوں کی جنگی استعداد کو چیلنج کر دیا تھا اور اُن پر پہلے ہی تصادم میں ایسا کاری وار کیا تھا کہ وہ خود کہا کرتے تھے کہ ایسے جنگجو اور بہادر لوگ نہ کبھی دیکھے تھے نہ سُنے۔ ان کے دلوں پر غازیوں کی دھاک بیٹھ گئی۔ اُنھوں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ سید بادشاہ روایتی پیر نہیں

ہیں کہ عقیدت مندوں کا ایک گروہ آپ نے گردوپیش جمع کرلیا ہے۔ اُن کے اندر ایک اچھے قائد کی بصیرت اور صلاحیتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ ایک ذہین فوجی جرنیل ہیں اور جو آدمی اُنھوں نے تیار کیے ہیں وہ پیری مریدی سے بلند تر نصب العین رکھتے اور بہترین سپاہیانہ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہیں۔ یہ لوگ روشن مستقبل کا عنوان بن سکتے ہیں، چنانچہ ہر طرف سے لوگ مُبارک دینے اور بیعت کرنے گروہ در گروہ آنے لگے۔ ان میں پُرجوش اور مخلص مسلمان عوام بھی تھے اور خواص بھی، اور وہ لوگ بھی جن کا خیال تھا سید بادشاہ سے تعاون ان کی ذاتی کامرانیوں کا زینہ بن سکتا ہے۔

انھی میں زیدہ کا رئیس اشرف خان اور ہنڈ کا سردار خادے خان ایسے ممتاز خوانین بھی تھے۔ خادے خان پچاس ساٹھ آدمیوں کے ساتھ آیا تھا۔ سید صاحب سے خلوت میں مِلا۔ آپ کے ہاتھ پہ بیعت کی اور عرض کیا: "وہ آپ کے پیشِ نظر جو عظیم کام ہے اس کے لیے اس بستی کو مرکز بنانا مناسب نہیں۔ میرے ہاں تشریف لے چلیے، وہاں آپ کو ہر طرح کا آرام اور اپنے مقصد کو سرانجام دینے کے لیے سہولتیں میّسر ہوں گی، مَیں وعدہ کرتا ہُوں ہر حال میں آپ کا ساتھ دوں گا۔" وہ ایک نامی گرامی سردار اور اس علاقے کا طاقتور رئیس اور خان تھا، ہنڈ کے مضبوط قلعہ کا مالک۔ سیّد صاحب نے سرحد میں کام کرنے کا جو منصوبہ تیار کیا تھا اس میں خوانین اور سرداروں کی رفاقت و تعاون کو بنیادی اہمیت حاصل تھی، چنانچہ اُنھوں نے پیش کش منظور کرلی۔ صُبح نماز کے بعد پُورا لشکر ہنڈ کی طرف روانہ ہُوا۔ ہنڈ کے مشرق میں تقریبًا ایک میل کے فاصلے پر دریا کے کنارے موضع بازار تھا۔ خادے خان نے یہ گاؤں سیّد بادشاہ اور اُن کے لشکر کے حوالے کردیا کہ وہ اسے اپنا فوجی ہیڈ کوارٹر بنالیں۔ چاروں طرف سے علاقے کے خوانین بازار پہنچنے اور بیعتِ جہاد کرنے لگے۔ صرف ایک دِن میں چار ہزار افراد نے سیّد بادشاہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنی زندگی کو حق کی سربلندی کے لیے وقف کرنے کا عہد باندھا۔

○

پیمانِ وفا

حضرو پر کامیاب چھاپے نے اہلِ اسلام کے عزائم کو اور مہمیز کر دیا۔ یہ دریائے اباسین (سندھ) کے پار چھ سات میل دُور سکھوں کی عملداری میں ایک بستی تھی اور علاقے میں تجارت کا مرکز۔ یہاں لاکھوں روپے کا کاروبار ہوتا۔ بستی کے کنارے ایک چھوٹی سی گڑھی تھی۔ یہاں ایک توپ بھی نصب تھی جس سے گڑھی اور منڈی کی حفاظت کی جاتی۔ چھاپہ مقامی لوگوں نے سیّد صاحب کی اجازت سے مارا تھا۔ مجاہدین میں سے صرف تیس چالیس قندھاری شریک ہُوئے۔ قندھاری غازیوں نے گڑھی پر قبضہ کر لیا، لیکن مقامی باشندے منڈی لُوٹنے میں لگے رہے۔ بہت سے سکھ مارے گئے۔ صبح یہ لوگ لُوٹے ہُوئے مال کی گٹھڑیاں سر پر اُٹھائے دریا کے کنارے پہنچے۔ سیّد صاحب اور مجاہدین نماز سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے، صبح کا چہرہ روشن ہو چلا تھا کہ قندھاری غازی بھی آتے دکھائی دیے۔ اور پھر اُنھوں نے دیکھا سکھ گھوڑے دوڑاتے تعاقب میں چلے آتے ہیں۔ سیّد صاحب کے حکم سے مجاہدین کا ایک دستہ اُنھیں روکنے کے لیے پار اُتر گیا تاکہ قندھاری غازی اور دوسرے مقامی چھاپہ مار دریا پار کر سکیں۔ مقامی لوگ تو افراتفری کے عالم میں دریا میں کُود گئے اور غازیوں نے مورچے جما لیے۔ زبردست جنگ کے بعد سکھ پسپا ہو گئے۔ یہ ایک مہینے کے اندر اندر سکھوں کے ساتھ دوسرا کامیاب تصادم تھا۔ سکھوں کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ غازی اُن کی عملداری میں اتنی دُور گھس آئیں گے۔ اب وہ اپنے آپ کو دُور دُور تک کے علاقے میں غیر محفوظ سمجھنے لگے تھے۔

اکوڑے کی جنگ اور حضرو کے چھاپے میں مقامی لوگوں کا ایک بے حد کمزور پہلو آشکارا ہُوا۔ دُشمن سے نبرد آزما ہونے کے بجائے اُن کی ساری توجہ مال و اسباب لُوٹنے پر مرکوز رہتی اور جب دُشمن کا دباؤ پڑتا تو سخت افراتفری کے عالم میں بھاگ کھڑے ہوتے۔ ان کی کوشش یہ ہوتی کہ اپنی جانیں اور لُوٹا ہُوا مال بچا لے جائیں۔ اس طرح جنگ کے گھاؤ غازیوں ہی کو کھانے پڑتے۔ پھر لُوٹے ہُوئے مال کا مسئلہ بڑی نازک صُورت اختیار کر گیا۔ لُوٹنے والے اِسے اپنا مال سمجھتے اور سیدھا گھروں کا رُخ کرتے۔ شریعت کی رُو سے اس مال و اسباب

کو اسلامی لشکر کے قائد کے پاس جمع ہونا چاہیے تھا۔ قائد کا یہ کام تھا کہ وہ پانچواں حصہ جماعت کے لیے رکھ کر باقی مال چھاپے میں حصہ لینے والے سب لوگوں میں تقسیم کر دیتا، خادے خان کے آدمی لوٹا ہوا مال لوگوں سے لینے لگے تو وہ مرنے مارنے کو تیار ہو گئے، سید صاحب نے اطلاع پا کر مداخلت کی اور خادے خان کو کہلا بھیجا کہ وہ کسی سے مال و اسباب کے بارے میں تعرض نہ کریں۔ آپس میں فساد مناسب نہیں۔ دنگا فساد تو ٹل گیا، لیکن دونوں بار کے واقعات سے عیاں ہو گیا کہ مقامی لوگ کسی ضابطے اور قاعدے کے پابند نہیں ہیں۔ اُن کی نظر صرف لُوٹ پر رہتی ہے اور اگر کوئی باقاعدہ شرعی نظام قائم نہ کیا گیا تو جہاد کی یہ ساری تگ و دو محض لُوٹ مار اور بلوہ بن کر رہ جائے گی، چنانچہ عُلمائے لشکر نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ امام مقرر کیا جائے تاکہ ساری جدّوجہد اُس کی قیادت و امامت میں ہو، مالِ غنیمت شریعت کے مطابق تقسیم ہو، شریعت کے احکام و قوانین جاری ہوں، شرعی حدود نافذ کی جائیں، عدل و احتساب کا نظام قائم ہو اور جو احکام سے سرتابی کرے اُسے سزا دی جائے، چنانچہ ۱۲ رجمادی الآخر ۱۲۴۲ھ کو سید صاحب کے ہاتھ پر بالاتفاق بیعتِ امامت کر لی گئی۔ ۱۳ رجمادی الآخر کو جُمعے میں خُطبہ آپ کے نام کا پڑھا گیا ـــــــ اس طرح برِصغیر کی تاریخ میں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی گئی۔

بیعتِ امامت کی خبر پھیلی تو عُلما، مشائخ اور چھوٹے بڑے خوانین اور سردار ہر طرف سے اُمڈ آئے اور ایک بہت بڑے مجمع میں سب نے سیّد صاحب کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر پیمانِ وفا باندھا۔ سیّد صاحب نے صاف صاف واضح کر دیا کہ وہ بیعت کر کے ایک بھاری ذمّہ داری کا بوجھ اُٹھا رہے ہیں۔ انھیں امام کی مکمّل اطاعت کرنی ہو گی، جاہلیّت کے رسم و رواج اور خلافِ شریعت اُمور چھوڑنے ہوں گے۔ حلال و حرام کی پابندی کرنا ہو گی، لُوٹ کھسوٹ اور انسانوں پر اپنی خُدائی کا سکّہ جمانے کے خود ساختہ حق سے دستبردار ہونا ہو گا اور اس کے لیے اپنے نفس کی ہر طرح کی قربانی دینی پڑے گی اور مال و جاہ و عزّت کے غلط تصوّرات ترک کرنے پڑیں گے۔

خادے خان، اشرف خان، فتح خان، سعادت خان، بہرام خان وغیرہ سب خوانین نے اقرار کیا کہ وہ بیعت کے تقاضے پُورے کریں گے، شریعت کے احکام بے چون و چرا بجا لائیں گے،

حق کی راہ میں آنے والی ہر سختی اور ابتلا کا خندہ پیشانی سے سامنا کریں گے اور ایثار و قربانی سے کام لیں گے۔ ان رئیسوں اور سرداروں نے یار محمد خان اور سلطان محمد خان والیان پشاور کو ایک مشترکہ مکتوب بھیجا جس میں انھیں سیّد صاحب کی امامت و امارت کی اطلاع دی اور مسلمان کفّار کے ہاتھوں جس قتل و غارت گری اور بے غرضی و بے آبروئی کا شکار ہو رہے تھے اُس کی طرف توجّہ دلائی اور درخواست کی کہ وہ بھی مجاہدین کا ساتھ دیں اور سیّد صاحب کی قیادت میں صف آرا ہو کر اسلام کے دشمنوں سے جہاد کریں۔ اُنھوں نے لکھا: "کیا آپ اہلِ شرک کے چنگل میں گرفتار بے بس و لاچار مسلمان مردوں، عورتوں اور بچّوں کی پکار نہیں سُن رہے جو رو رو کر کہہ رہے ہیں۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا۝ (تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں لڑنے نہیں نکلتے جب کہ کمزور و بے بس مرد و زن اور بچّے پکار رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں، ہماری کارسازی فرما اور ہمیں اپنی مدد سے نواز)"

خود سیّد صاحب نے ان سرداروں اور سرحد کے دوسرے رئیسوں کو نہایت پُرجوش اور پُر اثر خط لکھے، اپنی امامت کی اطلاع دی اور ان کی ایمانی غیرت اور اسلامی حمیّت کو جھنجھوڑا۔

بیعتِ امامت کا برق آسا اثر ہوا۔ اُمّتِ مسلمہ کی فطرت میں گُندھے ہوئے دینی جذبے کی آگ جسے یخ بستہ حالات نے سرد کر دیا تھا، پھر سے بھڑک اُٹھی۔ ہر طرف نئی زندگی کی حرارت دوڑ گئی۔ سکّھوں کے زخم خوردہ لوگ مدّتوں سے کسی ایسے مردے از غیب کے منتظر تھے جس کے گرد جمع ہو کر وہ بے چارگی کی اُس پستی سے نکلنے کی جدّ و جہد کرتے جس میں انھیں سکّھوں کی آئے دن کی وحشیانہ تاخت نے پھینک دیا تھا۔ وہ مردِ منتظر اب آ پہنچا تھا۔ سیّد بادشاہ رُوحانیت کے بلند مدارج پر بھی فائز تھے، شجاع اور عالی حوصلہ بھی تھے اور سیادت و قیادت کی عظیم صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور تھے اور یہ وہ اوصافِ حمیدہ ہیں جنھیں اُمّت نے ہمیشہ محبوب

رکھا ہے چنانچہ لوگ ہر جانب سے اُن کی طرف یُوں کھنچے آتے تھے جیسے لوہے کے ٹکڑے مقناطیس کی طرف لپکتے ہیں۔ دو مہینوں کے اندر اندر اسّی ہزار سرفروش پرچم اسلام اُٹھائے مجتمع ہو چکے تھے۔ اتنی بڑی قوت سرحدِ آزاد میں کبھی ایک پرچم تلے اکٹھی نہ ہُوئی تھی۔ ہر فرد والہانہ جذبے سے سرشار تھا اور ایک وقائع نگار کے الفاظ میں شہادت کی مُراد دل میں پالے زبانِ حال سے یہ ترانا گا رہا تھا:

باسبک رُوحاں بہ اُمّیدِ شہادت زندہ ایم
پیشِ ما ذکرِ حیاتِ جاوداں باشد گراں!

اور پھر جب خبر ملی کہ حاکمانِ پشاور یار محمّد خاں اور سلطان محمّد خان نے بھی سیّد بادشاہ کی دعوتِ بیعتِ امامت و جہاد کے جواب میں اطاعت و فرمانبرداری اور نیازمندی کا اظہار کیا ہے تو لشکر میں گویا مسرّت کے چشمے پھُوٹ نکلے، لیکن جن لوگوں کی نظران سرداروں کے کردار پر تھی اُن کے دلوں میں بھیانک اندیشے رینگنے لگے۔ یہ دُرّانی سردار سرحد کی سب سے بڑی سیاسی قوّت تھے۔ پشاور سے کابل تک ایک ہی باپ کے بیٹے حکمران تھے۔ لیکن یہ بھائی ہمیشہ آپس میں دست بگریباں اور برادر کُشی پر آمادہ رہتے۔ اس طرح ان کی یہ قوّت اہلِ اسلام کے حق میں تو کیا فائدہ مند ثابت ہوتی خود ان کے اپنے لیے بلائے بے درماں بن گئی تھی۔ غدر اور بے وفائی گویا ان کی سرشت میں تھی۔ ان کے کسی قول و قرار پر لوگ بہت کم اعتماد کرتے کہ جب بھی اُنھوں نے کسی سے عہد باندھا اُس سے دغا کی۔ یار محمّد خان تو خیانت و غدّاری میں دوسرے بھائیوں سے امتیازی شان رکھتا تھا۔ سگے بھائی وزیر فتح خان اور عظیم خان تک اس کے مکر و فریب کے ہتھکنڈوں سے نہ بچ سکے۔ بعض دُور اندیش سرحدی سرداروں اور خوانین نے سیّد صاحب سے عرض بھی کیا کہ یار محمّد خان کا اظہارِ اطاعت دنیا سازی اور مکر و فریب پر مبنی ہے، وہ قطعاً اعتماد کے قابل نہیں، اس سے ہوشیار رہنا چاہیے۔" سیّد صاحب نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ ہدایت دینے والا ہے، وہی دلوں کی دُنیا میں انقلاب لاتا ہے، فاسق متقی بن جاتے ہیں اور سرکش مطیع و فرمانبردار۔ اس شخص نے ہمارا ساتھ دینے کا عہد کیا ہے، دِلوں کا حال خدائے علیم و خبیر ہی جانتا ہے، ہمارے لیے ظاہر شریعت کا حکم ہے، اگر وہ دغا کرے گا تو اپنے واسطے کرے گا،

ہمارا کیا بگاڑے گا؟" سید صاحب توکّل علی اللہ کی نعمتِ عظمیٰ سے بہرہ یاب تھے اور ان کا جواب اُن کی اسی کیفیتِ قلبی کا آئینہ دار تھا، لیکن وہ خوانین جن کی نظر میں دُرّانیوں کے شب و روز تھے اُنھیں ایک مسلسل اضطراب نے آ لیا تھا۔

پہلی غدّاری

اور جلد ہی یہ اضطراب کربناک حادثات کے ایک سلسلے میں ڈھلتا چلا گیا۔

پے در پے دو جھڑپوں میں گھر اگھاؤ کھانے کے بعد سید بادشاہ کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کی خبر سکھوں کے کیمپ میں پہنچی تو مستقبل کے پردے میں کلبلاتے ہوئے خطرات ان کی رگ و پے میں تشویش بن کر دوڑ گئے اور پھر جب یہ خبر بھی ملی کہ بیعتِ امامت کا غیور پٹھانوں کے دل و دماغ پر انقلاب انگیز اثر ہوا ہے اور ۸۰ ہزار سے زائد جنگجو سید بادشاہ کے پرچم تلے جمع ہو چکے ہیں تو دربار لاہور تک لرزہ طاری ہو گیا۔ صرف کچھ مدت پہلے دربار لاہور نے سید بادشاہ کے قاصد کو بڑی نخوت و حقارت کے ساتھ دھتکار دیا تھا۔ اس نے سید بادشاہ کو محض ایک درویش اور بے مایہ فقیر سمجھا تھا لیکن اب سرحد سے آنے والی خبریں کہہ رہی تھیں وہ بے مایہ درویش اور فقیر شمالی ہند کی سب سے بڑی قوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا ہے۔ گھوڑے دوڑنے لگے، لاہور سے سردار بدھ سنگھ کے کیمپ اور پشاور میں خفیہ پیغامات آنے جانے لگے۔

سردار یار محمد اور اُس کے بھائی سید بادشاہ کو امام تسلیم کر چکے تھے، لیکن اطاعت کا وہ جذبہ دل و دماغ کی ایک وقتی رَو ثابت ہوا تھا۔ سید بادشاہ سے سردار یار محمد کی پہلی ملاقات کابل میں ہوئی تھی، وہ سید بادشاہ اور ان کے ساتھیوں کی زندگیوں سے جو خلوص وللّٰہیت اور قوتِ ایمانی سے عبارت تھیں بڑا متاثر ہوا تھا، تاہم وہ جس مقصد کو لے کر آئے تھے، اُس کے نزدیک ایک خوش خیالی سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ سکھوں کے آگے آزاد اور نبرد آزما پٹھانوں کی طاقت بے دم ہو کر رہ گئی تھی، یہ فقیر اور اس کے ساتھی اُن کا کیا بگاڑ سکتے تھے؟ پھر ایک اجنبی سرزمین میں اس مردِ درویش کے لیے قدم جمانا سکھوں کو شکست دینے سے زیادہ مشکل

تھا۔ سردار یار محمد اپنی قوم کے مزاج سے گہری واقفیت رکھتا تھا کہ اُس کا ہر فرد اور قبیلہ خود تھا، اپنے قبیلے سے باہر کسی کے آگے سرِ اطاعت خم کرنے کا تو وہ تصوّر ہی نہ کر سکتا۔ دینی شخصیتوں سے اُن کی عقیدت کے جذبے بلاشبہ فراواں تھے، لیکن یہ جذبے مادّی مفادات کے ساتھ تصادم میں نہ ٹِک سکتے تھے۔ اُس کے خیال میں جذبات کی یہ ہنگامی رَو تھی جو پُورے علاقے میں موجزن ہوگئی تھی۔ دانشمندی اور سیاست کاری کا تقاضا تھا کہ وہ اس رَو سے الگ تھلگ نہ رہے بلکہ اس کے ساتھ ہو کر حالات کو ایسے رُخ پر موڑ دے جس میں اُس کے خاندانی مفادات کی آبیاری ہو سکے۔ سرحد کے بعض خوانین ابھی تک اس کی خاندانی سطوت کے آگے نہیں جُھکے تھے، سیّد بادشاہ کی رفاقت میں انھیں زیرِ دام لانے کا عمدہ موقع ہاتھ آ سکتا تھا۔ اسی عمدہ موقع کو اُچکنے کے لیے اُس نے اپنے بھائیوں سمیت سیّد بادشاہ کا دامنِ امامت تھام لیا تھا۔ لیکن سیّد بادشاہ اور اُن کی جماعت کو قریب سے دیکھا، تو یہاں منظر ہی اور تھا۔ سیّد بادشاہ کا مقام جماعت میں محض پیرِ طریقت کا نہ تھا بلکہ وہ اُس کے حاکم اور مطاع تھے، اجتماعی زندگی میں اُن کے رہنما تھے۔ سیاسی و تہذیبی زندگی پر چھائی ہُوئی مایوسی کی تاریکیوں میں صبحِ اُمید کی روشن کرن تھے۔ وہ حالات کو جس رُخ پر موڑنے کا خواہش مند تھا یہاں اُسے کوئی موقع نہ مل سکتا تھا، چنانچہ سیّد بادشاہ اور ان کی جماعت میں اُس کے لیے کوئی کشش نہ رہی۔

مفادات کی آگ دِل میں شعلہ زن ہو تو آدمی خلوص اور صدق شعاری ہی سے محروم نہیں ہو جاتا، اخلاقی جرأت اور غیرتِ ایمانی بھی جاتی رہتی ہے، آنکھیں پَٹ ہو جاتی ہیں، کچھ نظر نہیں آتا کہ وہ کیا قدم اُٹھا رہا ہے اور اُس کے عواقب کیا ہوں گے۔ ایسے عالم میں اپنے بیگانے اور بیگانے اپنے بن جاتے ہیں، وہ ان کے ہاتھوں میں کھیلنے لگتا ہے اور اُن کے عزائم کی آبیاری کرنے میں ذرا شرمساری محسوس نہیں کرتا، اُس کا یہ طرزِ عمل خود اُس کے لیے دینی اور دنیاوی نقطۂ نظر سے کس قدر تباہ کُن ہوگا، اِس کی اُسے پروا نہیں ہوتی۔

سردار یار محمد ایک ایسی ہی نفسیاتی کیفیت سے دوچار ہو چکا تھا۔ دربارِ لاہور کے ایما پر سردار بُدھ سنگھ کے خُفیہ پیغامات آئے تو اپنا کام کر گئے۔ ان پیغامات میں اُسے لالچ بھی دیا گیا تھا اور دھمکی بھی۔ لالچ اس بات کا کہ سیّد بادشاہ سے الگ تھلگ رہو گے تو تُم سے

کوئی تعرض نہ کیا جائے گا، تمہارے علاقے تمہارے قبضے میں رہیں گے اور دھمکی یہ کہ سید کا ساتھ دیا تو تمہارا ایسا حشر کیا جائے گا کہ تمہاری نسلیں یاد رکھیں گی۔

سردار بدھ سنگھ کے لشکر پر حملہ کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ تقریباً ۸۰ ہزار کا لشکر جلو میں لیے سید بادشاہ ہنڈ سے نوشہرے اور وہاں سے شیدو کی طرف بڑھے جہاں سردار بدھ سنگھ مقیم تھا۔ سردار یار محمد کی بیس ہزار فوج اور توپخانہ ان کے علاوہ تھا۔ اکوڑہ سے کوس ڈیڑھ کوس ادھر پہنچ کر لشکر نے پڑاؤ ڈالا۔ سید بادشاہ کا کھانا سردار یار محمد کے مطبخ سے جاتا تھا۔ اُس رات سید بادشاہ نے کھانا کھایا تو اُن کی طبیعت بگڑ گئی۔ پھر غشی طاری ہونے لگی، کبھی افاقہ ہو جاتا اور کبھی بیہوش ہو جاتے، بھیگتی ہوئی رات کے ساتھ تکلیف بڑھتی چلی گئی، پھر قے شروع ہو گئی۔ زہر دینے کی علامات صاف ہویدا تھیں۔ پچھلے پہر دو تین گھڑی رہے رات کو کُوچ کا نقارہ بجا۔ سید بادشاہ اُس وقت ہوش میں تھے۔ شاہ اسماعیل نے عرض کی: "قرارداد کے مطابق جنگ کے لیے نکلنے کا وقت آ گیا، یار محمد خان نے آپ کی سواری کے لیے ہاتھی بھیجا ہے۔" سید صاحب نے کچھ فرمایا: "مجھے ہاتھی پر سوار کر کے میدانِ جنگ میں پہنچا دو۔"

○

شیدو کے میدان میں دونوں لشکر پہلی کھلی معرکہ آرائی کے لیے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ سکھ شیدو گاؤں کے جنوب مغرب میں اپنے گرد سنگھر بنائے خیمہ زن تھے۔ اسلامی لشکر خٹک کی پہاڑیوں سے متّصل دریائے لنڈے تک ہلال کی صورت پرا باندھے ہوئے تھا۔ انتہائی مغرب میں سردار یار محمد اور اُس کے سوار تھے۔ اُس کے بائیں جانب تھوڑے فاصلے پر اُس کے دونوں بھائیوں سلطان محمد خان اور پیر محمد خان کے سوار صف بستہ تھے۔ پیر محمد خان کے بائیں طرف سمہ کے خوانین فتح خان، اشرف خان، خادی خان وغیرہ اپنے اپنے عساکر لیے کھڑے تھے اور اُن کے بائیں جانب سید بادشاہ کے غازی۔ ایک نودارد مقامی مردِ مجاہد گودڑی شہزادہ اپنے غازیوں سمیت شیدو گاؤں میں مورچہ بند تھے۔ سکھوں کے ایک دستے نے سنگھر سے نکل کر دونوں لشکروں کے درمیان ایک خشک نالے پر چار مورچے بنا لیے تھے۔ اُدھر سکھ لشکر گاہ میں توپیں اس انداز سے نصب کر دی گئی تھیں کہ

پُورا اسلامی لشکر اُن کی زد میں تھا۔ لڑائی کا آغاز سکھوں نے مورچوں سے گولیاں اور لشکر گاہ سے گولے برسا کر کیا۔ مجاہدین جان پر کھیلتے ہوئے آگے بڑھے اور زبردست جنگ کے بعد نالے کے چاروں مورچے فتح کر لیے۔ بہت سے سکھ مارے گئے۔ باقی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے اور سنگھڑ میں جا پناہ لی۔ مجاہدین نے اُن کا تعاقب کیا اور سنگھڑ کے قریب گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ اُدھر گوڈڑی شہزادہ اور اُس کے مجاہد عقابوں کی طرح سکھ لشکر گاہ پر ٹوٹ پڑے۔ وہ سروں کی فصل کاٹتے، بندوق کے شعلوں سے زندگیوں کو بھسم کرتے اور برچھیوں کی اَنّی سے سینے چاک کرتے سنگھڑ میں داخل ہو گئے۔ اِس دوطرفہ حملے سے سکھوں میں افراتفری مچ گئی۔ وہ کچھ ایسے بدحواس ہوئے کہ توپیں تک چلانا بھول گئے۔ میدانِ جنگ کا رنگ خبر دے رہا تھا کہ فتح کی منزل تک پہنچنے میں بس چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ وہ چند لمحے جو ہر جنگ میں فیصلہ کُن ثابت ہوتے ہیں۔ مجاہدین ان لمحات کو سر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

سردار یار محمّد خان اس سارے ہنگامِ زد و خورد میں الگ تھلگ خاموش تماشائی بنے کھڑا تھا۔ سکھوں کے ساتھ جو خُفیہ قرارداد طے پائی تھی اُس کے پہلے حصّے پر وہ گزشتہ رات عمل کر چکا تھا۔ سید بادشاہ زہر خورانی کے اثر سے میدانِ جنگ سے باہر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ اب سازش کے دوسرے حصّے کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آ گیا تھا، عین معرکے میں اُسے میدان چھوڑ جانا تھا، لیکن شاید تذبذب نے اُسے آ لیا تھا۔ سکھوں کو اندیشہ ہُوا کہیں وہ بھی فتح سے ہمکنار ہونے والے مجاہدین کے ساتھ نہ مل جائے کہ ہَوا کا رُخ دیکھ کر مؤقف متعیّن کرنا قبائلی لشکریوں کی روایت بن چکی تھی۔ یار محمّد خان کی افواج، مجاہدین اور اُن کے حامی قبائل کے مقابلے میں زیادہ تربیت یافتہ اور عمدہ اسلحہ سے لیس تھیں، جنگ میں اُن کی شمولیت فوری طور پر فیصلہ کُن ثابت ہوتی۔ ایک سکھ توپچی نے اپنی توپ کا رُخ اُن کی طرف کر کے گولہ داغ دیا۔ گولہ یار محمّد خان سے کچھ دُور آ کر گرا۔ وہ خود تو بچ گیا، مگر اُس کے کئی سواروں کے پرخچے اُڑ گئے۔ یار محمّد خان کے لیے یہی انتباہ کافی تھا۔ اُس نے باگیں موڑیں اور بھاگ کھڑا ہُوا۔ پیچھے پیچھے اُس کا لشکر تھا۔ مجاہدین اور دوسرے سردار گرد و پیش سے بے خبر جنگ آزما تھے۔ کسی نے پُکار کر کہا: یار محمّد کے سوار بھاگ گئے ہیں۔ جس نے بھی یہ پُکار سُنی دَم بخود ہو کر رہ گیا۔

سُلطان محمد خان اور پیر محمد خان خشک نالے پر لڑ رہے تھے، خبر سُنتے ہی وہ پیچھے ہٹے اور پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ اُن کے بھاگتے ہی سمہ کے خوانین کی صفوں میں ابتری پھیل گئی۔ اُنھوں نے سمجھا شکست ہو گئی ہے، چنانچہ وہ بھی اپنے لشکروں سمیت بھاگ اُٹھے۔

سکھوں کی تدبیر کامیاب رہی تھی۔ مُسلمانوں کے لشکر میں افراتفری مچتے ہی اُن کے پسپا ہوتے ہُوئے قدم جم گئے اور پھر جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ مجاہدین میدان میں تنہا رہ گئے تھے اور جنگ کا سارا بار انھیں پر تھا۔ وہ آہنی دیوار بنے ڈٹ کر لڑ رہے تھے۔ گودڑی شہزادہ اور اُس کے اکثر ساتھی دادِ شجاعت دیتے ہُوئے شہید ہو گئے۔ باقی ماندہ غازیوں نے بھی اپنا خُون دے کر لڑائی کا رُخ پھر سے موڑنے کی کوشش کی اور اُن کی خاصی بڑی تعداد خلعتِ شہادت سے سرفراز ہو گئی۔ پھر اُنھوں نے محسوس کیا کہ بیس تیس گنا دشمن کی پے بہ پے اُمڈتی ہُوئی موجوں کو سر دے کر نہیں روکا جا سکتا، چنانچہ قدم بقدم پیچھے ہٹتے ہُوئے پھر سے سنبھل کر نئی معرکہ آرائیوں کے لیے میدان چھوڑ دیا ——— مجاہدین، یار محمد خان کی غدّاری اور منافقت سے جیتی ہُوئی جنگ ہار چکے تھے۔

مجاہدین کی شکست کی خبر لاہور پہنچی تو رنجیت سنگھ نے توپیں سر کرنے کا حکم دیا۔ سارے مُلک میں ڈونڈی پٹ گئی کہ جشنِ فتح منایا اور چراغاں کیا جائے۔ فرمانِ شاہی کی تعمیل میں لاہور کی فضا توپوں کی گرج سے لرز اُٹھی اور بڑے بڑے شہروں کے در و بام روشنیوں میں نہا گئے۔ سکھ مُسرت کے نقارے کیوں نہ بجاتے اُن کے مقابلے میں مُسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد پہلے کبھی مجتمع نہ ہُوئی تھی۔ اُنھوں نے اس عظیم لشکر کو جو فتح کی دہلیز پر پہنچ چکا تھا، خود اس کے اندر غدّار پیدا کر کے ہزیمت سے دوچار کر دیا تھا!

○

نفاق کے روگی

اور پھر یہ غدّاری اور منافقت اس دور کی تاریخ کا المیہ بن گئی۔ آنے والے روز و شب اس کی گھناؤنی داستان سُنا رہے تھے۔ سکھوں کے خلاف مجاہدین کی سرگرمیاں اب بھی جاری

تھیں۔ انھوں نے جس میدان میں بھی انھیں چیلنج کیا مجاہدین نے مُنہ توڑ جواب دیا۔ شیدو کی جنگ کے فوراً بعد ڈمگلہ اور پھر شنکیاری میں سکھوں سے تصادم ہُوا، دونوں مقامات پر مجاہدین فتحیاب رہے اور انھیں سخت نقصان پہنچایا۔ ڈمگلہ کی جنگ میں مجاہدین صرف ایک سو تھے اور سکھ چھ ہزار سے زائد۔ ایک ایک غازی نے کئی کئی سکھوں کو موت کے گھاٹ اُتارا صرف دو غازی شہید ہُوئے جب کہ سکھ مقتولین کی تعداد دو سو سے متجاوز تھی۔ شنکیاری کی جنگ میں غازیوں نے خرقِ عادت شجاعت کا مظاہرہ کیا۔ صرف شاہ اسماعیل شہیدؒ نے بارہ آدمی مَوت کے گھاٹ اتارے۔ سکھ مینہ کی طرح گولیاں برسا رہے تھے، لیکن شاہ صاحب کھُلے میدان میں ڈٹے رہے۔ ایک سکھ تلوار لے کر اُن پر حملہ آور ہُوا، انھوں نے گولی مار کر اُسے ٹھنڈا کر دیا۔ ابھی بندوق بھر ہی رہے تھے کہ دوسرا آدمی تلوار لے کر بڑھا، شاہ صاحب نے دوسری گولی اُس کے سینے میں پیوست کر دی۔ تیسری مرتبہ ایک گولی آپ کی اُنگلی پر لگی اور ہاتھ بندوق کے پیالے سے ہٹ گیا، شاہ صاحب نے اس حالت میں بھی گولی چلا دی۔ ایک اور سکھ ڈھیر ہو گیا۔ چوتھی مرتبہ بندوق بھرنے کا ارادہ کیا تو بارود خُون سے تر ہو گئی اور بندوق نہ بھری جاسکی۔ اس عالم میں چوتھا سکھ تلوار کھینچے سر پر آ پہنچا، آپ نے خالی بندوق ہی کا رُخ اُس کی طرف کر دیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ شاہ صاحب اپنی اس زخمی انگلی کی طرف اشارہ کر کے اکثر فرمایا کرتے: اگر اللہ تعالیٰ قبول کرے تو یہی اُنگلی میری نجات کے لیے کافی ہے ورنہ کتنے زخم ہیں جو لگتے ہیں، لیکن انسان کو کوئی ثواب نہیں ملتا۔

هَلْ أَنْتِ إِلَّا اصبع دمیت
وَفی سبیل اللّٰہ مالقیت

(تو محض ایک اُنگلی ہے جو خُون آلود ہُوئی ہے اور یہ زخم تجھے اَللہ ہی کے راستے میں پہنچا ہے۔)

یہ جنگ اچانک پیش آگئی تھی، شاہ صاحب اور اُن کے ساتھی دو فاقے کاٹ چکے تھے۔ اُس وقت اُن کے ساتھ صرف پندرہ سولہ آدمی تھے۔ غازیوں میں چھ سات شہید ہُوئے جو زندہ بچے وہ سب کے سب زخمی تھے، لیکن جب غازیوں نے لاشوں پر لاشیں بچھائی

شروع کیں تو سکھ اس قدر دہشت زدہ ہُوئے کہ بھاگ کر گڑھی میں پناہ گزیں ہو گئے۔ وہ اپنے پیچھے دو ڈھائی سو لاشیں چھوڑ گئے تھے۔

اگر مقابلہ محض سکھوں سے ہوتا تو مجاہدین مقامی خوانین کی بھاری تعداد کی تائید و حمایت سے محروم ہونے کے باوجود اُن سے نبٹنے کی مکمل صلاحیت رکھتے تھے، لیکن سکھ، منافقین کو اُن کے مقابلے میں لے آئے تھے۔ اب جنگ اسلام اور کفر کے درمیان نہیں اخلاص و للّٰہیت اور غدر و منافقت کے درمیان تھی۔ یہ غدّاری اور منافقت بدقسمتی سے بعض خوانین کی رگوں میں خُون بن کر رواں تھی۔ اُنھوں نے کسی دباؤ کے بغیر اپنی مرضی سے سیّد بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ایک بار نہیں کئی بار۔ لیکن ہر مرتبہ حق کی راہ میں سیّد بادشاہ کا ساتھ دینے اور احکامِ شریعت کے آگے خوش دِلی سے سر جھکا دینے کے بعد عہد و پیمان کو توڑا۔ اُنھوں نے سکھوں سے ساز باز کرنے سے بھی گریز نہ کیا جن کے ہاتھوں نہ اُن کی جان محفوظ تھی اور نہ آبرو اور آزادی و اقتدار۔ اُنھوں نے سکھوں کے ساتھ ہونے والی جنگوں میں مجاہدین کے خلاف مخبری کی۔ قلعہ اٹک کے مُسلمانوں نے مجاہدین کی مدد سے قلعہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا تو خادی خان نے سکھوں کو مطلع کر دیا اور یُوں اٹک کے مجبور و محکوم مُسلمانوں کو خاک و خُون میں لوٹا دیا۔ غدّاری کی ابتدا سردار یار محمّد خاں دُرّانی نے کی اور پھر خادی خان، پائندہ خاں اور سُلطان محمّد خان وغیرہ اُس کے نقشِ قدم پر چل کھڑے ہُوئے۔ خادی خان، رنجیت سنگھ کے فرانسیسی جرنیل ونٹورا کو مجاہدین پر چڑھا لایا۔ گو اُسے بھاری جمعیت کے باوجود منہ کی کھانی پڑی۔ نفاق کے ان علمبرداروں نے خدا مست سرفروشوں کو زخم پر زخم لگائے۔ وہ ہندوستان سے آنے والے قافلہ ہائے شوق کی راہ میں مشکلات کے کانٹے بکھیرتے، اُنھیں لُوٹ لیتے اور پکڑ کر دریا میں غوطے دیتے۔ سیّد بادشاہ کے لیے یہ ساری صُورتِ حال بڑی اذیت ناک تھی۔ اُنھوں نے خوانین کو بُلا کر بار بار سمجھایا مگر جاہلیت کی طویل کھر آلودرات نے اُن کے دِلوں سے غیرت و حمیّتِ اِسلامی کی حرارت یُوں چُوس لی تھی کہ اُنھیں سکھوں کا کھیل کھیلنے سے ذرا اجتناب نہ تھا۔ اس مذموم کھیل میں اُنھوں نے ہر ذلت برداشت کی، سکھوں کو نیازمندانہ تحفے تحائف بھیجے، حتیٰ کہ سردار یار محمّد خان نے اپنی وہ گھوڑی بھی دربارِ لاہور کو پیش کر دی جسے حاصل

کرنے کے لیے رنجیت سنگھ ایک جنگ لڑ چکا تھا اور سکھوں کے ہاتھ سے گہرے زخم کھانے کے باوجود سردار یار محمد خان اُس کو دینے پر آمادہ نہ تھا کہ ایک تو وہ گھوڑی دُرّانی سرداروں کی متاعِ بے بہا تھی، دوسرے اس دَور کے سیاسی آداب میں گھوڑے کا کسی والیٔ ریاست کو پیش کرنا اُس کی بالادستی اور سیادت کو تسلیم کرنے اور خراج ادا کرنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

سیّد بادشاہ اُن کے لیے زندگی کا پیغام لائے تھے اُسے وہ اپنے حق میں موت گمان کرتے۔ شریعت کے نفاذ نے اُن کی بے مہار زندگیوں کو نکیل ڈال دی تھی۔ خاندانی اور قبائلی عداوتوں کی جس آگ میں لوگ مدّتوں سے جلتے سُلگتے آرہے تھے وہ قانونِ خداوندی کے ابرِ کرم سے بُجھنے لگی تھی۔ اُن کے اندر مسلمان ہوتے ہُوئے بھی جاہلی تعصبات کی بنیادوں پر گروہ بندیاں نسل بعد نسل چلی آتی تھیں، نظامِ اسلامی کی برکت سے صدیوں کی یہ بُرائی دم توڑ رہی تھی۔ جن مقدّمات کے فیصلے سالہا سال گزر جانے کے باوجود نہ ہو پاتے تھے انھیں شرعی عدالتوں کے قاضی چند دنوں کے اندر اندر طے کر دیتے تھے۔ غیر اسلامی رسم و رواج کی کوکھ سے جنم لینے والی جن گوناگوں خرابیوں نے زندگی کو داغ داغ کر دیا تھا، اُن کا قلع قمع ہو چلا تھا۔ اُن کے معاشرے میں عورت سب سے مظلوم مخلوق تھی۔ مرد اُس کے ساتھ بے زبان جانوروں کا سا سلوک کرتے۔ بیواؤں کا نکاحِ ثانی تو حرامِ مطلق تھا ہی شادی بیاہ کی خود ساختہ شرائط اور جاہلی رواجوں کی بنا پر لڑکیاں غیر شادی شدہ بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جاتیں۔ جن لڑکیوں کا نکاح ہو جاتا، غیر اسلامی رسوم نے اُن کی رخصتی کا مرحلہ ایسا کٹھن بنا دیا تھا کہ برسوں پر برس گزر جاتے اور رخصتی کی نوبت نہ آتی۔ یوں مظلوم لڑکیاں رسم و رواج کے انگاروں پر تڑپتے زندگی گزار دیتیں۔ ایسی صُورتِ حال کسی معاشرے میں جن اخلاقی مفاسد اور قباحتوں کی راہیں کھول دیتی ہے سرحد کا پٹھان معاشرہ اُن سے محفوظ نہ تھا۔ اسلامی حکومت قائم ہُوئی تو عورتوں نے سیّد صاحب سے درخواست کی کہ اللہ تعالٰے نے آپ کو ہمارا امام بنایا ہے، ہماری دادرسی فرمایئے اور ہماری بیٹیوں کو اس عذاب سے نجات دلایئے۔ سیّد صاحب نے فوری اقدام کیا۔ ایسے قوانین نافذ کیے جن سے اس مظلوم طبقے کی دادرسی ہو سکتی۔ والدین پر جوان بیٹیوں کی وقت پر شادی لازم قرار دے دی، لڑکیوں کی خرید و فروخت ممنوع اور جہیز سے متعلق معاملات پر

پابندی لگادی۔ جو بے زبان لڑکیاں اس رواج کی بھینٹ چڑھی ہوئی تھیں، اُن کے نکاح کروادیے گئے۔ جن لوگوں نے اپنی لڑکیوں کا نکاح کر دیا تھا اور وہ سنِ بلوغ کو پہنچ چکی تھیں، انھیں اُن کے شوہروں کے گھر رُخصت کر دینے کے احکام جاری ہو گئے۔ سرداروں اور خوانین کی قیادتیں اور کبریائیاں انہی جاہلی عادات کے سہارے قائم تھیں۔ وہ ایک ایسے نظامِ زندگی کے آگے سر جھکانے اور اُسے برداشت کرنے کو تیار نہ تھے جس کی پہلی ضرب ان کی غیر اسلامی زندگی پر پلنے والی نفسانی خواہشات اور سیاسی و معاشرتی مفادات پر پڑتی تھی۔ اِن مفادات کی محبت نے اُنھیں اسلامی زندگی سے اس قدر متوحش کر دیا تھا کہ وہ کافروں کی عملداری میں رہنے کو اسلامی حکومت پر ترجیح دیتے۔

سوات کے ایک سردار عنایت اللہ خان نے اُن کی اِسی ذہنیت کی نمائندگی شاہ اسمٰعیل شہیدؒ سے ایک مُلاقات میں کی تھی۔ شاہ صاحب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ میر عالم خان کی دعوت پر باجوڑ جارہے تھے کہ سواتی سرداروں نے اُن کا راستہ روک لیا۔ شاہ صاحب نے اُن سے سدِّ راہ بننے کا سبب دریافت کیا تو عنایت اللہ خان نے اُن کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا: "ہم آپ کو باجوڑ نہیں جانے دیں گے، آپ اور میر عالم خان دونوں باہم متّفق ہو گئے تو پھر ہمارے اُوپر بھی شرعی احکام جاری کر دیں گے، ان احکام کو قبول کرنا اور اُن پر عمل پیرا ہونا ہم پر بڑا سخت ہے۔"

ایک مُسلمان کی زبان سے یہ جواب بڑا حیرت ناک تھا۔ شاہ صاحب نے افسوس کا اظہار کیا اور فرمایا: "آپ لوگ خُدا کے فضل سے مُسلمان اور مُسلمانوں کی اولاد ہیں، آپ کو تو احکامِ شرعی کے اجرا پر خوش ہونا چاہیے تھا، یہ کیسا اسلام ہے کہ آپ اللہ کی شریعت سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں؟ اگر ہم سے شرعی احکام کے نفاذ میں کوئی زیادتی ہو تو اپنے مقامی عُلماً سے دریافت کر کے کتاب و سُنّت کے مطابق ہماری اصلاح کیجیے۔"

عنایت اللہ خان بپھر گیا۔ وہ کھُلی سرکشی پر اتر آیا۔ کہنے لگا: "بے شک تم لوگ کتاب و سُنّت سے متجاوز نہیں ہوتے، قرآن و سُنّت اور عُلما تمھاری طرف ہیں، مگر کتاب و سُنّت سے ثابت دینی احکام ہم بوجھ سمجھتے ہیں، ہم تمھیں باجوڑ نہیں جانے دیں گے، اگر لڑنا پڑا تو بھی

دریغ نہیں کریں گے، ہم اگر غالب آگئے تو ہمارے اجداد کے رسم و رواج بھی غالب رہیں گے اور اگر تم فتحیاب ہُوئے تو ہم اس مُلک کو چھوڑ کر کافروں کی عملداری میں چلے جائیں گے تاکہ اپنے باپ دادا کے طریقے پر عمل کر سکیں۔"

یہ تھا وہ ذہن جو اسلام کی اِس قوت کے مقابلے میں کارفرما تھا۔ نفاق کا عناد اور شرارتیں حد سے بڑھ گئیں تو سید بادشاہ کو تادیبی اقدامات کرنے پڑے۔ ان کے نتیجے میں پہلے خادے خان مارا گیا۔ اُس کے بھائی امیر خان نے دُرّانی سردار یار محمد خان سے مدد طلب کی۔ زیدہ کے مقام پر دُرّانی لشکر کی مجاہدین سے جھڑپ ہُوئی اور پھر یار محمد خان کی لاش پشاور پہنچی۔ اب اُس کے بھائی سُلطان محمد خان نے جاہلی عصبیت کا پرچم اُٹھا لیا اور سید بادشاہ پر چڑھ دوڑا۔ مایار کے میدان میں دونوں لشکروں کی مڈبھیڑ ہُوئی اور یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے سید بادشاہ کو فتح عطا فرمائی۔ مجاہدین فاتحانہ پشاور کی طرف بڑھے۔ وہ جہاں سے بھی گزرے عام لوگوں نے ان پر احترام کے پھول نچھاور کیے۔ دُرّانی لشکر پر ایسی ہیبت طاری ہُوئی کہ سوار اور پیادے اپنے گھروں کو بھاگنے لگے۔ فوج میں انتشار اور پشاور کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر سُلطان محمد خان نے مصالحت کی بساط بچھائی۔ اُس نے ارباب فیض اللہ خاں مہمند ہزار خانی کو اپنا وکیل بنا کر سید بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ سید صاحب نے منافقین کے خلاف اقدام بڑی ناگواری کے عالم میں کیا تھا۔ انھوں نے بار بار اُن سے کہا کہ ہم آپ لوگوں سے لڑنے نہیں آئے، ہم تو کافروں سے جہاد کرنے آئے ہیں اور مُسلمانوں کا ملک سمجھ کر یہاں فقط اس نیت سے اُترے ہیں کہ آپ مُسلمان بھائیوں کے تعاون سے اللہ کی زمین پر اللہ کی مرضی نافذ کی جائے۔ ہمارا ساتھ دیجیے اور کافروں کے ہاتھ میں نہ کھیلیے، لیکن حق اور خیر پر مبنی ہر بات اُن کے پتھر دِلوں پر اُچٹ کر رہ گئی۔ اب ارباب فیض اللہ خاں، سردار سُلطان محمد خاں کا پیغام معذرت و پشیمانی لے کر آئے تو سید صاحب نے پھر اُنھی خیالات کا اظہار فرمایا۔ ارباب نے عرض کیا: "سُلطان محمد خان توبہ کے لیے تیار ہے۔ وہ کہتا ہے ہم سے بڑا قصُور ہُوا کہ ہم نے آپ کا مقابلہ کیا۔ ہم اپنے قصُور سے توبہ کرتے ہیں، آپ ہمارا قصُور معاف فرمائیں اور یہیں سے پلٹ جائیں، اب کبھی ہم سے ایسی تقصیر نہ ہوگی اور ہم زندگی بھر آپ کے تابعِ فرمان رہیں گے۔" ارباب نے آخر میں کہا: "یہ صُلح مَیں کروا رہا

ہُوں، اس کے بعد بھی اگر سلطان محمّد خان اور اُس کے بھائیوں نے اپنا پرانا وتیرہ نہ چھوڑا تو مَیں اُن کا ساتھ چھوڑ دوں گا اور ارباب بہرام خاں کی طرح آپ کا دامن سیادت تھام لُوں گا۔"

سیّد بادشاہ نے دُرّانیوں کے رویّے پر افسوس کرتے ہُوئے فرمایا:

"خان بھائی، ہم ہندوستان سے اس ملک میں صرف اس واسطے آئے ہیں کہ یہاں کے سب بھائی مُسلمانوں کو متّفق کر کے کافروں پر جہاد کریں کہ اسلام کی ترقّی ہو اور کفّار مغلوب ہوں۔ یہ دُرّانی وغیرہ اپنی بے وقوفی اور نادانی سے ہم مُسلمانوں کی رفاقت چھوڑ کر کافروں کے حامی و مددگار بنتے ہیں اور اُن کی طرف سے ہمارا مقابلہ کرتے ہیں۔ ہم نے اُن کو بارہا خط لکھ کر وعظ و نصیحت سے بہتیرا سمجھایا کہ یہ اپنی شرارت اور بغاوت سے باز رہیں اور ہمارا ساتھ دیں، مگر اُن کے خیالِ فاسد میں کچھ نہ آیا، یہاں تک کہ اُنھوں نے ہم پر لشکر کشی کی اور ہم سے لڑے اور ہیبتِ الٰہی سے شکست فاش کھا کر وہاں سے بھاگے۔ تب ہم نے بھی اُن کا تعاقب کیا۔ ہمیں تمھاری خاطر منظور ہے، مگر اُن کو سزا دینا ضروری ہے۔ یہاں سے ہم پلٹ گئے تو تمھارے سردار اس بات کا احسان نہ مانیں گے، ہم اِن شاء اللہ کل پشاور چلیں گے اگر سُلطان محمّد خان اپنے عہد و پیمان پر سچّے دِل سے قائم ہیں تو ہم اُنھیں اپنی طرف سے پشاور میں بٹھا کر چلے آئیں گے۔ سو خان بھائی، تم اُنھیں اپنے عہد و پیمان پر پکا کرو کہ بارِ دیگر بدعہدی نہ کریں۔"

دوسرے روز مجاہدین کُوچ کر کے پشاور کے قریب ارباب بہرام خاں کے گاؤں تہکال پہنچ گئے۔ یہاں اُن کے بھائی ارباب جمعہ خان تین چار سو سواروں سمیت اِسلامی لشکر میں شامل ہو گئے۔ یہیں ارباب فیض اللہ خان دوسری بار سیّد بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور عرض کیا: "مَیں نے آپ کے ارشادات لفظ بہ لفظ سردار سُلطان محمّد خان تک پہنچائے، وہ بہت نادم و پشیمان ہُوئے اور کہا: 'سیّد صاحب نے جو کچھ فرمایا بالکل درست فرمایا، مگر اب خالص دِل سے عہد و پیمان کرتے ہیں کہ ہم سے بغاوت و نافرمانی کا کوئی کام ظہور میں نہ آئے گا۔ باغیوں اور کافروں کی رفاقت اور شرکت سے ہم نے توبہ کی، خُدا اور رسولؐ کا جو کچھ حکم ہے وہ ہمارے سر آنکھوں پر، جس وقت اور جس جگہ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے سیّد بادشاہ ہمیں پکاریں گے ہم بلا عذر اپنی جان و مال اور فوج لے کر حاضر ہو جائیں گے، اب ہم سیّد بادشاہ

کی خدمت میں حاضر ہو کر تجدید بیعت کرنا اور منکرات اور نواہی سے سیّد صاحب کے دستِ بابرکت پر تائب ہونا چاہتے ہیں، ہم اطاعت کی علامت کے طور پر چالیس ہزار روپے بھی نذر کرنے کے خواہاں ہیں۔"

سیّد صاحب، ارباب کی زبان سے سُلطان محمّد خان کی معروضات بڑی توجّہ سے سُنتے رہے، پھر فرمایا:

"خان بھائی، ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ وہ مُسلمانوں کے اتحاد میں شریک ہوں اور کفّار کا مقابلہ کریں۔ ہم نہ کسی کی ریاست چھیننے آئے ہیں نہ کسی کا مُلک لینے۔ یہ تو اس دنیا دار شخص کا کام ہے جو ملک گیری کا ارادہ رکھتا ہو۔ ہم صرف جہاد فی سبیل اللہ کی نیّت رکھتے ہیں کہ کفّار کو زیر کریں اور اسلام کا بول بالا ہو۔ اگر وہ سچّے دِل سے اقرار کرتے ہیں تو ہم بھی اس بات سے باہر نہیں جائیں گے۔"

اُسی روز رات کو سیّد صاحب نے لشکر کے اصحاب الرّائے کو جمع کیا اور سُلطان محمّد خان کی پیش کش اور اپنے ارادے کا ذکر فرمایا۔ مجلسِ شوریٰ کے سبھی ارکان اور لشکر کی یہی رائے تھی کہ دُرّانی سردار ناقابلِ اعتماد ہیں، وہ فتنہ و فساد سے باز نہیں آئیں گے اور پہلا موقع ملتے ہی سرکشی کریں گے۔ ارباب بہرام خاں نے تو یہاں تک عرض کیا اندیشہ ہے کہ وہ مکر و فریب کا یہ نیا لبادہ اوڑھ کر لشکرِ اسلام پر اچانک حملہ نہ کر دیں، اُنھوں نے شاہ زمان اور شاہ شجاع سے کیا سلوک کیا کہ آپ کو بھلائی کی اُمید ہو؟ سیّد بادشاہ کا مَوقف یہ تھا کہ سردار سُلطان محمّد خان نے توبہ کر کے احکامِ شریعت کے آگے سر جھکا دینے کا عہد کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اب مَیں دوبارہ بغاوت و شرارت اور خُدا اور رسول ؐ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں کروں گا، میری خطا معاف کی جائے۔ اگر وہ یہ باتیں نفاق اور دغابازی سے کرتا ہے تو وہ جانے اور اُس کا خُدا جانے۔ شریعت کا حکم ظاہری اقرار پر ہے کسی کے دِل کے احوال پر نہیں۔ دِل کا حال خُدا کو معلوم ہے۔ ہم تو اس کے ساتھ وہی معاملہ کریں گے جو ظاہر شریعت کا حکم ہے۔

پشاور شہر کے لوگوں کو جب پتہ چلا کہ سیّد بادشاہ، سردار سُلطان محمّد خان کو مُلک واپس کیے دیتے ہیں تو اُنھوں نے بھی اپنے ایک نمائندے کے ذریعے عرضداشت بھیجی کہ

اس فیصلے پر نظر ثانی کی جائے، ہم تو خوش تھے کہ رعایا برایا کو دُرّانیوں کے جور و جفا سے نجات ملے گی، خدارا ہمیں اُن کے چنگل میں دوبارہ نہ دیجیے، فوج کے قیام اور ریاست کے انتظام کے لیے روپے کی ضرورت ہے تو حکم فرمایئے، ہم آپ کے قدموں میں مال و دولت کے ڈھیر لگا دیں گے۔ مگر سید صاحب اپنی نیک نیّتی کی بنا پر ایک فیصلہ کر چکے تھے، اس عرضداشت کے جواب میں شہریوں کے نمائندے سے فرمایا: "آپ نے یہ بات بہت اچھی کہی ہے۔ جو حاکم ملک گیری کا ارادہ رکھتے ہیں، اُن کے کام کی ہے۔ لیکن ہم ان حاکموں میں نہیں ہیں۔ ہم اپنے مالک کے فرمانبردار ہیں، جو کام بھی کرتے ہیں اُس کی مرضی کے مطابق کرتے ہیں، لوگوں کو اس میں نقصان نظر آئے یا فائدہ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ ہمارے مالک کا حکم ہے کوئی شخص کیسا ہی قصوروار ہو جب وہ اپنے قصور سے توبہ کرے اور اپنی خطا پر معذرت کا خواہاں ہو اُس کی خطا معاف اور معذرت قبول کرنی چاہیے۔ اگر اُس نے توبہ دغا بازی سے کی ہے تو ہمیں اُس کے اس فعل سے کوئی سروکار نہیں، وہ جانے اور اُس کا خدائے بزرگ و برتر۔ اُس کا مال اور مُلک زبردستی لے لینا درست نہیں[1]"

——— اور پھر شاید تاریخ کا انوکھا واقعہ رُونما ہُوا۔ فاتح نے تلوار کے زور سے فتح کیا ہُوا مُلک مفتوح حکمران کے حوالے کر دیا۔

زیرِ زمیں طُوفانی لہریں

پشاور ایک عجیب جذباتی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ ایک ایسی کیفیت جو اُمید کے ٹوٹتے ہُوئے آبگینوں کی صدائے خاموش اور خوف کی اُمڈتی موجوں کے بے آواز شور سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ مطلق العنان حکمرانوں کے ہاتھوں دنیا ہمیشہ نالاں رہی ہے۔ ان حکمرانوں سے مفادات کا رانب پلنے والے لوگوں کا ایک محدود حلقہ ہوتا ہے جو اُن کے گیت گاتا اور قصیدہ سرائی کرتا ہے۔ مجبُور اور بے بس عامتہ النّاس اُن کے اقتدار کی رتھ کے پہیّوں تلے پامال ہوتے

---

[1] سیّد صاحب سے مذاکرات کے سلسلے میں یہ تمام گفتگو سیرت سیّد احمد شہیدؒ جلد دوم۔ مصنّف سیّد ابوالحسن علی ندوی سے لی گئی ہے۔

رہتے ہیں، لیکن حرفِ احتجاج زبان پر لانے کی سکت نہیں رکھتے۔ وہ ظلم و جور کے کوڑے سہتے ہیں مگر اپنے اندر دم مارنے کا بل بوتا نہیں پاتے۔ جب کسی آمر اور مستبد حکمران کو وقت کا منصف ہاتھ مار گراتا ہے تو ان لوگوں کے دلوں میں اس خیال سے مسرت کا نور جگمگا اٹھتا ہے کہ اُن کی مصیبت کے ایام ختم ہو گئے۔ استبداد کی زنجیریں انھیں پگھل کر گرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ کچھ یہی کیفیت دُرّانی مملکت کے عام باشندوں کی تھی۔ لشکرِ اسلام کے جلو میں آنے والا انقلاب اُن کے لیے ایک نئی زندگی کی نوید لے کر آیا تھا۔ اب تک جن علاقوں میں اسلامی قوانین نافذ ہو چکے تھے اُن پر ابرِ رحمت بن کر برسنے والی برکتوں کی خبریں معاندانہ پروپیگنڈے کے باوجود، چاروں طرف پھیل چکی تھیں اور اہلِ ایمان اور کچلے پسے ہوئے طبقات نے پُرجوش جذبات کے ساتھ اس انقلاب کا خیر مقدم کیا تھا، لیکن جب اُنھوں نے سُنا کہ سید صاحب نے دُرّانیوں کو اُن کی ریاست واپس کر دی ہے تو اُن کے دِلوں میں پھوٹنے والی اُمیدوں اور مسرتوں کی روشنی جیسے بجھ کر رہ گئی۔ رگوں میں خوف سرسرانے لگا اور اُنھیں اپنی زنجیروں کے حلقے تنگ تر ہوتے محسوس ہوتے۔

سید بادشاہ نے تحریک اور ملت کی وسیع تر مصلحتوں کے پیشِ نظر ریاست واپس کر دینے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن جو لوگ دُرّانی سرداروں کی سرشت سے باخبر تھے اور جنھیں اُن کی خو واپنے بھائیوں سے غدّاری اور بے وفائی کی داستانیں یاد تھیں اُنھیں خوف و کرب کے گمبھیر احساس نے آلیا تھا۔ اُنھیں یہ خیال تڑپا دیتا کہ دُرّانی سردار، مجاہدین کو کسی وقت بھی چرکا لگا سکتے ہیں۔ انھی ڈراؤنے اندیشوں میں ڈوبے ہوئے لمحات اُن گھڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے جن کے دامن میں اُمّت کی تاریخ کا ایک اور المناک حادثہ پل رہا تھا۔

زندگی بظاہر ایک خوشگوار اور دلکش سکون و طمانیت سے ہمکنار تھی ——— وہ سکون و طمانیت جس کی تمنا انسان نے ہمیشہ کی ہے، لیکن یہ نعمتیں جس سرچشمۂ فیض سے حاصل ہوتی ہیں، اُس سے فیضیاب نہ ہونے کے باعث وہ اکثر ان نعمتوں سے محروم رہا ہے۔ یعنی اللہ کی زمین پر اللہ کے احکام کی حکمرانی اور انسانوں پر انسانوں کی خُدائی کا خاتمہ۔ برِصغیر کی تاریخ میں پہلی بار ایک مختصر سا خطہ ان نعمتوں سے بہرہ یاب ہو رہا تھا ——— لیکن اس

سطح کے نیچے نفاق، غدر اور بدی کی قوتیں بدستور سرگرمِ عمل تھیں اور اندر ہی اندر ایک طوفان جنم لے رہا تھا۔ سردار سُلطان محمّد خان اور اُس کے بھائیوں کے بارے میں اہلِ بصیرت کی رائے بالکل درست تھی۔ سیّد بادشاہ نے اپنے اخلاص و للّٰہیت اور کلمہ گو مُسلمانوں کے ظاہری دعووں پر اعتماد کی بنا پر اس رائے کو قبول نہیں فرمایا تھا۔ وہ اپنی نیک نیتی میں نفاق کی نفسیات کو نظر انداز کر گئے۔ نفاق بدفطرتی کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے ـــــ نیک فطرت مسلمان کبھی منافق نہیں ہوتا ـــــ اور بدفطرتی ہی کے ماحول اور فضا میں جو سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے وجود میں آتی ہے، پروان چڑھتا ہے۔ یُوں نفاق، منافق کی فطرت کا ایک ایسا حِصّہ بن جاتا ہے جسے وہ اپنے سے کبھی جُدا نہیں کر سکتا۔ یہ وہ زنگ ہے جو اُس کے قلب و رُوح کو بالکل مسخ کر دیتا ہے، اُس کی سوچ ہمیشہ منفی ہوتی ہے اور یہ وہ روگ ہے جو ایک بار دِلوں کو لگ جائے تو پھر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور ایک عام مُسلمان تو در کنار، خدا اور رسولؐ سے بھی فریب کرنے سے باز نہیں آتا۔ نفاق، اِخلاص کا دُشمن ہے اور جب کسی کُھلے معرکے میں اُس کے ہاتھوں پسپا ہوتا ہے تو اُس کا جانی دُشمن بن جاتا ہے، زخمی ناگ کی طرح وہ پیچ و تاب کھاتا اور اس تاک میں رہتا ہے کہ موقع ملے اور اپنے شکست دینے والے کو ڈس لے۔ سردار سُلطان محمّد خان کی کیفیّت بھی زخمی ناگ کی سی تھی۔

○

اُدھر سِکھ اس نئی صُورتِ حال سے اپنی جگہ بُری طرح تلملا رہے تھے۔

پشاور کی فتح اور دُرّانیوں کے سپر انداز ہونے کے بعد پُورا سرحدی خطّہ جو سیاسی اہمیّت اختیار کر گیا تھا اور حالات جس طرح سازگار تھے اُس کا مختصر مگر جامع نقشہ غلام رسُول مہر مرحوم نے اپنی کتاب "سیّد احمد شہیدؒ" جلد دوم میں کھینچا ہے:

"سُلطان محمّد خان کے عہدِ اطاعت کے بعد خیبر سے لے کر امب تک پُورے علاقۂ سرحد کے وسائل سیّد صاحب کی دسترس میں آ گئے تھے۔ مخالف عناصر ختم ہو چکے تھے۔ اب اطمینان کے ساتھ ایک زبردست لشکر منظّم کر کے سکھوں پر کامیاب یورش کے بہترین امکانات پیدا ہو گئے تھے۔ اگر سیّد صاحب کشمیر کی طرف پیش قدمی کرتے تو سُلیمان شاہ

والیٔ چترال زیادہ سے زیادہ ملک کے لیے تیار تھا اور کشمیر پر سکھوں کا قبضہ و تصرف خاصا کمزور نظر آرہا تھا جسے ختم کر دینا مشکل نہ تھا۔ پنجاب کی طرف بڑھتے تو غلزئی قبیلے کے سردار ساتھ دینے پر آمادہ تھے۔ ابتدائی کامیابی کے بعد افغانستان، بلوچستان اور سندھ کو بھی رفاقت پر آمادہ کر لینے کے قوی امکانات تھے...... سید صاحب جب سے سرحد پہنچے تھے سازگار حالات کا ایسا روشن دَور کبھی نہ آیا تھا"

سکھوں کی نگاہ سے اس ریاست کے اُبھرنے پھیلنے کے یہ روشن امکانات مخفی نہ رہ سکتے تھے۔ انگریزوں کی بھی دربارِ لاہور میں آمد و رفت شروع ہو چکی تھی، اُنھوں نے بھی سرحد میں اُبھرتی ہُوئی اس اسلامی قوت کی مضرتیں رنجیت سنگھ پر واضح کی ہوں گی۔ بلکہ اس کے عروج و کمال میں خود ان کے اپنے سامراجی عزائم کے لیے جو خطرہ مُضمر تھا وہ بھی ان کی نگاہوں میں ہوگا۔ اُن کے سامراجی چنگل ستلج کے کنارے تک پہنچ چکے تھے اور وہ مستقبل میں اپنے آپ کو رنجیت سنگھ کی سلطنت کا وارث سمجھتے تھے۔ اُن کی خواہش ہوگی کہ اس اِسلامی قوت کے قدم جمنے نہ پائیں، اگر وہ "سکھی پنجاب" پر قابض ہوگئی اور بلوچستان و سندھ تک اُس کے اثرات پھیل گئے تو پھر اس سے نبٹنا مشکل ہو جائے گا۔ وہ اس راز سے واقف تھے کہ کسی نئی اُبھرتی ہُوئی سیاسی قوت کو عنفوان ہی میں کچلا جا سکتا ہے، جوان ہو جائے تو اُس پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ اُنھوں نے یقیناً مشورہ دیا ہوگا کہ اس ریاست کو کسی صُورت زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ سرحد کے نفاق کے ساتھ دربارِ لاہور کی سازباز پہلے ہی تھی۔ وہ اُسے آلۂ کار بنا کر اُس کشمکش کا رُخ موڑ چکا تھا جس کا ہدف وہ خود تھا، تاہم نفاق اب روز بروز بے بس ہوتا جا رہا تھا، سرحد کی عام آبادی میں تحریک کے اثرات جڑ پکڑنے لگے تھے، جب تک پُوری آبادی سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں سے متنفر نہ ہو جاتی ان اثرات کو روکنا دشوار تھا۔

اور پھر ہندوستان سے سید بادشاہ اور قافلۂ حق کے جاں سپاروں کے خلاف کفر اور گمراہی کے فتوے دُرّانی سرداروں کے پاس پہنچنے لگے جن پر قبر پرست مولویوں اور دُنیا پرست مشائخ کی مہریں لگی ہوتیں۔ اس سلسلے میں کئی عُلماء کا ایک مشترکہ محضر نامہ بھی

انھیں پہنچا جس میں ان مردانِ حق کو قتل کر دینے اور اپنے علاقے سے نکال دینے کا فتویٰ دیا گیا تھا۔ سردار سلطان محمد خان نے سید صاحب سے ملاقات کے وقت یہ محضر نامہ اُن کی خدمت میں پیش بھی کیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ اُس نے باغیانہ رویّہ اسی محضر کی بنیاد پر اختیار کیا تھا۔ محضر نامے کے مرتّبین نے سید صاحب کو وہابی اور بدعقیدہ قرار دیا تھا اور جہاد فی سبیل اللہ کو مکر و فریب۔ مزید یہ کہ اُن پر ایک نیا مذہب نکالنے کی تہمت لگائی تھی اور کہا تھا کہ تم اُن کے وعظ و نصیحت کے دام میں نہ آنا، اُنھیں تباہ کر دو اور اپنے ملک میں نہ ٹکنے دو۔ سید صاحب نے محضر نامہ پڑھ کر فرمایا کہ یہ لوگ قبر پرستی اور پیر پرستی ہی کو اپنا دین و آئین جانتے ہیں، حلال و حرام میں امتیاز نہیں رکھتے اور یہی اُن کا ذریعۂ معاش ہے۔ ہمارے وعظ و نصائح سے اللہ تعالیٰ نے وہاں لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کی، وہ پکّے موحّد اور متبع سُنّت ہو گئے، چنانچہ اِن دُنیادار عالموں اور پیروں کا کاروبار سرد ہو گیا اور آمدنی مندی پڑ گئی تو رشک و حسد نے اُنھیں ہم پر اتہام باندھنے پر آمادہ کیا۔

محضر کی زبان اور انداز صاف ظاہر کرتا تھا کہ یہ سکھوں نے تیار کروایا ہے[1]۔ سید صاحب

---

[1] یہ بات کہ یہ فتوے اور محضر نامے سکھوں نے تیار کروا کر خوانین کو بھجوائے، زبان و بیان کی داخلی شہادت کے علاوہ سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سرحدی خوانین کا ہندوستان کے عُلماء سے براہِ راست کوئی رابطہ نہ تھا۔ وہ ایسا رابطہ سکھوں ہی کی وساطت سے قائم کر سکتے تھے۔ سردار یار محمد خان نے سب سے پہلے ہندوستانی عُلماء سے رابطہ نہیں جوڑا اور فتوے نہیں منگوائے بلکہ سکھوں کے ساتھ سازباز کی ـــ زیادہ صحیح الفاظ میں سکھوں نے اُس کے ساتھ رابطہ پیدا کر کے اُسے سید صاحب کو زہر دینے اور مجاہدین سے غدّاری کرنے پر اُکسایا۔ اس کے بعد بھی مجاہدین کی سکھوں سے جتنی جنگیں ہوئیں اُن میں باغی خوانین نے سکھوں کے اشارے ہی پر کام کیا۔ سکھوں کا یہ طرزِ عمل ظاہر کرتا ہے کہ فتویٰ پھیلانے کی مہم بھی انھی کے اشارے پر شروع کی گئی تھی اور یہ فتوے نہ تو خود خوانین نے ہندوستان کے عُلماء سے منگوائے تھے اور نہ اُن کے بستۂ فتراک عُلماء نے خود سلطان محمد خان نے سید صاحب سے کہا تھا کہ فتوے ہندوستانی عُلماء نے اُسے بھیجے ہیں۔ ظاہر ہے ان عُلماء کا سرحد سے براہِ راست کوئی رابطہ نہ تھا اُنھیں سرحد کے احوال کی خبر کسی ایجنسی ہی کے ذریعے ہی سے ہو سکتی تھی اور یہ ایجنسی یا سکھ حکومت خود ہو سکتی تھی یا اُس کے زیرِ نگیں علاقے کے عُلماء۔ عجب نہیں کہ سکھوں نے یہ کام دربارِ لاہور میں موجود انگریز نمائندوں کی معرفت کروایا ہو کہ اس نوخیز اسلامی ریاست کی تباہی سے سکھوں اور انگریزوں دونوں کا مشترکہ مفاد وابستہ تھا۔ اوّل الذکر کا فوری اور مؤخر الذکر کا مستقبل میں۔

نے اُن کے خلاف جہاد و قتال کا جو محاذ کھولا تھا اُس کو سکھ یہ کہہ کر کمزور کرنا چاہتے تھے کہ سید صاحب یہ جنگ اسلام کی سربلندی کے لیے نہیں لڑ رہے بلکہ اُنھیں انگریزوں نے اُن سے لڑنے اور سرحد کے احوال معلوم کرنے بھیجا ہے۔ اس طرح وہ سید صاحب کے کردار اور اُن کی جدّوجہد کو عام سرحدی مُسلمانوں کی نگاہ میں مشکوک بنا کر اُنھیں اُن کی ہمدردی اور حمایت سے محروم کر دینا چاہتے تھے۔ حالانکہ جن لوگوں نے یہ فتوے لکھے تھے اور ہندوستان میں سید صاحب اور اُن کی تحریک کی مخالفت کی تھی اُن میں سے اکثر یا تو انگریز حکومت میں اعلیٰ مناصب پر فائز تھے یا مسلک کے اعتبار سے اُن کے دامن سے وابستہ اور شاگرد۔ اس طرح ان لوگوں نے سکھوں کا کھیل تو کھیلا ہی، خود اپنے آقاؤں کی خدمت بھی کر گئے کہ سرحد میں جھوٹ پھیلا کر اور نیا مذہب ایجاد کرنے اور بدعقیدگی کی تہمتیں گھڑ کر ایک ایسی جماعت کو تباہ کروا ڈالا جو سکھوں ہی کے نہیں انگریزوں کے خلاف بھی پرچمِ جہاد لے کر اُٹھی تھی بلکہ جس کا اصل مقصود اسلامی ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنا اور اسلامی حکومت قائم کرنا تھا۔[1]

○

---

[1] سید صاحب کی جدّوجہد کے اس مقصد کی نشاندہی اُن کے اپنے خطوط سے ہوتی ہے جو اُنھوں نے سرحد سے وقتاً فوقتاً مختلف اصحاب کو بھیجے۔ مثلاً والیٔ چترال کو لکھتے ہیں:

"تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی حکومت و سلطنت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ عیسائیوں اور مشرکین نے ہندوستان کے اکثر حصّے پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور ظلم و بیداد شروع کر دی ہے۔ کفر و شرک کے رسوم کا غلبہ ہو گیا ہے اور شعائرِ اسلام اُٹھ گئے۔ یہ حال دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہُوا، ہجرت کا شوق دامنگیر ہُوا، دل میں غیرتِ ایمانی اور سر میں جہاد کا جوش و خروش ہے۔"

(سیرت سید احمد شہیدؒ جلد دوم ص ۲۵۷)

غلام حیدر خاں کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مُلک ہندوستان کا بڑا حصّہ غیر ملکیوں کے قبضے میں چلا گیا ہے اور اُنھوں نے ہر جگہ ظلم و زیادتی پر کمر باندھی ہے۔ ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہو گئی۔ کسی کو اُن سے مقابلے کی تاب نہیں۔ بلکہ ہر ایک اُن کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے، چونکہ بڑے بڑے اہلِ حکومت اُن کا مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے ہیں اس لیے چند کمزور و بے حقیقت اشخاص نے اس کا بیڑا اُٹھایا۔"

(ایضاً ص ۳۵۸)

شاہزادہ کامران کو تحریر فرماتے ہیں:

"اس ملک کو مشرکین کی نجاستوں سے پاک کرنے اور منافقین کی گندگی سے صاف کرنے کے بعد حکومت و سلطنت کا استحقاق اور ریاست و انتظامِ سلطنت کی استعداد رکھنے والوں کے حوالے کر دیا جائے گا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ احسانِ خداوندی کا شکر بجا لائیں گے اور ہمیشہ اور ہر حال میں جہاد کو قائم رکھیں گے اور کبھی اس کو موقوف نہیں کریں گے اور انصاف اور مقدمات کے فیصلے میں شرع شریف کے قوانین سے بال بھر بھی تجاوز و انحراف نہیں کریں گے اور ظلم و فسق سے کلیتہً اجتناب کریں گے۔ اس کے بعد میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ہندوستان کا رُخ کروں گا تاکہ اس کو ہر شرک و کفر سے پاک کیا جائے۔ اس لیے میرا مقصودِ اصلی ہندوستان پر جہاد ہے، نہ کہ ملک خراسان (سرحد و افغانستان) میں سکونت اختیار کرنا۔" (ایضاً ص ۶۳-۳۶۲)

(بقیہ اگلے صفحے پر)

سُلطان محمد خان نے توبہ اور تجدید بیعت کا ڈھونگ مہلت حاصل کرنے کے لیے رچایا تھا۔ کھُلی دشمنی میں نفاق ناکام ہو چکا تھا اور اُس کی سب سے بڑی طاقت (دُرّانی ریاست) حق و اخلاص کے مقابلے میں شکست کھا چکی تھی۔ اب وہ وسیع پیمانے پر سازش کر کے اسلام کی قوت کو موت کے گھاٹ اُتارنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اکھڑے ہُوئے قدم جمانے اور ہاتھ سے نکلی ہُوئی ریاست بحال کرانے کی ضرورت تھی۔ سیّد صاحب نے سُلطان محمد خان کی توبہ کو اپنی خطا کاریوں پر نادم و پشیمان مُسلمان کی توبہ سمجھ کر قبول فرما لیا تھا۔ آتشِ انتقام میں شعلہ زن نفاق کی رُوح جو وقت چاہتی تھی وہ اُسے مل گیا تھا؛ چنانچہ اب متحرک ہو چکی تھی اور اُس کے ساتھ ہی وہ تمام عناصر حرکت میں آ گئے تھے جن کی جاہلی عصبیتوں اور دُنیا پرستانہ مفادات پر شرعی قوانین کی ضرب پڑی تھی اور دل ہی دل میں بُری طرح کھول رہے تھے، مگر اسلامی حکومت کی بڑھتی ہُوئی قوت کے آگے اپنے آپ کو بے بس پاتے اور خُون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔ پروپیگنڈے کا سب سے مہلک ہتھیار گور پرست مُلّانوں اور بندگانِ دُنیا پیروں کے فتوے تھے جو بڑی رازداری سے قبائل میں پھیلائے جا رہے تھے۔

عام پٹھان نماز روزے اور دینی جذبات کی حد تک بہت اچھے مسلمان تھے۔ سید بادشاہ کو نگاہِ عقیدت سے دیکھتے تھے۔ اُن کی خاصی بڑی تعداد اپنے خوانین کے معاندانہ رویّے کے باوجود، تحریکِ جہاد سے قلبی وابستگی رکھتی تھی کہ اُس نے سکھوں کی وحشی طاقت کو پہلی بار کامیابی کے ساتھ چیلنج کیا تھا، اُن کی دہشت گردی سے جنم لینے والی سطوت

اور اس جہاد کا مقصد اپنی سلطنت قائم کرنا نہیں اللہ کے کلمے کو بلند کرنا تھا۔ شاہ سلیمان کو تحریر فرمایا:

"اس تمام معرکہ آرائی اور جنگ آرائی کا مقصود صرف یہ ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت زندہ ہو اور مُسلمانوں کا مُلک کفار و مشرکین کے قبضے سے نکل آئے، اس کے سوا کوئی مقصود نہیں۔" (ایضاً ص ۳۵۹)

ہندوستان کے امرا اور عُلما، و مشائخ کے نام ایک مکتوب میں لکھا:

یہ سب کچھ محض اللہ کے لیے ہے۔ اس جذبۂ الٰہیہ میں نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسے کا شائبہ بھی نہیں۔ اگرچہ یہ بات فقیر کے اکثر واقفانِ حال پر ظاہر ہے لیکن مزید تاکید کے لیے پھر نئے سرے سے کہتا ہُوں اور خدائے علاّم الغیوب کو گواہ بناتا ہُوں کہ کفار اور دشمنوں کے ساتھ جو جذبۂ جہاد فقیر کے دِل میں موجزن ہے اس میں رضائے الٰہی اور علائے کلمۃ اللہ کے مقصد کے سوا، عزت و جاہ و مال و دولت، شہرت، ناموری، امارت، سلطنت، برادران و معاصرین پر فضیلت و بزرگی یا کسی اور چیز کا فاسد خیال ہرگز دل میں نہیں ہے۔ واللہ علیٰ ما نقول وکیل ہم جو بات کہہ رہے ہیں اللہ اُس کا گواہ ہے۔"

(ایضاً ص ۵۶-۳۵۵)

کا طلسم توڑا تھا اور انھیں اُن کے مقابلے میں سر اُٹھا کر چلنا سکھایا تھا۔ یہ جذباتی تعلق اتنا گہرا تھا کہ اس کو کاٹے بغیر نفاق کی کامیابی ممکن نہ تھی۔ مجاہدین فتح سے ہمکنار ہوتے تو اُن کے اندر خوشی کی لہر دوڑ جاتی اور انھیں زک پہنچتی تو وہ اُس کا کرب محسوس کرتے۔ مُلّانوں کے فتووں نے انھیں تحریک اور سیّد صاحب سے برگشتہ کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ بدقسمتی سے نہ اُن کے اندر حقیقی دینی شعور تھا اور نہ وہ سیاسی آگہی سے بہرہ ور تھے۔ مولویوں کی زبان سے جب اُن پر منکشف "ہُوا کہ سیّد بادشاہ اور اُن کے ساتھی بدعقیدہ اور نئے دین و مذہب کے پیرو ہیں تو وہ سناٹے میں آ گئے۔ دین کے معاملے میں وہ عُلماء پر اعتمادِ کامل رکھتے تھے۔ وہ اگر سیاہ کو سفید کہتے اور سفید کو سیاہ تو سرِ تسلیم خم کر دیتے۔ وہ یہ تصور ہی نہ کر سکتے تھے کہ مقدّسین کا یہ طائفہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے، مذہب کے نام پر دھوکا دے سکتا ہے، افترا باندھ سکتا ہے اور اللہ اور اُس کے رسُولؐ پر ایمان اور تقویٰ واحسان کے اعلیٰ مدارج پر فائز مجاہدین فی سبیل اللہ کو کافر اور گمراہ قرار دے سکتا ہے۔ سیّد صاحب اور اُن کے ساتھیوں کے جو مثالی پیکر عام آبادی کی محبت واحترام کا مرکز تھے اس جھُوٹے پروپیگنڈے نے اُن پر سیاہی پھیر دی۔ پہلے اُس کے اندر بیزاری پیدا ہُوئی جس نے رفتہ رفتہ نفرت کی صُورت اختیار کر لی اور آخر کار یہ نفرت اشتعال میں بدل گئی۔ ایک خاصی بڑی تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جس نے مسلسل جھُوٹے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر غیر جانبدارانہ رویہ اپنا لیا اور حالت یہ ہو گئی کہ ہر بستی میں گنے چُنے لوگ تحریک کے ساتھ باقی رہ گئے۔ یہ بھی زیادہ تر وہ باشعور اور متّقی و دیندار عُلماء حق پرست سادات اور خدا ترس امام مسجد اور اُن طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد تھے جو جاگیر داری اور قبائلی نظام میں سیاسی اور معاشرتی طور پر اثر و رسوخ سے بے بہرہ ہوتے ہیں ــــــ عام آبادی میں برگشتگی کی رَو جیسے جیسے تُند و تیز ہوتی گئی، سطح کے نیچے ہی نیچے پلنے والا طوفان شدّت اختیار کرتا گیا۔

اور پھر ایک روز یہ طوفان پھٹ پڑا۔

○

بجرمِ عشق تو می کشند

نومبر کا مہینہ تھا۔ آدھی رات کو ایک سوار دارالحکومت پنجتار پہنچا۔ محمد امیر خاں قصوری پہرے پر تھے اور سید بادشاہ برج کے کوٹھے پر محوِ استراحت تھے۔ رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی، آنے والے کی آواز بلند ہوئی: "پہرے پر کوئی ہے؟" آواز کے زیروبم میں جذباتی ارتعاش سرسراتا ہوا صاف محسوس ہوتا تھا۔ امیر خاں نے جواب میں لمبی ہانک ماری "کون ہے؟"

"مَیں امام الدین بمبئی والا ہوں، پشاور سے آیا ہوں اور سید بادشاہ کے لیے پیغام لایا ہوں۔" نووارد نے کہا۔

"سید بادشاہ آرام کر رہے ہیں، کیا اذانِ صبح تک انتظار نہیں کر سکتے؟" محمد امیر خاں نے دریافت کیا۔

"نہیں، ایک ایک لمحہ قیمتی ہے اور تیزی سے اُڑ رہا ہے۔" امام دین نے کہا۔

"اچھا، ٹھہرو۔ مَیں امیرالمؤمنین سے اجازت لے کر آتا ہوں۔" امیر خان کی آواز آئی اور پھر خاموشی طاری ہو گئی۔

چاند کچھ دیر پہلے اُفق سے اُبھرا تھا اور آسمان کی مشرقی وسعتوں میں پھیلی ہوئی سیاہ بدلیاں اُس پر چھا جانے کے لیے یورش کر رہی تھیں۔ کبھی وہ کسی بدلی میں چھُپ جاتا اور کبھی اس کا روشن چہرہ پھر سے چمکنے لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ اپنا نُور زمین پر بکھیرنے کے لیے ان بدلیوں سے کشمکش کر رہا ہے۔ امام الدین اس منظر میں کھو سا گیا۔ تحریکِ دعوت و جہاد کے چاند پر بھی تو کفر و نفاق کے سیاہ بادل اسی طرح ہجوم کر رہے ہیں۔ وہ سوچنے لگا اور پھر اُس کی رُوح جیسے کپکپا گئی۔ تحریک کے اُفق پر چھانے والی تاریکیوں کے ہولناک تصوّر نے اُس کی سوچوں کو آگھیرا تھا...... پھر اُس کے خیالات کی رَو امیر خان کی آواز نے کاٹ دی۔ "امام الدین اُوپر آجاؤ۔" وہ کہہ رہے تھے۔

امام الدین، سید بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہُوا تو سلام مسنون عرض کیا۔ اُس کے چہرے پر غم و فکر کی پرچھائیں صاف ہویدا تھیں، سید صاحب نے پُوچھا: "منشی امام الدین!

خیر تو ہے، "کیا پیغام لائے ہو؟"

"حضرت، پیغام نہیں خبر، اندوہگیں خبر" امام الدین نے رُکتے رُکتے کہا۔ "سردار سُلطان محمّد خان نے مولوی مظہر علی، چار غازیوں اور ارباب فیض اللہ خان کو شہید کر ڈالا ہے۔"

خبر کیا تھی ایک بجلی تھی جو دل و دماغ پر کوندسی گئی۔ امام الدین کہہ رہا تھا "میں اپنی تلوار صیقل گر سے لینے گیا تو راستے میں ایک شخص نے مجھے الگ لے جا کر یہ المناک واقعہ سُنایا اور مجھ سے کہا فوراً بھاگ جاؤ، ورنہ تم بھی مارے جاؤ گے۔" میں وہاں سے نکلا ہزار خانی سے ایک گھوڑا لیا، اُس پر زین تک نہ ڈالی، دریا عبور کر کے حمزہ علی خاں کے پاس پہنچا، اُن سے دوسرا گھوڑا لیا اور راستے میں کہیں رُکے بغیر یہاں پہنچا ہُوں۔"

مُنشی امام الدین کے رُخصت ہوتے ہی سیّد صاحب نے شاہ اسمٰعیل، شیخ ولی محمد پھلتی، ارباب بہرام خاں وغیرہ کو مشورے کے لیے طلب فرما لیا۔

سیّد صاحب اس حادثے سے بے حد متأثر نظر آتے تھے۔ دراصل سردار سُلطان محمّد خان کی مشکوک سرگرمیوں اور اس کی بگڑتی ہُوئی نیّت کی خبریں اُن تک پہنچ گئی تھیں۔ پہلی اطلاع خود مولوی مظہر علی صاحب نے دی تھی۔ اُنھیں سیّد صاحب نے پشاور میں قاضی مقرر فرمایا تھا۔ سُلطان محمّد خان نے اطمینان کی فضا میسر آتے ہی خُفیہ قاصد دوڑانے شروع کر دیے تھے۔ اس کے نتیجے میں پشاور میں گردوپیش کے خوانین وغیرہ کی آمدورفت بہت بڑھ گئی تھی۔ مولوی صاحب نے سیّد صاحب کو اس کی رپورٹ دیتے ہُوئے لکھا: "پچھلے چند روز سے خوانینِ سمہ اور اُن کے آدمی سُلطان محمّد خان کے دربار میں بہت آنے جانے لگے ہیں، معلوم نہیں کیا سبب ہے، اطلاعاً لکھ رہا ہُوں۔" یہ غیر معمولی سرگرمیاں فی الواقع چونکا دینے والی تھیں۔ مرکز کو چاہیے تھا کہ عمّالِ حکومت کو ان سرگرمیوں کا خُفیہ طور پر کھوج لگانے کی ہدایت کرتا بلکہ اسلامی ریاست جن حالات میں عالمِ وجود میں آئی تھی اور اُسے جس قسم کے شب و روز درپیش تھے اُس کے پیشِ نظر ضروری تھا کہ سیّد صاحب انٹیلی جنس کا باقاعدہ الگ محکمہ قائم کرتے جو ریاست کے اندر اور معاند خوانین کے ایک ایک لمحے پر کڑی نظر رکھتا، لیکن نہ خود سیّد صاحب نے اس جانب توجّہ فرمائی اور نہ کسی اور نے اس اہم ضرورت کی طرف اُنھیں

متوجہ کیا۔ مولوی مظہر علی کی اطلاع کو بھی اُنھوں نے اپنی نیک طبعی کی بنا پر کسی سازش کا پیش خیمہ سمجھنے کی بجائے اُسے ایک عام سا واقعہ خیال کیا۔ جواب میں لکھا: "اِس سے پہلے خوانین اور دُرّانیوں میں نااتفاقی تھی، اب اتفاق ہوگیا ہے اس لیے اُن لوگوں کا بکثرت آنا جانا ایک فطری بات ہے۔" معاملات کے روشن اور مثبت پہلوؤں پر نظر رکھنا یقیناً ایک اچھی صفت ہے، رجائیت پسند اور نیک دِل لوگ ہمیشہ اُمید اور نیکی ہی کے رُخ کو اپنے اور دوسروں کے لیے پسند کرتے ہیں، تاریک پہلو سے فطرتاً متنفر ہونے کی وجہ سے بالعموم اُسے اہمیت نہیں دیتے، خصوصاً اِسلامی تحریکوں کے کارکنوں میں کسی معاملے کے تاریک پہلو پر نظر ڈالنے کو مایوسی پھیلانے کے مترادف سمجھا جاتا ہے، حالانکہ جب تک ایک معاملے کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر غور نہیں ہوتا، کسی صحیح فیصلے پر نہیں پہنچا جاسکتا۔ حالات کا یک رُخا مطالعہ تحریکوں کے لیے بالعموم تباہ کُن ثابت ہُوا ہے۔ یہی اضطراب انگیز صُورت یہاں جنم لے رہی تھی۔

مولوی مظہر علی صاحب بھی اس جواب سے مطمئن ہوگئے۔ قاصد آتے جاتے رہے اور زیرِ زمیں سازشیں پکتی اور جواں ہوتی رہیں۔ تھوڑی ہی مُدت بعد مولوی مظہر علی نے ایک اور رپورٹ دارالحکومت کو بھیجی۔ ارباب فیض اللہ خان نے انھیں بتایا تھا کہ دُرّانی سرداروں کی نیت میں فتور ہے، وہ امیر المؤمنین کے خلاف اندر ہی اندر خوانین سے جوڑ توڑ کررہے ہیں اور بغاوت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ارباب نے مولوی صاحب سے یہ بھی کہا کہ میری اور آپ کی جانیں خطرے میں ہیں، امیر المؤمنین کو اطلاع دے کر اپنے اور غازیوں کے لیے ہدایات طلب کریجیے۔ مولوی صاحب نے فوراً اِطلاع دینے کے بجائے اس معاملے کی خود تحقیق کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن ابھی وہ کچھ بھی نہ کرپائے تھے کہ سردار سُلطان محمد خان نے اُنھیں دربار میں طلب کیا۔ وہاں مقامی عُلماء بھی بڑی تعداد میں موجود تھے، ان کے وہاں جاتے ہی وہ بھری ہُوئی بھڑوں کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑے اور خادے خان اور یار محمد خان کے قتل کا شرعی جواز پُوچھنے لگے۔ دیر تک بحث ہوتی رہی۔ سُلطان محمد خان کے تیور بھی بگڑے ہُوئے تھے۔ اُن کے اندازِ بحث و گفتار سے اُن کا معاندانہ رویّہ صاف جھلک رہا تھا، یُوں لگتا تھا

کہ وہ کوئی فیصلہ کر چکے ہیں اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حیلے بہانے کی تلاش میں ہیں، لیکن مولوی مظہر علی نے اسے محض ایک علمی گفتگو سمجھا اور اپنی رپورٹ بھی اسی انداز میں مرتب کی۔ البتہ ابتدا میں ارباب فیض اللہ خان کے اندیشوں اور مشورے کا ذکر بھی کر دیا۔ رپورٹ کے اسلوب نے سر پر قضائے مبرم بن کر منڈلانے والے خطرے کو کچھ اس طرح دبا دیا کہ شاہ اسماعیل ایسا زیرک اور صاحبِ بصیرت شخص بھی دُرّانیوں کے مولویوں کے اعتراضات میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اُنھوں نے ایک ایک اعتراض کا علمی جواب دیا اور سید صاحب کے مشورے سے مولوی مظہر علی کو لکھا کہ بات چیت میں اُٹھائے جانے والے سوالات کے سلسلے میں افہام و تفہیم سے کام لو تاکہ عُلماء کے اندیشے اور غلط فہمیاں دُور ہو جائیں۔ یہ مشیتِ الٰہی ہی تھی کہ رپورٹ کا اصل حِصّہ کسی کی توجہ اپنی جانب نہ کھینچ سکا، ورنہ مولوی مظہر علی کی پہلی رپورٹ کی روشنی میں اس دوسری رپورٹ کا تجزیاتی مطالعہ کیا جاتا تو اصل حقیقت واشگاف ہو سکتی تھی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اندر ہی اندر پکنے والی سازش کی بُو کہیں کہیں سید بادشاہ کے بہی خواہوں تک بھی پہنچنے لگی تھی۔ دارالحکومت پنجتار سے ڈھائی تین کوس کے فاصلے پر شمال مشرق میں دکھاڑے کا گاؤں تھا۔ وہاں سید صاحب کے حکم سے چار غازی متعین تھے۔ دکھاڑا کے امام مسجد سید محمد اصغر ان غازیوں کے امیر شیخ حسن علی سے تخلیے میں ملے اور نہایت رازداری سے کہا:

"شیخ بھائی، آج بستی میں خوانین کا مشورہ تھا، تمھیں کچھ اس کی خبر ہے؟"

"ہمیں کیا معلوم، کسی امر کا مشورہ ہوگا!" شیخ حسن علی نے جواب دیا۔

"تم ہندوستانی لوگ بڑے سادہ ہو، اپنے گرد و پیش کے احوال کی بھی خبر نہیں رکھتے۔" سید اصغر کا مارے غُصّے کے چہرہ لال سُرخ اور آواز احتیاط کے باوجود خاصی بلند ہو گئی۔

شیخ حسن علی گھبرا گئے، پُوچھا: "کیا بات ہے؟"

"مَیں مُسلمان ہُوں، کافر نہیں ہُوں، یہاں کے سب خوانین کافر ہو گئے ہیں۔" سید اصغر بولے "اُنھوں نے مشورہ کیا ہے کہ جس جس بستی میں سید بادشاہ کے غازی متعین ہیں آج کے

چھٹے روز سب قتل کیے جائیں گے، جلد جاؤ اور سید بادشاہ کو خبر کر دو کہ وہ اس کفر کا کوئی تدارک کریں اور اپنے غازیوں کو مختلف مقامات سے پنجتار بلوا لیں۔"

شیخ حسن علی کو یقین نہ آتا تھا، لیکن سید اصغر قابلِ اعتماد رفیق تھے، انھیں جھٹلایا نہ جا سکتا تھا۔ شیخ صاحب نے اپنے بھائی عبدالعزیز سے بات کی اور کہا فوراً پنجتار پہنچو اور سید صاحب کو جا کر بتاؤ۔ عبدالعزیز بے ساختہ بول اُٹھے "مجھے تو یہ بات بالکل غلط معلوم ہوتی ہے، کہیں مسلمان بھی مسلمانوں سے دغابازی کر سکتے ہیں؟"

"ہاں بظاہر کوئی بھی مسلمان اس کا تصور نہیں کر سکتا، لیکن سید اصغر بھروسے کے آدمی ہیں، وہ جھوٹ نہیں بول سکتے۔ ہمیں یہ اطلاع کسی تاخیر کے بغیر پنجتار پہنچا دینی چاہیے، جھوٹ سچ کی تحقیقات خود امیر المومنین فرما لیں گے...... ابھی روانہ ہو جاؤ۔ ایک لحظے کی غفلت کسی بڑے حادثے کو جنم دے سکتی ہے۔"

شیخ عبدالعزیز بھاگم بھاگ پنجتار پہنچے۔ اُسی روز شاہ اسمٰعیل کا مکتوب لے کر قاصد پشاور روانہ ہُوا تھا۔ شیخ صاحب نے سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر سید اصغر کی بیان کردہ خبر گوش گزار کی۔ یہ خبر پچھلی رپورٹوں کے ساتھ مل کر سازش کی کڑیوں کو عیاں طور پر مکمل کر دیتی تھی، لیکن تقدیرِ الٰہی پھر آڑے آگئی۔ پاک نفس سید کا ردِ عمل وہی تھا جو ایک پاک طینت مسلمان کا دوسرے مسلمان سے حسنِ ظن کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ انھوں نے فرمایا:

"شیخ بھائی، یہ بات ناقابلِ تصور ہے، سراسر غلط معلوم ہوتی ہے، اس ملک میں رئیس اور خوانین سب ہمارے ہم نوا ہیں، ہمیں ان سے ہرگز ایسی اُمید نہیں، غالباً ہمارے اور اُن کے درمیان نااتفاقی ڈالنے کے لیے یہ خبر اُڑائی گئی ہے۔"

شیخ عبدالعزیز دکھاڑے واپس آئے، سید صاحب کی رائے سے شیخ حسن علی اور سید اصغر کو آگاہ کیا۔ وہ دونوں کفِ افسوس ملنے لگے۔ سید اصغر نے انھیں دوبارہ پیغام دے کر بھیجا کہ میری اطلاع غلط نہیں ہے، امیر المومنین اپنے تمام غازیوں کو فوراً واپس بُلا لیں اور ذرا بھی دیر نہ کریں۔" شیخ عبدالعزیز نے پیغام دیا تو سید صاحب نے ازرہِ شفقت اُن کی پیٹھ تھپکی اور فرمایا:

"بھائی، یہ بات غلط ہے۔ سمہ کے خوانین اور ملک ہمارے دوست ہیں۔ کسی مفسد نے یہ خبر مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کے لیے گھڑی ہے آپ جائیں اور دلجمعی سے اپنے مقام پر بیٹھیں۔"

اخلاص کا پیکر سید اصغر تڑپ کر رہ گیا۔ اُس نے شیخ عبدالعزیز کو تیسری بار سید صاحب کی خدمت میں بھیجا، لیکن نکوسرشت سید نے پھر اُنھیں تسلی دی اور فرمایا یہ ہمارے دشمنوں کی افسانہ طرازی ہے، وہ ہمارے اندر بے اعتمادی پیدا کرنا چاہتے ہیں، اُن کے اِس منصوبے کا ہمیں شکار نہیں ہونا چاہیے۔" سید اصغر نے سید بادشاہ کا جواب سُنا تو فرطِ قلق سے اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، شیخ عبدالعزیز سے کہنے لگے: "میری اس بات کو یاد رکھنا، دو تین روز میں حقیقت آشکار ہو جائے گی۔"

یُوں منافقوں اور غداروں کی خفیہ سرگرمیوں کی خبر مل جانے کے باوجود سید صاحب اپنی پاک نفسی کی بنا پر اُن پر اعتماد کرتے اور ان خبروں کو نظر انداز کرتے رہے، اب کہ پہلا دھماکا ہو چکا تھا سید صاحب کا اس سے شدید متأثر ہونا غیر فطری نہ تھا۔

○

اللہ کی مشیت اپنا کام کر کے رہتی ہے، کوئی اضطراب، کوئی تدبیر اور کوئی تگ و دو اُس کی راہ نہیں روک سکتی۔ قدرت جب اپنے اٹل فیصلے نافذ کرنے پر آتی ہے تو عقل و دانش، سوچ بچار کی قوتیں اور بر وقت عملی اقدام کرنے کی صلاحیتیں شل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ عام حالات میں جس بات کو انسانی ذہن ایک پیش پا افتادہ حقیقت کی طرح فوراً اُچک لیتا ہے وہی بات سامنے ہوتے ہُوئے بھی عقل و خرد کی دسترس سے دُور نکل جاتی ہے۔ عمدہ سے عمدہ تدبیریں کارگر نہیں ہوتیں اور بے تدبیریاں اور غلطیوں پر غلطیاں سرزد ہوتی چلی جاتی ہیں۔ سید صاحب اور اُن کے اصحاب الرّائے ساتھی کچھ ایسی ہی صُورتِ حال میں گرفتار تھے۔ سید صاحب نے منشی امام الدین کی رپورٹ سُنتے ہی اصحابِ شوریٰ کو طلب فرما لیا تھا۔ غازی سمہ کے دیہات میں جگہ جگہ سرکاری کاموں کے لیے بکھرے ہُوئے تھے۔ کہیں وہ پانچ پانچ دس دس کی ٹولیوں میں تھے اور کہیں عسکری یونٹوں کی صُورت میں بہت سے مقامات پر

وہ تین تین چار چار سے زیادہ نہ تھے۔ طے پایا کہ ان سب کو پنجتار میں فوراً جمع ہونے کا پیغام بھیج دیا جائے۔ سنگین صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ اس فیصلے پر فی الفور عمل ہوتا۔ ایک ایک لمحہ قیامت کا تھا اور اس کا ضیاع قیامت ڈھا سکتا تھا، مگر پھر بے تدبیری کے کانٹوں نے اُنھیں اُلجھا دیا۔ شیخ ولی محمد نے رائے دی کہ رات کے وقت قاصدوں کا بھیجنا مناسب نہیں، صُبح سُورج نکلنے پر بھیج دیے جائیں گے۔ سیّد صاحب نے سکوت فرمایا اور سبھی اس رائے پر متفق ہو گئے۔ صُبح یہ کام سیّد اسماعیل رائے بریلوی کے سپرد ہُوا، اُنھیں سیّد صاحب نے اپنی سواری کا گھوڑا دیا اور ہدایت کی کہ وہ شیوہ اور یار حسین جا کر غازیوں کو یہ خبر پہنچا دیں اور کہہ دیں کہ وہ بعجلت تمام پنجتار پہنچ جائیں۔ یار حسین میں رسالدار حمزہ علی سے کہیں کہ وہ دو دو، چار چار سوار اطراف کے دیہات میں بھیج کر غازیوں کو یہی پیغام پہنچا دیں ——

سیّد اسماعیل رائے بریلوی پنجتار سے اپنے "ٹاسک" پر روانہ ہُوتے تو خاصا دِن چڑھ آیا تھا۔ شیخ ولی محمد کی رائے سے جو وقت ضائع ہُوا اُس نے آنے والے دِنوں کا رُخ ہی بدل دیا۔

یہی ایک بے تدبیری نہ تھی جو ان نازک ترین لمحات میں تحریک کے رہنماؤں سے سرزد ہُوئی۔ ضروری تھا کہ مولوی مظہر علی اور اُن کے ساتھیوں کی شہادت کی خبر پنجتار میں پھیلنے نہ پاتی اور عام باشندوں کو شہر سے باہر جانے نہ دیا جاتا۔ جن دماغوں نے مجاہدین کو قتل کرنے کی سازش کا وسیع اور مؤثر منصوبہ بنایا تھا اُنھوں نے اپنے آدمی پنجتار میں بھی بٹھا رکھے تھے، تاکہ مرکزی حُکّام کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں اور ان کی اطّلاع سازشیوں کو دیتے رہیں۔ مجلسِ شُوریٰ کو رازداری کا مکمل اہتمام برتنا چاہیے تھا۔ اس کے فیصلے کی خبر عام نہیں پھیلنی چاہیے تھی۔ غیر پنجتاری باشندوں کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھنا اور مشتبہ افراد پر شہر سے باہر جانے کی پابندی لگانا بھی لازمی تھا، تاکہ اس فیصلے کی خبر اگر مقامی طور پر پھیل بھی جاتی تو شہر سے باہر سفر کرنے نہ پاتی۔ بالکل آخری وقت پر کیے جانے والے فیصلے پر کامیابی سے عمل مکمل رازداری ہی سے کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہاں ان دونوں باتوں کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔

پشاور کے حادثے اور رات کے فیصلے کی خبر صبح ہوتے ہوتے پنجتار میں پھیل چکی تھی۔ گڑھی امان زئی کے رہنے والے ایک شخص نصراللہ خاں کو پنجتار میں سازشیوں نے اسی مقصد

کے لیے متعین کر رکھا تھا، جونہی سید اسماعیل روانہ ہوئے وہ بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر چل کھڑا ہوا اور بستی بستی منافقین کے سرغنوں کو اطلاع دیتا چلا گیا کہ سازش کی خبر پنجتار میں ہو چکی ہے، جو کام پرسوں کرنا ہے اُسے آج ہی کر ڈالو ورنہ غازی تمھارے ہاتھ سے بچ کر نکل جائیں گے۔

ایک ایک غلطی اور بے تدبیری حالات کے دھارے کو مشیتِ الٰہی سے قریب تر کرتی جا رہی تھی۔ آخری فاصلہ غازیوں کے تساہل اور غفلت نے پورا کر دیا۔ سید اسماعیل نے شیلوہ اور بار دسین پیغام پہنچا دیا۔ رسالدار حمزہ علی نے جو سوار مختلف دیہات میں بھیجے اُن کے ذریعے سے صرف پنجتار جلد سے جلد پہنچ جانے کا پیغام بھجوایا، سمہ میں پیدا ہونے والی نازک صورتِ حال کی طرف اشارہ تک نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ غازیوں کو سنگین صورتِ حال کا احساس تک نہ ہُوا کہ وہ احکام ملتے ہی روانہ ہو جاتے۔ اکثر یہی سمجھے پشاور کی مہم درپیش ہے اس لیے انھیں طلب کیا جا رہا ہے۔ اُنھوں نے اپنی سہولت کے مطابق روانگی کا فیصلہ کیا، کسی نے کہا ہم یہاں سے شام کو روانہ ہوں گے، کسی بستی کے غازیوں نے آدھی رات یا صُبح پچھلے پہر کا وقت مقرر کیا۔ بستی والوں کے ساتھ بظاہر اُن کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے، چنانچہ وہ اپنے دوستوں اور شناساؤں سے وداعی ملاقاتیں کرنے لگے۔ ان ملاقاتوں میں دیہاتیوں کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ غازی کس وقت کُوچ کریں گے۔ غازیوں کے اس تساہل اور غفلت اور فاش غلطی نے جو اُن سے بے خبری کے عالم میں سرزد ہُوئی تھی، اُن کی اپنی ہی نہیں سرحد کی اسلامی ریاست کی قسمت پر مُہر ثبت کر دی۔

ننّیہ (علاقہ) امان زئی کے ناظم حاجی بہادر شاہ خان سیّد صاحب کی خدمت میں حاضری دے کر گڑھی امان زئی کے لیے روانہ ہوئے تو بظاہر فضا بالکل صاف تھی اور اضطراب اور خوف کی کہیں بھی کوئی لہر نہ تھی۔ زندگی معمول کے مطابق جاری تھی۔ وہ غور غشتی اور شیوہ میں ٹھہرتے ہوئے کالو خان پہنچے اور وہاں سے اسماعیلیہ۔ ہر جگہ لوگ عقیدت سے پیش آئے۔ وہ صاحبِ احسان بزرگ تھے اور سیّد صاحب نے انھیں لوگوں کی تربیت اور تزکیۂ نفس کا کام بھی سونپ رکھا تھا۔ اس کوچے کے رہ نورد اُن سے توجہ لیا کرتے، چنانچہ انھیں عزت و تکریم کی نظر سے دیکھتے۔ اسماعیلیہ وہ تقریباً عصر کے وقت پہنچے تھے۔ دو روز پہلے پشاور میں مولوی مظہر علی اور اُن کے ساتھیوں کا حادثۂ شہادت پیش آچکا تھا۔ رات سیّد صاحب نے شوریٰ کا اجلاس طلب کر کے غازیوں کو پنجتار بلانے کا فیصلہ کیا تھا اور صبح سیّد اسماعیل رائے بریلوی احکام لے کر شیوہ روانہ ہو چکے تھے اور اُن کے پیچھے پیچھے غدار نصراللہ خان سازشیوں کو ہوشیار، خبردار کرنے اور فوری وار کرنے کا مشورہ دینے نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ دوپہر سے کچھ پہلے پیغام دے کر آگے نکل گیا تھا۔ چونکہ یہاں کوئی غازی متعین نہ تھا اس لیے حاجی بہادر شاہ خان اُمڈنے والے طوفان سے بے خبر ہی رہے۔ اسماعیلیہ والوں نے حسبِ سابق اُن کی بڑی تعظیم و تکریم کی وہ تو اُسی روز آگے روانہ ہو جانا چاہتے تھے، لیکن انھوں نے بہت اصرار سے انھیں ایک رات کے لیے ٹھہرالیا۔ بے حد خاطر تواضع کی، پرتکلف کھانا کھلایا اور عشا کی نماز میں امام بنایا۔ پہلی رکعت کا سجدہ کر کے دوسرے میں گئے۔ زبان پر ربِ بزرگ و برتر کی تسبیح جاری تھی کہ بستی کے خان، اسماعیل خان نے تلوار ماری اور سر تن سے جدا کر دیا۔ اُن کی پاکیزہ روح اپنے پالنہار کے ذکر میں ڈوبی اعلیٰ علییّن میں پہنچ گئی۔ اُن کے پاک لہو سے مسجد کا فرش یوں سرخ ہو گیا جیسے کسی نے سرخ بانات کی چادر بچھا دی ہو۔

حاجی صاحب کو شہید کرتے ہی اسماعیلیہ میں نقارہ بجا۔ اِدھر یہاں نقارے

پر چوٹ پڑی اُدھر گاؤں گاؤں، بستی بستی میں نقارے بجنے لگے۔ نزدو دُور سے یکے بعد دیگرے بلند ہوتی ہُوئی نقاروں کی آوازیں تاریک رات کو پُر ہَول بنائے دے رہی تھیں۔ یہ اس امر کا اعلان تھا کہ جو کچھ فیصلہ ہو چکا ہے اس پر عمل پیرا ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ زیادہ تر مُجاہدین کچھ سمجھ نہ پائے کہ نقارے اچانک کیوں پھٹ پڑے ہیں۔ بعض مقامات پر کچھ غازیوں کا ماتھا ٹھنکا۔ اُنھوں نے اپنے ملنے جُلنے والوں سے دریافت کیا یہ کیا معاملہ ہے؟ ظالموں نے جواب دیا۔ "خندروس کوبی" (جوار کوٹنے) کے لیے لوگوں کو جمع کیا جا رہا ہے تاکہ سید بادشاہ نے جو عُشر کا غلہ جلد سے جلد ادا کرنے کا فرمان جاری کیا ہے، اُس کی تعمیل ہو سکے۔ غازی مطمئن ہو گئے۔ اُن کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ آئی کہ "خندروس کوبی" خُفیہ اشارہ ہے جو غداروں اور منافقوں نے اُن کے سروں کی فصل کاٹنے کے لیے مقرر کر رکھا ہے ـــــ اور پھر جگہ جگہ غازیوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ کوئی عشا کی نماز میں، کوئی آدھی رات کو، کوئی نمازِ فجر میں قیام اور رکوع و سجود کی حالت میں، کوئی طہارت اور وضو کرتے ہُوئے شہید کر دیا گیا۔ کہیں غازی دھوکے فریب سے قتل ہُوئے کہیں اُنھوں نے مردانہ وار لڑ کر جان دی۔ ہر جگہ مخلصین موجود تھے مگر اکثر دَم سادھے ہُوئے اور خاموش کہ خود اُن کی اپنی جانیں خطرے میں تھیں۔ کئی مقامات پر صدق و وفا کے پیکروں نے اپنی جانوں پر کھیل کر غازیوں کو بچانے کی کوشش کی اور اُنھیں اپنے گھروں میں پناہ دی۔ پنجتار میں عُلماء اور سادات قرآن شریف لے کر آئے اور خدا اور رسولؐ کا واسطہ دے کر ظالموں سے کہا کہ وہ ان مظلوم مُسلمانوں کو ناحق ظلم سے قتل نہ کریں، خدا کے غضب سے ڈریں، یہ حاجی، غازی اور مہاجر ہیں اور انھوں نے تمھارا کوئی نقصان بھی نہیں کیا۔ بستی کی عورتیں بھی گھروں سے نکل آئیں اور وہ اپنے خاوندوں، بیٹوں اور بھائی بھتیجوں سے لپٹ لپٹ گئیں، ہتھیار چھیننے کی کوشش کی۔ وہ خُدا اور رسولؐ کا نام لے لے کر کہتیں: ان مظلوم بے گناہوں کو کس لیے قتل کرتے ہو؟ انھوں نے تمھارا کیا بگاڑا ہے؟ غضبِ الٰہی سے ڈرو اور کافر نہ ہو جاؤ، خونِ ناحق مت کرو۔ مگر منافقوں پر خُون سوار تھا، خدا اور رسولؐ کے واسطے، منتیں سماجتیں،

کسی شے سے بھی اُن کا دِل نہ پسیجا۔

کُشت و خُون کے اس طُوفان سے صرف انھی مقامات کے غازی بچ سکے جہاں وہ فوجی دستوں کی صُورت میں مقیم تھے۔ اکثر دیہات میں بکھرے ہُوئے غازیوں میں ایک شخص بھی زندہ نہ بچا، کہیں کہیں ایک دو دو غازی بچ نکلے جنھیں کسی مخلص نے جرأت کر کے اپنے گھر میں پناہ دے دی۔ زیادہ تر ایسا ہُوا کہ ظالموں نے غازیوں کو دھوکا فریب دے کر اور چکنی چُپڑی باتیں کر کے نہتّا کر دیا اور پھر تلواروں اور چُھریوں سے نہایت بے دردی کے ساتھ شہید کر ڈالا۔ بعض کو بھیڑ بکریوں کی مانند لٹا کر ذبح کیا۔ سدّم کے ناظم حاجی محمُود خان کے بھائی عظیم اللہ خان کو اُن کے خُسر نے چھاتی پر بیٹھ کر ذبح کیا، حالانکہ یہ دونوں بھائی سدّم والوں کے ہم قوم تھے۔ اُن کی سنگدلی، شقاوت اور اسلام بیزاری کا یہ عالم تھا کہ شہیدوں کی لاشوں کو گھوڑوں کے پاؤں تلے روندتے اور کہتے: اُٹھو اور نماز کی تاکید کرو اور عُشر لو۔ سُدّم کے قتلِ عام سے صرف دو غازی بچ سکے۔ انھوں نے بھاگ کر ایک بُڑھیا کے گھر میں پناہ لی تھی۔ اس داستانِ خونچکاں کا اہم پہلو یہ ہے کہ دیہات کے اکثر مرد جہاں خُون کے پیاسے ہو رہے تھے وہاں خواتین نے اُن کی حمایت کی۔ سیّد بادشاہ نے شریعت کے قوانین نافذ کر کے انھیں مردوں کے جبر و استحصال سے نجات دلائی تھی۔ دوسری باتوں کے علاوہ اس "گناہِ عظیم" نے بھی مردوں کو سیّد بادشاہ اور اُن کے غازیوں کا دشمنِ جاں بنا دیا تھا، چنانچہ اپنے محسنوں پر ہونے والے ظلم و ستم پر سب سے زیادہ دُکھ اسی مظلوم اور کمزور صنف کو ہُوا اور جہاں بھی انھیں موقع مِلا انھوں نے غازیوں کو اپنے مردوں کے دستِ ستم کیش سے بچایا۔

اِس قتلِ عام میں شجاعت، جانبازی، صبر و استقلال اور صدق و اخلاص کی بہت سی تابندہ مثالیں دیکھنے میں آئیں۔

مینئی میں حبیب خان، سولہ برس کا ایک نوجوان غازی تھا، بونیر کا رہنے والا۔ اُس کے ہم قوم بلوائیوں نے ہر چند کہا کہ وہ غازیوں کا ساتھ چھوڑ دے اور اُن کے پاس

آجاتے، اُسے کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے، لیکن اس حق پرست لڑکے نے ان کی پیش کش ٹھکرا دی، سید بادشاہ کا دامن چھوڑنے کے بجائے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے تمھارے ساتھ جینا منظور نہیں، غازیوں کے ہمراہ شہادت پانا میرے لیے ہزار درجہ بہتر ہے میں خدائے قدیر کی بارگاہ میں اعلیٰ مدارج کو زندگیٔ ناپائدار پر ترجیح دیتا ہوں۔ سید امیر علی، حافظ عبدالعلی پھلتی کے ساتھ عُشر کی تحصیل و تحریر کے سلسلے میں دیہات کے دورے پر رہا کرتے تھے۔ وہ اتفاق سے شیوہ پہنچ گئے۔ سید امیر علی بیت المال کا روپیہ بھی لائے تھے۔ نقارے بجے تو وہ کھٹک گئے کہ یہ بے وقت نقارے کوئی طے شدہ خفیہ پیغام پہنچا رہے ہیں اور کسی شرارت کی تمہید ہیں۔ اُنھوں نے فوراً روپیہ لیا، گھوڑے پر سوار ہوئے اور گاؤں سے نکل آئے کہ روپیہ تو بحفاظت پنجتار پہنچا دیں۔ اُنھوں نے حافظ عبدالعلی کو بھی ہمراہ لے لیا تھا، لیکن وہ یہ کہہ کر واپس گاؤں چلے گئے کہ میں اس نازک وقت میں مصیبت میں گھرے ہوئے رفقاء کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا، چنانچہ اگلے روز انھیں کے دوش بدوش لڑتے ہوئے شہادت کا پیرہن پہن لیا۔ پھولڑے کی جنگ آخری جنگ تھی جو مردانِ حق نے سکھوں سے لڑی۔ حافظ عبدالعلی اس میں شریک ہوئے تھے، واپس آئے تو بڑے حسرت کے عالم میں کہا کرتے: وائے میری بدنصیبی کہ میں شہادت سے محروم رہا۔ اب اُن کے نصیب کھل گئے تھے۔ اللہ نے اُن کی حسرت و تمنّا پوری کر دی تھی۔ وہ شہادت کی مرگِ باسعادت سے بہرہ مند ہو چکے تھے، لیکن غیروں کے ہاتھ سے نہیں اپنوں کے ہاتھ سے، مسلمان کہلانے والے کلمہ گویوں کے ہاتھ سے!

میاں محمد بخش رامپوری کو پنتی کے ایک نیک دل عالم دین نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی، پھر وہ ایک اور بزرگ سید محمد کے ہاں منتقل ہو گئے۔ سید محمد اُن سے لپٹ کر ملے اور بہت روئے اور کہا کہ ان سنگدلوں نے بڑا ظلم اور بے دینی کا کام کیا کہ بے گناہ لوگوں کو مارا۔ اُنھوں نے کہا: "ہم شوقِ شہادت ہی دل میں پالے دُور دراز کے اس مقام پر آئے تھے، جو لوگ شہید ہوئے وہ مراد کو پہنچ گئے جو باقی ہیں اُن کی تمنائے دِل بھی یہی ہے کہ راہِ حق میں قربان ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے امام کو سلامت رکھے، اللہ نے

چاہا تو اُن کی برکت سے پھر جہاد کا سامان ہو جائے گا۔" ایک اور موقع پر کہنے لگے: "جو لوگ شہید ہوئے وہ بھی جذبہ لے کر آئے تھے، لیکن ہر شخص کا خیال تھا کہ وہ کفار کا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کرے گا، یہ تو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اسلام کے دعویدار اپنی خون آشام تلواروں کی دھار اُن کی گردن پر آزمائیں گے۔"

اس قتلِ عام میں کس قدر مردانِ حق شہید ہوئے؟ سیّد صاحب کی ایک تقریر کے مطابق اُن کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو خود سیّد صاحب ہی کے الفاظ میں علم و عمل، خدا ترسی، تقویٰ اور اتباعِ شریعت میں پورے برِصغیر کا خلاصہ اور لُبِ لباب تھے اور حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان میں زمین کا نمک۔

○

نئے اُفق کی تلاش

حادثہ بے حد جانگداز تھا۔ مجاہدین غم و حُزن کے سمندر میں ڈوب گئے۔ سب سے زیادہ متأثر سیّد بادشاہ تھے۔ وہ صبر و استقامت اور حلم و تحمّل کے عظیم پیکر تھے۔ حالات ابتدا ہی سے ناسازگار تھے اور مزاحم طاقتوں نے تحریک کے لیے قدم قدم پر رُوح فرسا رکاوٹیں کھڑی کر دی تھیں، مصائب و شدائد آئے دن ہجوم کرتے رہتے اور چرکے پرچرکے لگا جاتے، لیکن سیّد صاحب نے ان سے کبھی کوئی تأثر نہ لیا۔ اب سینکڑوں رفقا کے مظلومانہ قتل نے اُنھیں ہلا کر رکھ دیا، جیسے زبردست آندھی کسی مضبوط اور تناور درخت کو ہلا ڈالتی ہے۔ اُنھیں پہلی بار احساس ہُوا کہ وہ جس زمین پر کھڑے ہیں وہ اندر سے کھوکھلی ہے اور جن لوگوں پر اعتماد کر کے اُنھوں نے وقت کے باطل کو چیلنج دیا ہے، اُن کے اندر نفاق کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہے جو ہر خیر اور خوبی کو یُوں کھا جاتا ہے جیسے آگ خشک لکڑی کو۔ اور منافقوں پر بھروسا کر کے نہ صرف باطل سے کوئی جنگ نہیں لڑی جا سکتی بلکہ یہ حق کی صفوں میں رہ کر مردانِ حق کو چھُرا گھونپنے کا وہ کام کر گزرتے ہیں جو دشمن کھُلی صف آرائیوں میں کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اُنھیں اس سرزمین اور اس کے

ندوں سے نفرت ہوگئی۔ جب اللہ کی راہ میں ساتھ دینے والے بظاہر مخلص ترین لوگ بھی غیر مخلص اور ناقابلِ اعتماد نکلیں تو صرف اللہ کے لیے محبت اور دشمنی کرنے والے لوگوں کے دل میں اُن کے لیے کیا جگہ رہ سکتی ہے؟ چنانچہ سیّد صاحب نے ہجرت کر کے نئے اُفق کی تلاش میں نکل کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کی خبر پھیلی تو وہ علمائے حق، ساداتِ عظام اور معتقد خوانین اور عام باشندے جنھوں نے بھڑکتے شعلوں میں بھی ساتھ نہ چھوڑا تھا اور اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر غازیوں کو بچانے کی کوشش کی تھی، پنجتار پہنچنے لگے اور زور دینے لگے کہ وہ یہاں سے نہ جائیں، طوفان کا ایک مرغولا تھا جو اُٹھا اور دم توڑ گیا ہے، اب ہم اس خونی طوفان کے پیدا کرنے والوں کا احتساب کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ خود تحریک کے تمام نمایاں اصحاب کی یہی رائے تھی کہ ہمیں یہ جگہ نہیں چھوڑنی چاہیے۔ مولوی خیر الدین شیر کوٹی جو اپنے مجاہدین کو بسلامت لوند خوڑ سے پنجتار لے آئے تھے اور سیّد صاحب نے انھیں اور اُن کی جماعت کو "زندہ شہید" کا لقب عطا فرمایا تھا، بہت دانشمند، معاملہ فہم اور صاحبِ بصیرت تھے۔ انھوں نے سیّد صاحب سے گزارش کی کہ میری ناقص رائے میں موجودہ مقام کو چھوڑنا درست نہیں۔ کسی نئے علاقے میں جائیں گے تو اوّل تو وہاں کے لوگوں کو وعظ و نصیحت کر کے خیر کے سانچے میں ڈھالنے اور اُن کی عادات اور خصائل سے واقف ہونے میں لمبی مدّت لگے گی۔ پھر کیا خبر وہ کس قسم کے لوگ ہوں، ہمارے وہاں ٹھہرنے پر راضی ہوں یا نہیں، اس لیے یہاں مقیم رہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ایک عرصے سے ہم یہاں کے لوگوں کے اندر رہ رہے ہیں اور مخلص و منافق اور وفا شعار اور باغی سب ایک دوسرے سے ممتاز ہو گئے ہیں۔" سیّد صاحب نے فرمایا: "مولوی صاحب، بات آپ سچ کہتے ہیں، مگر یہاں قیام کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، کیونکہ مخلص لوگ تو تھوڑے ہیں اور مُفسد بہت۔ اب اُن سے ہدایت و صلاحیت کی اُمید نہیں رہی۔ ایک بار اُن سے دھوکا کھا کر پھر ان میں رہنا دینداری اور ہوشیاری سے بھی بعید ہے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے لَا یُلْدَغُ الْمُوْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَّرَّتَیْنِ۔ مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔۔۔۔۔۔ اب

یہاں کے لوگوں سے مجھ کو ایسی نفرت ہو گئی ہے، جیسی آدمی کو اپنی قے سے۔ اب یہاں سے ہجرت کرنی ہی بہتر ہے۔"

"ہم فرمانبردار ہیں، آپ جس طرف کو چلیں گے، ہم لوگ بے حیل و حُجّت آپ کے ہمرکاب ہوں گے۔" مولوی صاحب نے امام کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہُوئے کہا۔

ایک روز ارباب بہرام خان نے عرض کیا کہ اجازت عطا فرمائیں تو لشکر اور توپ لے کر نکل جاتا ہُوں، سارے دیہات سر اطاعت خم کر دیں گے اور اللہ نے چاہا تو جنگ کی بھی نوبت نہ آئے گی۔

"بھائی" سیّد صاحب نے فرمایا "پہلے پہل ہم اس مُلک میں پہنچے تو نہ ہم اس قوم کے حالات سے باخبر تھے اور نہ وہ ہمارے احوال سے۔ ہم اُنھیں کئی برس وعظ و نصیحت کرتے رہے اور ان کی زندگیوں میں انقلاب لانے کی جدّوجہد کرتے رہے، لیکن جب اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو ہم نے حاکمانہ طور طریق اختیار کیے اور فہمائش اور دلائل سے کام لیا۔ اس تمام جدّوجہد سے ہمارا مقصود دین حق کے احکام جاری و نافذ کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ افسوس اس کا بھی اُن پر کوئی اثر نہ ہُوا بلکہ اُن کی سرکشی اور تمرّد میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ اُنھوں نے سینکڑوں مُسلمانوں کو جو اپنے مُلک کا خلاصہ اور لُبّ لباب تھے، شہید کر دیا۔ ہماری اس سیاست کی غرض یہ نہ تھی کہ ہم ملک و جاہ کے طالب تھے، ہمارا مطلوب و مقصود محض اصلاح و تربیت تھی۔ اب ہم اس ملک کے لوگوں کو منتقم حقیقی کے انصاف پر چھوڑتے ہیں اور اپنے بچے کھچے رفقاء کو لے کر کسی دوسرے ملک کی راہ لیتے ہیں۔ ہم اپنے وطن کو اللہ کی خاطر چھوڑ چکے ہیں، ہمیں جہاں کہیں قول کے سچے اور مخلص و راستباز مسلمان ملیں گے وہیں اقامت اختیار کر لیں گے، کچھ اس ملک پر ہماری دعوت و تحریک کا انحصار نہیں ہے۔" سیّد صاحب کی آواز میں کمال صبر کے باوجود لرزش پیدا ہو گئی تھی۔ اُن کے چہرے سے صاف ہویدا تھا کہ وہ اپنے دل میں کروٹیں لینے والے جذبات کو دبانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ارباب کا چہرہ بھی غم و کرب میں ڈُوب گیا تھا۔

ارباب بہرام خان نے درست کہا تھا۔ سید بادشاہ کی عسکری طاقت۔ سینکڑوں سرفروش مجاہدین سے محروم ہو جانے کے باوجود اب بھی اتنی تھی کہ باغی خوانین لرزہ براندام تھے۔ انھیں جب پتہ چلا کہ سید صاحب پنجتار میں بسلامت ہیں اور مختلف گڑھیوں اور قلعوں میں متعین عسکری دستے بھی بحفاظت ہیڈکوارٹر پہنچ گئے ہیں تو اِس فکر نے آلیا کہ سید صاحب لشکرکشی کریں گے اور اپنے شہیدوں کا انتقام لیں گے، چنانچہ وہ خود حاضر ہو کر یا اپنے نمائندے بھیج کر عفوو کرم طلب کر رہے تھے۔ ہر شخص اُس گھناؤنے ظلم کی ذمّہ داری دوسروں پر ڈالتا کہ وہ اُن کے بہکاوے میں آگیا تھا۔ اِسلامی افواج باغی دیہات میں پیش قدمی کرتیں تو اخلاقی قوت سے تہی دست مجرم ضمیر اُن کے مقابلے میں نہ ٹِک سکتے۔ پھر عام آبادی کے وہ طبقات بھی تھے جنھیں اِسلامی شریعت کے نفاذ کی بدولت خوانین کے جوروا ستحصال سے نجات ملی تھی اور اِس خونی طوفان میں بالکل بے بس ہو کر رہ گئے تھے، وہ اِسلامی افواج کا ساتھ دینے اُٹھ کھڑے ہوتے اور پورا باغی علاقہ چند روز کے اندر اندر سرنگوں ہو جاتا۔ لیکن سید صاحب منافقین اور غداروں کے طرزِ عمل سے اِس قدر نالاں اور متنفر ہو چکے تھے کہ وہ اب اِس علاقے میں رہنے کا تصور کرنے پر بھی آمادہ نہ تھے۔ اپنے ساتھیوں سے بار بار فرماتے: "مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا، ہم ان منافقوں سے بار بار دھوکا نہیں کھائیں گے، یہاں رہ کر جدّوجہد کرنا پہاڑ کھود کر گھاس کا تنکا برآمد کرنے کے مترادف ہے۔"

ایک مجلس میں، جماعت کے ممتاز افراد کے علاوہ مقامی حامی اور ہمدرد بھی حاضر تھے، ارشاد فرمایا: "اب ہم یہاں سے ہجرت کریں گے اور جدھر اللہ تعالیٰ لے جائے گا، اُدھر جائیں گے، مگر یہاں نہیں رہیں گے، اِنشاءاللہ تعالیٰ۔ قدیم سے یہ سُنّت جاری ہے۔ انبیاء علیہم السلام حضرت نوحؑ سے حضرت خاتم المرسلین صلّی اللہ علیہ وسلّم اور حضرت کے نائبین میں سے اب تک جو داعی الی اللہ ہوتے ہیں، اُن سب کو مخالفین نے اذیّت کا نشانہ بنایا، وہ خلقِ خُدا کی خیرخواہی کرتے، اُن کو بھلائی سے بہرہ یاب کرنے کے لیے اپنی جانیں تک گھلا دیتے، لیکن مخالفین اُن کی شان میں گستاخی کرتے، اُنھیں بے عزّت کرتے اور اُن کو ایذائیں پہنچاتے ۔۔۔ لیکن یہاں کے لوگ تو اُن سب پر بازی لے گئے۔ وہ پہلے لوگ تو اُس دین

کے منکر و مخالف تھے جس کی طرف وہ داعیانِ حق اُنھیں بُلاتے تھے، یہ اُس دین کے ماننے والے تھے، اِنھوں نے دین کی نصرت و حمایت کا قول و قرار کیا تھا، اِس کے باوجود اس گھناؤنے فعل کا ارتکاب کیا کہ اِسلامی شریعت کی مخالفت کی اور اہلِ حق کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔"

یہ گویا حتمی اور آخری اعلان تھا کہ ہجرت کا جو فیصلہ ہو چکا ہے اُس میں کوئی ردّ و بدل نہ ہوگا۔

○

سیّد صاحب اور اُن کے غازی جذبات کے تلاطم میں روانہ ہُوئے۔ وہ جب یہاں وارد ہُوئے تھے تو اُمید و رجا کی چاندنی اُن کے دِلوں میں چھٹک رہی تھی۔ اُنھوں نے اِس علاقے کو برِّصغیر میں اِسلام کی نشاۃِ ثانیہ کی بنیاد بنانے کا فیصلہ اس لیے کیا تھا کہ یہاں کے لوگوں کی دینی غیرت و حمیّت کے چرچے دُور دُور تک پھیلے ہُوئے تھے اور برِّصغیر میں اُمڈنے والے غلامی کے اندھیارے ابھی تک یہاں نہیں پہنچے تھے۔ سکھوں کے ساتھ اُن کی چپقلش جاری تھی جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اُبھرنے والے سیاسی نقشے میں بظاہر ایک اہم طاقت تھے، لیکن اب اس طاقت کی موجوں میں وہ پہلی سی تُندی اور شوریدگی نہیں رہی تھی۔ جن لوگوں کی نظر اس کے نامیاتی عناصر پر تھی وہ جانتے تھے کہ دریا اُتر چلا ہے۔ بس گاہے گاہے اچانک کچھ لہریں اُٹھتیں اور سرحدِ آزاد کے کوہساروں اور وادیوں سے جا ٹکراتیں، اپنی راہ میں آنے والی بستیوں کو زخم لگاتیں، زندگیوں کو تہ و بالا کرتیں، خراج سمیٹتیں اور پھر اپنی تہہ میں سمٹ آتیں۔

——— اور قوموں کی قوّت کا دریا جب اُتر جاتا ہے تو پھر یا تو ان کے اندر سے پھُوٹنے والا ایک نیا سیلاب اُنھیں زندگی بخشتا ہے یا وہ کسی دوسری قوم کی سیلابی طاقت کی رَو میں بہنے لگتی ہیں۔ سکھ بحیثیت قوم ایسے ہی احوال سے دوچار تھے۔ اُن کے اندر دوبارہ قوّت پکڑنے کی صلاحیّت سرے سے مفقود تھی اور انگریزوں کی بڑھتی ہُوئی قوّت اُن کی گھات میں بیٹھی تھی، تاہم سکھوں کے اندر جیسی کچھ قوّت باقی رہ گئی تھی بھرحد

کے خوانین اور سردار اُس کے آگے بھی اپنے آپ کو بے بس و لاچار پاتے تھے۔ پشاور کے دُرّانی سردار سب سے طاقتور تھے، مگر وہ بھی سکھوں کے مقابلے میں پسپا ہو چلے تھے۔ سیّد صاحب نے اس علاقے کو اپنی تگ و دَو کا مرکز بنایا تو اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں کے لوگ سکھوں کے زخم خوردہ تھے۔ سیّد صاحب کا خیال تھا کہ یہ زخم خوردہ لوگ ان کی دعوت کو خلوصِ دل سے قبول کر کے سکھوں کی طاقت توڑنے میں بصد ذوق و شوق ان کا ساتھ دیں گے اور سکھ طاقت ٹوٹنے کا دوسرا مطلب یہ ہو گا کہ برِّصغیر کی شمالی سرحدوں میں اسلامی سلطنت قائم ہو جائے گی جو انگریزی سامراج کی بڑھتی ہُوئی طاقت کی کامیاب مزاحمت کر سکے گی ـــــ لیکن چار برس کے شب و روز کے بعد جب غازی یہاں سے رخصت ہو رہے تھے تو اُن کی اُمیدوں کی چاندنی گہنا چکی تھی۔ وہ جو سکّھوں کے لگائے ہُوئے زخموں کا مداوا لے کر آئے تھے، زخم خوردہ لوگوں کے ہاتھوں گہرا زخم کھا کر انجانی منزل کی طرف جا رہے تھے۔ وہ جس سرزمین کو چھوڑ چلے تھے اُس کے طُول و عرض میں اُن کے ساتھی ابدی نیند سو رہے تھے، سینکڑوں شہادت کا خلعت پہنے اور سینکڑوں طبعی مَوت کا شکار ہو کر ہجرت و جہاد کے اجر و ثواب سے شاد کام و بامراد۔ وَمَن يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (النساء)

کھر کی خاک میں شیخ الاسلام مولانا عبدالحی محوِ خواب تھے۔ جن کے تذکرے کے بغیر دعوت و جہاد کی یہ عظیم داستان مکمل نہیں ہوتی۔ یہاں سیّد صاحب، دُرّانی سرداروں کے جوڑ توڑ کو ختم کرنے کے لیے کچھ عرصہ مقیم رہے تھے۔ مولانا بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ یہیں مرض الموت میں مبتلا ہُوئے اور اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ تحریک کے سب سے عظیم ستون تھے اور سیّد صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرنے والے سابقون الاوّلون میں سے ایک۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے داماد اور خاندانِ ولی اللّٰہی کی عظیم و متبرک روایات کے امین۔ علم و فضل کے ایسے سمندر کہ خود شاہ عبدالعزیزؒ ان کی تعریف فرماتے اور انھیں شیخ الاسلام اور عالمِ ربانی قرار دیتے۔ ایک مکتوب میں انھیں اور شاہ اسمٰعیلؒ

کو تاج المفسّرین، فخر المحدّثین اور سرآمد علمائے محقّقین کے القاب سے بھی یاد فرمایا اور یہ صحیح ہے کہ دونوں حضرات تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، منطق وغیرہ میں مجھ سے کم نہیں۔ یہ اتنا بڑا اعزاز تھا کہ شاہ صاحبؒ کے بڑے بڑے شاگرد اس پر رشک کرتے، لیکن مولانا عبدالحی کی سادگی اور عجز و انکسار کی یہ حالت تھی کہ اپنے آپ کو کسی شمار قطار میں نہ سمجھتے اور فرمایا کرتے: مجھے جو کچھ ملا ہے سیّد صاحب کی برکت سے ملا۔ مولانا عبدالحی نیک نفسی، زہد و تقویٰ اور اخلاص و توکّل اور عمل کا دلکش پیکر تھے اور اس کے اثرات اُن کے چہرے سے عیاں تھے، نورِ ایمان برستا محسوس ہوتا اور صالحیّت اُن کی پیشانی سے جھلکتی دکھائی دیتی۔ ردِ بدعات اور سُنّتوں کے احیا میں بڑے گرم جوش تھے۔ سیّد صاحب کا دامن تھاما تو پھر آخری سانس تک پکڑے رکھا۔ جب تحریک کا آغاز ہُوا تو بوڑھے ہو چکے تھے اور ضعف و ناتوانی نے آ لیا تھا، مگر حق کی راہ میں جوانوں سے زیادہ قوی اور نشاطِ عمل سے بہرہ مند تھے۔ اسی بڑھاپے میں کئی کئی روز مسلسل وعظ و ارشاد فرماتے۔ اسی عالم میں سیّد صاحب کے ہمراہ شمالی اضلاع کا تبلیغی دورہ کیا اور پھر صحّت کی اسی کیفیّت میں حج کے سفر میں بھی سیّد صاحب کے جلو میں تھے۔ سیّد صاحب نے وطن سے ہجرت کی تو انھیں بعض اُمور کے اہتمام و تکمیل کے سلسلے میں پیچھے چھوڑ گئے۔ مفارقت کے یہ دن آپ پر بڑے شاق تھے۔ کہاں تو یہ حال کہ سفر و حضر میں اپنے پیر و مُرشد کے ساتھ رہتے اور اِس شان سے کہ دورانِ سفر میں ادنیٰ خادموں کی طرح سواری کی رکاب تھامے ہُوئے چلتے اور حضر میں جب سیّد صاحب رات کو استراحت فرماتے تو اُن کی حضوری میں بیٹھے بیٹھے صبح کر دیتے اور کہاں جُدائی کے اذیّت ناک شب و روز۔ ایک ایک لمحہ اس انتظار میں کٹنے لگا کہ کب نامۂ دوست، وصالِ دوست کا پیغام لاتا ہے۔ پانچ مہینے اسی کربِ انتظار میں گزر گئے۔ آخر مژدۂ زندگی آ پہنچا۔ مولانا پر عجب وجد سا طاری ہو گیا۔ ضعیفی اور مدّتوں کے جان کو لگے ہُوئے روگوں سے پہلے ہی لاغر ہو چکے تھے اب انتظار کے کرب نے بالکل ہی مضمحل کر ڈالا، لیکن نسیمِ صبحگاہی کے دوش پر آنے والی بُوئے دوست نے ان کے اندر رُوحِ تازہ بھر دی۔ فوراً رختِ سفر باندھا۔ اربابِ حق کا ایک قافلہ، جو پہلے ہی سے تیّار کر رکھا تھا، ساتھ لیا اور راہِ شوق میں نکل کھڑے ہُوئے۔

ایک دیوانگی سی دیوانگی تھی، فرزانے جس کا تصور نہ کر سکتے تھے۔ چلتے چلتے اپنے خیالات میں گم ہو جاتے، سید صاحب کا خط نکال کر پڑھتے اور بے اختیار آنکھوں کے آبشار بہہ نکلتے۔ پھر بزم دوست میں جلد سے جلد پہنچنے کا خیال اُن کے رہوارِ شوق کو مہمیز کر دیتا اور وہ تیز تیز قدم اُٹھانے لگتے۔ جو راہگیر ملتا اُس سے کہتے: مجھے سید صاحب نے طلب کیا ہے۔ وہ اِن کے گرد و غبار میں اَٹے ہوئے نورانی چہرے پر نظر ڈالتا اور سمجھ جاتا کہ مردِ پیر کسی اور دنیا میں ہیں۔ عام راستہ اختیار کرنے کے بجائے دہلی سے بہاولپور، شکارپور، درہ بولان، قندھار، کابل اور جلال آباد کے راستے سوات کے گاؤں چارباغ میں وارد ہوئے، جہاں ان دنوں سید صاحب دورے پر تھے۔ ساری راہ گوناگوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کہیں علاقے کے علاقے زیرِ آب تھے، کہیں ریگزار کی مشقت بھری راہیں تھیں اور کہیں کوہساروں کی شدید سردی اور برفانی ہوائیں۔ مولانا نے راستے کا ہر کٹھن مرحلہ کمال جذب و اشتیاق کے ساتھ طے کیا۔ سید صاحب بھی مولانا کی آمد کا ہلالِ عید کی طرح انتظار فرما رہے تھے، آمد آمد کی خبر سُنی تو خود استقبال کو نکلے۔ دریا کے کنارے ملاقات ہوئی۔ مصافحہ و معانقہ ہوا۔ مولانا نے دستِ مبارک کو بوسہ دیا۔ ملاقات کے وقت مولانا کے دل کی جو کیفیت تھی اُس کا تذکرہ اُنھوں نے اپنے دوستوں کے نام ایک مکتوب میں کیا۔ لکھا:

"مجھ پر ویسی ہی حالت طاری ہوئی جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے روز مومن کو جنتِ معلّٰی میں غوطہ دیا جائے گا، چنانچہ اُس نے دنیا کی زندگی میں جو مصائب و شدائد اور صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کیں اُن کا رنج و ملال رُوح و جسم سے دُھل جائے گا۔"

سید صاحب نے مولانا عبدالحی کو مکان میں ٹھہرایا اور لشکر کا قاضی مقرر فرمایا۔ مولانا مقدمات فیصل کرتے اور علماء کا تقرر فرماتے۔

مولانا عبدالحی سرحد آنے کے بعد تقریباً نو دس مہینے زندہ رہے۔ اُنھیں بواسیر کا پُرانا مرض تھا، وہی مرض الموت بن گیا۔ کبھی بے ہوش ہو جاتے کبھی ہوش میں آ جاتے۔ انتقال کے وقت سید صاحب بالیں پر بیٹھے تھے۔ عرض کیا کہ حضرت شہادت تو نصیب میں نہ تھی، اب اتنی تمنا ہے کہ اپنا قدم مبارک میرے سینے پر رکھ دیجیے کہ اسی حالت میں میری جان نکل جائے۔ سید صاحب نے فرمایا، میرا پاؤں اس قابل کہاں ہے کہ اس سینے پر رکھوں جو قرآن و حدیث

بھی علم کا مخزن ہے پھر اپنا ہاتھ اُن کے سینے پر رکھ دیا اور اسی عالم میں اُن کی رُوح خاکی قفس سے پرواز کر گئی۔

جان دی، دی ہُوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا۔

مولانا عبدالحیؒ بڑے حق گو تھے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں شمشیرِ برہنہ۔ اس باب میں اپنے شیخ اور مرشد کا لحاظ بھی نہ کرتے۔ ایک مرتبہ شادی کے بعد سید صاحب خلافِ معمول جماعت میں کچھ تاخیر سے آئے، دوسرے دن بھی تکبیر اولیٰ فوت ہوگئی۔ مولانا نے سلام پھیرنے کے بعد فرمایا: "عبادتِ الٰہی ہو گی یا عشرت"۔ سید صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف فرما لیا۔ ایک بار سید صاحب نے آپ سے فرمایا: "مولانا، اگر مجھ سے کوئی بات خلافِ سُنّت دیکھیے تو متنبّہ کر دیجیے گا"۔ مولانا نے فرمایا: "حضرت جب کوئی خلافِ سُنّت فعل عبدالحی دیکھے گا تو وہ آپ کے ساتھ ہو گا ہی کہاں؟"[1]

ایک مرتبہ رائے بریلی میں سُورہ المجادلہ کی آخری آیت پر وعظ فرمایا: لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ

---

[1] جماعت مجاہدین کے مصنف مولانا غلام رسول مہر مرحوم ان دونوں واقعات کو مبالغہ آمیز قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں مولانا عبدالحیؒ کا تعلق سید صاحب سے ایسا نہ تھا کہ وہ اس قسم کا لب و لہجہ اختیار کرتے اور پھر اس میں تبلیغ کی بھی کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ مولانا عبدالحیؒ کے جو مواعظ کتابوں میں درج ہیں اُن کی روشنی میں مہر صاحب کی یہ رائے محض عقیدت پر مبنی دکھائی دیتی ہے۔ مولانا حق و صداقت کے بیان اور منکرات کی نکیر میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ خصوصاً وہ لوگ جن کے ہاتھ میں اُمّت کی دینی رہنمائی کی زمام تھی اُن کی کمزوریوں پر تو بڑی شدید گرفت کرتے کہ اُن کی ذرا سی خامی اور کمزوری عام مسلمانوں کے لیے اپنی کمزوریوں اور خامیوں سے محبّت کرنے اور انھیں پالنے پوسنے کا جواز فراہم کر سکتی تھی اس لیے کہ وہ اُمّت کے لیے نمونہ ہوتے ہیں۔ اچھے نمونے کو انسان کا نفس مشکل سے اپناتا ہے اور بُرے نمونے کی طرف وہ تیزی سے لپکتا ہے اس لیے اُن سے سرزد ہونے والی ذرا سی غلطی پر پُوری قوت سے ٹوکنا ضروری ہوتا ہے۔ رہی موخر الذکر بات تو اس سے مولانا عبدالحی کا مقصود بظاہر یہ بتانا ہے کہ ہم آپ کے اردگرد اس لیے جمع ہُوئے ہیں کہ آپ کتاب و سُنّت کی دعوت دیتے اور اُن کے متبع ہیں جس روز آپ نے اتباعِ سُنّت چھوڑ دی، ہم بھی آپ کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔

قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَیُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنھوں نے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی مخالفت کی ہے، خواہ وہ ان کے باپ ہوں، یا اُن کے بیٹے، یا اُن کے بھائی، یا اُن کے اہلِ خاندان۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک رُوح عطا کر کے اُن کو قوت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے راضی ہُوا اور وہ اللہ سے راضی ہُوئے۔ وہ اللہ کی پارٹی کے لوگ ہیں۔ خبردار رہو، اللہ کی پارٹی والے ہی فلاح پانے والے ہیں) مولانا کا ہر وعظ بڑا پُر تاثیر ہُوا کرتا ـــــ سینوں میں دھڑکتے ہُوئے پتھر پگھل جاتے اور آنکھوں سے جھڑی لگ جاتی۔ یُوں لگتا دلوں کی پُرانی دُنیا درہم برہم ہو رہی ہے اور اس کی جگہ ایک نئی کائنات جنم لے رہی ہے۔ لیکن اُس روز تو مولانا کا انداز ایک خاص ہی رنگ لیے ہُوئے تھا۔ خطابت و بلاغت کا دریا تھا کہ بہہ رہا تھا معانی و مطالب کی وہ نئی دنیا سامنے آ رہی تھی جس پر آج تک بڑے بڑے عُلماء کی نظر نہ گئی تھی۔ قرآن کے بے پایاں سمندر میں غوطہ زن ہو کر مولانا ایسے دُرہائے آبدار سے سامعین کے دلوں کا دامان تہی بھر رہے تھے کہ تاریکیوں میں لپٹی ہُوئی رُوحیں جگمگا اُٹھی تھیں۔ ہر شخص دم بخود اور حیران تھا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کی دی ہُوئی اس کسوٹی پر عام آدمیوں ہی کے نہیں ہندوستان کے تمام عُلماء و مشائخ کے اعمال و کردار اور رسوم و اعتقادات کو پرکھا سب کی کمزوریاں بیان کر دیں اور ذرا لاگ لپیٹ سے کام نہ لیا۔ نہ شاہ ولی اللہ کے خاندان کا پاس کیا جس سے خود ان کا اپنا بھی تعلق تھا اور نہ شاہ علم اللہ کے خاندان کا، جس کے گل سرسبد سیّد صاحب تھے۔ ان خاندانوں کے جو اعمال اس آیت کے خلاف تھے، سب پُوری طرح کھول کر بیان کر دیے اور پھر بھرے مجمع میں سیّد صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا: حضرت، ایک بات اگر آپ اپنے خاندان سے دُور فرما دیں تو اس آیت پر پُورا پُورا

عمل ہو جائے سید صاحب یہ بات سن کر بے تابی کے ساتھ اپنی جگہ سے اُٹھے اور آپ کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئے اور کہا: "مَیں خُدا کا بندہ ہُوں اور اُس کے رسُولؐ کا تابع۔ اللہ اور اُس کے رسُولؐ کی اطاعت میں عزیزوں، رشتے داروں اور امیر و غریب کسی کا پاس نہیں کروں گا اور شریعت کے حکم کی بے کم و کاست تعمیل کروں گا اور کسی کی خوشی ناخوشی کی پروا نہیں کروں گا۔"

مولانا کا اشارہ بیواؤں کے نکاحِ ثانی کی طرف تھا جس کو شرفا کے خاندانوں کی طرح یہاں بھی بہت بُرا بلکہ حرام سمجھا جاتا تھا۔ اس وعظ کا یہ اثر ہُوا کہ رسم و رواج کا وہ بُت ڈھے گیا جس پر ضرب لگانے کی جرأت عُلماء اور مشائخ کو نہ ہو سکی تھی۔ سید صاحب نے سب سے پہلے اپنی بیوہ بھاوج سے نکاح کر کے مُردہ سُنّت کا احیا کیا۔ اس طرح ذاتی مثال قائم ہو گئی۔ سید صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ شاہ عبدالعزیزؒ اور اپنے خُلفاء کے نام خط لکھوائے، اس واقعے کی اِطلاع دی اور اِس سُنّت کے زندہ کرنے کی رغبت دلائی۔ بیوہ کا دوسرا نِکاح شاہ ولی اللہ کے خاندان میں ہُوا۔ شاہ اسماعیل نے اپنی بیوہ ہمشیرہ کا نِکاح مولانا عبدالحی سے کر دیا حالانکہ وہ اس وقت معمّر ہو چکی تھیں اور پھر ان درخشندہ مثالوں کا اثر یہ ہُوا کہ نکاحِ بیوگان عام ہو گیا۔ غیرت و حمیت کے مصنوعی تصورات ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے، ہزاروں مظلوم و بے زبان عورتیں جو اس مصنوعی تصور کی بیڑیوں میں جکڑی ظلم و ستم کا شکار ہو رہی تھیں اور غیر فطری زندگی بعض اَوقات بھیانک اخلاقی فساد کا باعث ہو جاتی تھی اُسے فطری راستے پر ڈال دیا گیا تھا۔

وعظ و ارشاد کی مجلس میں ہزاروں کا مجمع ہوتا۔ تقریر کا موضوع بالعموم ان قوموں کے حالات و صفات اور اخلاق ہوتا جن پر عذابِ الٰہی نازل ہُوا تھا۔ بڑی تفصیل کے ساتھ اُن کے افکار و اعتقادات، اعمال و اخلاق، وضع و معاشرت، رسم و رواج اور صُورت و سیرت کا نقشہ کھینچتے اور اپنے سامعین میں یہ احساس اُجاگر کرتے کہ وہ اپنا اور اپنے معاشرے کا احتساب کریں۔ کہیں اُن کے احوال اُن قوموں کے احوال سے ہم آہنگ تو نہیں تھیں؟ بعض اَوقات ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک ایک پہلو کا اقوامِ ماضی کی زندگیوں سے موازنہ کرتے۔

یُوں سُننے والوں کے دِلوں میں ان کے غیر اسلامی نسب و روز سے نفرت پیدا کرتے اور وہ اکثر حق کی راہ پر ہو لیتے۔

یہ مردِ مومن تو عظیم انسان تھا ہی یہاں کی خاک میں مدفون دوسرے لعل و گوہر بھی کچھ کم گراں مایہ نہ تھے۔ انھی میں مولانا محمد یوسف پھلتی تھے۔ شاہ ولی اللہؒ کے بھائی شاہ اہل اللہ کے پوتے۔ نواب وزیر الدولہ (ٹونک) کے بقول علم میں بے مثل اور عمل میں بے بدل تھے۔ آغازِ دعوت کے بعد پہلے شخص تھے جنھوں نے سید صاحب کے دستِ مُبارک پر بیعت کی سعادت حاصل کی۔ بڑے بہادر اور نشانہ باز تھے۔ پَے بہ پَے بندوقیں چلانے میں پُورے لشکر میں اُن کا ثانی نہ تھا۔ ایک مرتبہ سر کر کے بندوق دوسری مرتبہ بھرنے اور سر کرنے میں تین بار پلک جھپکانے سے زیادہ دیر نہ لگتی۔ جماعت کے انتظامی اُمور اُن کے سپرد تھے۔ اُنھیں کے پاس روپیہ جمع ہوتا وہی چیزیں خریدتے اور حساب کتاب رکھتے۔ حافظِ قرآن تھے۔ ہر وقت زبان کلام الٰہی کی تلاوت سے معطر رہتی۔ بے حد متقی تھے، ذرا ذرا بات کی احتیاط کرتے۔ بے اجازت کسی کی شے کام میں نہ لاتے۔ ایک مرتبہ سید صاحب نے انھیں رائے بریلی سے اپنا گھوڑا لانے کے لیے مظفر نگر یا سہارن پور بھیجا جو کسی ارادت مند نے تحفے میں دیا تھا۔ واپسی پر گھوڑے کی باگ تھامے پیدل آئے، اُس پر سوار اس لیے نہ ہُوئے کہ سید صاحب سے اِذن و اجازت نہ لی تھی۔ دمہ کے مرض میں فوت ہُوئے تو سید صاحب نے فرمایا: "یُوسف جی اس لشکرِ اسلام کے قطب تھے، آج لشکر قطب سے محروم ہو گیا"۔ بڑے قناعت پسند، زاہد و متورع اور متوکل تھے۔ مزاج میں ایسا استقلال تھا کہ ایک بار جس کام میں ہاتھ ڈالتے اُسے انجام کو پہنچا کر رہتے، چاہے کتنے ہی کٹھن حالات سے دوچار ہونا پڑتا۔

انھی میں سید صاحب کے اپنے بھانجے سید احمد علی، اُن کے صاحبزادے سید محمد مُوسیٰ اور ایک قریبی عزیز سید ابو محمد تھے۔ سید احمد علی پھولڑہ کی جنگ میں شہید ہُوئے اور موخر الذکر دونوں مایار کی لڑائی میں۔

پھر مولوی مظہر علی عظیم آبادی تھے۔ فتح پشاور کے بعد قضا کا منصب اُنھیں سونپا گیا۔ غازیوں کے قتلِ عام کی غدارانہ مہم میں پہلا نشانہ یہی بنے سردار سلطان محمد خان

نے اُنھیں مشورے کے بہانے اپنے محل میں طلب کیا، جونہی کمرے کے اندر قدم رکھا اُس کے آدمی ان پر ٹوٹ پڑے اور تلواریں مار مار کر شہید کر دیا۔ بڑے بہادر تھے، تقریر میں بے پناہ تاثیر تھی۔ پشاور میں اسلامی لشکر داخل ہُوا تو پہلا جمعہ انھی نے پڑھایا جس نے بھی ان کی تقریر سُنی گرویدہ ہو گیا۔

پھر قمرالدین حسین تھے۔ پٹنہ کے آخری نائب ناظم رفیع الدین حسین اُن کے دادا اور مولانا ولایت علی کے نانا تھے۔ سیّد صاحب حج سے واپسی پر پٹنہ تشریف لے گئے تو اُنھوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی اور گھر بار چھوڑ کر پیر و مُرشد کی رفاقت اختیار کر لی۔ سرحد کی اکثر جنگوں میں شریک رہے۔ مولوی مظہر علی نے قاضی بننے کے بعد اپنے ساتھ پشاور میں جماعت کے جن کارکنوں کو رکھا ان میں ایک قمرالدین حسین بھی تھے۔ اُنھیں بھی سُلطان محمد خان کے آدمیوں نے مولوی مظہر علی صاحب کے ساتھ شہید کر دیا۔ ایک کارکن امام الدین بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے باقی دو بھی دُرّانی سرداروں کی بے وفائی کا شکار ہُوئے۔

ایک اور سرفروش نوجوان مولوی باقر علی عظیم آبادی تھے۔ مولانا ولایت علی کے عم زاد بھائی۔ سولہ سترہ برس کی عمر تھی کہ پٹنہ میں سیّد صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور پھر راہِ حق ہی کے ہو رہے۔ سیّد صاحب نے ہجرت کی تو اُن کے جلو میں تھے۔ ارادت مندی کی آن بان یہ تھی کہ سیّد صاحب کی سواری کے ساتھ پیدل چلا کرتے۔ اُونچے اور صاحبِ ثروت گھرانے کے فرد تھے، لیکن سیّد صاحب کی رفاقت اختیار کی تو ساری لذاتِ دنیوی اور سامانِ راحت سے کنارہ کش ہو گئے۔ بالکل سادہ سے کپڑے زیبِ تن ہوتے، اکثر پاؤں میں جُوتے نہ ہوتے۔ سکھوں کے ساتھ پہلی جنگ میں جو پہلی گولی سکھوں کی طرف سے آئی وہ اُنھیں لگی اور کارگر ہو گئی۔ یُوں شہدائے حق کے جلیل و جمیل سلسلے کا سرِ آغاز بننے کی سعادت ایک ایسے گھرانے کے نوجوان کو حاصل ہُوئی جو مستقبل میں تحریکِ اسلامی کے اِس قافلۂ شوق کی تاریخ کو ایک نیا عنوان دینے والا تھا۔

اسی گھرانے کا ایک اور اٹھارہ اُنیس سالہ نوجوان، مولانا ولایت علی کا چھوٹا بھائی،

مولوی طالب علی بھی انہی کوہستانی سلسلوں میں جنگلئی کے مقام پر محوِ خواب تھا۔ وہ جنگ شیدو کے بعد جگر اور تلی کے ورم میں مبتلا ہو کر اپنے رب کے حضور سرخرو حاضر ہو گئے تھے۔ اس سے بڑھ کر سرخروئی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان کو موت اللہ کا کلمہ بلند کرنے کی جدّوجہد کرتے ہوئے مہاجرت کے عالم میں آئے۔

پھر کانٹرا غور کے قاضی محمد حبان تھے۔ ان چند مقامی مردانِ حق میں سے ایک، جنھوں نے سید صاحب کی بیعت کی تو اپنے اس عہدو پیمان کو پوری وفا کیشی کے ساتھ نبھایا۔ بہت بڑے عالمِ باعمل، ذہین وفطین، غیور، اعلیٰ درجے کے مقرر، بے حد بہادر اور متقی اور غیرتِ دین کا پیکر تھے۔ بیعتِ اقامتِ شریعت کے بعد قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے منصب جلیلہ کے لیے سید صاحب کی نگاہِ انتخاب انہی پر پڑی۔ سید صاحب کی مجلسِ شوریٰ کے اہم رکن تھے۔ مقامی سیاست اور معاشرتی مسائل کی پیچیدگیوں سے بخوبی واقف تھے، بنابریں جنگ وصلح کے معاملات میں اُن کے مشورے بہت مفید ہوتے۔ مردان کی جنگ میں بہادری سے لڑتے ہوئے شہادت کے مرتبۂ عالیہ پر فائز ہو گئے۔

پھر خیر آباد کے ایک سعادت مند گھرانے کے چار بھائی تھے جو مختلف مقامات میں ہجرت وشہادت کے ثواب سے بہرہ یاب روزِ حشر کے انتظار میں تھے۔ خوش نصیب باپ اور اُس کے چھ بیٹے سید صاحب کی دعوت سے متاثر ہوئے، اُن کے ہاتھ پر بیعت کی اور سب کے سب جہاد فی سبیل اللہ کی کٹھن مگر اخروی نعمتوں اور آسائشوں سے آراستہ گھاٹی میں گامزن ہو گئے۔ سب سے بڑے گوہر خان میدانِ جنگ تک نہ پہنچ سکے اور نیت کے شیریں ثمرات سمیٹنے کے لیے اگلی دنیا میں پہنچ گئے۔ ابراہیم خان مشہدِ بالاکوٹ میں حاضر تھے، پھر شیخ ولی محمد کے ساتھ رہے اور انہی کے ہمراہ ٹونک چلے گئے۔ باقی چاروں بھائی اسی سرزمین میں آرام کر رہے تھے۔ امام خاں، پایندہ خاں کے ساتھ جنگ میں شہید ہوئے۔ شاہ اسماعیل نے اُن کی شہادت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: "دشمن سے رزم وپیکار کے لیے انسانوں کی قسمیں ہوتی ہیں، بعض صاحبِ تدبیر ہوتے ہیں، بعض شجاع اور دلاور اور بعض دونوں اوصاف کے حامل۔" منشی محمدی انصاری نے تبصرہ سُن کر کہا:

انام خان میں دونوں خصوصیتیں تھیں، یعنی وہ مدبر بھی تھے اور شجاع بھی۔ شاہ صاحب نے اپنے تبصرے میں اسی جانب اشارہ فرمایا تھا۔ دوسرے بھائی محمّد خان نے پھولڑہ کی جنگ میں خلعتِ شہادت پہنا۔ احمد خان اور ارادت خان کو دورانِ جہاد میں طبعی موت نے آلیا۔ رہا ان خوش نصیب بیٹوں کا خوش نصیب باپ تو بالاکوٹ کی مٹی اُس کا پاک لہو اپنے سینے میں جذب کرنے اور خاکی جسد کو چھپا لینے کے لیے بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

ایک اور صاحب کالے خاں شمس آبادی مایار کی سرزمین میں خوابیدہ تھے۔ مایار کی جنگ میں توپ کے گولے سے زخمی ہوئے۔ نزع کے عالم میں زبان پر اللہ اللہ کا ذکر جاری تھا۔ گاہے گاہے پوچھ لیتے جنگ کا کیا حال ہے؟ دُرّانیوں کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ نکلے تو انھیں خوش خبری سنائی گئی۔ سُنتے ہی الحمدللہ کہا اور ساتھ ہی دم نکل گیا۔

○

سرحد کے اس چمن زار میں خاک و خون میں آغشتہ کس کس لالہ وگُل کا ذکر کیا جائے؟ ایک آسمان تھا جو اپنے ستاروں کے ساتھ اس سرزمین میں اُتر آیا تھا اور اس آسمان کے کتنے ہی ستارے تھے جو اپنی چمک دمک سے تہ بہ تہ تاریکیوں کے سینے منوّر کرنے کی جدّوجہد میں خون میں نہا گئے تھے۔

اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے جُدا ہوتے وقت غازیوں کا رنج و ملال فطری تھا اور سب سے بڑا غم تو اس مقصد کا غم تھا جس کے لیے اُنھوں نے اس علاقے کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ ظالموں نے بے گناہ نیک نفس اِنسانوں ہی کو ذبح نہیں کیا اُس مقصد اور اُس کے لیے کارفرما اُمنگوں اور اُمّیدوں کو بھی موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ غازی بوجھل دِل سینوں میں لیے پنجتار سے رخصت ہو رہے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی اس بستی کے ساتھ اُن کی حسین ترین یادیں وابستہ تھیں۔ ابتدائی چند ماہ کو چھوڑ کر پنجتار اسلام کی چھاؤنی اور اصلاح و ارشاد کا مرکز بنا رہا تھا۔ یہاں سیّد صاحب اپنے ساتھیوں کی دینی و اخلاقی تربیت کرتے، مختلف اطراف میں فوجی مہمیں روانہ کرتے، اسلامی شریعت کے فرمان جاری فرماتے، مختلف علاقوں سے آنے والے وفود کو خوش آمدید کہتے

اور اسلام اور اہلِ اسلام کی سربلندی کی تدبیریں سوچتے اور ہندوستان کے دُور دراز گوشوں سے تازہ و گرم خُون لانے والے قافلوں کو سینے سے لگاتے تھے۔ اِس بستی کے در و دیوار سیّد صاحب اور غازیوں کی دُعاؤں اور مناجاتوں سے آراستہ تھے۔ اِس کی مٹی میں اپنے رب کے حضور جُھکنے والی پیشانیوں کا نُور تھا۔ اُس کی راتیں قیام وقعود اور رکوع و سجود سے بیدار اور دن سعی و عمل سے زندہ تھے۔ یہاں اِسلامی زندگی کو چلتے پھرتے اور اسلامی معاشرت کو مجسّم صُورت میں دیکھا جا سکتا تھا۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے اس بستی کا خاکہ بڑے حسین پیرائے میں کھینچا ہے:

"یہاں اِسلامی زندگی اور اِسلامی معاشرت کا صحیح نمونہ، عبادت و مجاہدہ، اخوت و مساوات، خدمت و مواسات، ایثار و ہمدردی، سادگی و بے تکلفی اور محنت و جفاکشی کے ایسے رِلے جُلے مناظر دیکھنے میں آتے جو قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کرتے ہیں ------

مجاہدین کا عجیب عالم تھا۔ تکبّر، شان، خودی، ننگ و عار کا نام نہ تھا۔ ایک دوسرے کی خدمت کرتے، ہر کام میں للہ فی للہ شریک ہوتے، دوسروں کا ہاتھ بٹاتے، کسی کو محنت کا کام کرتے دیکھتے تو بے کہے شریک ہو جاتے اور کرنے لگتے، اگرچہ اس کام کی اُس روز اُن کی باری نہ ہوتی، فقط ثواب جان کر کہ یہ کام خُدا کا ہے۔ دُنیا کے سب کام کرتے: چکّی پیستے، کھانا پکاتے، کپڑے دھوتے اور سیتے، لکڑی چیرتے، گھاس چھیلتے، گھوڑا مَلتے، بیماروں کی خدمت کرتے، اُن کا پیشاب، پاخانہ، قے اٹھاتے، آپس میں ایک دوسرے کی حجامت بناتے، پَیر دباتے، زمین پر سوتے، پھٹے پُرانے کپڑے سیتے، فحش گوئی، بدزبانی، حسد، عداوت کوئی نہ جانتا تھا۔ جہادِ کفّار کے ساتھ جہادِ نفس بھی اور مجاہدۂ رُوحانی بھی خانقاہوں سے زیادہ ہو رہا تھا اور ان تمام کاموں میں بڑے بڑے مخدوم اور امیرزادے شریک ہوتے اور اپنی سعادت و عزّت سمجھتے"۔[1]

سیّد بادشاہ اور اُن کے غازی اِس بستی کی ساری برکتیں اور عظمتیں جو

---

[1] سیرت سیّد احمد شہید جلد دوم ص ۱۹، ۲۲

انھی کے دم قدم سے تھیں، اپنے دامن میں سمیٹے لیے جا رہے تھے[1] ــــــ ایک نئی منزل کی طرف جس کا کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں ملے گی۔ پہلا پڑاؤ بر ڈھیری کے گاؤں میں ہُوا۔ یہاں سیّد صاحب نے اپنے رفقاء سے خطاب فرمایا۔ دیر تک ہجرت و جہاد کے فضائل اور مجاہدین و شہداء کے بلند مراتب بیان فرمائے۔ اس وعظ و تلقین سے رنج و غم کا وہ غبار چھٹ گیا جو مجاہدین کے دِل و دماغ پر چھایا ہُوا تھا اور وہ یُوں تر و تازگی محسوس کرنے لگے جیسے مُرجھائی ہُوئی کھیتی لہلہا اُٹھتی ہے ------ بر ڈھیری سے آگے کی منازل بڑی دشوار اور کٹھن تھیں۔ سیّد صاحب سرِ دست کشمیر کی طرف جانا چاہتے تھے مگر راستے میں آباد قبائل راہ دینے کو تیّار نہ تھے۔ اُن کے ہاتھ مجاہدین کے خُون سے آلودہ تھے اور اُنھیں خطرہ تھا کہ سیّد صاحب کہیں انتقام نہ لیں۔ ناچار توپیں وہیں چھوڑیں اور دشوار گزار پہاڑوں میں سے گزرنے والے راستے پر ہو لیے ------

○

روشن راہ کے روشن مسافر

تاریخ کا مسافر دریائے کنہار کے کنارے سرنگوں بیٹھا ہے۔ وہ قافلہ جو نئی منزل کی تلاش میں پنجتار سے نکلا تھا ابھی چند گھنٹے پہلے ایک المناک حادثے سے دوچار ہو چکا ہے۔ اس قافلے کے مردانِ تیز گام تو بے شک اپنی منزل کو پہنچ چکے ہیں، رضائے الٰہی نے اُنھیں اپنے گلے سے لگا لیا ہے، لیکن وہ منزل نگاہوں سے اوجھل ہو گئی

[1] پنجتار جو اسلامی ریاست کا صدر مقام ہونے کی صورت میں تاریخ کے صفحات میں دمشق، بغداد، دِلّی اور سمرقند و بخارا کی طرح ہمیشہ کے لیے زندہ رہتا اب اُس کی حیثیت ایک ایسے پڑاؤ کی سی تھی جہاں چند روز کے لیے قافلۂ حق ٹھہرا تھا اور جس کا رئیس جسے اہلِ ایمان اخلاص و وفا کا پیکر سمجھا کرتے تھے ایک مشتبہ کردار بن کر رہ گیا ــــ اور پھر یہ پڑاؤ بھی زمانے کے ہاتھوں ایسا اُجڑا کہ آج وہ ایک بے مایہ سا گاؤں ہے اور وہ بھی اصل مقام سے ہٹ کر کہیں دُور۔ یہ قافلہ پورے علاقے کے لیے برکتوں کا جو سامان لایا تھا اُس سے محروم ہو جانے کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ اس کے رُخصت ہوتے ہی امن و امان اُٹھ گیا۔ سکھ سمہ کے دیہات اور قصبات پر اپنی پُوری وحشتوں کے ساتھ ٹُوٹ پڑے، اُنھیں لُوٹ لیا، مکانات نذرِ آتش کر دیے اور ان گنت عورتوں کو پکڑ کر لے گئے جنھیں یا تو انھوں نے اپنے گھروں میں ڈال لیا یا لاہور اور دوسرے قحبہ خانوں میں بٹھا دیا۔

ہے، جس کی طرف برِصغیر کی زوال پذیر اُمتِ مُسلمہ کو لے جانے کے لیے یہ اربابِ صدق و وفا اُٹھے تھے۔ اُمت کے آسمان سے چھٹتا ہُوا اندھیرا پھر گہرا ہو گیا ہے، اب وہ نجانے کب تک اس اندھیرے میں بھٹکتی پھرے گی اور اس کو چیر کر کھوئی ہُوئی منزل کا سُراغ لگانے کے لیے کیا خبر اُسے زمانے کی کتنی گردشوں میں پسنا ہوگا۔ افسردہ و غمگین فضا میں اُلّو کی چیخیں پے در پے گونج رہی ہیں جن سے ماحول اور بھی خوفناک ہوگیا ہے، اور تاریخ کا مسافر سوچ رہا ہے جو قوم اپنے شاہینوں کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر دیتی ہے یا اُنھیں ذبح کروانے کے لیے دشمن کے آگے ڈال دیتی ہے، اُلّو کی قسمت اُس کا مقدر بن جاتی ہے!

رات گہری ہوتی جا رہی ہے اور اُلّو کی چیخیں گمبھیر سناٹے ہیں اور کرخت ہو گئی ہیں۔ تاریخ کا مُسافر سوچتے سوچتے ایک اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ سیّد بادشاہ کا قافلہ اُس کی آنکھوں کے سامنے تاریخ کی شاہراہ پر سفر کر رہا ہے۔ ایسے قافلے اُس نے اس شاہراہ پر بہت کم گرمِ سفر دیکھے ہیں اور وہ جب بھی نظر آئے ہیں قافلے والوں کی سیرت و کردار کے نُور سے یہ شاہراہ دُور دُور تک روشن ہو گئی ہے۔ سیّد بادشاہ کا قافلہ افکار و کردار کی مشعلیں جلائے چلا جا رہا ہے اور فضا جگمگا اُٹھی ہے۔ یہ عجیب و غریب قافلہ ہے۔ اِس میں شامل رہروانِ حق کو دیکھ کر تاریخ کا مسافر انگشت بدنداں ہے۔ صحابہ کرامؓ کے بعد اتنے بلند پایہ افراد اتنی بڑی تعداد میں اُس نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا مطلوب و مقصود حصولِ رضائے الٰہی کے سوا کچھ نہیں۔ انھیں دنیا، اُس کی لذّتوں اور نشاط آرائیوں، مادّی منفعتوں اور مال و منال کی دلکش تابانیوں سے ذرا دلچسپی نہیں۔ ان کی بہت بڑی تعداد کھاتے پیتے گھرانوں اور اُن خوشحال طبقات سے تعلق رکھتی ہے جن کے ہاں ہر چیز مادّی میزان میں ناپی تولی جاتی ہے، دُنیا اور اُس کی نعمتوں کا حصول اور اُن سے دل کھول کر تمتّع جن کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے، جن کے بُوڑھے، جوان اور بچّے ایک دوسرے سے بڑھ کر دُنیا حاصل کرنے کی دُھن میں اپنی زندگیاں کھپا دیتے ہیں، مگر سیّد بادشاہ کی دعوت و تربیت نے ان کے دلوں سے دُنیا کی محبت یُوں نکال دی ہے جیسے اس کوچے میں کبھی اُن کا گزر رہی نہ ہُوا

تھا۔ وہ گھر بار، اہل وعیال، عزیز واقربا، مال ومتاع اور دُنیاداری کے سارے ساز وسامان اور علائق کی زنجیریں کاٹ کر راہِ خُدا میں آبلہ پائی کے لیے نکل کھڑے ہُوتے ہیں۔ اس قافلے میں وہ سالخوردہ لوگ بھی ہیں جن کی عمریں عشرت سامانیوں میں ڈُوبی رہیں۔ وہ جوان بھی ہیں جو کبھی نہایت شوقین مزاج، بانکے، خوش پوش اور نازک بدن تھے، ان میں سے بعض فِسق وفجور کی صحبتوں میں غرق رہے تھے، بہت سے اکھڑ مزاج اور تُند خو تھے، لیکن اب اُن کا شمار قافلے کے انتہائی سیدھے سادھے، جفاکش، صالح، نرم مزاج، متّقی اور زاہد لوگوں میں ہوتا ہے۔ قافلے میں نازونعم میں پلے ہُوئے ایسے کم عمر نوجوان بھی ہیں جن کی مَسیں ابھی تک نہیں بھیگیں یا سبزے کا آغاز ہُوا ہی ہے لیکن حق کی راہ میں وہ بہت سے بوڑھوں سے آگے بڑھے ہُوئے ہیں۔

یہ عجب مٹّی اور قالب کے لوگ ہیں۔ رضائے الٰہی ہر لمحے ان کے پیشِ نظر رہتی ہے۔ ہر کام عبادت سمجھ کر کرتے ہیں۔ باہمی محبّت ومودّت کے ایسے رشتوں میں بندھے ہُوئے ہیں کہ خاندانی رشتے اور تعلّقات اُن کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ وہ ہندوستان کے دُور دراز علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ معاشی اور معاشرتی اعتبار سے بھی مختلف اُونچے نیچے طبقات اور گھرانوں کے فرد ہیں، لیکن اخوّت ومساوات کی ایک ایسی لڑی میں منسلک ہیں کہ ایک ہی جسد کے اعضا نظر آتے ہیں، ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار۔ ان میں کوئی بلند وپست نہیں، کھانے پینے، رہنے سہنے اور لباس پوشاک میں سب برابر ہیں۔ جو کام ادنیٰ یا اعلیٰ، کسی کارکن کو سونپا جاتا ہے اُسے راضی خوشی خدا کا کام سمجھ کر سرانجام دیتا ہے۔ شہادت اِن کی منزلِ مراد ہے اور صبح وشام اس منزل کو پا لینے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ مَوت کا خوف اِن کے قریب تک نہیں پھٹکتا۔ یہ ڈرتے ہیں تو بس اللہ سے۔ موت سے اس بے خوفی اور شہادت کے شوق نے اِن کی فطری شجاعت کو دوآتشہ کر دیا ہے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بڑے بڑے لشکروں سے ٹکرا جاتی ہیں اور اُنھیں زیروزبر کر کے رکھ دیتی ہیں۔ ہر فرد عزیمت واخلاص کا پُتلا ہے۔ نہ ناموری سے غرض رکھتا ہے نہ شہرت سے کہ ان کی ہلکی سی خواہش بھی نیکی کو ریاکاری میں بدل ڈالتی ہے۔ مصائب وشدائد کا

خندہ پیشانی سے سامنا کرتے ہیں۔ کئی کئی روز فاقے میں گزر جاتے ہیں، کھانے کو ملتا بھی ہے تو ضرورت سے کم۔ اکثر خشک روٹی پر گزر بسر کرنا پڑتی ہے، مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں آتا۔ ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں، فرشِ خاکی پر سوتے ہیں اور مہینوں چارپائی اور بستر کی شکل دیکھنے میں نہیں آتی۔ اپنے حال میں مست، اللہ کے صابر و شاکر بندوں کی طرح دن رات خدا کے کام میں مصروف رہتے ہیں کہ یہی اِن کی غایتِ زندگی ہے۔ عفیف و پاکباز ہیں عصمتوں کے پاسبان اور آبروؤں کے محافظ۔ جہاں ڈیرہ جماتے ہیں لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب اُن کی جان و مال اور عزّت و آبرو پر کوئی دست درازی نہیں کر سکتا۔

کچھ بھی ہیں، آخر انسان ہیں، فرشتے نہیں۔ اِن میں جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ کوئی، کسی پر اپنی فطری افتاد کے باعث زیادتی کر گزرتا ہے تو اِس زیادتی کا احساس اُسے فوراً بے چین کر دیتا ہے اور وہ متعلقہ ساتھی سے معافی کا خواہاں ہوتا ہے۔ کبھی مقدّمے تک نوبت آجاتی ہے۔ اِسلامی عدالت مظلوم کے حق میں فیصلہ کرتی ہے مگر وہ ظالم سے زیادتی کا بدلہ لینے کے بجائے لِلّٰہ فی اللہ معاف کر دیتا ہے۔ کدورت سے بوجھل فضا صاف اور خوشگوار ہو جاتی ہے۔ رائے بریلی کے سیّد کی تربیت نے بلاشبہ ایسے یگانۂ روزگار صاحبِ کمال لوگ بنائے جن کے کردار سے پھوٹنے والی روشنی سے تاریخ کی شاہراہ ایک عرصے تک جگمگاتی رہے گی ۔۔۔۔۔۔ سیّد صاحب نے خود اِس قافلے کو جن خطوط پر تیّار کرنا چاہا تھا فی الواقع یہ قافلہ اُن خطوط پر ٹھیک ٹھیک تیار ہُوا ہے۔[1]

"کتنے پیارے اور عظیم لوگ اُمّت نے ان کوہساروں اور وادیوں میں کھو دیے ہیں" تاریخ کا مسافر سوچتا ہے "اور جو باقی رہ گئے ہیں، زخموں سے چُور اور شکستہ اُمّید لوگ جانے اُنھیں کب تک ان پہاڑوں میں سرگرداں پھرنا پڑے گا" اور اُلو برابر چیخ رہا ہے۔ شاید وہ پکار پکار کر بے دردوں سے کہہ رہا ہے تمھارے کچھ شاہین ابھی زندہ ہیں، اِن کی خبر لو، یہ جب تک زندہ رہیں گے میرا راج خطرے میں رہے گا۔

---

[1] سیّد صاحب نے ایک مکتوب میں لکھا: ہم لوگوں نے ربُّ العالمین کے احکام کی پیروی اور سیّد المرسلین کی سُنّت کے احیا کی خاطر اہل و عیال کو چھوڑا۔ بھائی بندوں اور وطنوں سے ہجرت اختیار کی۔ ہم نے خدا کے سوا ہر شے کو پس پشت ڈالا اور خدا کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کو اپنا نصب العین بنایا۔ انسان کو بال بچوں، اہل و عیال، مال و منال، وطنوں اور بھائی بندوں سے جو مضبوط رشتے ہوتے ہیں، وہ سب دل کی گہرائیوں سے نکال کر باہر پھینک دیے۔ طرح طرح کے رنج اور تکلیفیں اپنے لیے پسند کیں۔ رکنِ اعظم (جہاد) کے قیام اور سردارِ انبیاءؑ دین کی تائید میں کسی قسم کی سُستی اور کوتاہی گوارا نہ کی۔ دُنیوی فائدوں میں سے کسی فائدے کی اُمّید ہم روا نہیں رکھتے۔ قدیم دوستوں اور مخلص بھائیوں کی پاسداری چھوڑ دی۔ اپنی جان کے نفع و نقصان سے بھی دست بردار ہو گئے اور اس راہ میں خدا کے سوا ہر شے کی پاسداری سے ہم بیزار ہیں (جماعت مجاہدین ص ۶۸-۶۹)

دوسری منزل

صادقِ پور

درویشِ کج کلاہ

پنجتار مجاہدین کا مرکز بن چکا تھا۔ ڈمگلہ اور شنکیاری کے معرکے پیش آ چکے تھے۔ شیدو کی جنگ میں منافقین کی جو فتنہ آرائی اُبھر کر سامنے آئی، وہ بتدریج گمبھیر ہوتی جا رہی تھی۔ سرحدِ آزاد کے عام مُسلمان بڑے مخلص اور جذباتی تھے۔ سید بادشاہ کی آمد پر انھوں نے بڑے اخلاص و محبّت کا اظہار کیا، لیکن وہ قبائلی بندھنوں میں کچھ اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ اپنے سرداروں کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اُٹھانا تو درکنار، ان کی سوچ سے الگ سوچ رکھنے کا تصوّر بھی نہ کر سکتے تھے۔ اور سرداروں کا جو حال تھا اُس کی عکّاسی ان خطوط میں ہوتی ہے جو شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اگرورا اور امب کا دورہ کرتے ہوئے سید بادشاہ کی خدمت میں تحریر کیے۔ ایک خط میں لکھا: "خوانین زبانی تو ایک دُوسرے سے بڑھ چڑھ کر تواضع کی بات کرتے ہیں یہاں تک کہ انھوں نے اس فقیر کے ہاتھ پر جناب کی بیعتِ امامت بھی کی، لیکن اُن کی باتوں سے ٹپکتا ہے کہ ان کے دِلوں میں ایمانی غیرت، اسلامی حمیّت اور ملّی اخلاص کا ایک ذرہ اور اطاعتِ الٰہی کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ ان کا مطمحِ نظر اور منتہائے فکر محض دنیاوی مال و متاع کا حصول اور ہم چشموں پر تفوّق اور امتیاز ہے۔" شاہ صاحب نے تو یہ بات اگرورا اور امب کے خوانین کے بارے میں کہی تھی، لیکن چند روشن مستثنیات کے سوا الفاظ کا یہ جامہ تمام خوانین کے قامت پر راست آتا تھا۔ ایسے حالات میں مقامی آبادی پر کلیتہً انحصار ممکن نہ تھا۔ درپیش جدّوجہدِ طویل اور جانکاہ نظر آتی تھی اور سارا دار و مدار ایک ایسے بیس (BASE) پر تھا جہاں سے کسی رکاوٹ کے بغیر دعوت و عزیمت

کے جذبے سے سرشار مخلص و سرفروش رضا کار اور مالی وسائل فراہم ہوتے رہیں۔

ظاہر ہے اس دَور کے سیاسی تناظر میں ایسا بیس ہندوستان ہی میں ہو سکتا تھا یہاں تحریک کی جڑیں جس قدر مضبوط اور پھیلی ہُوئی ہوتیں اتنی ہی زندگی اور قوّت اس جدّوجہد کو مل سکتی تھی۔ سید بادشاہ نے ہجرت سے پہلے صرف شمالی اور مشرقی صوبوں میں کام کیا تھا اور وہ بھی ہنگامی بنیادوں پر دو تین وسیع دَوروں کی صُورت میں۔ ان دَوروں کی نوعیت بالکل اس بادِ بہاری کی سی تھی جو چند روز کے لیے چلتی ہے اور مٹّی میں خوابیدہ غُنچوں اور مُرجھائے ہُوئے پَودوں اور درختوں کو جگاتی اور ان کے اندر نئی زندگی کی رُوح پھُونکتی ہُوئی نکل جاتی ہے۔ جہاں جہاں سعادت کا خزینہ پنہاں ہوتا ہے گل و گلزار کھِل اُٹھتے ہیں۔ طویل جدّوجُہد کے لیے جم کر جو کام ہونا چاہیے تھا وہ ایسے رَواں دَواں دَوروں میں نہ ہو سکتا تھا، بس جہاں کہیں دعوت کے بیج پڑ گئے تھے کھیتی لہلہا اُٹھی تھی اور انہی مقامات سے اہلِ حق قافلہ در قافلہ چلے آتے تھے اور مسلّح انقلابی جدّوجُہد کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ لیکن یہ برِّصغیر کے وسیع سمندر میں محدود وسائل رکھنے والے محدود جزیرے تھے۔ شمال سے جنوب تک وسیع و عریض علاقے ابھی تک اس زندگی بخش دعوت سے محرومِ خوابِ غفلت میں ڈُوبے ہُوئے تھے۔ ضرورت تھی کہ انھیں بھی جگایا جاتا اور دعوت و جہاد کی آگ ان کے سرد سینوں میں بھی روشن کی جاتی۔ اس ضرورت کا احساس سید بادشاہ کو پہلے دِن سے تھا اور حالات کے الاؤ نے اس آنچ کو اور تیز کر دیا تھا، چنانچہ سوات اور بونیر کے دَورے سے واپس آتے ہی اُنھوں نے برِّصغیر کے مختلف علاقوں میں مبلّغ اور داعی روانہ فرمانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس مقصد کے لیے سید بادشاہ کی نگاہِ مردم شناس اپنے جن ساتھیوں پر پڑی اُن میں ۳۸ برس کے ایک نوجوان مولانا ولایت علی بھی تھے۔ طلب فرمانے پر سید بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہُوئے۔ مائل بہ درازی متوسط قد، سانولا رنگ، گھنی اور پیوستہ بھنویں، قدرے فربہ جسم، ڈاڑھی چھوٹی نہ بڑی، رُخسار — پُرگم اور ٹھوڑی پر زیادہ چہرے بُشرے سے سخت جانی اور سخت کوشی عیاں۔ سید بادشاہ نے مُدعا بیان فرمایا۔

مولانا ولایت علی پہلے سُن چکے تھے کہ مبلّغین ہندوستان بھیجے جا رہے ہیں۔ ایک اور نوجوان ساتھی سید محمد علی رامپوری کو جنوبی ہند جانے کا حکم صادر ہو چکا تھا، لیکن ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ دوسرا دیوانہ جس کے نام قرعۂ فال پڑے گا وہ خود ہوں گے۔ وہ تو گھر بار چھوڑ کر اپنے عظیم مُرشد کے پرچم تلے راہِ حق میں جہاد کرنے آئے تھے..... جب سے انھوں نے سید کا دامن تھاما تھا شہادت زندگی کی سب سے بڑی آرزو بن گئی تھی، لیکن اب انھیں دکن جانے کا حکم ہو رہا تھا۔ عرض کی: "حضرت، حضورِ حق تعالیٰ میں زندگی کا نذرانہ لے کر حاضر ہوا تھا اور آپ مجھے واپس بھیج رہے ہیں۔" فرمایا: "مولانا ہم آپ کو تخم کر کے اُٹھاتے ہیں۔" اپنا ملبوسِ خاص، کلاہ، کُرتا اور پاجامہ پہنا کر سینے اور پُشت پر ہاتھ پھیرا اور دُعا کی اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ پھر بڑے شفقت بھرے لہجے میں وصیت فرمائی: "کلمۂ حق بیان کرنے میں کسی کا خوف اور لحاظ نہ کیجیے۔ خلقِ خُدا کو حق کی طرف بُلاتے رہیے کہ خیر و برکت اسی فرض کی ادائگی میں ہے۔"

وصیت مختصر تھی مگر اس میں تحریکِ دعوت و اِصلاح کے مبلّغ کے لیے وہ مکمل منہاجِ عمل آگیا تھا جو اُسے اختیار کرنا چاہیے۔ خوف اور لحاظ دو بنیادی اخلاقی خرابیاں ہیں جو اگر کسی تحریک کے کارکنوں خصوصاً اُس کے مبلّغین اور رہنماؤں میں پیدا ہو جائیں تو نہ صرف تحریک کے پھلنے پھُولنے کی راہیں مسدُود ہو جاتی ہیں بلکہ خود تحریک کے چھوٹے بڑے افراد زندگی کی رُوح سے محروم ہو جاتے ہیں۔ خوف سے جُبن اور بُزدلی جنم لیتی ہے اور لحاظ سے مداہنت اور حق گوئی کی قوّت وصلاحیّت سے تہی دامنی۔ پھر راہِ حق و صدق میں جو مشکلات آئیں اور جن مصائب کا سامنا ہو انھیں صبر کے ساتھ برداشت کرنا اور راہِ فرار اور پسپائی اختیار کرنے کے بجائے اپنے مَوقِف پر مضبُوطی کے ساتھ جم کر جدّ و جہد کرتے رہنا بھی وہ بُنیادی اَوصاف ہیں کہ ان کے بغیر اس راہ پر قدم بھر بھی نہیں چلا جا سکتا۔ اور آخری ارشاد میں تو انھوں نے ایک ایسی قوّت کی نشاندہی کر دی تھی کہ جس کو مُسلمان اپنا لیں تو اسلامی زندگی کی برکتوں اور بھلائیوں سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں اور چھوڑ دیں تو دنیا اور آخرت دونوں میں ذلّت و رُسوائی مقدّر بن جاتی ہے۔ حق کی طرف

نہ بلانے اور منکر کو نہ روکنے کے جو نتائج و اثرات مسلمان معاشرے پر مترتب ہوتے ہیں اُس کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے خدا کو گواہ بناتے ہوئے ان الفاظ میں فرمایا تھا "قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم لوگ نیکیوں کا حکم دیتے رہو اور بُرائیوں سے روکتے رہو ورنہ اللہ تعالیٰ تم پر عذاب نازل فرما دے گا۔ پھر اُس وقت خدا سے دُعا کرو گے اور تمھاری دُعا قبول نہ کی جائے گی"۔ سید بادشاہ کی تحریک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تحریک تھی اور اسی کی تلقین وہ اپنے فرستادے کو کر رہے تھے۔

سیّد بادشاہ کی طرف سے خرقہ خلافت کی عطا مولانا ولایت علی کیلیے باعثِ صد اعزاز و سعادت تھی مگر جہاد سے محرومی اور حضرت سے جُدائی کا غم اتنا شدید تھا کہ ازرہِ امتثالِ امر ہندوستان روانہ ہوئے تو اس عالم میں کہ دل کی دنیا میں اضطراب برپا تھا اور آنکھیں اس مضطرب دنیا سے اُمڈتے ہوئے آنسوؤں سے نمناک۔

○

یہ نوجوان جنھیں سید بادشاہ نے تخم کے طور پر اٹھانے کے لیے میدانِ جنگ سے ہندوستان واپس بھیج دیا تھا تحریک کے ان گرم جوش و سرفروش افراد میں سے تھے جن کی زندگیاں حق کی دعوت نے یکسر بدل کر رکھ دی تھیں۔ وہ صادق پور، عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے والے تھے اور ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ جو کئی پُشتوں سے اسلامی سلطنت میں اعلیٰ مناصب پر فائز چلا آتا تھا۔ ان کے دادا اروال (ضلع گیا) کے قاضی (جج) تھے۔ اس خدمت کے صِلے میں انھیں بہت بڑی جاگیر بادشاہِ وقت سے عطا ہوئی تھی۔ والد مولوی فتح علی کا شمار عظیم آباد کے رؤسا اور عمائد میں ہوتا تھا۔ نانا رفیع الدین حسین خان صوبہ بہار کے آخری ناظم (گورنر) تھے۔ مولانا ولایت علی چاندی کا چمچ مُنہ میں لیے پیدا ہوئے اور ناز و نعم اور جاہ و ثروت کے گہوارے میں جھول کر پروان چڑھے۔ نانا کے بڑے چہیتے تھے۔ نعمتوں کی فراوانی اور لاڈ پیار نے اُن کے اندر وہ ساری خُو بُو پیدا کر دی تھی جو طبقۂ رؤسا کے بچّوں کی خصوصیت ہُوا کرتی ہے۔ بے حد ذہین و ذکی، منچلے، خوش پوشاک اور شوقین مزاج تھے۔ تعلیم کے ابتدائی مدارج سے فارغ

ہو کر تکمیل کے لیے لکھنؤ پہنچے تو وہاں کی مترفانہ اور عشرت پرور فضا میں اُن کا یہ رنگ اور شوخ ہو گیا۔ بدن پر اعلیٰ قسم کی زربفت و زردوز پوشاک، آنکھوں میں سُرمہ، دانتوں میں مسّی ہاتھوں پر رنگِ حنا، گیسو آہن تاب پُشت پر پڑے ہوئے، انگلیوں میں طلائی انگوٹھیاں اور چھلّے، پاؤں میں زردوز جُوتی، جسم اور لباس ہر وقت خوشبویات میں بسا ہُوا، غرض اپنے دَور کے پُورے پُورے فیشن ایبل نوجوان تھے۔

سیّد بادشاہ کے لکھنؤ آنے کا جب غلغلہ بلند ہُوا تو مولانا ولایت علی ۲۴ برس کے تھے اور معقولات کے ماہر مولانا محمّد اشرف فرنگی محل کے حلقۂ درس میں شامل تھے۔ سیّد صاحب کا چرچا پہلے ہی پھیل چُکا تھا۔ وہ ایک ایسے انقلاب کے داعی تھے جس نے زندگیوں کو تہ و بالا کر دیا تھا اور اُس جمُود کو توڑ ڈالا تھا جو عُلماء کی بے عملی، مداہنت اور مصلحت کوشی، سیاسی زوال اور اخلاقی و فکری انحطاط کی بدولت اُمّت پر طاری تھا۔ لوگوں نے سُن رکھا تھا کہ سیّد صاحب جہاں جاتے ہیں زندگیاں بدل جاتی ہیں، دینی حمیّت و غیرت کا جوہر چمک اُٹھتا ہے، عبادتِ الٰہی کا ذوق و شوق اور خشیّتِ الٰہی کا درد و سوز پیدا ہو جاتا ہے، شراب کی دکانیں بند ہو جاتی ہیں اور مسجدیں آباد۔ فسق و فجور میں غرق انسان زاہد و متّقی بن جاتے ہیں، شرک و بدعت کے اعمال چھُوٹ جاتے ہیں اور دِل و دماغ توحید و سُنّت کے نُور سے منوّر ہو جاتے ہیں۔ ان باتوں کا لوگوں پر مختلف ردِ عمل ہوتا۔ بے شمار پیچ و تاب کھاتے کہ اب تک وہ جن باتوں کو مسلمان ہونے کا تقاضا سمجھتے آتے تھے یہ سیّد انھیں شرک و بدعت اور غیر اسلامی رسوم و عقائد قرار دے رہا ہے۔ بہت سے اس لیے چیں بجبیں تھے کہ عامّۃ المسلمین کو جہالت کے اندھیروں میں گم کر کے انھوں نے اپنے کھانے پینے اور مسندِ مشیخت بچھانے کا جو سر و سامان کر رکھا تھا۔ وہ خطرے میں پڑ گیا تھا۔ لوگوں میں دینی شعور پیدا ہونے کا مطلب یہ تھا کہ دین کے نام پر جو کاروبار وہ کر رہے تھے اب مندا پڑ جائے گا۔ پھر وہ لوگ بھی تھے جو اس انقلاب کو اچھّی نظر سے دیکھتے اور اُس کے آئینے میں روشن مستقبل کو جھلکتا پاتے۔ بہت سے اہلِ علم و فضل وہ تھے جنھیں صِرف ایک بات پر سخت حیرت تھی کہ سیّد صاحب کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن

ولی اللّٰہی خانوادے کے دو عظیم فرزند اُن کے حلقہ بگوش ہو چکے تھے اور ایسے حلقہ بگوش کہ اپنے پیرو مُرشد کی رکاب تھام کر چلتے اور راتیں اُن کے داتیں باتیں بیٹھے جاگ کر کاٹ دیتے تھے۔

اور جب سیّد بادشاہ لکھنؤ میں وارد ہوئے تو ایک دُنیا اُن کی مجالس اور وعظوں میں اُمڈ آئی۔ مخالف بھی اور موافق بھی۔ اور پھر لوگوں نے عظیم سیّد کو اُن باتوں سے کہیں بڑھ کر پایا جو انھوں نے سُنی تھیں۔ عُلماء اور اصحابِ فضل کا تانتا بندھا رہتا جو بھی خدمت میں حاضر ہوتا نقدِ دل ہار دیتا۔ ایک روز مولانا محمّد اشرف نے اپنے عزیز شاگرد ولایت علی کو پیغام دے کر بھیجا اور تخلیے میں ملنے کی درخواست کی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ رائے بریلی کے اِس سیّد میں ایسی کیا بات ہے کہ ولی اللّٰہی خاندان تک ان کی عقیدت وارادت کا دم بھرتا ہے حالانکہ یہ خاندان خود علم و کمالات کی اُن بلندیوں پر فائز ہے کہ بڑے بڑے اہلِ علم اور مشائخ اس کے آستانے پر حاضری دینے کو سعادت سمجھتے ہیں۔ سیّد بادشاہ نے کہلوا بھیجا: "بڑی خوشی سے تشریف لائیے، فقیر دِل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتا ہے۔" اگلے روز وقتِ معیّن پر اُستاد اور شاگرد دونوں حاضر ہوئے۔ مولانا اشرف نے مزاج پُرسی کے بعد وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کی تشریح چاہی۔ سیّد صاحب نے کوئی دو گھنٹے ایسے مؤثر انداز میں وضاحت فرمائی اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا مقصد بیان فرمایا کہ دونوں حضرات پر پہلی بار آشکارا ہوا کہ وہ اب تک منطق و فلسفہ کی بھول بھلیّوں میں سرگرداں رہے ہیں، یہ تو دنیا ہی اور ہے۔ روتے روتے ہچکی بندھ گئی اور جب وہ اس بابرکت مجلس سے رخصت ہوئے تو سیّد بادشاہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے چکے تھے۔

مولانا ولایت علی کی دنیائے فکر و نظر تو اُسی روز تبدیل ہو گئی، لیکن عمل کی دنیا میں انقلاب اُس وقت آیا جب سیّد بادشاہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حج کر کے واپس آئے۔ مولانا ولایت علی اپنے دو بھائیوں ــ مولانا عنایت علی اور طالب علی۔ اور خاندان کے کئی افراد کو لے کر اپنے پیرو مُرشد کا استقبال کرنے پاپیادہ، مونگیر پہنچے۔

قافلہ پٹنے پہنچا تو خاندان کے بڑوں نے باری باری سید صاحب کی ضیافت کی اور خاندان کے ہر چھوٹے بڑے فرد نے بیعت کی اور پھر عورتوں اور بچوں سمیت پورا گھرانا دعوتِ حق کے رنگ میں ایسا رنگا کہ برِ صغیر کا کوئی اور گھرانا اس باب میں اس کا ہم سر نہ تھا۔ سکھوں کے ساتھ پہلی جنگ میں جو پہلا شخص راہِ خدا میں شہید ہوا وہ اسی خاندان کا ایک نوجوان مولانا ولایت علی کا چچیرا بھائی --- باقر علی تھا اور پھر تو کم و بیش ایک صدی یہ خاندان تحریکِ دعوت و جہاد میں اپنی قربانیوں سے رنگ بھرتا اور راہِ حق و صدق میں عشق و اخلاص کی ایسی تابناک مثالیں قائم کرتا رہا جن سے دعوت و عزیمت کی تاریخ کے اوراق ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔

پٹنہ میں قافلۂ حق نے کئی روز قیام کیا۔ سید بادشاہ رائے بریلی روانہ ہوئے تو مولانا ولایت علی بھی ساتھ ہو لیے۔ اس وقت تک ان میں عہدِ جاہلیت کے شب و روز کا میل کچیل باقی تھا۔ ابھی تک ڈاڑھی منڈواتے تھے، لباس بھی وہی امیرانہ تھا اور شوقین مزاجی بھی کچھ کم نہ ہوئی تھی۔ سید بادشاہ کے خواہرزادہ سید عبدالرحمٰن نے اُن کی غیر متشرع وضع قطع کی شکایت کرتے ہوئے کہا "حضرت یہ شاہزادے تو بار ثابت ہوں گے۔" فرمایا "نہیں، یہ راہِ صدق و صفا میں سب قدیم لوگوں سے بازی لے جائیں گے اور یہ ظاہری شکل و صورت بدل جائے گی۔"

سید صاحب نے سچ فرمایا تھا۔ راہِ حق و صداقت کچھ ہے بھی ایسی کہ اس پر بہت سے چلنے والے جو آگے ہوتے ہیں وہ پیچھے رہ جاتے ہیں اور بہت سے وہ جو پیچھے ہوتے ہیں آگے بڑھ جاتے ہیں۔ یہ راہ کانٹوں اور صعوبتوں سے بھری ہوئی راہ ہے اور راہرو دل سے قربانی، سرفروشی، ایثار اور استقامت کا مطالبہ کرتی ہے۔ جو راہرو اس متاعِ گراں مایہ کو جتنے اخلاص اور ذوق و شوق کے ساتھ پیش کرتا ہے وہ اتنے ہی بلند مدارج پر فائز ہوتا چلا جاتا ہے۔

مولانا ولایت علی گھر بار چھوڑ کر نکلے تو چند روز کے اندر اندر زندگی کا پرانا خول ٹوٹ پھوٹ گیا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں ــــ

"مُصعبؓ بن عُمیرؓ کی طرح حالت یکسر بدل گئی۔ اب آپ عظیم آباد اور لکھنؤ کے بانکے نہ تھے سید صاحب کی جماعت کے ایک جفاکش مزدور اور معمولی خادم تھے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اور سر پر لاد کر لاتے، اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے، مٹّی گارے کا کام کرتے۔" زہد و ریاض اور مشقت کی زندگی نے یہ حالت کر دی کہ پہچانے نہ جاتے۔ ایک مرتبہ والدِ گرامی نے بچپن کے خدمتگار کو چار سو روپے نقد اور بیش بہا ملبُوسات اور دوسرا سامان دے کر رائے بریلی بھیجا۔ سید صاحب کے قافلے میں پہنچ کر اُس نے آپ کو دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا دریا کے کنارے مٹّی گارے کا کام کر رہے ہیں۔ وہ کنارِ دریا پہنچا۔ وہاں بہت سے لوگ مسجد اور قافلے کے مکان تعمیر کرنے میں مصروف تھے۔ مَولانا بھی موٹا سا سیاہ تہمد پہنے، گارے میں لتھڑے مصروفِ کار تھے۔ صُورت شکل ایسی بدل چکی تھی کہ وہ پہچان نہ سکا۔ انہی سے پُوچھا: "مولوی ولایت علی پٹنہ والے کہاں ہیں؟" آپ نے جواب دیا: "بھائی ولایت علی تو میرا نام ہے۔" خدمتگار سمجھا یہ شخص تمسخر کر رہا ہے، بڑے غُصّے میں کہا: "مَیں تم کو نہیں پُوچھتا، ولایت علی صادقپوری کو پُوچھتا ہُوں جو مولوی فتح علی کے صاحبزادے اور رفیع الدین حسین خان کے لاڈلے نواسے ہیں۔" آپ نے فرمایا: "بھائی صادقپوری ولایت علی تو مَیں ہی ہُوں۔" اُس نے کہا: "مجھ سے مذاق کرتے ہو؟" فرمایا: "پھر جاؤ قافلے میں تلاش کر لو۔" وہ قافلے میں واپس آیا تو لوگوں نے یقین دلایا کہ ولایت علی عظیم آبادی وہی ہیں جن سے تم دریا کے کنارے مل کر آئے ہو، چنانچہ وہ نادم و پشیماں آپ کے پاس آیا اور اپنی جسارت پر معافی چاہی۔ آپ نے اُسے گلے لگا لیا۔ وہ اس انقلاب

ل مُصعبؓ بن عُمیرؓ مکّہ کے نہایت حسین و خوشرو امیرزادے تھے۔ بڑے ہی خوش ذوق، عُمدہ سے عُمدہ پوشاک پہنتے اور ہر وقت اعلیٰ خوشبُوئیں بسے رہتے۔ سواری پر نکلتے تو آگے پیچھے غلام ہوتے۔ اسلام کی آغوش میں آنے کے بعد حالت بالکل بدل گئی۔ مدینہ منوّرہ میں تبلیغ و ارشاد اور تعلیم و تربیت کے لیے انصار کی طلب پر نبیِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انھیں روانہ فرمایا تو صرف ایک چادر جسم پر تھی۔ جنگِ اُحد میں اسلام کا پرچم اُٹھائے شہادت پائی تو اسی چادر میں دفن ہُوئے اور کیفیت یہ تھی کہ چہرہ ڈھانکتے تو ان کے پیر برہنہ ہو جاتے اور چادر پیر پر ڈالتے تو سر کُھل جاتا۔ بالآخر چہرہ چھپایا گیا اور پیروں پر اذخر گھاس ڈال دی گئی۔ اس عالم میں دیکھ کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی آنکھیں بھر آئیں، فرمایا: مَیں نے اس جوان کو مکّہ میں دیکھا تھا۔ اس سے زیادہ حسین، خوش پوشاک اور پروردۂ نعمت کوئی اور نہ تھا۔

احوال پر دیر تک زار زار روتا رہا۔ پھر سامان اور روپیہ آپ کی خدمت میں پیش کیا مولانا ولایت علی نے سب چیزیں لیں، انھیں کھول کر بھی نہ دیکھا۔ اسی طرح بندھی بندھائی لے جا کر سیّد صاحب کے قدموں میں رکھ دیں اور چُپ چاپ چلے آئے۔

سیّد بادشاہ نے قافلے کو چار جماعتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ مولانا ولایت علی، شاہ اسمٰعیلؒ کی جماعت میں تھے اور شاہ صاحب کے نائب مولانا، شاہ صاحب سے حدیث بھی پڑھا کرتے اور جب اپنے کام سے فراغت ملتی تو سیّد صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاتے یا تن تنہا اوراد و اذکار اور نماز و دُعا میں مصروف رہتے۔ یُوں سیّد صاحب کے فیضِ قلب و نظر سے بہرہ یاب ہونے کے ساتھ ساتھ شاہ صاحب کا رنگِ جلال و جمال بھی ان کی زندگی پر چڑھ گیا۔ وہی توحیدِ خالص کا عشق و گداز، وہی اتباعِ سُنّت کا جذب و جنوں، وہی زُہد و اتقا، وہی لِلّٰہیت اور صدق و اخلاص، وہی دینِ حق کو سر بلند کرنے کی تڑپ اور اضطراب، وہی راہِ حق میں چلنے کا ذوق و شوق، وہی خلقِ خدا کو راہِ راست پر لانے کی لگن جو شاہ صاحب میں پائی جاتی تھی ان کی زندگی کا عنوان بن گئی۔ سیّد صاحب کی نظر موزوں ترین آدمی پر پڑی تھی۔

○

مُجاہِد کی اَذاں

سلطنتِ آصفیہ کا دار الحکومت حیدر آباد خوابِ غفلت میں گُم تھا کہ اُس کے گلی کوچوں میں اِس مردِ خدا کی انقلاب آفریں آواز بُلند ہُوئی۔ چنگ و رباب کے نغموں اور عیش و طرب کی سرمستیوں میں غرق فضا میں یہ آواز بالکل اجنبی تھی۔ سیّد صاحب کی تحریکِ احیائے دین و دعوتِ جہاد جس نے شمالی ہند میں قلب و ذہن کی دنیا میں تلاطم برپا کر دیا تھا اُس کی لہریں یہاں تک پہنچ ہی نہ پائی تھیں۔ بس خبر کی حد تک عُلماء اور پیروں کے محدود سے حلقوں میں اس کا ذکر ہُوا۔ دِلوں نے اگر کچھ تأثر لیا بھی تو معاندانہ رنگ میں۔ حیدر آباد طالع آزمائی کی تخلیق تھا اور اُس کا خمیر اپنوں سے غداری اور اغیار سے وفاداری کے آب و گِل سے اُٹھا تھا۔ مُسلم ہندوستان میں سیاسی انتشار و زوال

کو تیز تر کرنے اور انگریزوں کو برِصغیر خصوصاً جنوبی ہندوستان پر مسلط کرنے میں اُس نے اہم کردار ادا کیا تھا اور یوُں برطانوی ہند کے تشکیل پانے والے نئے نقشے میں اپنے زندہ رہنے کا سامان کر لیا تھا اور اب وہ گردوپیش سے بے نیاز مصنوعی جاہ و دولت کے نشے میں بہکی بہکی زندگی بسر کر رہا تھا۔ راجا اور پرجا، عوام اور خواص سب پر خمار طاری تھا۔ مُسلم عوام پر جہالت، افلاس اور ریاست کے حکمرانوں سے دینی رشتہ رکھنے کی بنا پر دوسری رعایا سے برتر ہونے کا خمار تھا اور خواص پر عیش و عشرت، مال و متاع اور جاہ و منصب کا۔ ان میں وہ تمام مفاسد بُری طرح پھیل رہے تھے جنھیں اخلاقی زوال اپنے ساتھ لاتا ہے اور پھر ان مفاسد کو جاہ و جلال کے مصنُوعی ماحول نے اور زیادہ گہرا کر دیا تھا۔ سیاسی زوال سے معاشرہ جس اقتصادی اور سماجی اُکھاڑ پچھاڑ اور ابتری کا شکار ہوتا ہے برِصغیر کا مُسلمان معاشرہ اسی اُکھاڑ پچھاڑ اور افراتفری کا شکار تھا۔ اس کے اعلیٰ اور اُونچے متوسّط طبقے کے لوگ ان عافیت کدوں کا رُخ کر رہے تھے جو چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی صُورت میں انگریزوں کے سایے تلے بظاہر محفوظ و مامون تھے حیدر آباد اُن میں سب سے بڑا عافیت کدہ تھا اور اپنے دامن میں آنے والوں کے لیے روشن مستقبل رکھتا تھا۔ یوُں وہ مترفانہ زندگی کے متوالوں کی سب سے بڑی پناہ گاہ بن گیا تھا نتیجہ یہ کہ اُوپر سے نیچے تک تعیّش اور رفاہیت کا خونِ فاسد معاشرے کی رگوں میں سرایت کر چکا تھا۔

نواب سکندر جاہ ناصر الدولہ ریاست کا والی تھا۔ انگریزوں نے اگرچہ اعزازات سے لاد رکھا تھا اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ نے ذہنوں میں یہ تصوّر بٹھا دیا تھا کہ وہ ایک باوقار سلطنت کا ذی جاہ والی ہے، لیکن عملاً اُن کا صیدِ زبوں تھا۔ انگریزوں کی نگاہ ریاست کے ایک ایک لمحۂ زندگی پر تھی۔ ریاست کے اندر اُٹھنے والی خیال و عمل کی ہر لہر پر اُن کا ہاتھ تھا۔ دربار میں اُن کے آدمی تھے جو عمائدینِ سلطنت پر کڑی نظر رکھتے اور ہر زندہ اور توانا رُوح کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا جال بُنتے رہتے۔ خود نواب کے چاروں طرف گھیرا ڈال رکھا تھا۔ اُسے حالات کا وہ آئینہ دکھاتے جو انگریزی مفاد کے حق میں ہوتا۔ ایسے عالم میں مولانا ولایت علی کی آواز ایک زلزلے سے کم نہ تھی۔ لوگ جھنجھوڑ دیے گئے

تھے۔ گھر گھر میں اُن کے افکار کا چرچا تھا، موافقت میں کم مخالفت میں زیادہ۔ انگریزوں اور نواب کی دُہری غلامی میں گرفتار لوگ ذہنی طور پر بھی ناتواں تھے۔ وہ دُہرے آقاؤں کی ڈالی ہُوئی زنجیروں ہی کے نہیں، اوہام اور خوش خیالیوں کے بھی اسیر تھے اور یہ سب وہ رکاوٹیں ہیں جو حق کی آواز کو قبول کرنے کی راہ میں ہمیشہ حائل ہوتی رہی ہیں۔ یہاں بھی یہی کیفیت تھی، تاہم سعادت مند رُوحیں ہر بگڑے ہُوئے معاشرے میں موجود ہوتی ہیں۔ یہ رُوحیں اس آواز کی طرف کھِنچ رہی تھیں۔ اَللہ نے اپنے بندے کی زبان میں تاثیر ہی کچھ ایسی دی تھی کہ ذہنوں میں ہلچل مچ جاتی، آنکھوں پر پڑے ہُوئے پردے چاک ہو جاتے، دِلوں کے زنگ دُھل جاتے، افکار و عقائد اور کردار و اعمال پر صدیوں سے جمی ہُوئی بدعتوں اور غیر اسلامی رسوم و عقائد کی گرد چھٹ جاتی اور کتاب و سُنّت کا نُور زندگی میں اُجالا کر دیتا۔ عوام کے اندر جنم لینے والے اس انقلاب کی لہریں عمائدین اور اعیانِ سلطنت کے محلّات تک پہنچیں تو وہ جیسے ہڑبڑا گئے۔ ماتھوں پر شکنیں اُبھر آئیں۔ زبانیں کہہ رہی تھیں:
"یہ کون شخص ہے جس نے شیریں نغموں کی ترنّم ریزیوں میں نوائے تلخ چھیڑ دی ہے؟"

نواب ناصر الدّولہ کے چھوٹے بھائی نواب مبارز الدّولہ امیر گوہر علی خان کے دربار میں بھی اس نوائے درویش کا تذکرہ ہُوا۔ نواب صاحب نے چند عالموں کو بھیجا کہ دیکھیں یہ صاحب کون ہیں اور کیسے ہیں؟ وہ مولانا ولایت علی کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان سے گفتگو کی اور جب رپورٹ دینے نواب صاحب کی سرکار میں پہنچے تو اُن کے قلب و نظر کی دُنیا میں انقلاب آ چکا تھا۔ نواب اس شدّتِ تاثیر پر حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ اُن کی سرکار میں بڑے بڑے اربابِ علم و فضل تھے، پھر خود انھیں بہت سے اصحابِ زہد و تقویٰ اور مردانِ دل آگاہ کی صحبت میں تھوڑا بہت بیٹھنے کا اتفاق ہُوا تھا، لیکن ایسی انقلابی تاثیر انھوں نے کسی شخص میں نہ پائی تھی کہ ایک ہی صحبت زندگی کے شب و روز بدل دے۔ پھر یہ انقلاب بڑا عجیب تھا۔ اُنھوں نے دیکھا تھا کہ لوگ کسی مردِ خدا مست سے متاثر ہوتے تو اپنے اندر کی دُنیا میں اور ڈوب کر رہ جاتے، لیکن یہاں معاملہ اُلٹ تھا۔ عظیم آباد کے اس مردِ درویش کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والے افراد کو اپنے دَرُوں کی فکر

کے ساتھ گرد و پیش پھیلی ہوئی، رُشد و ہدایت کی محتاج دنیا کی فکر بھی لاحق ہو جاتی۔ جمود کے شکار لوگ متحرک، گرم جوش اور حیاتِ تازہ کے پیغام بر بن جاتے۔ باپ دادا سے وہ جن رسوم و قیود میں جکڑے چلے آتے تھے اور جن کی گرانباری کا انھیں کبھی احساس نہ ہو پاتا پہلے ہی مرحلے میں وہ ساری زنجیریں بُری طرح کھلنے لگتیں اور وہ انھیں کاٹ کر سبکسار ہو جاتے۔

اسی حیرت کے عالم میں نواب صاحب نے اگلے روز اپنے دو معتمد مولوی زین العابدین اور سید محمد عباس آپ کی خدمت میں بھیجے۔ یہ دونوں اصحاب ذہانت اور علم و فضل کے اعتبار سے بھی ممتاز تھے اور زہد و ورع اور سلوک و طریقت کے کوچے سے بھی آشنا مگر یہاں کا تو عالم ہی اور تھا۔ بیعت کا قلادہ گلے میں ڈالے واپس ہوئے۔ نواب صاحب سے مولانا ولایت علی کی کیفیت اور وعظ و ارشاد کی تاثیر بیان کی تو اُن کے دل میں بھی آتش شوق بھڑک اُٹھی۔ مولانا کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ وہ تشریف لائے تو آگے بڑھ کر اُن کی پذیرائی کی۔ مولانا دیر تک اپنے مخصوص انداز میں وعظ و تلقین فرماتے رہے۔ ایک عجب سوز تھا اُن کی باتوں میں! نواب صاحب نے اپنے دِل کی گہرائیوں میں آگ سی سُلگتی محسوس کی اور پھر جیسے اس آگ میں ماضی کے تاریک اور رِندمشرب دنوں سے تعلق رکھنے والی ہر شے جل کر بھسم ہو گئی ——— اور اب ایک نیا نواب نئے قلب و رُوح کے ساتھ جنم لے چکا تھا۔ وہ نواب، کتاب و سُنّت کی اتّباع جس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ شرک و بدعت کے تمام مراسم اور نواہی ترک کر دیے۔ وقت کے حکمرانوں اور امراء عمائد میں چار سے زیادہ عورتیں رکھنے کا عام رواج تھا۔ ان کے حرم میں بھی بہت سی عورتیں داخل تھیں۔ انھوں نے صرف چار عورتیں رکھیں اور باقی سب کو اجازت دے دی کہ وہ جس سے چاہیں نکاح کر لیں۔ ہر ایک کو اس کی حیثیت کے مطابق روپیہ اور ضرورت کی اشیا دے کر رخصت کیا۔ دربار میں آداب و تسلیمات کے بجائے سلام مسنون جاری ہو گیا۔ گھر، جاگیر اور دربار ہر جگہ شریعت کے احکام پر عمل ہونے لگا۔ نواب صاحب کی زندگی کے اس انقلاب پر بڑا شور مچا۔ نظام، نواب ناصر الدولہ تک بات پہنچی اور وہ سخت خفا ہُوا، لیکن نواب مبارز الدولہ صبر و عزیمت کے ساتھ راہِ حق پر گامزن رہے۔

نواب مبارزالدولہ کی بیعت سے پہلے ہی حیدرآباد میں اہلِ حق کی خاصی تعداد مولانا ولایت علی کی دعوت قبول کر چکی تھی، لیکن نواب صاحب کی تحریک میں شرکت گویا حالات کے رہوار کو مہمیز کر گئی۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ۔ حکمران جس فکر و نظر اور سیرت و کردار کے مالک ہوتے ہیں رعایا پر بھی وہی رنگ چڑھ جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی ہُوا۔ اب تک تحریک میں شامل ہونے والے اکثر متوسط اور پسے ہُوئے نچلے طبقے کے لوگ تھے، نواب صاحب شریک ہُوئے تو اُونچے متوسط اور اعلیٰ طبقے کے افراد، خصوصًا نواب صاحب کی سرکار سے متعلق اصحاب بھی جوق در جوق اس دعوت کی طرف متوجہ ہُوتے اور پھر اُن کی زندگیوں میں انقلاب رُونما ہُوا تو زندگی کے کسی عمل سے پہچانے نہ جاتے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو چند روز پہلے تک تعیّش اور فکری و عملی کج رویوں میں مستغرق تھے جنھیں نہ اپنے دین اور آخرت کی فکر تھی اور نہ اپنے دنیاوی مستقبل پر چھانے والے ان تیرہ و تار بادلوں کی پروا جو مترفانہ زندگی کے نتیجے میں اُٹھتے اور پُورے معاشرے پر تباہی کی بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ اب وہ بالکل نئے انسان تھے۔ حق پرست، توحید و سُنّت کے عاشق، بُرائیوں سے نفور اور نیکیوں کے حریص۔ جن گھروں سے ساز و سرود کی صدا اُٹھا کرتی تھی وہاں اب اَللہ کے احکام اور اُس کے رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک اور احادیث کا چرچا تھا۔ جہاں بدعتیں اور مشرکانہ رسوم اور توہّمات زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنے ہُوتے تھے وہاں ایک ایک قدم اُٹھاتے وقت دیکھا جاتا کہ اس باب میں اللہ کا فرمان کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا رہنمائی فرماتے ہیں۔

مولانا ولایت علی بیعت لیتے وقت جن باتوں کا اقرار کروایا کرتے اُن سے زندگی کی راہ آپ سے آپ متعین ہو جاتی۔ بیعت کرنے والا اقرار کرتا کہ وہ شریعت کی اتباع کرے گا کہ یہی رضائے الٰہی کا راستہ ہے کسی مخلوق سے خالق کی صفات منسُوب نہ کرے گا، ایسی رسوم سے محترز رہے گا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں رائج نہ تھیں۔ معاشرت میں اُن تمام طور طریقوں پر سختی سے کاربند رہے گا جو عہدِ نبوت کے معمُولات تھے، عبادات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے مطابق ادا

کرے گا، شادی بیاہ اور مرگ و پیدائش کے رسم و رواج، تعظیمِ قبور، قبروں پر عمارتوں کی تعمیر، مُردوں کی برسیوں میں صرفِ کثیر، تعزیہ داری اور تمام بدعات اور غیر شرعی اور ہندوانہ طرزِ حیات سے جنم لینے والے افعال و اعمال سے اجتناب کرے گا اور اپنی زندگی کو ان آلودگیوں اور اخلاقی ذمائم سے حتی الامکان پاک صاف کر دے گا۔ یہ عہد اپنے اندر ایک زبردست انقلابی پروگرام رکھتا تھا۔ اس پر عمل پیرا ہوتے ہی ایک نئی زندگی وجود میں آ جاتی۔ زندگی جو حُسن و خوبی، احساسِ فرائض، اخلاقی ذمہ داریوں، صدق و صفا، اخوت و مساوات، اپنے رب کے ساتھ تعلق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کی پیروی سے عبارت تھی۔ حیدر آباد اور اُس کے نزدو دُور کے شہر اور قصبات اسی انقلاب سے دوچار تھے۔ جہاں دعوت کا بیج پڑ جاتا ، ایک حلقہ قائم ہو جاتا۔ ہر حلقے کا ایک مرکز ہوتا جو عموماً کسی رفیقِ دعوت کی رہائش گاہ ہوتی۔ ان مراکز میں تعلیم و تدریس، وعظ و نصیحت، اعمال و عقائد کی اصلاح اور تطہیرِ قلب و نظر کا اہتمام ہوتا۔ یہیں تحریک کے ساتھی وقتاً فوقتاً خود بھی جمع ہوتے اور گرد و پیش کے مسلمانوں کو بھی دعوت دیتے اور اُن تک تحریک کا پیغام پہنچاتے۔ مولانا ولایت علی حیدر آباد میں تقریباً چار برس رہے اس عرصے میں دعوت کا کام جس قدر وسیع پیمانے پر ہُوا اُس کا ہلکا سا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف دارالحکومت میں تیرہ چودہ حلقے کام کر رہے تھے اور جب وہ ریاست سے رخصت ہُوئے تو دس ہزار سے زائد مُسلمان اُن کے حلقۂ دعوت میں شامل ہو چکے تھے۔

○

جفاکش کسان

مولانا ولایت علی کا دائرہ سعی و عمل رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اب بمبئی کے اضلاع بھی ان کی سرگرمیوں کی جولانگاہ بن گئے تھے۔ دعوت تیزی سے فروغ پا رہی تھی، یُوں لگتا اللہ نے اپنے بندوں کے دِل کھول دِیے ہیں۔ اگرچہ مخالفت بھی جاری تھی کہ یہ حق کی پکار کا فطری تقاضا ہے، اسے کچھ نہاد ذہنوں نے کبھی ٹھنڈے پیٹ برداشت نہیں کیا؛ تاہم مولانا ولایت علی مخالفوں سے اُلجھ کر اپنی صلاحیتیں اور وقت ضائع کرنے کے بجائے

مثبت انداز میں کام کرنے کے قائل تھے اور وہ اس میں شب و روز لگے ہوئے تھے۔ اسی عالم میں بالاکوٹ کے حادثے کی خبر پہنچی۔ غم و اندوہ کی ایک بجلی تھی جو گری اور قلب و رُوح کو زخمی کرتی رگ ریشے میں اُتر گئی۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا، لیکن حادثہ رُونما ہو چکا تھا!

مولانا ولایت علی نے خبر سُنی تو محسُوس کیا جیسے ایک کوہِ گراں اُن پر آ پڑا ہے۔ غم و الم ہی کا نہیں، ذمہ داریوں کا کوہِ گراں بھی۔ یہ احساس کچھ غلط نہ تھا۔ سید بادشاہ کے صفِ اوّل کے خلفا میں صرف چند ایسے اصحاب زندہ بچے تھے جن کے اندر اس عظیم الشان تحریک کی باگ ڈور سنبھالنے کی صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔ ان میں بھی بعض وہ تھے جن کا دماغ بالاکوٹ کے ناگہانی حادثے سے شل ہو کر رہ گیا تھا اور بعض مایوسی کا شکار ہو کر گھروں کو لوٹ آئے تھے اور گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ صرف دو آدمی تھے جن کی طرف اس کڑے وقت میں نگاہیں اُٹھ سکتی تھیں اور جن کی قائدانہ صلاحیتیں پچھلے چار برسوں میں اُبھر کر سامنے آگئی تھیں۔ ایک سید محمّد علی رامپوری تھے جنھیں سید بادشاہ نے سرحد سے بڑی خوش آئند توقعات اور دُعاؤں کے ساتھ جنوبی ہندوستان بھیجا تھا اور اب مدراس کے علاقے میں تبلیغ و تلقین اور اصلاح و ارشاد کے کام میں مصروف تھے اور دوسرے مولانا ولایت علی۔ سید محمّد علی رامپوری ایک خاص مزاج رکھتے تھے اور اُن لوگوں میں سے ایک جو اپنے لیے ایک مرتبہ کوئی میدانِ عمل چُن لیتے ہیں تو پھر پُوری زندگی اُسی دائرے کے اندر گزار دیتے ہیں، نہ اُس سے باہر نکلتے ہیں اور نہ پیچھے ہٹتے ہیں۔ اس کٹھن اور جانکاہ مرحلے میں تحریک کو ایک ایسے قائد کی ضرورت تھی جو انتہائی متحرّک اور فعّال ہو، جو نہ صرف تحریک کے پُرانے کارکنوں پر چھائی ہُوئی مایوسی کو اپنی بے پناہ رجائیت سے دُور کر سکے بلکہ افسردگی کا شکار ہوتی ہُوئی تحریک میں پھر سے رُوح تازہ پھُونک دے اور اُس کے اندر ایمان و یقین اور عشق و جنوں کے وہی جذبے بھر دے جو سید صاحب کے عہد میں موجزن تھے اور جس کی شخصیت اور کردار ایسا مسحور کن ہو کہ دُنیا اُس کی دعوت پر کھنچی چلی آئے۔ مولانا ولایت علی کو اللہ تعالیٰ نے یہ ساری صلاحیتیں ودیعت کی تھیں۔ بلاشبہ وہ واحد شخص تھے جو سید بادشاہ کی جانشینی کا بوجھ اُٹھا سکتے تھے۔ اور حادثۂ بالاکوٹ سے پیدا ہونے والا خلا پُر کرنے کا سب سے زیادہ

احساس بھی انہی کو ہُوا۔ اُنھوں نے خبر سُنتے ہی کمر ہمت باندھ لی، حیدر آباد میں دعوت کا کام اپنے خلفا کو سونپا اور خود عظیم آباد کی طرف روانہ ہو گئے۔ کام کا ایک پُورا نقشہ اُن کے ذہن میں تھا۔ یہ محض واپسی کا سفر نہ تھا۔ وہ جن راہوں سے گزرے وہاں دعوت و انقلاب کے چراغ روشن کرتے چلے گئے۔ بُرہان پُور، جبل پُور، نرسنگھ پُور، کندولی اور سیونی وغیرہ مختلف شہروں میں وہ کئی کئی ماہ مقیم رہے اور جب پٹنہ پہنچے تو انھیں حیدر آباد سے چلے دو برس بیت چکے تھے۔ دراصل وہ چاہتے تھے کہ صادق پُور میں جم کر بیٹھنے اور تحریک کی زمام قیادت سنبھال کر ذہن میں اُبھرنے والے نقشے میں رنگ بھرنے سے پہلے ان علاقوں میں دعوتِ اِصلاح و جہاد کی تخم ریزی ہو جائے جہاں ہجوم کار کے باعث انھیں دوبارہ آنے کا موقع ملے یا نہیں۔

پھر شاید یہ خیال بھی ہو گا کہ اس عرصے میں حالات کا چہرہ نکھر کر سامنے آجائے گا۔

سید بادشاہ کی خبرِ شہادت ملنے کے بعد کچھ اور خبریں بھی آنے لگی تھیں وہ یہ کہ سید بادشاہ شہید نہیں ہُوئے بلکہ وقتی طور پر غائب ہو گئے ہیں۔ یہ خبر بھی ملی کہ بعض اصحاب زیارت کی سعادت بھی حاصل کر چکے ہیں۔ بظاہر یہ دِلوں کو تھامنے والی باتیں تھیں، لیکن سید صاحب کے سانحۂ شہادت کا چونکہ کوئی عینی شاہد نہ تھا اس لیے اکثر لوگوں نے اُن پر یقین کر لیا۔ پھر یہ خبر بھی آئی کہ سکھوں نے سید بادشاہ کی سر بریدہ لاش، زخمی مجاہدین سے شناخت کروا کر دفنا دی تھی، تاہم عقیدت و محبت کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔ اِنسان دِلوں کے آبگینوں کو تند و تلخ حقیقتوں کی ٹھیس لگنے سے بچانے کے لیے اپنے اِرد گرد خوش کن اور جذباتی تصورات کی ایک فضا تعمیر کر لیتا ہے اور اُس کی دِلربائیوں کا سہارا پکڑتا اور اُن کے اندر کھو کر اسی فضا کو اصل حقیقت سمجھنے لگتا ہے۔ سید صاحب کی جماعت کے اکثر افراد کا یہی حال تھا۔ سید صاحب کی غیوبت کا خیال اُن کے دِلوں میں جم گیا تھا۔ خود مولانا ولایت علی کا قلب و ذہن اس روایت کو قبول کر چکا تھا۔ یہی نہیں یہ خیال بیسویں صدی کے دوسرے عشرے تک جماعت میں زندہ رہا۔ اس قسم کے بے بنیاد تصورات اور پھر وہ تصورات جنھیں محض جذباتی سہارے حاصل کرنے کی خواہش نے تخلیق کیا ہو — عموماً بے شمار اعتقادی اور نظریاتی خرابیوں کا باعث ہوتے ہیں۔ تاریخ کے مسافر نے اُن کی کوکھ سے نئے نئے فرقے جنم لیتے اور ان کے ماننے والوں میں فکری و

عملی مفاسد راہ پاتے دیکھے ہیں، لیکن اللہ کے یہ بندے اس تصور کو حرزِ جاں بنانے کے باوجود نہ صرف خود راہِ حق و صدق پر قائم رہے بلکہ کتاب و سُنّت کی نکھری ہُوئی تعلیمات کا نُور برِّ صغیر میں پھیلا تو انھی کے ذریعے سے پھیلا۔ گمراہ کن نظریات، شخصیت پرستی، توہمات، بدعات، مشرکانہ عقائد اور ہندوانہ رسوم کی زنجیروں سے اہلِ ایمان کو چھٹکارا دلایا تو اہلِ حق کی اسی جماعت کی تبلیغی اور اصلاحی جدّوجہد نے دلایا۔ وہ سیّد صاحب کی غیوبت کے قائل تھے لیکن انھوں نے اسے خود اپنے اور جماعت میں شامل ہونے والے دوسرے لوگوں کے ایمان اور عقیدے کا مسئلہ کبھی نہ بنایا۔ وہ لوگوں کو ہمیشہ اللہ اور اُس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی طرف بُلاتے اور کتاب و سُنّت کو اپنی زندگیوں میں نافذ کرنے کی دعوت دیتے رہے، اس دعوت کو پھیلانا اور سربلند کرنا اُن کا مقصدِ زندگی بنا رہا۔ یہ اس جماعت پر اللہ تعالیٰ کا کرمِ خاص تھا اور یقیناً اُس اخلاص کا ثمرہ تھا جس اخلاص کے ساتھ اُنھوں نے کتاب و سُنّت کی دعوت پر لبّیک کہی تھی۔

بہرحال دو برس کے عرصے میں ایک حقیقت بالکل نکھر کر سامنے آگئی۔ وہ یہ کہ سیّد صاحب کی جانشینی کا کوئی حق ادا کر سکتا ہے تو وہ مولانا ولایت علی ہو سکتے ہیں ——

حادثۂ فاجعہ سے مایوسی اور افسردگی کی جو فضا پیدا ہو گئی تھی وہ ابھی تک موجود تھی۔ جماعت تتر بتر ہو چکی تھی۔ سرحد میں جو لوگ بچ رہے تھے اُن کی بڑی تعداد نے دِل برداشتہ ہو کر جہاد اور تگ و دَو کی زندگی تج دی تھی اور اپنے گھروں کو واپس چلے آئے تھے اور اب تزکیۂ ذات میں گُم ہو چکے تھے۔ جو سرفروش اور پاک نفس اِنسان پیچھے رہ گئے وہ پہلے شیخ ولی محمّد پھلتی کی قیادت میں نئے مرکز کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ سرحدی خوانین ان مردانِ حق کو اپنے مقاصد کے لیے اِستعمال کرنا چاہتے تھے اور وہ بھی رسوا کن شرمناک مقاصد کے لیے۔ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے اور اپنی سیاوت کا سکّہ جمانے کے لیے۔ مجاہدین، سکّھوں کے مقابلے میں تو اُن کی مدد کو ہمہ تن تیار تھے، لیکن اُن کی قبائلی دشمنیوں میں فریق بننے اور مُسلمانوں پر حجّتِ شرعی کے بغیر فوج کشی پر آمادہ نہ ہوتے۔ نتیجہ یہ کہ سانحۂ بالاکوٹ کے بعد جن مقامات کو بھی اُنھوں نے مرکز بنایا وہاں سے اُنھیں نکلنا پڑا۔ آخر ستھانہ نے درِ دل وا کیا۔ ستھانہ، بونیر کے علاقے میں دریائے سِندھ کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ اسے سیّد ضامن شاہ نے آباد

کیا تھا جو سید علی ترمذی کی اَولاد میں سے تھے اور ان دنوں سید اکبر شاہ خاندان کے سربراہ تھے۔ یہ سادات، سید صاحب کے زمانے ہی سے تحریک کے ساتھ وابستہ چلے آتے تھے اور سرحد کے ان چند اصحاب میں سے تھے جو گرمی سردی، تنگی ترشی اور آزمائش، ہر دَور میں عہدِ وفا پر کاربند رہے اور اس راہ میں آنے والی ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا۔ سید بادشاہ کے بعد جب بھی مجاہدین پر دَورِ ابتلا آیا، انھی سادات کی بستیاں اُن کی جائے پناہ بنیں، یہاں تک کہ انگریزوں نے اِن بستیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور یہ زخم بھی اُنھوں نے عظیم شانِ صبر و عزیمت کے ساتھ برداشت کیے۔ ستھانہ میں قدرے اطمینان سے سانس لینا میسر ہُوا تو شیخ ولی محمدؒ، سید بادشاہ کے اہلِ خانہ کو بڑی بی بی کے پاس پہنچانے کے لیے سندھ روانہ ہو گئے اور مولوی نصیرالدین منگلوری مجاہدین کے امیر بنے۔ وہ سید صاحب کی جماعت کے قائدانہ صلاحیتیں رکھنے والے ممتاز افراد میں گنے جاتے تھے، شیخ ولی محمدؒ کے دورِ امارت میں ان کے دستِ راست اور مجاہدین کے سپہ سالار تھے۔ لیکن گرد و پیش کے معاند حالات روز بروز مہیب ہوتے جا رہے تھے۔ خوانینِ ہندوستان سے آنے والے لوگوں کی راہ میں حائل ہوتے اور اُن کے قافلوں کو لُوٹنے اور خُون میں نہلانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ مجاہدین کے سامنے ان رکاوٹوں کا تدارک کیے بغیر کوئی راستہ نہ تھا اور اسی کش مکش کا مولوی نصیرالدین خود اور اُن کے کتنے نمایاں ساتھی شکار ہو گئے۔ پہلے بھی صُورتِ حال کچھ ایسی روشن نہ تھی، بس اپنے اَللہ سے کیا ہُوا عہد تھا جو اِن مردانِ حق کو بے قرار اور مضطرب، وقت کے تند و تیز اور متلاطم دھارے پر لیے پھرتا تھا۔ اب تو اُن کی کیفیت اُس چنگاری کی سی ہو گئی تھی جو ہَوا چل پڑتی ہے تو سُلگنے لگتی ہے اور فضا سازگار ہو تو شُعلے بن کر بھڑک بھی اُٹھتی ہے اور جب ہَوا کے تھپیڑے رُک جاتے ہیں تو پھر کجلا جاتی ہے۔

○

ایسے شب و روز تھے جب صادق پُور عظیم آباد کے اس عظیم فرد نے تحریک کا پرچم سنبھالا، صادق پُور کو مرکز بنایا اور جدّ و جہد کا آغاز کر دیا۔ اس جدّ و جہد کے لیے اُنھوں

نے سائنٹیفک خطوط اختیار کیے۔ اب تک تحریک کے افراد زیادہ تر انفرادی طور پر کام کرتے تھے۔ کہیں کہیں کوئی حلقہ قائم تھا۔ سید بادشاہ اور اُن کے بعد مجاہدین کے امیر جو اعلام نامے اور خطوط وغیرہ بھیجتے وہ بالعموم مختلف علاقوں کے افراد کے نام ہوتے جنھیں سید بادشاہ نے خلعتِ خلافت عطا کیا تھا یا کارِ دعوت و اصلاح پر متعین فرمایا تھا۔ مولانا ولایت علی نے اس سارے کام کو ایک مرکز کے تحت منظم کیا اور اس نظام کو ایسی مضبوط بنیادوں پر اس طرح وسعت دی کہ انگریزی حکومت نے تقریباً ایک سو برس تک اسے اُکھاڑنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر ناکام رہی۔

مولانا ولایت علی نے مختلف سمتوں میں اقدام کیا۔ بہار، شمالی اضلاع اور دہلی میں سید صاحب کے ہاتھ پر ہزاروں افراد نے بیعت کی تھی۔ یہ حضرات قریہ قریہ، شہر شہر بِکھرے ہُوئے تھے۔ مولانا نے انھیں نئے نظمِ جماعت میں پرونے کی کوشش کی اور فعال اور متحرک عُنصر نے بڑی تعداد میں ان کی رفاقت اختیار کر لی۔ اس طرح سید بادشاہ کی شہادت کے بعد ہندوستان میں جو انتشار پیدا ہو گیا تھا وہ ختم ہو گیا، افسردگی اور مایوسی کی جگہ حالات اور نتائج سے بے نیاز ہو کر سید صاحب کے بنا کردہ مشن کو جاری رکھنے کے جوش اور جذبے نے لے لی۔ مولانا ولایت علی نے ملک کو کئی حلقوں میں تقسیم کیا اور سید بادشاہ کے خُلفا کو ان حلقوں کا نظم سونپا۔ ابتدا میں بہار، بنگال، بمبئی، حیدر آباد دکن اور مدراس اس نظم میں شامل تھے، پھر اُن کا دائرہ بڑھتے بڑھتے اودھ، دہلی اور پشاور تک پھیل گیا۔

مرکزی نظم خود مولانا کے اپنے ہاتھ میں تھا۔ وہ جماعت کے امیر تھے اور بڑے حضرت کے نام سے مشہور تھے۔ صادق پور کے رؤسا کی مشہور نئی اور پُرانی حویلیاں جو ان زبیری اور جعفری گھرانوں کو وراثت میں ملی تھیں اس تحریک کا مرکز بن گئیں۔ مولانا

لہ مولانا ولایت علیؒ حضرت زبیرؓ بن العوام کی اولاد میں سے تھے اور مولانا احمد اللہؒ اور مولانا یحییٰ علیؒ حضرت جعفر طیارؓ کی اولاد میں۔ دونوں خاندان رشتوں اور ناتوں کے ذریعے من تو شدم تو من شدی کا مصداق تھے۔ نمو ہیہ (پٹنہ ہی کا ایک محلہ) کے شاہ محمد حسینؒ کا عباسی خاندان بھی اسی طلائی لڑی میں منسلک تھا۔

ولایت علی پُرانی حویلی میں بیٹھ کر تحریک کے پُورے کام کی نگرانی کرتے، تمام حلقوں کے ساتھ قابلِ اعتماد قاصدوں اور خط کتابت کے ذریعے براہِ راست رابطہ رکھتے اور انھیں ہدایات جاری کرتے۔ مقامی طور پر اُٹھنے والے مسائل کو حل کرتے اور اُلجھنیں سُلجھاتے۔ نواب فخر الدولہ کی مسجد میں نمازِ جُمعہ کی امامت کراتے اور خطبۂ جمعہ پڑھاتے۔ خود پٹنے سے باہر دَورے پر ہوتے تو آپ کے خلیفہ اور رفیق مولوی حکیم ارادت حسین آپ کی نیابت کرتے۔ ظہر اور عصر کے درمیان اپنے گھر پر قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ بڑے صاحبزادے مولوی عبداللہ قاری ہوتے، عُلما تفسیر کی کتابیں لے کر بیٹھتے۔ عُلماء کے علاوہ عام ارادت مندوں کی بڑی تعداد شریک ہوتی۔ قرآن مجید اور ابنِ حجر عسقلانیؒ کی مرتّب کردہ حدیث کی مختصر کتاب بلوغ المرام کا لفظی ترجمہ مَردوں، عورتوں اور بچّوں کو پڑھاتے۔ اس طرح کتاب و سُنّت کا علم جو اب تک عُلما تک محدود تھا عام مُسلمان بھی براہِ راست اُس سے مستفید ہو گئے۔ پھر یہی لوگ اپنے اپنے حلقوں میں اس کام کو جاری رکھتے۔ خواتین اپنے بچّوں کی زندگیوں میں کتاب و سُنّت کے اس نُور سے اُجالا پھیلاتیں۔ تھوڑی ہی مدت میں یہ کام وسیع پیمانے پر ہونے لگا۔ پڑھے لکھے لوگ دینِ خالص کے شعُور سے بہرہ یاب ہو گئے۔ اب وہ خود معلوم کر سکتے تھے کہ زندگی کے کسی معاملے میں خدا کی مرضی کیا ہے اور کون سی بات اُس کی مرضی کے خلاف ہے۔ اَن پڑھ نمازوں میں جو سُورتیں اور دُعائیں پڑھتے ان کے مفہوم سے بخوبی آگاہ ہوتے۔

کتاب و سُنّت کی تعلیمات عام کرنے اور دعوت کو پھیلانے کے لیے انھوں نے لٹریچر کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمۂ قرآن اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے رسائل دہلی سے شاہ محمّد اسحاقؒ سے منگواتے۔ انھیں لکھنؤ کے مطبع حسینی سے طبع کروانا چاہا، لیکن مطبع کے مالک نے انکار کر دیا، چنانچہ آپ نے یہ کام اپنے خلیفہ مولانا بدیع الزّماں بردوانی کے حوالے کیا۔ اُنھوں نے دس ہزار روپے سے ایک ٹائپ پریس خریدا اور کتابوں کی طباعت شروع کی۔ برِّصغیر میں یہ پہلا پریس تھا جو خالصتاً ایک مشن کے تحت قائم ہُوا۔ اس کے بعد تو مطبع خانوں کی ریل پیل ہو گئی۔ دینی کتابوں

کی اشاعت کو منفعت بخش کاروبار سمجھ کر مسلمانوں نے بھی نئے نئے پریس لگائے اور ہندو کاروباریوں نے بھی۔ خود مولانا ولایت علی نے ایک سو سے زائد رسالے قلم بند کیے اور شائع کروائے۔

بڑے حضرت اُس محنتی اور جفاکش کسان کی طرح تھے جسے ہر وقت اپنی کھیتی کی غور و پرداخت، اصلاح و آبیاری اور سلامتی کی فکر رہتی ہے۔ دن رات اَن تھک جدّوجہد کرتے۔ جُمعہ اور درس کا اہتمام تو تھا ہی، حق کی آواز پھیلانے اور کتاب وسُنّت کی تعلیمات کو عام کرنے اور دعوت و تحریک کو مردانِ کار فراہم کرنے کے لیے اپنے استاذ اور عظیم رفیق شاہ اسماعیل شہیدؒ کی طرح ہر وقت بے چین اور سرگرمِ عمل رہتے۔ شاہ صاحبؒ کا احساسِ ذمہ داری بڑا شدید تھا۔ وہ عُلمائے حق کی غفلت اور عُلمائے سُو کی فتنہ پردازیوں کے شکار مُسلم عوام کو بدعات، مشرکانہ عقائد اور اخلاقی بیماریوں میں مبتلا دیکھتے تو مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ کے الفاظ میں "وہ ان سے زیادہ اپنے آپ کو گنہگار سمجھتے اور میدانِ حشر کا نقشہ ان کے سامنے پھر جاتا کہ جب یہ خُدا کے سامنے علماء کا دامن پکڑیں گے کہ ان بیناؤں نے ہم نابیناؤں کا ہاتھ نہیں پکڑا تو اس استغاثے کا کیا جواب دیں گے"۔ بڑے حضرت کی کیفیت اس سے کچھ مختلف نہ تھی۔ انھیں آخرت کی جوابدہی کا یہی احساس ہر وقت تڑپائے رکھتا تھا اور اُنھوں نے شاہ صاحب ہی کی طرح بندگانِ خدا کو راہِ حق و صدق پر گامزن کرنے کی تگ و دو میں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ جھونک دیا تھا۔ تحریک کا تنظیمی کام خاصا کٹھن اور محنت طلب تھا۔ ابتدائی دو برس تو وہ اسی میں کھُب کر رہ گئے تھے، لیکن اس کے باوجود جب بھی اس سے ذرا فرصت ملتی وہ حق کی دعوت گھر گھر پہنچانے کے کام میں لگ جاتے۔ دَورے پر نکلتے تو مہینوں اپنے مستقر کی طرف نہ لَوٹتے۔ جانِ پُرسوز لیے ایک ایک شہر اور قریے میں جاتے۔ لوگوں کو ان کے گھروں، چوپالوں، بازاروں، کارگاہوں، کھیتوں اور کھلیانوں میں جا کر اللہ کی باتیں پہنچاتے۔ میلوں ٹھیلوں اور دوسرے مجمعوں میں جاتے اور اللہ کی بندگی و اطاعت اور مومنِ صالح بننے کی ترغیب

دیتے۔ لوگ تمسخر اڑاتے اور بدزبانی، اہانت، درشتی اور خشونت سے پیش آتے مگر حق کی خاطر ہر تلخی اور بدتہذیبی برداشت کرتے۔ مخالفت اور عناد کو ان کی شقاوت اور بدبختی پر محمول نہ کرتے بلکہ خیال کرتے کہ حق کا پیغام پہنچانے میں خود ان سے کوتاہی ہو رہی ہے، چنانچہ وہ اور تن دہی سے اس کام میں منہمک ہو جاتے۔ انہی دوروں میں تحریک کو راج محل، مالدہ اور بہار و بنگال کے دوسرے شہروں میں کارکن میسر آئے جنھوں نے آنے والے ماہ و سال میں انتہائی سنگین فضا میں تحریک و دعوت کا پرچم اُٹھائے رکھا اور تحریک کی رہنمائی کی۔ اسی دوران میں ایک بار مولانا ولایت علی سُورج گڑھ میں فروکش ہوئے تو ایک ایسا گوہرِ شاہوار (مشہور محدّث میاں صاحب سیّد نذیر حسینؒ دہلوی) ہاتھ آیا جس نے خود اور برِصغیر کے طُول و عرض میں پھیلے ہوئے اُس کے پُرجوش اور متحرک شاگردوں نے کتاب و سُنّت کے نُور سے اپنے گرد و پیش کے ماحول کو روشن کیا۔

تبلیغی دَورے میں جب بھی کسی ایسے گاؤں یا قصبے میں جاتے جہاں ابھی تک دعوت نہ پہنچی ہوتی وہاں اپنے قیام و طعام کا انتظام خود کرتے۔ ایک ایک آدمی پر محنت کرتے۔ اُس کے اندر بڑے حکیمانہ انداز سے طلبِ حق اور اصلاحِ اعمال و عقائد کا جذبہ اجاگر کرتے، اِنسان کی فطرت میں رچی بسی نیکی سے محبّت کی چنگاریوں کو ہوا دیتے، اُسے بہت پیار سے جھنجھوڑتے اور دنیا کی لذّتوں اور مشاغل میں کھوئے ہوئے دِل میں آخرت کی فکر پیدا کرنے کی کوشش فرماتے۔ اُن کی باتوں میں بلا کا اثر تھا۔ عموماً ایک آدھ صحبت ہی میں دِل و نگاہ کا فیصلہ ہو جاتا۔ ایک بار کوئی شخص دعوت قبول کر لیتا تو پُورے اہتمام سے اُسکی تربیتِ فکر و کردار کرتے اور بسا اوقات کئی کئی مہینے اُسی ایک پر لگا دیتے اور جب وہ اُن کے معیار کے مطابق تیار ہو جاتا تو اس علاقے میں دعوت و تبلیغ کا کام اُسے سونپ کر اگلی بستی کی راہ لیتے۔

مشرقی بنگال میں علاقہ حاکم پُور کے ایک ایسے ہی شخص کا تذکرہ تاریخ نے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا ہے۔

بڑے حضرت ان دنوں دَورے پر نکلے ہوئے تھے۔ پھرتے پھراتے حاکم پُور کے

ایک گاؤں میں پہنچے۔ ایک نور باف اپنی کارگاہ میں بیٹھا کپڑا بُننے میں مصروف تھا۔ سلام کہہ کر اُس سے باتیں کرنے لگے۔ سادہ اور معمولی سا لباس زیبِ تن تھا۔ نور باف سمجھا کوئی بھکاری ہے۔ ایک نظر اُنھیں دیکھا اور اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ بڑے حضرت نے ایک بھرپور نگاہ نور باف کے چہرے پر ڈالی اور پھر بڑے دھیمے مگر سوز میں تپے لہجے میں کھڈی کے شور کو چیرتی ہوئی اُن کی آواز اُبھری: "میرے بھائی! دُنیا کی زندگی کے لیے تو آپ اتنا اہتمام کر رہے ہیں، سارا سارا دِن کھڈی میں بیٹھے رہتے ہیں اور اپنے اہل و عیال کے کھانے پینے اور پرورش کی فکر آپ کو دن رات سرگرمِ عمل رکھتی ہے، حالانکہ یہ چند روزہ زندگی ہے، انسان کے سانس کا کوئی بھروسہ نہیں، ابھی آمد و شُد جاری ہے اور ابھی ٹوٹ کر رہ جائے گا۔ اس ناپائدار زندگی کے لیے آپ یہ کچھ کرنے میں لگے ہوئے ہیں، لیکن اس زندگی کے بعد جو آخرت کی زندگی ہے جسے کوئی فنا نہیں، اُس کے لیے بھی آپ کچھ کر رہے ہیں؟" اِس فقیر کی صدا کا انداز بڑا انوکھا ہے:" نور باف نے دِل ہی دل میں کہا اور تہمد کے پلّو میں سے چار پیسے نکالے اور اُن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "یہ لو اور اپنا راستہ پکڑو۔" اُس کی آواز کرخت ہو گئی تھی۔ شاید یہ اُس ارتعاش کا اثر تھا جو اس مردِ درویش نے نور باف کی توجہ سے محروم زندگی کی جھیل میں ایک ہلکا سا کنکر پھینک کر پیدا کر دیا تھا۔ آپ نے فرمایا: "بھائی، پیسے اپنے پاس رکھو اور جو مَیں کہتا ہوں اُسے کان لگا کر سُنو۔" نور باف اب بھی اس دَرویش کا مُدّعا نہ سمجھ پایا۔ اُس نے دو تین آنے پلّو میں سے نکالے اور دیتے ہوئے کہا: "میاں، یہ اور لو اور جان چھوڑو۔" بڑے حضرت نے وہی پہلا جواب دیا: "بھائی پیسے اپنے پاس رکھو، مجھے ان کی احتیاج نہیں ہے، جو کہنا چاہتا ہوں بس وہ سُن لو۔" نور باف کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس نے کوچی اُٹھالی اور بولا: "اچھا، اب ہمیں دوسری طرح نبٹنا پڑے گا۔" بڑے حضرت نے کسی قسم کا تأثر لیے بغیر فرمایا: "میاں، مارنا ہے تو مار لو، لیکن میری بات تو سُن لو۔" نور باف اس جواب پر دم بخود رہ گیا۔ عجیب اِنسان ہے یہ! میرے درشت رویّے کا کوئی تأثر نہیں لیتا۔ بھکاری بھی نہیں ہے، پھر کہنا کیا چاہتا ہے؟ ہاں وہ آخرت کی بات کر رہا تھا۔ آخرت ہے تو سہی مگر...... کیوں نہ اس کی بات

سُن لُوں۔ نُور باف کے دِل و دماغ میں خیالات کی رَو جاری تھی۔ بڑے حضرت غور سے اُس کا چہرہ پڑھ رہے تھے جس پر اُس کے داخلی تاثرات کی پرچھائیاں کبھی اُبھرتی اور کبھی مٹ جاتی تھیں۔ "بھائی، تم جو کام کر رہے ہو کرتے رہو، بس میری باتوں پر کان لگائے رکھو۔" بڑے حضرت کی آواز بلند ہُوئی اور نُور باف کے خیالات کا سلسلہ ٹُوٹ گیا۔ اُس نے اُن کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ دیر تک چُپ چاپ دیکھتا رہا۔ گویا وہ ان کی باتیں سُننے پر آمادہ ہوگیا تھا۔ بڑے حضرت نے دُنیا کی ناپائداری اور آخرت کی بے حد و بے پایاں جاودانی زندگی کا ذکر بڑے دلکش پیرائے میں کیا اور فرمایا "یہ تم جو کچھ کر رہے ہو سب دُنیا کے دھندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس نے ہمیں پیدا کیا اور جو ہمیں رزق دیتا ہے اُس کی رضا چاہنے اور اُس کی ناراضی سے بچنے کے لیے ہم اور آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ زندگی تو جانوروں کی زندگی ہے کہ روزی حاصل کرنے کی بھاگ دوڑ کی، جو کچھ کمایا اُسے کھاپی کر اپنے آپ کو پالا پوسا، بچّے پیدا کیے اور مر گئے۔۔۔۔"

بڑے حضرت وعظ و تلقین فرماتے رہے۔ نُور باف اُن کی باتیں سُنتا اور اپنا کام کرتا رہا۔ پہلے پہل قدرے بیزاری کے ساتھ۔ رفتہ رفتہ بیزاری جاتی رہی اور ان عجیب و غریب باتوں میں اس کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ عجیب و غریب باتیں جو وہ پہلی بار سُن رہا تھا۔ مُلّا مولوی اُس کے گاؤں میں بھی تھے اور اڑوس پڑوس کے شہروں سے بھی گاہے گاہے آتے رہتے تھے۔ چندہ لینے، مسجدوں کی تعمیر کے لیے، مدرسوں کے لیے۔۔۔۔۔ لیکن کسی نے کبھی ایسی باتیں نہ کی تھیں۔ باتیں جو اس کے دِل و دماغ کو ہلانے لگی تھیں۔ شام تک وہ ان باتوں میں ڈُوب کر رہ گیا تھا۔ شام ہُوئی تو بڑے حضرت اپنے ڈیرے پر تشریف لے گئے۔ وہ رات نُور باف نے جاگ کر کاٹی۔ اس مردِ درویش کی باتیں اُس کے کانوں میں گُونج رہی تھیں۔ باتیں جن میں زندگی تھی، جذب و سوز تھا، سچّائی تھی۔ اُسے پہلی مرتبہ احساس ہُوا کہ وہ بے مقصد زندگی گزار رہا ہے، جانوروں کی سی زندگی۔ پھر مُسلمان ہونے کے معنی بھی اُس پر پہلی بار آشکارا ہُوئے تھے۔ ایک شخص مُسلمان ہونے کا دعویٰ کرے اور جانوروں کی سی زندگی گزارے! واقعی عجیب بات ہے اور اِس مردِ درویش

کے بقول یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے ساتھ نہیں چل سکتیں۔ وہ ساری رات خیالات کی لہروں پر کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح اُٹھا اور کھا پی کر کام میں لگ گیا۔ اُدھر بڑے حضرت بھی ناشتہ کر کے آ گئے۔ آج کی محنت کا نتیجہ نکلا کہ نُورباف نماز پڑھنے پر آمادہ ہو گیا۔ آپ نے اُسے مختصر طور پر نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا اور ظہر، عصر اور شام کی نمازیں اپنے ساتھ کھڑا کر کے پڑھوائیں۔ تین چار روز یہ معمول جاری رہا۔ اس دوران میں نُورباف نے نماز بھی یاد کر لی اور اب وہ اکیلے میں بھی نماز پڑھنے لگا۔

اب بڑے حضرت نے اُس کی دینی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اُسے کتاب پڑھنے کی ترغیب دی اور بغدادی قاعدہ پڑھانے لگے۔ آدمی ذہین تھا، چل نکلا اور جلد ہی اُس نے قاعدہ ختم کر لیا۔ اب تیسواں پارہ، عم ترجمے کے ساتھ شروع کروایا۔ ساتھ ہی ساتھ مطلب بھی سمجھاتے جاتے۔ اس شخص کی تعلیم میں کوئی سات آٹھ مہینے لگے۔ بڑے حضرت رات اپنے ڈیرے پر رہتے اور صبح سے شام تک اُس کی کارگاہ میں اُسے تعلیم دیتے ہوئے گزارتے۔ اب وہ نماز پابندی سے پڑھنے لگا تھا۔ نماز روزے کے مسائل سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ پارہ عم کی سُورتوں کا ترجمہ اور مفہوم بھی سمجھنے لگا تھا۔ کسان کی محنت ٹھکانے لگی تھی۔ ایک روز فرمایا: "اس بستی میں ہم نے تمھارے سوا کسی اور شخص پر محنت نہیں کی، تمھیں دین سمجھایا ہے، عملی زندگی میں دین کے احکام برتنا سکھائے ہیں، اب اس بستی کو سنبھالنا تمھارا کام ہے، اِسے ہم تمھارے سپرد کرتے ہیں، تم جانو اور تمھاری بستی،" یُوں علاقے میں ایک مضبوط اور قابلِ اعتماد مرکز قائم کر کے بڑے حضرت رُخصت ہو گئے۔ نُورباف اپنے محسن استاد اور مُرشد کو بستی سے باہر دُور تک چھوڑنے آیا۔

اَللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی اس پُرخلوص محنت کو شرفِ قبول عطا فرمایا۔

اس نُورباف کے ذریعے اس بستی اور قُرب وجوار کی دوسری بستیوں میں دین کی روشنی پھیلی اور لوگوں کی خاصی بڑی تعداد قرآن و حدیث کی عامل، تہجد گزار اور اللہ والی بن گئی جنھوں نے دعوت و جہاد کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

○

کتاب وسنّت کی تبلیغ وتلقین کی اس مہم میں بڑے حضرت زیادہ زور عقائد کی اصلاح، غیر شرعی رسم ورواج اور بدعات کے استیصال اور احیائے سُنّت پر دیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرکانہ عقائد، بدعات وتوہمات اور غیر اسلامی رسم ورواج کا اسیر ہوکر اسلام کا کام کرنے کا نہ تو تصور کیا جاسکتا ہے اور نہ ایسے کام میں اللہ برکت ہی دیتا ہے۔ اسلام تو نام ہی اللہ کے احکام ومرضیات اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے آگے سر تسلیم خم کرنے اور اپنی عملی زندگی کو اسوۂ حسنہ کے سانچے میں ڈھالنے اور ہر اس عقیدہ وعمل کو تج دینے کا ہے جس کی کوئی دلیل کتاب وسنّت میں نہیں ملتی۔ جو شخص اپنے فکر وعمل میں کوئی انقلاب نہیں لاتا، جس کی عملی زندگی کے شب وروز ذرا بھی بدلنے نہیں پاتے، غیر اسلامی رسم ورواج کی زنجیریں جس کے پاؤں میں پڑی رہتی ہیں، عقائد بھی خالص توحید وسُنّت پر مبنی نہیں ہوتے، اپنے نفس کی خواہشات یا برادری کی مرضیات کے آگے اپنے آپ کو بے بس پاتا اور اس بے بسی کے عالم میں ہر وہ کام کر گزرتا ہے جو خدا اور رسولؐ کی راہ سے بھٹکی ہوئی دنیا کرتی ہے اُس سے یہ اُمید نفس کے ایک خوش آمند دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ اسلام کو سربلند اور کتاب وسُنّت کے احکام کو اجتماعی زندگی میں نافذ کرسکے گا اور دُنیا جن زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اُسے اُن زنجیروں سے نجات دلاسکے گا۔ ایسے لوگ اپنے نفس کے بُتوں کو تو سربلند کرسکتے ہیں، لیکن اسلام ان کے ہاتھوں سے کبھی سربلند نہیں ہوسکتا۔ اسلام کی تاریخ میں ایک ورق بھی ایسا نہیں ملتا جو نفس کے بندوں، توہمات کے قیدیوں اور رسم ورواج کے متوالوں اور بدعتوں اور غیر اللہ کے بندھنوں میں جکڑے ہوئے لوگوں نے لکھا ہو اور اس پر اُمّت فخر کرسکے۔ یہ درحقیقت وہ اعمال ہیں جو مُسلمانوں سے اسلامی زندگی کا جوش وجذبہ سلب کرتے، ان کی عملی صلاحیتوں اور توانائیوں کو غلط راہوں میں ڈال کر ضائع کرتے، پیش آمدہ مسائل سے بیگانہ کرتے اور جمود اور بے حسی کا شکار بناتے ہیں۔ اسی لیے جب بھی تجدید واحیائے دین اور اقامتِ حق کی دعوت اُٹھی ہے اُس نے اہلِ ایمان کو ان سلاسل سے نجات دلانے کی جدّوجہد کی ہے اور اس کے داعیوں

نے اِن زنجیروں کو کاٹنے کا آغاز اپنے گھر سے کیا ہے۔ اُنھوں نے پہلے خود اس کی مثال پیش کی ہے اور پھر دوسروں کو دعوت دی ہے۔

بڑے حضرت نے اصلاحِ عقائد تطہیرِ فکر و نظر اور تزکیۂ نفس کے لیے کتاب و سُنّت کا براہِ راست علم حاصل کرنے پر زور دیا اور قرآن و حدیث سے ایک ایسا مختصر نصاب منتخب کیا جو ان کی دعوت سے متاثر ہونے والے ہر شخص کو خواہ وہ پڑھا لکھا ہوتا یا ناخواندہ پڑھنا پڑتا۔ معاشرتی اصلاح اور اسلامی زندگی کے فروغ کے لیے انھوں نے سُنّتوں کے احیا پر زور دیا۔ صُوبۂ بہار اور بنگال میں نکاحِ بیوگاں کا آغاز آپ ہی کے خاندان سے ہُوا۔ مولوی الٰہی بخش جعفری نے اپنی بیوہ صاحبزادی جمیلۃ النّساء کا نکاحِ ثانی آپ سے کر دیا۔ یہ مقامی مُسلمانوں کے اُونچے خاندانوں اور اعلیٰ سماجی مرتبہ والوں میں نکاحِ بیوگاں کی پہلی مثال تھی۔ اس شادی نے ان کی صفوں میں سنسنی پھیلا دی اور بڑا شور مچا۔ مگر مولانا ولایت علی اور مولوی الٰہی بخش نے اس مخالفت کی کوئی پروا نہ کی۔ اور پھر تو گویا یہ سُنّت خُوب زندہ ہُوئی اور آپ نے ہزاروں بیوہ عورتوں کے نکاح کروائے۔ کچھ عرصے بعد مولوی الٰہی بخش کے فرزند اکبر علی کی بیوہ (بنت شاہ محمد حسین) کا غائبانہ نکاح مولانا عنایت علی غازی سے کر دیا۔ وہ اس وقت بنگال میں تبلیغ و ارشاد میں مصروف تھے۔ مولانا ولایت علی نے خود نیابتاً ایجاب و قبول کیا اور جس طرح نجاشی نے اُمّ المؤمنین اُمّ حبیبہؓ (بنت ابوسفیانؓ) کا نکاح رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کر کے اُنھیں حضورؐ کے پاس مدینہ منوّرہ بھیج دیا تھا، اسی طرح مولانا نے ان خاتون کو مولانا عنایت علی کے پاس بنگال بھیج دیا۔ یہ بیوہ کا دوسرا نکاح تھا جو اس خاندان میں ہُوا۔ اس تقریب میں مولانا نے اپنی ساری برادری اور اپنے مریدوں کو شرکت کی دعوت دی تھی اور اس سُنّت کو زندہ کرنے کی ترغیب دی۔

ایک صاحب عبدالغنی نگرہنسوی تھے، نہایت غریب اور مسکین، لیکن زاہد و مُتقی۔ ان کا عقد ایک بیوہ عورت سے کر دیا اور مہر قرآن کی تعلیم قرار دیا۔

بہار کے شرفا میں تعدّدِ ازدواج معیوب تھا اور ایک بیوی کے ہوتے ہُوئے

برابر کی جوڑ میں دوسرا نکاح کرنا تو گویا حرام سمجھا جاتا تھا۔ مولانا نے اس رسم پر بھی ضرب لگائی۔ اپنی برادری میں ایسی دو شادیاں کرائیں اور ان میں تمام برادری اور عقیدتمندوں کو دعوت دے کر انہیں اتباعِ سُنّت کی ترغیب دی۔

شادی بیاہ کی رسوم اور بندھنوں نے زندگی کو آج ہی کی طرح تلخ بنا دیا تھا۔ ان رسوم پر ہزاروں روپے اُٹھ جاتے۔ پھر برات دُلہن والوں کے ہاں جاتی تو رہی سہی کسر پُوری ہو جاتی۔ خود صادق پُوری گھرانے اس باب میں اسراف و تبذیر کا بُری طرح شکار تھے۔ مولوی الٰہی بخش کے بڑے صاحبزادے مولانا احمد اللہ کا نکاح سیّد صاحب نے پڑھا تھا۔ شادی کی تقریب بعد میں انجام پائی تھی۔ ابھی یہ گھرانے سیّد صاحب کی دینی تحریک کے رنگ میں پُوری طرح نہیں رنگے تھے بس ایک جذباتی عقیدت کا تعلق تھا، چنانچہ برات شاہ محمّد حسین کے ہاں بڑی دُھوم دھام سے گئی۔ بَری اور برات کا دوسرا ساز و سامان اس قدر زیادہ تھا کہ برات کا اگلا سرا شاہ صاحب کے مکان پر نَنموہیہ پہنچ گیا اور پچھلا سرا ابھی صادق پُور ہی میں تھا۔ واپسی کا منظر دلہن کے جہیز نے اور بھی خیرہ کُن بنا دیا تھا۔ مولانا ولایت علی نے اس رنگ کو یکسر بدل ڈالا۔ مولانا فرحت حسین اُن کے چھوٹے بھائی تھے ان کی صاحبزادی صالحہ جوان ہو چکی تھیں۔ ایک روز جمعہ کے دن مولانا نے اپنے بھائی سے فرمایا: "صالحہ تو اب سیانی ہو گئی ہے، اس کے نکاح کا کوئی سامان ہُوا ہے یا نہیں؟"

"ابھی تک تو کوئی بات نہیں ہُوئی؟" مولانا فرحت حسین نے جواب دیا۔

"صالحہ کا نکاح مولوی عبداللہ سے کر دیا جائے تو کیسا رہے گا؟" مولانا نے پُوچھا۔

مولوی عبداللہ ان کے بڑے صاحبزادے تھے۔

"آپ کی رائے سر آنکھوں پر" چھوٹے بھائی کا جواب تھا۔

"تو جمعہ کی نماز کے بعد آج ہی عقد ہو جائے گا۔" مولانا ولایت علی نے فرمایا۔

صادق پُور کی مسجد میں جمعہ کے بعد نمازیوں سے کہا گیا کہ وہ ذرا رک جائیں۔

مولانا ولایت علی نے مولوی عبداللہ صاحب کا نکاح صالحہ بیگم سے کر دیا۔ اعلان کر دیا گیا کہ

کل فلاں وقت ولیمہ کی دعوت ہے۔ لوگ رُخصت ہو گئے تو مولانا ولایت علیؒ گھر تشریف لاتے اور اپنی بھاوج سے فرمایا: "ہم نے صالحہ کا نکاح عبداللہ سے کر دیا ہے، آج رات ہی رخصتی ہو جائے گی۔"

نیک بخت خاتون نے خبر سُن کر کہا: "بہت اچھا ہوا مگر رُونمائی کیسے ہو گی؟ شادی کے کپڑے وغیرہ تو تیار نہیں ہیں!" فرمایا: "جیسے کچھ کپڑے گھر میں موجود ہیں وہی پہنا دو کہ یہی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں۔" چنانچہ انھی پُرانے کپڑوں میں لڑکی کی رخصتی کر دی گئی اگلے روز ولیمے کی دعوت بھی بڑے سادہ سے انداز میں ہُوئی۔

مولانا نے اپنے دوسرے صاحبزادے ہدایت اللہ کا نکاح اور ولیمہ بھی اسی سادگی کے ساتھ کیا۔ نہ دُلہا کے لیے کوئی نیا کپڑا بنا نہ دُلہن کے لیے۔ پیوند لگے سادہ کپڑے جو اُن کے بدن پر تھے انھیں میں پانچ ہزار کے مجمع میں یہ تقریب منعقد ہُوئی۔

یُوں مولانا ولایت علی نے اپنے عمل سے ان سُنّتوں کو زندہ کیا جنھیں مُسلمان چھوڑ چکے تھے اور ان سُنّتوں کے ترک ہو جانے سے جو مفاسد معاشرے میں پیدا ہُو چکے تھے اُن کا آپ سے آپ قلع قمع ہونے لگا۔ تحریک سے وابستہ افراد نے مُلک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ان عملی مثالوں کو اپنا معمول بنا لیا۔ یہی نہیں اس تحریک میں جو لوگ بھی شامل ہوتے اُن کے عقائد کی اصلاح و تطہیر کے ساتھ ساتھ ان کے گھروں میں شادی بیاہ، موت فوت اور معاشرتی زندگی کے دوسرے غیر اسلامی رسم و رواج دَم توڑ جاتے۔ سادہ زندگی کا دَور دَورہ ہو جاتا، تمدنی برائیاں ختم ہو جاتیں۔ وہ سارے معاشرتی و اخلاقی مفاسد جن کی تباہ کاریوں سے معاشرے کو بچانے کے لیے حکومتیں بعض اوقات قوانین بنایا کرتی ہیں ان سے فکر و نظر کے اس انقلاب کی بدولت زندگیاں خود بخود پاک صاف ہو جاتیں۔

○

کٹھن راہیں

مولانا ولایت علی نے مختلف علاقوں میں جو ناظم اور داعی مقرر کیے تھے وہ تن مَن

دھن سے فروغِ حق وصدق کی جدّوجہد کر رہے تھے۔ مظفّر پُور، چھپرہ، ترہٹ اور پٹنہ کے گردو نواح کے علاقے شاہ محمد حسین کے سپرد تھے اور وہ بڑی تندہی سے اپنا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ اُنھوں نے شہر کی کئی مساجد میں جمعہ اور خطبہ کا آغاز کیا۔ بہت سی غیر آباد مساجد آباد کیں۔ خود مسجد نمو ہیہ میں نماز پڑھاتے، جُمعہ کا خطبہ دیتے اور سیّد صاحب کی تعلیمات کے خاص خاص پہلوؤں کی تبلیغ و تلقین کرتے۔ جو کچھ کہتے خود اُس پر عمل کرتے اور عامّۃ المسلمین کو ذاتی مثالوں سے حق کی راہ پر چلاتے۔

مدراس میں سیّد محمد علی رامپُوری، سیّد صاحب کے زمانے ہی سے کام کر رہے تھے اور اب صادق پُور کے مرکز سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہاں انھیں بڑی کامیابی حاصل ہُوئی۔ ہزاروں لوگ راہِ راست پر آئے۔ ان میں سب سے نمایاں مدراس کے ایک رئیس نواب خان عالم خان بہادر تہوّر جنگ ـــــ اور اُن کی صاحبزادی (نواب ارکاٹ کی بیگم) تھے۔ مدراس کا مُسلمان معاشرہ، برِصغیر کے دوسرے علاقوں سے مختلف نہ تھا۔ وہی اخلاقی بے راہروی، کبائر کا ارتکاب، کِتاب وسُنّت سے بے خبری، بدعات اور غیر شرعی اعمال ورسوم کی گرم بازاری یہاں بھی تھی جو دوسرے مقامات پر پائی جاتی تھی گمراہی کی انتہا یہ تھی کہ ہندوؤں کا ایک دیوتا نرسو تھا، اُسے مُسلمان عوام وخواص بھی پُوجا کرتے تھے۔ اس دینی اور اخلاقی ماحول میں حق کی دعوت بلند ہُوئی اور یہاں بھی اِس کا ردِّ عمل دوسرے مقامات کا سا ہُوا۔ جن لوگوں نے دعوت قبول کر لی ان کے شب و روز میں زبردست انقلاب آ گیا۔ شراب، سیندھی، گانجا پینے والے فاسق اور نرسو کو پُوجنے والے نام نہاد مُسلمان تائب ہو گئے اور پنج وقتہ نماز پڑھنے لگے۔ غیر شرعی اور کافرانہ رسوم ترک کر دیں اور سُنّت کی اتباع کرنے لگے۔ دینداری اور تقویٰ کی بادِ نسیم نے مردوں ہی کو نہیں عورتوں کو بھی ایسا ذوقِ عبادت عطا کیا کہ وہ تہجّد گزار ہو گئیں۔ بَیعت کرنے والے عام مسلمانوں کی زندگیوں میں جو تغیّر آیا وہ تو آیا، اُونچے طبقے کے افراد بھی جب حق کی آواز سُن کر بدلے تو سراپا بدل گئے۔ بَیعت سے پہلے نواب خان عالم خان کی زندگی کا رنگ ڈھنگ ٹھیک وہی تھا جو ہر دور میں اعلیٰ طبقے کا رہا ہے، لیکن سیّد بادشاہ کے قافلے میں شریک ہُوئے

تو اس طرح کہ اُس کے رنگ میں پوری طرح رنگے گئے۔ اتباعِ سنّت کی راہ اپنائی تو پھر کوئی صعوبت اور مشکل انھیں اس راہ پر آگے بڑھنے سے نہ روک سکی۔ بیعت کرتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ گھر کی وہ تمام چیزیں تُڑوا ڈالیں جو شریعت کی رُو سے ناجائز تھیں۔

سیّد محمّد علی کی یہ کامرانیاں ایسی نہ تھیں کہ باطل انھیں چُپ چاپ برداشت کر لیتا۔ ان کے خلاف ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ علمائے سُوء اور بگڑے ہوئے رؤسا اس ہنگامے میں پیش پیش تھے۔ سیّد پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ انھیں اذیتیں دی گئیں۔ زہر تک دینے کی کوشش ہوئی۔ نواب خان عالم خان تحریکِ دعوت کے ممتاز ترین فرد تھے، اُن پر بھی وار ہوئے۔ نواب ارکاٹ کے کان بھرے گئے۔ نواب خان عالم کو دربار سے گیارہ سو روپے ماہانہ تنخواہ ملا کرتی تھی، مخالفوں نے وہ بند کروادی۔ یُوں اُنھیں معاشی مار مار کر تحریک سے کاٹ دینا چاہا۔ ان کی صاحبزادی بھی ابتلا سے محفوظ نہ رہیں۔ نواب ارکاٹ نے جبر کے حربے تک آزمائے کہ وہ غیر شرعی مراسم پھر اختیار کر لیں جنھیں چھوڑ چکی تھیں، لیکن باپ بیٹی نے ہر ظلم پُوری شانِ استقامت کے ساتھ سہا۔ حق پرست خاتون نے تو نواب سے صاف صاف کہہ دیا کہ مَیں آپ کی بیوی ہُوں اور آپ کے ہر فرمان کے آگے سر جھکانے کو تیار ہُوں لیکن قبر اور آخرت کے معاملات ہر ایک کے الگ الگ ہیں۔ مَیں آپ کے فرمان سے کسی غیر شرعی امر کی مرتکب نہیں ہوسکتی۔ گویا عزیمت کی اُس پُتلی خاتون نے وہ راستہ اختیار کیا جس کی تلقین رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمائی تھی لا طاعۃ لمخلوقٍ فی معصیۃ الخالق۔ کسی انسان کو اللہ کی نافرمانی پر مبنی حکم کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔

طُوفان اُٹھتے رہے، سیّد محمّد علی اور اُن کے ساتھی پُوری شانِ استقامت کے ساتھ ان طُوفانوں کا مقابلہ کرتے اور زخم کھاتے رہے، لیکن کلمۂ حق کا پرچم سرنگوں نہ ہونے دیا۔

○

جس زمانے میں جنوبی ہند کے اربابِ وفا اور اصحابِ صدق وصفا سنگین

آزمائش میں مبتلا تھے تقریباً اُسی زمانے میں حیدر آباد دکن میں ابتلا کے تیرہ و تار بادل مردانِ حق پر ہجوم کر رہے تھے۔ مردِ درویش — مولانا ولایت علی — کی انقلاب آفریں پکار نے خوابِ غفلت میں سرمست فضا میں زبردست تلاطم برپا کر دیا تھا۔ دِلوں کی دنیا اُلٹ رہی تھی اور زندگی کے طور طریقے بدل رہے تھے۔ پُرانے شب و روز کے پُشتیبان اور اُن سے مفادات پانے والے طبقات، انقلاب کی اس تند و تیز رَو کو بڑھتے اور زندگیوں کو اپنی لپیٹ میں لیتے ہُوئے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے تھے، تاہم یہ لوگ چونکہ اقتدار اور اثر و رسُوخ کے مالک تھے اس لیے اُن کے اس خوف نے سخت مزاحمت کی صُورت اختیار کر لی تھی۔ نواب مبارز الدولہ حلقۂ دعوت میں شامل ہُوئے تو مخالفین تلملا اُٹھے۔ اور نواب صاحب کے دوسرے بھائی تو اس اقدام پر سخت چراغ پا ہو گئے۔ انھوں نے انھیں باپ دادا کی روش چھوڑنے اور مولویوں کے سے طَور طریق اپنا کر حکمران خاندان کو بدنام کرنے کا مجرم قرار دیا۔ اِدھر ان عورتوں نے شور مچا کر نواب صاحب کے خلاف نفرت کے سُلگتے جذبات کو بھڑکتے شعلوں میں بدل دیا جنھیں اُنھوں نے اپنے حرم سے رُخصت کر دیا تھا۔

نظام اور نواب مبارز الدولہ کے درمیان اس بڑھتی ہُوئی خلیج سے اُن لوگوں کی بَن آئی جو تحریک دعوتِ دیں کو کچل دینے کے خواہشمند تھے، لیکن نواب صاحب کی وجہ سے سخت بے چارگی محسوس کر رہے تھے۔ تحریک حیدر آبادی معاشرے میں ایک اہم قوت بنتی جا رہی تھی۔ ان لوگوں نے جنھیں نظام کا خصوصی تقرب حاصل تھا اسی کو ہَوا بنا کر نظام کے سامنے پیش کیا اور اُس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی کہ نواب مبارز الدولہ اس قوت کی مدد سے خود ریاست کے والی بننا چاہتے ہیں۔ اُدھر انگریز اپنی جگہ مضطرب تھے۔ وہ ذہنی بیداری اور سماجی اصلاح و تطہیر کی اِس تحریک کو اُس ماحول کے لیے نہایت مہلک سمجھتے تھے جسے ریاستوں میں قائم رکھنا چاہتے تھے۔ یُوں نواب مبارز الدولہ اور تحریک کے دوسرے ممتاز افراد کی دُہری نگرانی ہو رہی تھی۔ ایک طرف نظام کے پرچہ نویس تھے اور دوسری طرف انگریزوں کے "ہاتھ پاؤں" اور "آنکھیں"، تاہم ان اصحاب کو ابھی تک صرف ایک ہی جُرم کا مرتکب پایا گیا تھا اور وہ تھا باپ دادے کی روش چھوڑ

دینے کا جرم!

فکرو اضطراب کا مدوجزر دلوں میں برپا تھا کہ ایک نیا واقعہ پیش آیا۔

سید بادشاہ کی شہادت سے تحریک دعوتِ دین و جہاد میں اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ سرحد میں مٹھی بھر مجاہدین رہ گئے تھے اور ہندوستان میں تحریک کے کارکنوں کو افسردگی نے آلیا تھا۔ اِن حالات میں تحریک میں تازہ رُوح اور نیا جوش و خروش پھُونکنے کے لیے شاہ اسحٰقؒ کے داماد سید نصیر الدینؒ دہلوی نے پرچم جہاد لہرایا اور ایک جماعت کو لے کر راہِ ہجرت پر گامزن ہو گئے۔ ان کا ارادہ کابل اور جلال آباد جانے اور افغان حکمران دوست محمد خان سے تعاون کرنے کا تھا جو ایک طرف سکھّوں سے اور دوسری جانب انگریزوں سے مصروفِ پیکار تھا لیکن سندھ پہنچے تو وہاں کے حالات دامن گیر ہو گئے۔ مزاریوں کی سکھوں کے ساتھ کش مکش جاری تھی۔ وہ اپنی آزادی کے تحفظ کی جنگ لڑ رہے تھے۔ سید نصیر الدینؒ نے وہیں ٹھہرنے اور اُن کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اُنھوں نے ہندوستان بھر میں سید بادشاہ کے خلفا اور مخلصین کے نام اعلام نامے بھیجے۔ اعلام نامے سیدہ اُمّ اسمٰعیل (اہلیہ سیدِ شہیدؒ) کی جانب سے تھے۔ اُن میں مسلمانوں سے کہا گیا تھا کہ وہ سید نصیر الدینؒ کی مہم میں اُن کا ساتھ دیں، جن کے پاس زادِ راہ، سواری اور ضرورت کی دُوسری چیزیں موجود ہوں وہ خود آئیں اور جو خود نہ آسکیں وہ دوسروں کی مدد کریں۔

ایک اعلام نامہ نواب مبارز الدولہ کے ملاحظے میں بھی پیش ہوا۔ نواب صاحب نے مولوی محمد آصف اور سید عباس اور تحریک کے تین دوسرے ممتاز کارکنوں کو طلب فرمایا اور حکم دیا کہ وہ پچاس مجاہدین ساتھ لے کر سندھ جائیں، وہاں حالات کا خود جائزہ لیں، دیکھیں کہ سندھ کے حکمران کس پوزیشن میں ہیں، وہ مجاہدین کا ساتھ کس حد تک دے سکیں گے، مجاہدین کے کیمپ اور اخراجات و مصارف کی کیا صُورت ہے، غرض ہر پہلو سے جائزہ لے کر کسی قابلِ اعتماد وکیل کے ذریعے ہمیں مطلع کریں۔ ہم مجاہدین کی حتی الامکان مدد کریں گے، انھیں بہت سا سازو سامان اور آدمی بھیجیں گے۔ ان حضرات نے مولانا بدر الزماں بردوانی (کلکتہ) سے ایک خط کے ذریعے سید نصیر الدین سے متعلق دریافت کیا اور اعلام نامے

کے سلسلے میں رہنمائی چاہی۔ وہاں سے جواب آیا کہ وہ تحریک ہی کے آدمی ہیں اور سید صاحب کا چھوڑا ہوا کام کرنے کے لیے میدان میں آئے ہیں۔ اب یہ حضرات شولا پور، پونا اور بمبئی کے راستے بحری جہاز سے کراچی پہنچے اور وہاں سے حیدر آباد ہوتے ہوئے سید نصیر الدین کی خدمت میں شکار پور حاضر ہوئے اور تمام مطلوبہ معلومات ایک مفصل مکتوب کی صورت میں اپنے دو ساتھیوں کے ہاتھ نواب مبارز الدولہ کو بھیج دیں۔

نواب صاحب نے تحریک کے کارکنوں میں سے لڑنے کے قابل افراد منتخب کرنے کا حکم دے دیا۔ ان کے شب و روز پر انگریز اور خود ان کے اپنے بھائی کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ خفیہ پولیس کے آدمی تحریک سے تعلق رکھنے والوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ اعلام نامے کی آمد، پچاس پچپن افراد کا حیدر آباد سے سندھ جانا اور وہاں سے حاصل کردہ معلومات کی بنا پر رضا کاروں کی بھرتی اُن کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

یہ ایک خالصتاً دینی فریضہ تھا جو اُنھوں نے ادا کرنا چاہا تھا۔ اس کا سلطنتِ آصفیہ کی داخلی اور حکمران خاندان کی محلّاتی سیاست سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا، لیکن مخالفین نے اس کو نظام کے سامنے اور ہی رنگ میں پیش کیا۔ ان کی رپورٹ تھی کہ نواب مبارز الدولہ نظام کے خلاف بغاوت کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ تلور کے ایک انگریز مجسٹریٹ نے تو یہ انکشاف کر کے اس رنگ کو اور بھیانک بنا دیا کہ حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش پکڑی گئی ہے۔ نظام کی حکومت نے فوری کارروائی کی۔ نواب مبارز الدولہ اور تحریک کے دس نمایاں کارکن ۱۳ ربیع الاوّل ۱۲۵۵ھ کو گرفتار کر لیے گئے۔ نواب صاحب کو گولکنڈہ کے قلعہ میں بھیج دیا گیا۔ اس سے پہلے بھی انھیں دو مرتبہ پکڑا گیا تھا، مگر ان گرفتاریوں کا سبب اُن کا باپ دادے کی روش کے خلاف طرزِ عمل تھا۔ اب مخالفین نے بھرپور وار کیا تھا۔ اب اُن پر بغاوت اور سازش کا الزام تھا۔ اُن کے ساتھیوں کو عام جیلوں میں ٹھونس دیا گیا۔ پھر شہر شہر گاؤں گاؤں میں پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی اور تحریک کے کارکنوں کی بھاری تعداد بندی خانوں میں پہنچ گئی اور تحریک کا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ اِصلاحِ عقائد اور تطہیرِ فکر و کردار کی جس تحریک میں مخالفین کو اپنے مفادات

اور غلط نظریات کی موت نظر آتی تھی اُسے اُنھوں نے بڑے ڈرامائی انداز میں کچلوا دیا۔ نواب مبارز الدولہ قید و بند ہی میں اپنے اللہ سے جا ملے۔ تحریک کے کارکن مدّتوں جیلوں میں پڑے سڑتے رہے۔ صرف دو اصحاب مولوی زین العابدین اور مولوی محمد عبّاس کسی طرح فرار ہو کر عظیم آباد پہنچ گئے۔ اُنھیں الہ آباد اور اڑیسہ میں تنظیم کا کام سونپ دیا گیا۔

بے مثال خانقاہ

بڑے حضرت نے بنگال میں دعوت و تبلیغ کا فرض اپنے منجھلے بھائی مولانا عنایت علی کو سونپا تھا۔ آپ اپنے برادرِ بزرگ ہی کی طرح محنتی، فعّال اور متحرک شخصیت تھے۔ اللہ نے اعلیٰ تنظیمی اور قائدانہ صلاحیّتوں سے نوازا تھا۔ میدانِ جنگ کے تو شہسوار تھے جنگی اسٹریٹجی تیار کرنے اور فوجوں کو لڑانے میں بھی کمال حاصل تھا اپنی انھیں صلاحیّتوں سے کام لے کر انھوں نے بنگال کے طُول و عرض میں دعوت پہنچائی اور تحریک کو ایسی مضبوط بنیادوں پر منظّم کیا کہ مستقبل کے معرکوں میں بنگال کی جماعت ایک مدّت تک رضاکاروں کی بھاری تعداد فراہم کرتی رہی۔ مولانا عنایت علی نے مسلسل سات برس سرگرم تگ و دَو میں گزارے۔ وہ دَورے پر نکلتے تو کئی ماہ گھر سے باہر رہتے۔ قریہ قریہ گھومتے اور حق کا پیغام ایک ایک گھر تک پہنچاتے۔ سوتوں کو جگاتے اور جاگنے والوں کو عمل پر اکساتے۔ زیادہ تر دَورے پاپیادہ کرتے۔ نہ کھانے پینے کا ہوش تھا اور نہ راحت و آرام کی فکر۔ اللہ نے دنیا کی نعمتیں اور عیش و راحت کا سامان فراواں عطا فرمایا تھا، لیکن سیّد بادشاہ کی قیادت میں اُس کے راستے پر گامزن ہوئے تو اس سارے سر و سامان کو اس طرح چھوڑا کہ پھر کبھی اُس کا خیال تک دِل میں نہ لائے۔ حق کی راہ میں اپنے آپ کو خاک کر ڈالا۔ طبیعت قدرتے تُند تھی جیسا کہ فوجی مزاج کا خاصہ ہوتا ہے، لیکن دعوت و تبلیغ کی مہم پر نکلتے اور رُشد و ہدایت کی حاجت مند خلقِ خدا سے واسطہ پڑتا تو فولاد کی مانند کڑی طبیعت ابریشم کی طرح نرم ہو جاتی حق کی راہ میں عجز و انکسار مگر عزیمت کے ساتھ پیش قدمی کرتے مشکلات و مصائب پیش

لُٹتے تو صبر و استقامت سے اُن کا سامنا کرتے۔ بارہا فاقہ کشی کی نوبت آجاتی، لیکن ہر حال میں راضی برضائے الٰہی رہتے۔ پیہم سفر سے تھک جاتے تو دو ایک ماہ کے لیے حاکم پور آجاتے جو آپ کا مستقر تھا۔ آپ کی بیوی یہیں رہا کرتی تھیں۔ یہ زمانہ بھی اطمینان و سکون سے نہ گزرتا۔ حاکم پور اور گرد و نواح کے علاقے ان کے رہوارِ عمل کی جولان گاہ بن جاتے۔ فروعی اور متنازعہ مسائل پر گفتگو کرنے سے گریز کرتے اور دین کی بنیادی دعوت کی طرف لوگوں کو بلاتے۔ سارا زور فکر و عقائد کی درستی اور کتاب و سُنّت کی اتباع پر دیتے۔

مسجدوں کی تعمیر اور ان میں نمازِ باجماعت اور جمعہ کا قیام اُن کی دعوت کا خصوصی پہلو تھا۔ بنگال میں اکثر بستیاں ایسی تھیں جہاں کوئی مسجد نہ تھی۔ اس قسم کے دیہات میں آپ مسلمانوں کو مسجد کی تعمیر پر آمادہ کرتے، کچھ مدت خود وہاں رہ کر اُنھیں دین کی تعلیم دیتے اور جب چند آدمی تیار ہو جاتے تو مسجد کی امامت اُن میں سب سے زیادہ موزوں شخص کو سونپ دیتے اور اُسے ہدایت کرتے کہ وہ مسجد اور دعوت و تبلیغ کا کام اپنے ساتھیوں کے مشورے سے انجام دے۔ بعض بستیوں میں مسجدیں تو تھیں، لیکن امام نہ تھے۔ لوگ انفرادی طور پر نماز پڑھا کرتے، اکثر اذان تک نہ ہوتی۔ ایسی مساجد میں بھی مولانا تحریک کے تربیت یافتہ امام مقرر کرتے اور باجماعت نماز کا نظام قائم کرتے۔ اس طرح پورے علاقے میں مسجدوں کا جال بچھ گیا۔ اور وہ دینی اور معاشرتی رہنمائی کا مرکز بن گئیں۔ ہر مسجد میں مکتب تھا جس میں بڑے بوڑھے قرآن اور حدیث کی تعلیم حاصل کرتے اور بچے لکھنا پڑھنا سیکھتے اور قرآن حفظ کرتے۔

مولانا عنایت علی اخلاقی و دینی تربیت میں اس بات پر خصوصی زور دیتے کہ لوگ آپس میں لڑنے جھگڑنے اور ایک دوسرے کا حق مارنے سے باز رہیں، کوئی تنازعہ پیدا ہو تو باہم مل کر طے کر لیں، مقدمہ بازی کی نوبت نہ آنے دیں۔ انگریزی قانون پر مبنی عدالتیں تحریک کے نقطۂ نظر سے طاغوت کی عدالتیں تھیں جن میں جانا اور اپنے تنازعات کے فیصلے کرانا کسی مسلمان کے لیے جائز نہ تھا۔ اس مقصد کے لیے

مولانا نے اپنا عدالتی نظام قائم کیا۔ اگر کبھی کوئی جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا تو فریقین اپنے گاؤں یا محلے کے امام مسجد کے پاس اپنا مقدمہ لے جاتے۔ امام مسجد کتاب و سُنّت کے مطابق فیصلہ کرتا۔ اگر مقامی سطح پر جھگڑے کا تصفیہ نہ ہو پاتا تو مقدمہ علاقے کی جامع مسجد کے امام کے پاس چلا جاتا۔ یہ امام تعلیم یافتہ اور متدین ہوتا اور سیشن جج کے فرائض انجام دیتا۔ یہاں بھی قضیہ نہ چکتا تو اس کی اپیل مولانا عنایت علی بنفسِ نفیس ان مقامات پر پہنچ کر سُنتے۔ فیصلہ سُنانے کے بعد وعظ و ارشاد کے ذریعے مقدمے کے فریقین اور دوسرے حاضرین کا تزکیہ نفس کرتے، اُنھیں محبت و اخوت کے ساتھ رہنے کی تلقین فرماتے اور پھٹے ہوئے دِلوں کو جوڑنے کی کوشش فرماتے۔ ہر علاقے میں ایک کونسل تھی جو تحریک سے وابستہ بستیوں اور علاقوں کے معاملات صلاح مشورے سے طے کرتی۔

شرعی عدالتوں کا قیام کچھ مولانا عنایت علی ہی سے مخصوص نہ تھا۔ یہ اس دَور میں تحریک کی عمومی پالیسی تھی۔ مولانا ولایت علی کے خلفا نے اپنے اپنے حلقوں میں ایسا ہی عدالتی نظام قائم کر رکھا تھا۔ یہی کیفیت اِن حلقوں کے جماعتی نظام کی تھی۔ ضلع وار مرکز قائم تھے جن کا رابطہ اپنی ماتحت دیہاتی اور قصباتی جماعتوں سے تھا۔ یہ مراکز تبلیغی اجتماعات کا اہتمام بھی کرتے اور زکوٰۃ، صدقات، عمومی لگان اور ہنگامی عطیات کی وصولی کا انتظام بھی۔

اِن حضرات کی جدّوجہد سے چند برس کے اندر اندر مُبلّغین کی بڑی تعداد تیار ہوگئی۔ یہ لوگ اپنے رہنماؤں کی طرح مخلص، جفاکش، محنتی اور فعّال تھے۔ ان کا کردار بے داغ تھا۔ تحریک کے مفاد پر بڑے سے بڑے ذاتی مفاد کو بلا پس و پیش قربان کر دیتے۔ راحت و آرام کی زندگی بسر کرنے کی مقدرت رکھتے ہوئے بھی اُس کے قریب نہ بھٹکتے سادہ پہنتے اور رُوکھی سُوکھی کھاتے۔ سال میں کئی کئی مہینے سفر میں رہتے اور گھر بار اور بال بچّوں کی فکر کبھی اُن کی راہ میں حائل نہ ہوتی۔ جہاں رات آجاتی وہیں آسمان تلے فرشِ خاکی پر ڈیرے ڈال دیتے۔ ان کی اس سادہ، بے لوث، مُتّقیانہ اور للّٰہیت کی زندگی نے ان کے اندر بے پناہ مقناطیسیت بھر دی تھی، جن دیہات اور علاقوں سے

گزرتے وہاں کے لوگوں کو یہ زندگی اپنی جانب کھینچ لیتی۔ شروع شروع میں یہ طول طویل سفر وہ عموماً اکیلے کیا کرتے تھے، پھر دو ایک کارکن بھی ساتھ رہنے لگے۔ ان کارکنوں کی تعلیم و تربیت سفر ہی کے دوران میں کرتے اور جب وہ ذہن و کردار میں پختہ کار ہو جاتے، دعوت و تحریک رُوح بن کر ان کی زندگی میں بس جاتی تو انھیں ایسے علاقوں میں متعین کر دیتے جہاں لوگ ابھی تک اس حیات بخش دعوت سے ناآشنا دنیا پرستی میں غرق غفلت و سرگشتگی کی زندگی میں گُم ہوتے۔ ان حضرات کا اندازِ بیان پیشہ ور واعظوں سے بالکل مختلف ہوتا۔ جہاں جاتے پُوری جُرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنی بات کہتے۔ حق جو کڑوا ہوتا ہے اور جاہلیت کی زندگی کے لیے ناقابل برداشت، بے خوف و خطر بیان کرتے۔ لیکن اس قدر شیریں اور سوز و درد سے معمُور انداز میں کہ دلوں کے تار مرتعش ہو جاتے اور آدمی کی حالت اُس مسافر کی سی ہو جاتی جو راستے کی دلفریبیوں سے لُطف اندوز ہونے کے لیے ذرا کی ذرا ٹھہر جائے اور غفلت کی نیند اُسے آ لے، اچانک کسی مردِ خدا کی یہ آواز چونکا دے کہ سونے والے اپنی منزل کھوٹی نہ کر، دن کا بڑا حصّہ گزر چکا اور جو رہ گیا ہے وہ ہاتھ سے نکلا جاتا ہے۔ مسافر آنکھیں ملتے ہُوئے اُٹھے اور دیکھے کہ واقعی سفر کا بہت سا قیمتی وقت اُس نے سوتے میں گنوا دیا ہے، احساسِ زیاں اُسے بے قرار کر دے اور وہ دن کی باقی رہ جانے والی ساعتوں کا ایک ایک لمحہ پُوری جانفشانی اور مستعدی کے ساتھ منزل کی طرف بڑھنے میں صرف کر دینے کا تہیّہ کیے اپنی راہ پر ہو لے۔

○

تحریک کا مرکز صادق پور بہت بڑی اور اپنے طرز کی بے مثال خانقاہ تھا۔ جو لوگ مُبلّغین کے مواعظ اور دعوت سے متأثر ہُوتے انھیں یہاں کُچھ مدّت ضرور حاضری دینا پڑتی۔ سال کے بارہ مہینے لوگوں کی چھوٹی بڑی ٹولیوں کی آمد و رفت جاری رہتی۔ اسی اعتبار سے تحریک کی مخصوص زبان میں بڑے حضرت کی حویلی، قافلہ یا کارواں سرائے کہلاتی تھی۔ یہاں پہنچ کر آدمی محسوس کرتا کہ وہ ایک نئی دنیا میں آ گیا ہے۔ دنیا جس میں نیکی رُوح بن کر جاری و ساری تھی۔ صادق پُور کی سادہ سی مسجد ان دنوں کی یاد دلاتی

تھی جب مسجدوں کو شوکت و عظمت اور تزئین و آرائش کا رنگ و آب دینے کے بجائے انسانوں کو نیکی اور اخلاق سے مزیّن کرنے اور ان کے فکر و عمل میں اسلام کا مقصود و مطلوب انقلاب لانے پر ساری توانائیاں اور صلاحیتیں صرف کی جاتی تھیں۔ مسجد کی فضا میں ذکر و فکر اور تسبیح و تہلیل سے ایک دلکش تقدس رچا بسا محسوس ہوتا۔ نمازیں اول وقت پر اور طُول طویل ہوتیں کہ اہلِ عزیمت کا ہمیشہ یہی شعار رہا۔ فرض کی ادائیگی کا وقت ہوجاتا تو وہ اُسے ادا کرنے میں جلدی کرتے، مبادا پھر توفیق ہی نہ ملے، اللہ نے جو مُہلتِ عمل دے رکھی ہے ختم ہوجاتے اور فرشتۂ اجل رگِ جاں کاٹ کر رکھ دے اور فرض کا بوجھ گردن پر رہ جائے۔ پھر آخری وقت کے انتظار میں بیٹھے رہنے کا معمول انسان کے اندر سرسراتی ہوئی کاہلی اور غفلت پسندی کی غمازی کرتا ہے اور اُسے ارباب عزیمت نے ہمیشہ ناپسند کیا ہے۔ دراصل عزیمت کی راہیں الکسی پن کا شکار اور کاہل و غافل لوگوں کے لیے بنی ہی نہیں ہیں۔ ان راہوں پر چلنے کے لیے تو ہر لمحے فوجیوں کی طرح مستعد اور چاق چوبند رہنا پڑتا ہے۔ مردانِ حق تو اللہ کی فوج کے وہ سپاہی ہیں کہ جونہی ڈیوٹی شروع ہونے کی پکار بلند ہوتی ہے اسے ادا کرنے صف در صف نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ فرض نمازوں کے علاوہ رات کو تہجد اور نوافل کا اہتمام بھی بڑے ذوق و شوق سے ہوتا۔ اس طرح یہاں پہنچتے ہی آدمی پر بالکل غیر شعوری طور پر دعوت کا عملی رنگ چڑھنے لگتا۔ قرآن و حدیث کا درس ذہنوں کو روشن اور دِلوں کو صیقل کرتا، ان کے اندر تحریک کے افکار و نظریات راسخ کرتا۔ جمعہ کا خطبہ جو شہر کی عام مسجدوں سے بالکل مختلف ہوتا سُننے والوں کو اسلام کے افکار و عقائد اور تعلیمات کو عملی زندگی میں نافذ کرنے اور برتنے پر اُکساتا۔

اس بابرکت و پاکیزہ دُنیا کے دو خصوصی پہلو اور بھی تھے۔ بڑے حضرت ہر ہفتے منگل کی رات نمازِ مغرب کے بعد اپنی وسیع حویلی میں وعظ فرماتے جس سے فیضیاب ہونے کی عام دعوت تھی۔ کمرے میں ایک جانب پانچ چھ سو عورتیں ہوتیں اور دوسری جانب چھ سات ہزار مرد۔ عُلما اور فضلا بھی خاصی تعداد میں حاضر ہوتے۔ وعظ بے حد

پُرتاثیر ہوتا۔ لوگوں کا حال دگرگوں ہو جاتا۔ قیامت، آخرت میں حساب کتاب اور جہنم کی ہولناکیوں کا بیان ہوتا تو ایک تصویر سی سامعین کی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی اور وہ زار و قطار رونے لگتے۔ جنّت اور اُس کی نعمتوں کا ذکر ہوتا تو دِلوں میں انھیں حاصل کرنے کا ولولہ موجزن ہو جاتا۔ رمضان میں تو گویا بادِ بہاری چل پڑتی۔ تلاوتِ قرآن، رکوع و سجود اور اذکار اور اورادِ مسنونہ شب و روز کے ایک ایک لمحے کا حُسن بن جاتے۔ نمازِ تراویح دو عشروں تک رات کے پہلے حصّے میں مسجد کے اندر ہوتی اور آخری عشرے میں پچھلی رات کو بڑے حضرت کے مکان میں ایک طرف مرد ہوتے اور دوسری جانب خواتین۔ رمضان کی دُعا اور تراویح میں شرکت کے لیے سینکڑوں مرد و زن دور دراز کے دیہات سے آتے اور پُورا مہینہ صادق پُور کے مہمان خانے میں قیام کرتے۔ ہر شخص کو دو وقت کھانا فراہم کیا جاتا۔ روزانہ افطار کے وقت بلند آواز سے طویل دُعا ہوتی۔ بے حد سحر انگیز سماں ہوتا۔ بڑے حضرت خود ہاتھ پھیلائے آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں دُعا کرتے۔ پُورے مجمع پر رقّت طاری ہو جاتی، سسکیاں اور ہچکیاں بلند ہوتیں، آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے۔ اللہ کا بندۂ عاجز ہونے کا احساس ہر دل میں جاگ اُٹھتا۔ بندگی و بے چارگی کے اس احساس کے ساتھ ساتھ اللہ کے حاجت روا، مشکل کُشا، رزق رساں، شفا بخش اور دستگیر ہونے کا تصوّر دل و دماغ میں گہرا نقش ہو جاتا۔ زندگی کی کٹھن راہ پر چلتے ہُوئے قدم قدم پر پیش آنے والے احوال میں صرف اُسی سے دستگیری اور نصرت کی التجا، اُس کے ابرِ کرم سے فیضیاب ہونے کی تمنّا اور عبادات و دُعاؤں کو شرفِ قبول بخشنے کی استدعا زبان پر ہوتی۔ ہر دُعا اور التجا پر آمین آمین کی پُرسوز پکار سے بے پایاں لذّت و سرور رگ و پے میں دوڑنے لگتا۔ یُوں افطاری کے وقت کی یہ اجتماعی دُعا تربیتِ فکر و نظر، تطہیرِ کردار اور حصُولِ قربِ الٰہی کے نصاب کا بڑا مؤثر حصّہ تھی۔ اللہ پر توکّل فزوں تر ہو جاتا، مصائب و شدائد کے لمحات میں اس کے دامنِ رحمت میں پناہ لینے اور اُسی کی طرف رجوع کرنے کا جذبہ اُبھرتا۔ اُس کی الوہیت و ربوبیت پر ایمان پختہ اور گہرا ہو جاتا، بندگی کا رشتہ اور مضبوط ہو جاتا اور انسان اپنے بادشاہ،

آقا و مولا اور حقیقی رازق اور پالنہار کو اپنی شہ رگ سے بھی قریب محسوس کرنے لگتا۔

بڑے حضرت تربیت کے لیے آنے والے ایک ایک کارکن کی طرف خصوصی توجّہ دیتے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے جُداگانہ صلاحیتیں اور توانائیاں عطا کی ہیں۔ وہ فطری طور پر نیک ہوتا ہے لیکن معاشرے کا ماحول، تعلیم و تربیت کا غلط انداز یا فقدان اور نفسیاتی نشوونما کی خامیاں اُسے حالات کے بہاؤ میں بہالے جاتی ہیں۔ بڑے حضرت اُن کی تربیت اس انداز میں کرتے کہ ان کی چھپی ہُوئی صلاحیتیں اُبھر آتیں، ان کی توانائیاں مثبت راہوں میں صرف ہونے لگتیں اور ان کے خمیر میں گُندھے ہُوئے نیکی کے جذبے کو اس طرح جِلا مِل جاتی کہ وہ پُوری زندگی پر چھا جاتا۔ بڑے حضرت تحریک کے کارکنوں میں دو اور باتوں پر بہت زور دیتے۔ ایک دُنیا سے بے رغبتی دوسرے نفس کُشی۔ دُنیا کی خواہشات کا بندہ بن کر اور اُس کی دلآویزیوں میں کھو کر انسان زندگی میں کوئی بھی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا، کجا یہ کہ دینِ حق کو سربلند کرنے کا ارفع و اعلیٰ مقصد اس کے ہاتھوں انجام پائے۔ یہی کیفیّت نفس کی ہے۔ وہ اگر سرکش ہو اور لذتوں میں غرق رہے تو نہ ان پابندیوں کو برداشت کرتا ہے جو دینِ حق نے لگائی ہیں اور نہ اُس کے اندر اُن مشکلات و مصائب کو انگیز کرنے کا کس بل ہی ہوتا ہے جن سے راہِ حق پر چلتے ہُوئے لازمًا دوچار ہونا پڑتا ہے۔

عجز و انکسار بھی بڑے حضرت کی تعلیم و تربیت میں ایک اہم اصول تھا۔ اس کا مقصد کارکنوں کو اس تصنّع بھری زندگی سے نجات دلانا تھا جس کا خول معاشرے کے ہر طبقے نے اپنے اُوپر چڑھا لیا تھا اور جس نے انھیں ایک اُمّت ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بیگانہ کر رکھا تھا۔ بڑے حضرت ایسی عملی تدبیریں اختیار کرتے کہ شرفا اُونچ نیچ کا تصوّر اور نسل و نسب پر فخر کرنا چھوڑ دیتے، عُلما اور فضلا اپنے جس علم و فضل پر ناز کیا کرتے ہیں، وہ ان کے لیے ذمّہ داری کا ایک ایسا بوجھ بن جاتا جس کے تلے وہ اپنے آپ کو پِستا ہُوا محسُوس کرتے اور اس ذمّہ داری کو پُورا کرنے کی جدّوجہد میں دن رات ایک کر دیتے اور پھر بھی آخرت کی پُرسِش کا ہَول انھیں کھائے جاتا کہ کہیں اُن کا

حال اُس قاری قرآن کا سا نہ ہو جسے قیامت کے روز اللہ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ اللہ اس سے پوچھے گا کہ دنیا میں تم نے کیا کچھ کیا۔ وہ کہے گا میں نے تیرا قرآن پڑھا اور دوسروں کو پڑھایا تاکہ تیرا دین پھیلے۔ اللہ فرمائے گا تم جھوٹ کہتے ہو، تم نے یہ سارے پاپڑ اس لیے بیلے تھے کہ دنیا میں بہت بڑے قاری کہلواؤ۔ پھر فرشتوں کو حکم دے گا کہ اسے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے لے جاؤ اور جہنم میں جھونک دو۔

یہ حضرات پیشہ ور واعظ اور مبلغ نہ تھے۔ اِن کے پیشِ نظر اللہ کی رضا اور اُس کے بندوں کی ہدایت کے سوا اور کوئی مقصد نہ ہوتا۔ ان کی تقریر اور وعظ کا انداز نہایت سادہ اور دل میں اُتر جانے والا ہوتا۔ وہ فروعات سے بچتے اور کتاب و سُنّت کی طرف براہِ راست بلاتے۔ بحث مباحثوں اور مناظروں سے دامن کش رہتے اور افہام و تفہیم کے انداز میں اُن تک اپنی بات پہنچاتے۔ عُلمائے سے علمی بحث ہو بھی جاتی تو صرف عُلمائے کے حلقے تک محدود رکھتے اور عامّتہ المسلمین کو اس میں نہ اُلجھاتے۔ یوں برِصغیر کی تاریخ میں پہلی بار عام لوگوں کی ذہنی سطح کے مطابق دینِ خالص کی دعوت پہنچانے کا اہتمام ہُوا۔

اس تربیت سے عابدوں کو اپنی عبادت و طاعت کے مظاہرے اور شب زندہ داریاں ہیچ نظر آنے لگتیں۔ جو لوگ متموّل طبقے سے تعلق رکھتے تھے اُن کا دولت اور کبر و نخوت کا نشہ ٹوٹ جاتا۔ اُن کے اندر حق کی خاطر تن من دھن لٹا دینے کا جذبہ جواں ہو جاتا۔ وہ مال و متاع اور سر و سامان رکھتے ہُوئے بھی فقر و مسکینی اور بے سر و سامانی کی زندگی بسر کرتے اور خدا کی دی ہُوئی دولت خدا کے کاموں اور اُس کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے وقف کر دیتے۔ مسکینوں اور غریبوں میں فقر و توکّل کی رُوح پیدا ہو جاتی، وہ اپنے اللہ کے غیور، صابر و شاکر اور احسان مند بندے بن جاتے۔ انھیں اپنے پھٹے پُرانے کپڑے، سادہ غذائیں اور ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے دنیا کی ہر گراں مایہ چیز سے زیادہ عزیز ہوتے اور بادشاہ تک اُن کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ رکھتے۔ وہ سامانِ عیش کی جستجو میں زندگی کھپانے اور مُردار دُنیا کے پیچھے دوڑنے کے بجائے حق کو پھیلانے اور اُسے سر بلند کرنے کی تگ و دو

میں مصروف رہتے۔ تحریک کے فرائض کی پابندی اور کبائر سے اجتناب تو ضروری تھا ہی اور بڑے حضرت بیعت لیتے وقت اس کا عہد لیا کرتے تھے، نوافل کی کثرت اور تہجد کی ادائیگی کی بھی تلقین فرماتے کہ نفس کُشی کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہے اور وہ تمام اہلِ حق جنھوں نے دین کی راہ میں جدّ و جہد کو اپنا مقصدِ زندگی بنایا، نوافل اور تہجد کے ہمیشہ پابند رہے ہیں۔

دورانِ تربیت نظریاتی اور تہذیبی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ معاشرتی رُخ پر بھی توجّہ دی جاتی۔ کارکنوں سے مختلف سماجی کام کروائے جاتے۔ مقصد یہ ہوتا کہ تحریک کے کارکن عام لوگوں کے اندر گھُل مل کر رہیں۔ ان کی ضروریات اور مسائل کو اپنی ضروریات اور مسائل سمجھیں، انھیں حل کرنے کی تگ و دَو کریں اور ان پر کوئی مشکل آپڑے تو اُن کی مدد کریں۔

بڑے حضرت کا یہ اندازِ تربیت جسے اُن کے خلفا نے بھی اپنائے رکھا، زندگیوں پر بڑے گہرے اثرات مرتّب کرتا۔ نالہائے نیم شبی اور سحر خیزی آپ کے تربیت یافتہ افراد کی زندگی کا نمایاں وصف تھا۔ ان کی دُعاؤں میں عجب اثر ہوتا اور قول و بیاں میں ایسی حلاوت اور تاثیر کہ عُلما اور مشائخ سُنتے تو متحیّر ہوتے۔ اُن کو دیکھنے سے اللہ یاد آجاتا۔ انھیں رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد ہر وقت اپنے نفس کا احتساب کرنے پر آمادہ رکھتا کہ اس سے پہلے کہ تمھارا احتساب کیا جائے، اپنا محاسبہ خود کرلو۔ حَاسِبُوا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوا۔ وہ اپنے نَفَس نَفَس کا احتساب کرتے۔ اپنی ذرا سی لغزش پر مضطرب ہو جاتے اور بارگاہِ حق تعالیٰ میں عفو و کرم کی التجائیں کرتے۔ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر شرمسار ہوتے اور ان داغ دھبّوں سے اپنا دامن صاف کرنے کی فکر میں رہتے۔

بڑے حضرت کی تربیت ایک کٹھالی تھی کہ سونا اس میں تپ کر اور پگھل کر مَیل کچیل سے پاک صاف ہو جاتا اور کُندن بن جاتا۔ ایمان دِل کی گہرائیوں میں بس جاتا، اس کے تقاضے سیماب وار بے تاب کر دیتے اور انسان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا کی طلب میں اپنے مال و جان، دُنیا کی لذّتوں اور شادکامیوں اور مادّی زندگی سے تعلق رکھنے والی

ہر عزیز شے کو قربان کر دینے پر تیار ہو جاتا۔

○

دعوت و تبلیغ، اصلاحِ افکار و عقائد اور تزکیۂ نفس کا یہ کام سیّد بادشاہ کے حادثۂ شہادت (مئی ۱۸۳۱ء) کے بعد تقریباً گیارہ بارہ برس جاری رہا۔ مولانا ولایت علی اور اُن کے خُلفا نے یہ سارا عرصہ بے پناہ سعی و جہد میں گزارا۔ اس عرصے میں ہزاروں کارکُن تیار ہُوئے جن میں سے اکثر جوش و جذبہ اور کردار و عمل کے اعتبار سے خود بڑے حضرت کا نمونہ تھے۔ تحریک کے کٹر دشمن ہنٹر کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ جن لوگوں نے تحریک کی دعوت پر لبیّک کہی اُنھوں نے اپنی ساری زندگی اور اُس کی قوّتیں اس مقصد کے لیے وقف کر دیں۔ وہ اپنے آپ کو بالکل بھُول چکے تھے، انھیں کوئی چیز یاد تھی تو وہ تحریک اور اُس کی دعوت تھی۔ اُن کی زندگیاں بے داغ تھیں۔ "وہ انگریز کی حکومت کو کافر حکومت قرار دیتے اور اُسے تباہ کرنے میں ہمہ تن سرگرمِ عمل رہتے...... وہابی وہ ہے جو کسی سے نہ ڈرے اور نہ اصول کے خلاف کسی کی رعایت کرے۔ اُس کی زندگی کا راستہ صاف ہے۔ کسی قسم کی تہدید یا تشدّد اس کو اپنی راہ سے منحرف نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ اپنے عقیدے کے مطابق بڑے پاک طینت تھے۔ اُنھوں نے بغاوت میں حصّہ لیا تو کسی ادنیٰ مقصد کے لیے نہیں لیا۔"

تحریک کے مُبلّغین اور داعیوں کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہُوئے اُس نے لکھا:

"مقامی مُبلّغین بعض اوقات خطرناک آتش بیاں ثابت ہوتے ہیں، مگر میرے لیے ناممکن ہے کہ مَیں اُن کا نام ادب سے نہ لوں۔ ان میں سے اکثر خدا ترس نوجوان کی حیثیّت سے زندگی شروع کرتے ہیں۔ یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ وہابی مُبلّغ، سب سے زیادہ رُوحانیت رکھنے والے، سب سے زیادہ بے غرض اور بے لَوث ہوتے ہیں۔ وہ نہایت دلیری سے عوام النّاس میں تبلیغ کرتے ہیں۔ اُن کا سیاسی اَور مذہبی نصب العین انقلاب پسندوں کی اُمید و بیم کے عین مطابق ہے۔ اور اُن میں ہزاروں اشخاص ایسے ہیں جو فی الواقع بڑے ہی متّقی ہیں اور نفس کشی کو اپنی زندگی کا

نصب العین تصور کرتے ہیں۔ یہی افراد اَصل میں تمام جماعت کی برتری کا باعث ہیں اور یہ انہی کی برکت ہے کہ اس جماعت کو دُنیا دار لوگوں کی اکثریت بے حد عزت اور تقدس کی نظر سے دیکھتی ہے۔"

دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ تحریک کی تنظیم کا کام بھی جاری رہا۔ بظاہر سطح پر کہیں کسی نوعیت کی کوئی تنظیم دکھائی نہ دیتی۔ بس سیدھے سادے مبلّغین جن کی شخصیت میں کسی قسم کا عالمانہ کرّوفر نہ تھا، شہروں اور دیہات میں آتے جاتے اور تقریریں کرتے پائے جاتے۔ ان کی تقریروں اور وعظوں کا موضوع اہلِ ایمان کے عقائد و اعمال کی اصلاح و تطہیر ہوتا۔ اصلاحی افکار و نظریات کی اس عیاں لہر کے ساتھ ساتھ انھیں انقلابی قوت میں ڈھال دینے والی ایک خفیہ زیرِ زمیں رَو بھی جاری تھی۔ اس منظّم تحریک کا نظم و نثر میں اپنا لٹریچر تھا جو اگرچہ تقریروں اور وعظوں کا سا ہی اصلاحی رنگ لیے ہوئے تھا؛ تاہم اس کا انقلابی لب و لہجہ کہیں زیادہ بلند آہنگ تھا۔ تحریک جن جن علاقوں کو مسخّر کرتی ہُوئی بڑھتی، یہ لٹریچر اُس کے ساتھ ساتھ پھیلتا جاتا۔ یہ اپنے دَور کا بہترین لٹریچر تھا۔ اُس نے نہ صرف قلب و رُوح کو شعورِ راسخ بخشا بلکہ اُردو زبان کو تحریری اور علمی زبان بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

تحریک کو صادق پُور کی خانقاہ سے کنٹرول کیا جاتا، اس انداز سے کہ پنجاب کی آخری سرحدوں سے جنوبی ہند کے انتہائی کناروں تک کے کارکن اور متاثرین گرم جوشی کے ساتھ اس میں حصّہ لیتے۔ یہ تحریک دِلوں کی گہرائیوں میں کتنی گہری جڑیں پکڑ چکی تھی، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مَردوں نے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں، تاجر اور سوداگر پیشہ لوگ اپنی آمدنی کا خاصا بڑا حصّہ ہر مہینے ادا کرتے، عورتیں زیورات اور جواہرات تک بیت المال کو پیش کر دیتیں۔ انقلابی تحریکوں کی تاریخ میں پہلی بار خفیہ اصطلاحات اور خُفیہ طور طریق اسی جماعت نے وضع کیے، اِن اصطلاحات اور حربوں سے جماعت کے خاص کارکن ہی واقف ہوتے۔ خط کتابت میں بھی خفیہ اصطلاحات استعمال کی جاتیں۔ سرحدِ آزاد میں جہادی سرگرمیوں میں مصروف کارکنوں، مرکز کے عہدیداروں

اور مختلف علاقوں میں مرکز سے رابطے کا سلسلہ قائم رکھنے والے افراد کے کئی کئی نام ہوتے تاکہ انگریزوں کی دست بُرد سے محفوظ رہ کر تحریک کی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ اس طرح مختلف مقامات اور اشیا کے نام بھی فرضی ہوتے۔ یہ خُفیہ نظام ضرورتِ وقت کی پیداوار تھا، لیکن اس قدر مربُوط اور منظّم کہ انگریزوں کے اس پر پَے دَر پَے وار بھی اُسے پُوری طرح نہ توڑ سکے۔ یہ آخر وقت تک کام کرتا رہا اگرچہ اس کی ہیئت اور طریق کار میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی رہی۔

مولانا ولایت علی کی قائدانہ صلاحیتوں کا ایک مُثبت رُخ یہ تھا کہ اُنھوں نے دعوت و تنظیم کے پھیلاؤ کے نئے اُفق تلاش کیے اور اُنھیں وسعت دی۔ برِصغیر کا شمالی علاقہ خصُوصًا پنجاب سیّد صاحب کی زندگی میں تحریک سے متاثر نہ ہو سکا۔ دہلی سے متّصل چند اضلاع میں تحریک کے اثرات نے راہ پالی تھی، لیکن اس حد تک کہ کچھ لوگ انفرادی طور پر متاثّر ہُوئے۔ وسیع پیمانے پر تحریک کو کام کرنے کا موقع نہ ملا۔ وجہ یہ تھی کہ پنجاب کے بڑے علاقے پر سکھ چھائے ہُوئے تھے، وہاں کھلے عام اذان دینے تک کی اجازت نہ تھی کجا یہ کہ واعظین گاؤں گاؤں شہر شہر پھر کر مُسلمانوں کے اندر بیداری کی لہر پیدا کرتے، تاہم جونہی سکھ اقتدار کے چنگل کمزور پڑے، اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں آئے اور سکھ خانہ جنگی کا شکار ہو گئے اور پنجاب کی فضا ان کے وحشیانہ جبر و جور سے آزاد ہُوئی، تحریک دعوت و جہاد کے مُبلّغین ان علاقوں میں پھیل گئے اور چند برسوں کے اندر اندر دہلی اور سرہند کے آگے تھانیسر، انبالہ، لاہور سے راولپنڈی اور ہزارہ تک تحریک کے حلقے قائم ہو گئے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جب سیّد صاحب نے سرحدی علاقے کی طرف ہجرت کی تو اُنھیں سندھ اور بلوچستان کے راستے افغانستان جانا پڑا اور وہاں سے قندھار کے راستے پشاور آئے۔ اسی طرح سیّد صاحب کی شہادت کے فوراً بعد سیّد نصیرالدین دہلویؒ کی قیادت میں مجاہدین ٹُوٹے ہُوئے دِلوں کو سہارا دینے اور دعوت و جہاد کا کام جاری رکھنے کے لیے روانہ ہُوئے تو اُنھوں نے بھی سندھ ہی کا راستہ اختیار کیا، لیکن رنجیت سنگھ کے مرنے (۱۸۳۹ء) کے بعد پنجاب میں اتنے

وسیع پیمانے پر اور اتنی تیزی سے کام ہُوا اور ایسے مربوط اور منظّم حلقے قائم ہو گئے کہ پہلے مولانا عنایت علی اور پھر مولانا ولایت علی جب ہجرت کر کے سرحدِ آزاد تشریف لے گئے تو اس کے باوجود کہ ایک بڑی جمعیّت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر ان کے ساتھ گئی، انگریزی حکومت کو پتہ نہ چل سکا۔

یہی نہیں آنے والے ستّر اسّی برسوں میں تحریک کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑا اور تحریک اُن سے جس طرح عہدہ برآ ہُوئی اُس نے تاریخ پر یہ نقش ثبت کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اِس بندے کو عظیم انتظامی اور قائدانہ صلاحیتیں بخشی تھیں اور ان صلاحیتوں سے کام لینے میں اُنھوں نے کوئی کوتاہی نہ برتی۔

○

شعلۂ مستعجل

مولانا ولایت علی، سیّد بادشاہ کے قافلے کو تازہ و گرم خون فراہم کرنے کا سامان کر رہے تھے کہ سرحد سے کاغان کے سیّد ضامن شاہ کا پیغام مِلا: فضا سازگار ہو چکی ہے، تشریف لائیے اور حالات کو اپنے ڈھب میں ڈھال کر اسلامی حکومت کی اُستواری اور استحکام کا بندوبست کیجیے۔ بڑے حضرت خود موزوں وقت اور سازگار ماحول کی پکار کے بے چینی سے منتظر تھے، اس پیغام نے اُنھیں جنگ و جہاد کے مرحلے میں گامزن کر دیا۔

پنجاب اور شمالی سرحدی علاقے زبردست انقلاب کی لپیٹ میں تھے۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ مر گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند ہوتے ہی ظلم و جور اور وحشیانہ دہشت گردی پر قائم ہونے والی سلطنت جو بظاہر بڑی مستحکم نظر آتی تھی، دھڑام سے زمین پر آ رہی تھی۔ سکھ درحقیقت کبھی کوئی قوّت ہی نہ تھے۔ وہ محض خلا کی پیداوار تھے۔ ایسا خلا جو مضبوط مرکزی قوّت کے ختم ہو جانے اور اُس کی جگہ لینے والی کسی دوسری اصلح قوّت کے موجود نہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے، جس کے نتیجے میں ہر طرف افراتفری اور انتشار

پھیل جاتا ہے اور طالع آزما لوگ فوجی جتھا بندی کر کے تاریخ کے اُفق پر اُبھرنے اور اپنی ہم عصر دنیا پر چھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سکھ بھی ایسے ہی طالع آزماؤں کا ایک جتھا تھے جنھیں ان کی متعصب، خون آشام منتقم فطرت اور دہشت گردی کے حربوں نے بظاہر ناقابلِ تسخیر بنا دیا تھا۔ مُسلمانوں کے اخلاقی زوال اور سیاسی پراگندگی نے ان دہشت گردوں کو اور زیادہ ہیبت ناک رنگ دے دیا تھا۔ ظلم و جور پر قائم ہونے والی حکومت ہمیشہ اندر سے کھوکھلی ہوتی ہے اور سکھوں کی قوّت بھی کھوکھلی تھی۔ ان کے پاس نہ کوئی اخلاقی کشش تھی جس کی جانب دِل آپ سے آپ کھنچ جاتے ہیں اور نہ کوئی نظام تھا جس کے دامن میں دُنیا فلاح و اطمینان کی زندگی بسر کرنے کا سامان پاتی ہے۔ وہ ایسا کوئی نظام دینے کی صلاحیت ہی سے عاری تھے۔ ان کی چھوٹی بڑی ٹکڑیاں آتش و خوں کا سیلاب اپنے جلو میں لیے، ایک مُدّت تک، بستیوں اور آبادیوں پر قہرِ الٰہی بن کر ٹوٹتی اور ان کی جان و مال اور عزّت و آبرو سے کھیلتی رہیں۔ رنجیت سنگھ نے انھیں متحد کر کے باقاعدہ ایک سلطنت کی بنیاد رکھی، لیکن اپنی ان بنیادی قومی کمزوریوں کی بنا پر وہ بھی اس سلطنت کو استحکام نہ دے سکا، چنانچہ اس کی مَوت سے جو خلا پیدا ہُوا اُس میں دس برس کے اندر اندر پُوری سکھ قوّت غائب ہوگئی۔ اس طرح خلا کی پیداوار قوّت کو خلا ہی نے نگل لیا۔

رنجیت سنگھ کے مرتے ہی محلاتی سازشوں نے سکھوں کو خانہ جنگی کی آگ میں جھونک دیا۔ اس آگ سے نکلنے کے لیے سکھ لیڈروں نے انگریزوں سے کُھلے تصادم کی پالیسی اختیار کی جو رفتہ رفتہ رنجیت سنگھ کے جانشینوں کو بے بس کرتے اور اپنے چنگل گہرے گاڑتے چلے جا رہے تھے۔ پہلے خانہ جنگی اور پھر انگریزوں کے ساتھ پہلی جنگ میں شکست کھانے کے بعد سکھوں کی گرفت کمزور پڑی تو سرحد کے وہ علاقے جو ان کے جبر و ظلم اور قتل و غارت کا شکار ہو رہے تھے، ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ مختلف لڑائیوں میں بہت سے علاقے سکھوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ زیریں ہزارہ کے آزاد شدہ علاقے میں ستھانہ کے سیّد اکبر شاہ کو بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ بالائی ہزارہ کے خوانین اور رتوسا گلاب سنگھ والی جمّوں سے برسرِپیکار تھے اور اب اُنھوں نے مولانا ولایت علی سے مدد طلب کی تھی۔ سیّد ضامن علی شاہ کا پیغام

میر اولاد علی لاتے تھے جو مولوی نصیر الدین منگلوری کی شہادت کے بعد مجاہدین کے امیر بنے تھے۔ سید اکبر شاہ والی زیریں ہزارہ کے ایما پر سید ضامن شاہ نے انھیں عظیم آباد (پٹنہ) بھیجا تھا۔
مولانا ولایت علی نے پیغام ملتے ہی مولانا عنایت علی کو سرحد بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اس وقت بنگال میں تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ جونہی انھیں مرکز سے ہدایت پہنچی دو ہزار مجاہدین ساتھ لے کر عظیم آباد پہنچ گئے۔ صادق پور میں تحریک کے کارکن بارہ مہینے آمد و رفت رکھتے تھے، لیکن اکا دکا یا مختصر ٹولیوں میں، البتہ رمضان کے دنوں میں افطاری کی دعا میں شریک ہونے کے لیے ہزاروں مرد و زن کا ہجوم ہو جاتا۔ رمضان کا مہینہ ہوتا تو شاید لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کسی توجہ کا مرکز نہ بنتی۔ لیکن ربیع الثانی (۱۲۵۹ھ) کے آخری دن تھے۔ خلافِ معمول صادق پور میں اتنے لوگوں کی آمد سے انگریز حکام چونک گئے اور ان میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ مخبر گرد و پیش منڈلانے لگے۔ مولانا عنایت علی نے چند قریبی ساتھیوں کے سوا کسی کو نہ بتایا تھا کہ انھیں بڑے حضرت نے کس مقصد کے لیے طلب فرمایا ہے۔ اس لیے مخبر اس صورتِ حال کے پیچھے جھانکنے میں ناکام رہے؛ تاہم بڑے حضرت نے حکمت و تدبر اور دور اندیشی سے کام لیا۔ فوراً ساری جمعیت منتشر کر دی اور فیصلہ کیا کہ لوگ پانچ پانچ، چھ چھ کی ٹولیوں میں بٹ کر یکے بعد دیگرے سفر کریں۔ یوں نہ انگریزوں کی تشویش کسی الجھن کا پیش خیمہ بنے گی اور نہ سکھوں کے علاقے سے گزرنے ہی میں کوئی دشواری پیش آئے گی۔ پانچ مجاہدین پر مشتمل پہلی ٹولی مولانا ولایت علی کے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ کی قیادت میں جمادی الثانی ۱۲۵۹ھ (جولائی ۱۸۴۳ء) میں روانہ ہوئی اور پھر یہ سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ ہر گروپ کا لیڈر بالعموم جماعت کا کوئی ممتاز کارکن ہوتا۔ انہی میں میر اولاد علی، میر مقصود علی (یہ پٹنہ کے الٰہی بخش کے بھائی تھے جس کا ذکر تیسری منزل میں آئے گا) اور مولوی زین العابدین حیدر آبادی بھی تھے۔ خود مولانا عنایت علی نے شوال ۱۲۵۹ھ میں عظیم آباد کو خیر باد کہا —— ان سب کو ہزارہ کے علاقے میں پکھلی کے مقام پر جمع ہونا تھا۔

چار پانچ ماہ کے عرصے میں تین سو سے زائد مجاہدین پکھلی میں جمع ہو چکے تھے۔ یہ نقل و حرکت اس قدر خاموشی اور رازداری سے ہوئی کہ سکھوں کو آنے والے طوفان کی ہوا تک نہ لگنے پائی۔ دراصل اب ہزارہ تک ایسے خفیہ پڑاؤ قائم ہو چکے تھے جہاں مجاہدین کسی خوف و خطر کے بغیر دورانِ سفر ٹھہر سکتے تھے۔ وہ سکھوں کی عملداری سے گزرتے ہوئے ــــــ غیر آباد راستوں سے سفر کرتے، جہاں سکھ جتھوں سے کم ہی آمنا سامنا ہوتا۔ اس سفر میں خفیہ پڑاؤ کے کارکن اُن کی رہبری کرتے۔ پکھلی میں مجاہدین کے پہنچتے ہی سید بادشاہ کے قافلے کے بچے کھچے مردانِ عزیمت بھی سید عبد الرحیم ولایتی کی سربراہی میں اُن سے آملے تھے۔ حادثۂ بالاکوٹ کے بعد مولوی نصیر الدین منگلوری کے وقت سے کوئی ستر اَسی مجاہدین ستھانہ میں قیام پذیر تھے۔ مولوی صاحب شہید ہو گئے تو میر اولاد علی نے ان کی قیادت سنبھالی۔ سید نصیر الدین دہلوی شکار پور (سندھ) کابل اور غزنی سے ہوتے اپنے دو تین سو مجاہدین کو لیے ستھانہ پہنچے تو میر اَولاد علی اور اُن کے رفقا نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کر لی، لیکن سید نصیر الدین ابھی کوئی پروگرام وضع نہ کر پاتے تھے کہ اللہ کا بلاوا آگیا اور وہ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ کہتے ہوئے اپنے خالق و آقا سے جا ملے (۱۸۴۰ء) اب امارت کے لیے مجاہدین کی نظر سید عبد الرحیم ولایتی پر پڑی، چنانچہ یہ جانگسل ذمہ داری اُنھیں سونپ دی گئی ـــــ اور راہِ حق کی رہ پر رواں دو دھارے پکھلی کے مقام پر ایک دوسرے سے آملے تھے۔

مولانا عنایت علی کی آمد سے پورے علاقے میں اُمید و خوف کا ایک نیا دور کروٹیں لینے لگا۔ اُمید اُن دِلوں میں پھر سے روشن ہو گئی جو شمالی ہند میں لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی صُورتِ حال سے بھرپُور فائدہ اُٹھانے ہی میں اُمّت کی بھلائی سمجھتے تھے۔ وہ جن کی اُنگلیاں حالات

لہ مزاریوں نے سکھوں کے ساتھ مصالحت کر لی تھی، چنانچہ سید نصیر الدین دہلوی سندھ سے کابل چلے گئے۔ انھی دِنوں انگریزوں نے شاہ شجاع کو افغانستان کے تخت پر بٹھانے کی کوشش کی۔ امیر دوست محمد خان نے سید نصیر الدین سے مدد کی درخواست کی، چنانچہ اُنھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں مردانہ وار حِصّہ لیا۔ ولیم ولسن ہنٹر اپنی کتاب "انڈین مسلمانز" میں لکھتا ہے: "اُنھوں نے جنگِ کابل میں ایک بڑی فوج ہمارے دشمنوں کی امداد کے لیے بھیجی۔ ایک ہزار کے قریب مجاہدین ہمارے خلاف بڑی ثابت قدمی سے آخری دم تک لڑتے رہے صرف فتح غزنی کے موقع پر تین سو مجاہدین نے انگریزی سنگینوں سے جام شہادت نوش کیا۔

کی نبض پر ہوتی ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ لوہا جب بھٹّی میں تپ کر ایک خاص نقطے پر پہنچ جاتا ہے تو ہنر مند ہاتھ کی چند ضربیں اُسے مطلوب قالب میں ڈھال دیتی ہیں، لیکن اگر وہ لمحہ چُوک جاتا ہے تو پھر جسم و جان کی ساری توانائیاں نچوڑ دینے سے بھی مطلوبہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ سرحد کے مسلمان اپنی بدبختیوں کے سبب ماضی میں ایسے متعدد اہم ترین لمحات کھو چکے تھے اور اب ایک اور لمحہ دعوتِ عمل دے رہا تھا اور عزت و وقار اور دین و ایمان سے بہرہ یاب زندگی بسر کرنے والوں کی اُمیدیں اسی لمحے سے وابستہ ہو گئی تھیں۔ خوف ان دلوں کو تھا جنھیں قافلۂ حق کی فتح و کامرانی میں اپنی سرداریاں اور چودھراہٹیں، نفسانی لذتیں اور مفاد پرستیاں دم توڑتی نظر آتی تھیں۔ اپنی اس متاعِ دُنیا کو بچانے کے لیے اُنھوں نے پہلے بھی دین و ملّت کے دشمنوں سے ساز باز کرنے اور اُن کا کھیل کھیلنے کی رُسوائیاں مول لینے سے گریز نہیں کیا تھا اور اب پھر انھیں اس خوف نے آلیا تھا کہ دعوتِ حق کی یہ تازہ لہر اگر کوہ و دمن پر چھا گئی تو ان کی خود ساختہ عظمتیں زمیں بوس اور نفس پرستی کے بُت پاش پاش ہو جائیں گے۔ وہ اس بات کو بھول گئے تھے کہ نفس پرستی قوموں کا وجود چاٹ جاتی ہے اور مسلمان کو سچّی عظمتوں سے کوئی قوت ہمکنار کر سکتی ہے تو وہ اسلام کی قوّت ہے۔ اُمتِ مسلمہ کی زندگی اسلامی زندگی کے احیاء اور غلبے میں مضمر ہے۔

مولانا عنایت علی جنوری ۱۸۴۴ء (اواخر ۱۲۵۹ھ) میں پکھلی پہنچے اور وہاں سب سے کواتی (کاغان) میں مجتمع ہُوئے۔ اگلے دو برس کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ باقاعدہ سرگرمیوں کا آغاز دسمبر ۱۸۴۵ء میں ہُوا۔ یہ سارا عرصہ غالباً اُنھوں نے علاقے کے رؤسا سے روابط پیدا کرنے، ان کے ذہن و کردار کا مطالعہ کرنے اور فوجی مہموں کی تیاری میں گزارا۔ اسی تگ و دو کا نتیجہ تھا کہ پُورے شمالی ہزارہ کے مسلمان قلبی اور عملی طور پر مولانا عنایت علی کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ اور انھی کے تعاون سے آگے چل کر باقاعدہ فوج قائم کی گئی۔ پہلی فوجی مہم کا آغاز ذی الحجہ ۱۲۶۱ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) میں بالاکوٹ پر حملے سے ہُوا۔ مجاہدین نے سکھوں پر ضرب کاری لگائی اور وہ قبضہ چھوڑ کر نکل بھاگے۔ اس پہلی کامیابی سے حوصلے بلند ہو گئے اور اُمید کی روشنی تیز ہو گئی۔ اب مولانا عنایت علی کو باضابطہ طور پر امیرِ جہاد تسلیم کر لیا

گیا۔ انھوں نے باقاعدہ فوج تشکیل دی اور مجاہدین کو بھی نئے خطوط پر منظم کیا۔ محرم ۱۲۶۲ھ (جنوری ۱۸۴۶ء) میں گڑھی حبیب اللہ کو فتح کرلیا گیا۔ ان پے در پے شکستوں نے سکھوں کے اوسان خطا کر دیے۔ مجاہدین کی یلغار کا وہ بھلے دنوں میں بھی جبکہ ان کی طاقت و سطوت اپنے عروج پر تھی، بمشکل مقابلہ کر پاتے تھے؛ اب تو وہ زوال کی راہ پر گامزن تھے۔ اُن کی قوت اگر کوئی تھی تو خانہ جنگی میں ٹوٹ چکی تھی۔ رہی سہی کسر انگریزوں کے ساتھ مسلح کشمکش نے پوری کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گڑھیاں اور قلعے یکے بعد دیگرے ان کے قبضے سے نکلتے گئے۔ گڑھی حبیب اللہ، شنکاری، بیر کھنڈ، اگرور اور مظفر آباد اسی یلغار کے آگے سرنگوں ہوتے۔ یہاں سکھوں کے مضبوط گیریژن تھے جنھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ بہت کم لوگ زندہ بچ کر جا سکے۔ مظفر آباد کی جنگ نسبتاً زیادہ شدید تھی۔ یہاں کے رئیس سلطان حسین خان بمبا نے دوسرے مسلمان سرداروں کی طرح حوصلہ پاکر سکھ اقتدار کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ مولانا عنایت علی کی پالیسی یہ تھی کہ ایسے سرداروں کو کمک پہنچاتے تاکہ وہ سکھوں کا کامیاب مقابلہ کر سکیں؛ چنانچہ میر مقصود علی کی کمان میں ایک فوج مظفر آباد بھیج دی گئی، جس میں دو سو مقامی سپاہی اور مجاہدین تھے۔ گھمسان کی جنگ کے بعد فتح و کامرانی نے مجاہدین کے قدم چومے اور مظفر آباد سکھوں کے تسلط سے آزاد ہو گیا۔ "امید کی شعاعیں اور تیز ہو گئیں اور خوف" کے لیے موت اور زندگی کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔

فتوحات کے اس سیلاب کو اُمڈے چار پانچ مہینے ہی گزرے تھے کہ مجاہدین اور باضابطہ افواج فتح گڑھ کو گھیرے میں لے چکی تھیں۔ یہ بالائی ہزارہ میں سکھوں کا آخری نہایت مضبوط اور مستحکم قلعہ تھا۔ یہاں سکھوں نے زبردست مزاحمت کی۔ وہ جانتے تھے کہ اس مورچے سے قدم اکھڑ گئے تو پھر کہیں جم نہ سکیں گے۔ بچے کھچے علاقے میں بغاوتِ عام ہو جائے گی اور اُن کے حامی خوانین بھی فاتح قوت کے آگے سر جھکا دینے پر مجبور ہوں گے۔

سکھ فوج پانچ ہزار پیادوں اور نو سو گھڑ سواروں پر مشتمل تھی۔ اُس کے مقامی حامیوں کی تعداد دس بارہ ہزار سے کم نہ تھی۔ منافقین ان کے علاوہ تھے۔ وہ جن کے بارے میں قرآن کریم نے کہا ہے کہ انھیں یہ خوف کھائے جاتا ہے کہ حق کا ساتھ دیا تو مصیبت آلے گی یعنی

مفادات پر ضرب لگے گی، سرداریاں جاتی رہیں گی خواہشاتِ نفس کو زنجیریں پہنانی پڑیں گی اور دنیا کی لذتوں سے محرومی مقدر بن جائے گی۔ وہ پہاڑ کے دامن میں دائیں بائیں پرا جمائے منتظر تھے کہ مجاہدین کو شکست ہو تو اُن کا گوشت نوچنے کے لیے گِدھوں کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑیں۔ اُنھوں نے سکھوں کے کھُلے مقامی حامیوں سے ساز باز کر رکھی تھی کہ ہزیمت کی صورت میں وہ دونوں مل کر ایک مجاہد کو بھی زندہ نہ جانے دیں گے۔ مجاہدین سامنے کھُلے میدان میں تھے۔ باضابطہ فوج اگلی صفوں میں تھی اور مجاہدین اُس کے پیچھے۔ دوسری طرف سکھ سوار آگے تھے اور پیادہ فوج ان کے عقب میں۔ میدانِ جنگ کا جائزہ لیتے اور صف بندی کرتے کرتے نمازِ ظہر کا وقت ہو گیا۔ مجاہدین کے لشکر سے اذان بلند ہوئی اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ..... اللہ کی ہستی سب سے بزرگ و برتر ہے، اللہ کی کبریائی کے آگے ساری کائنات سرنگوں ہے اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ...... مَیں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کی ذاتِ بے ہمتا کے سوا اور کوئی آقا، مالک، خالق اور عبادت و طاعت کے لائق نہیں ..... مؤذّن کے آہنگ میں ایسا جوش و جلال تھا کہ وادی و کوہ لرزتے محسوس ہوتے تھے۔ سکھ لشکریوں نے اپنی رگ و پے میں ایک عجیب خوف سا رینگتا محسوس کیا جس کی وہ کوئی تعبیر نہ کر سکتے تھے۔ یہ اُن کا ہزاروں بار کا تجربہ تھا مسلمان اللہ کی کبریائی کا نعرہ بلند کرتے تو جانے کیوں ان کے دل دھڑکنے لگتے اور ایک انجانے خوف کی سنسناہٹ ان کے بدن پر طاری ہو جاتی۔ لیکن وہ لوگ جو اللہ کے بزرگ و برتر ہونے پر ایمان رکھتے تھے، جو اُسے اپنا مولا و آقا سمجھتے تھے اور اس کے باوجود کفر و باطل کا ساتھ دے رہے تھے اور اہلِ حق کو ناکام دیکھنے کے متمنّی تھے ان کے دل جُوں کے تُوں پتھر تھے۔ ذرا بھی تو ان پر اثر نہ ہُوا تھا۔ ادھر دعوتِ حق پر ایمان لانے اور اُس کی راہ میں سر کٹانے کا جذبہ لے کر گھروں سے نکل آنے والوں کی دنیائے دِل کا حال بالکل مختلف تھا۔ حق کی اس پکار کا ایک ایک لفظ اُن کے دل کی گہرائیوں میں اُترتا اور ایک عجیب لذّت و سرور سے ان کے ریشے ریشے کو سیراب کرتا جا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اللہ کی کبریائی اور بے ہمتائی پر ایمان لانے کے تقاضے کیا ہیں اور انھیں پُورا کرنا کتنا کٹھن ہے۔ اُنھوں نے ان تقاضوں کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنے اور انھیں پُورا کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ وہ انھی

تقاضوں کو پُورا کرنے میدان میں آئے تھے۔ اس عظیم انقلابی پُکار کے ایک ایک کلمے کے زیروبم کے ساتھ ان کا ایمان فزوں ہوتا جارہا تھا۔ اذان کے بعد آدھے مجاہدین نے صفیں باندھ لیں، باقی نصف ہتھیار لیے چاق چوبند کھڑے رہے۔ مولانا عنایت علی نے نماز پڑھائی۔ ایک رکعت پڑھنے کے بعد مجاہدین نے سلام پھیر دیا۔ انھوں نے ہتھیار سنبھال لیے اور پہرہ دینے والا گروہ مولانا عنایت علی کے پیچھے نماز میں شریک ہو گیا۔ نماز پڑھ چکے تو مولانا اور مجاہدین دیر تک فتح و نصرت کی دُعا مانگتے رہے۔

جنگ شروع ہو گئی۔ تعداد اور سروسامانِ جنگ میں سکھوں کا پلڑا مجاہدین کے مقابلے میں کہیں بھاری تھا۔ وہ شاہینوں اور بندوقوں سے اَولوں کی طرح گولیاں برسانے لگے۔ مجاہدین کے پرچم بردار محمد عمر کو دو گولیاں ہاتھ پر لگیں۔ دوسری گولی پر پرچم اُس کے ہاتھ سے گر گیا، سکھوں کے مقامی حامیوں نے نعرۂ مسرت بلند کیا اُنھوں نے سمجھا مجاہدین کو شکست ہو گئی لیکن محمد عمر نے پرچم فوراً زخمی ہاتھ ہی میں اُٹھا لیا۔ سکھوں کی طرف سے گولیوں کی بارش تیز تر ہوتی جا رہی تھی اِسلامی لشکر کے روہیلے (باضابطہ فوج کے پٹھان سپاہی روہیلے کہلاتے تھے) اور مجاہدین جان پر کھیلتے اور اَولوں کی بوچھاڑ کو چیرتے ہُوئے بڑھے اور سکھوں پر حملہ کر دیا۔ ساتھ ہی پُوری بلند آہنگی کے ساتھ اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ حملہ اس قدر اچانک اور ناقابلِ یقین حد تک دلیرانہ تھا کہ سکھوں پر دہشت سی طاری ہو گئی۔ وہ پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہُوئے۔ دُور جا کر سنبھلے، مُڑے اور دل کڑا کر کے حملہ آور ہُوئے۔ اِدھر سے مجاہدین نے بھی بڑھ کر ہلّہ بول دیا۔ زبردست تصادم کے بعد سکھ پھر بھاگ اُٹھے۔ اسی طرح اُنھوں نے تین مرتبہ پَے در پَے حملے کیے، لیکن مجاہدین نے ہر بار جوابی حملہ کر کے ان کا مُنہ پھیر دیا۔ چوتھی بار وہ نہایت بدحواسی کے عالم میں پسپا ہو گئے۔ مجاہدین نے ان کا تعاقب شروع کر دیا، وہ حوصلہ چھوڑ کر ایسا بھاگے کہ پیچھے مُڑ کر نہ دیکھا۔ مقامی لوگوں نے جو پہاڑ کے دامن میں دائیں بائیں مجاہدین کی شکست کی تمنا دل میں پالے کھڑے تھے، اُنھیں بھاگتے دیکھا تو وہ اُن کے کیمپ پر ٹوٹ پڑے اور ایک لاکھ سے زیادہ کا مال دیکھتے دیکھتے لُٹ گیا۔

برسات کا موسم تھا۔ ہر طرف دھان کے کھیت تھے جن میں پانی بھرا ہُوا تھا۔ سکھ

ایسی افراتفری کے عالم میں بھاگے تھے کہ وہ منتشر ہو کر رہ گئے تھے۔ بھاگتے بھاگتے بُرا حال ہو گیا۔ مارے تھکن کے قدم نہ اُٹھا سکتے۔ دیہات کی عورتوں اور مردوں نے اُنھیں سراسیمگی کا شکار دیکھا تو وہ ڈنڈے، کلہاڑیاں اور پھاوڑے لیے گھروں سے نکل آئے اور ان پر پل پڑے۔ جن کے پاس کچھ شے نہ تھی اُنھوں نے پتھروں سے کام لیا۔ وہ ایک مدت سے اُن کی ستم رانیاں سہتے آرہے تھے، اب دل کھول کر بدلہ لیا۔ ایک گوجر نے جو کھیتی باڑی کر رہا تھا اتنے سکھ مارے کہ شام کے وقت اُن سے چھینی ہوئی بندوقوں کا گٹھا سر پر اٹھا کر گھر لایا۔ دس کوس تک لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ مجاہدین نے ان کا شام تک تعاقب کیا۔ پھر موضع سلہڈ میں ٹھہر گئے۔

○

فتح گڑھ کی فتح نے بالائی ہزارہ میں سکھوں کی قوت توڑ کر رکھ دی۔ آٹھ دس دن کے اندر اندر بائیس قلعوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ سکھوں نے مانسہرہ میں قدم جمانے کی کوشش کی، لیکن دوبارہ شکست کھائی۔ اور پھر اس طرف کا رُخ کرنے کی اُنھیں کبھی ہمت نہ ہوئی۔ نواں شہر میں بھی ان پر کاری ضرب پڑی اور وہ علاقہ جدون سے بھی نکل گئے۔ مجاہدین کے ہاتھ بہت سی توپیں، شاہینیں، اُونٹ، گھوڑے، ڈیرے، خیمے اور مال و متاع آیا۔ اسلامی مملکت کی سرحدیں نواں شہر سے سکندر پور کے جوار تک پہنچ گئی۔ فتح گڑھ کا نام بدل کر اسلام گڑھ رکھ دیا گیا اور وہ دارالحکومت قرار پایا۔ اب تک اکثر مقامی خوانین "دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔ مجاہدین کے ساتھ اُن کا تعاون محض زمانہ سازی کے طور پر تھا۔ احکامِ شریعت کے آگے سر جھکانے سے صاف انکار کر دیتے۔ مملکت کے اقتصادی نظام میں زکوٰۃ اور عُشر ریڑھ کی ہڈی تھی انھیں یہ لوگ تاوان اور چٹی قرار دیتے۔ بعض نے تو ان کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ فتح گڑھ کی جنگ نے حالات کا رُخ بدل ڈالا۔ مجاہدین علاقے کی اہم قوت بن کر اُبھر آئے۔ چاروں طرف ان کی ہیبت چھا گئی اور وہی خوانین، رئیس اور جاگیردار جو عُشر دینے سے انکاری تھے اب خود حاضر ہو کر عرض کر رہے تھے کہ اسلامی حکومت کے عمال ان کے ہاں آئیں اور عُشر وصول کر لیں۔

اسلام گڑھ کی ریاست باقاعدہ ایک اسلامی شورائی ریاست تھی۔ تمام اُمور

ریاست مشورے سے طے پاتے اور یہ کام مقامی اور ہندوستانی مجاہدین کے اصحاب رائے پر مشتمل مجلس شوریٰ انجام دیتی۔ اس ریاست کی سرحدیں متعین تھیں۔ باضابطہ فوج تھی جس کی تدریب و تربیت کا اہتمام تھا۔ زیادہ تر بنگال، اودھ، صوبجات متوسط اور شمالی اور زیریں پنجاب کے جوان شامل تھے۔ میر مقصود علی کمانڈر انچیف تھے، عبداللہ عسکری اور بعض دوسرے لوگ قلعوں اور چھاؤنیوں میں روزانہ نماز فجر کے بعد فوجوں کو پریڈ کرواتے اور جنگی تربیت دیتے۔ افسروں کے مختلف رینک تھے۔ سپاہیوں کو تنخواہ ملا کرتی۔ ایک آرڈی ننس فیکٹری تھی جہاں چھوٹی توپیں اور دوسرے ہتھیار تیار کیے جاتے۔ ریاست کے مختلف مقامات پر سلاح خانے (ARSENALS) اور اصطبل بنے ہوئے تھے۔ انتظامی طور پر ریاست چھوٹے بڑے کئی اضلاع میں منقسم تھی۔ یہ تقسیم قبائلی بنیادوں پر کی گئی تھی۔ ریاست کے پہلے سربراہ مولانا عنایت علی تھے۔ مولانا ولایت علی تشریف لے آئے تو انھیں امیر چن لیا گیا۔ پروٹوکول اور آداب حکومت کا خیال رکھا جاتا۔ امیر ریاست کے جلو میں ہر وقت سات بندوق بردار رہتے۔ کسی اعلیٰ فوجی افسر کو امیر طلب کرتا تو وہ ایک سپاہی کے ساتھ حاضر ہوتا۔ مولانا ولایت علی تشریف لائے تو ان کا استقبال اسی تزک و احتشام سے کیا گیا جو کسی سربراہ مملکت کے لیے مختص ہوتا ہے۔ انھیں ریاست کی امارت بھی ایک تقریب میں سونپی گئی۔ دوسری حکومتوں کی طرح باقاعدہ انتظامی محکمے قائم تھے۔ جن کا قلمدان اہل ترین اور باصلاحیت افراد کے سپرد تھا۔ ہر بستی کا ایک امیر اور ہر قلعے کا ایک قلعہ دار ہوتا۔ ہر انتظامی یونٹ میں ایک تحصیل دار مقرر تھا۔

یہ ایک نظریاتی ریاست تھی اور اس کا مقصد وہی تھا جو ایک اسلامی ریاست کا ہونا چاہیے اور جس کا بنیادی اصول خود قرآن کریم نے دیا۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ (الحج - ۴۱) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ ریاست ان چاروں فرائض کو بڑے اہتمام سے انجام دیتی۔ مسلمانوں کو حکم تھا کہ با جماعت نماز ادا کریں۔ عذر شرعی کے

بغیر مسجد سے غیر حاضری جُرم تھا اور اس کوتاہی کے مرتکب پر جرمانہ عائد کیا جاتا۔ شادی غمی کے مواقع پر غیر اسلامی رسوم ممنوع تھیں اور ارتکاب کرنے والا جرمانے کا مستحق قرار پاتا۔ اخلاقِ عامّہ کی اصلاح و تطہیر اور جرائم کے سدِ باب کے لیے محکمہ احتساب قائم تھا۔ جُوا، شراب اور دوسری منہیات میں ملوّث افراد کو سزا دی جاتی۔ عدالتیں تھیں جن میں مقدمات شریعت کے مطابق فیصل ہوتے اور مجرموں کو سزائیں ہوتیں اور ان پر حدود نافذ کی جاتیں۔ بُرائیوں کے انسداد اور نیکیوں کے فروغ اور اسلامی احکام و تعلیمات کی تبلیغ پر خصوصی زور دیا جاتا۔ بازار میں قیمتوں کے اتار چڑھاؤ، اشیاء کی فراہمی اور ناپ تول پر کڑی نظر رکھی جاتی۔ ریاست کی آمدنی پانچ لاکھ سالانہ تھی جس کا بڑا ذریعہ زکوٰۃ، عُشر، صدقات اور خراج تھے۔ ہنگامی مواقع پر عطیات بھی لیے جاتے۔

خارجہ پالیسی کے دو بڑے بنیادی اصول تھے۔ سکھّوں (بعدازاں انگریزوں) کے خلاف آخری فتح تک جہاد جاری رکھنے کے لیے گرد و پیش کے قبائل اور ملکوں کی حمایت اور دوستی حاصل کرنا اور ضرورت اور مشکلات کے وقت اُن کی امداد۔ اسی پالیسی کی بنا پر کابل اور کشمیر کے ساتھ دوستانہ روابط استوار ہو چکے تھے۔ کشمیر کا گورنر شیخ امام الدّین تھا اور لاہور کی سکھ حکومت نے اُسے متعین کیا تھا۔ انگریزوں نے کشمیر کو راجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ بیچ ڈالا تھا، لیکن شیخ امام الدین نے کشمیر کو گلاب سنگھ کے حوالے کرنے سے اِنکار کر کے مولانا عنایت علی کے ساتھ نامہ و پیام شروع کر دیا تھا۔ اُدھر کابل کے حکمران امیر دوست محمّد خان سے بھی تعلقات قائم ہو چکے تھے اور اس نے رفاقت اور امداد کا تحریری وعدہ بھی کیا تھا۔ رہا۔ دوسرا اصول تو مولانا عنایت علی سرحد میں آنے کے بعد کتنی ہی جنگیں خوانین کو سکھّوں سے نجات دلانے کے لیے لڑ چکے تھے۔

○

اسلام گڑھ کو دارالحکومت بنے تھوڑی ہی مدّت ہُوئی تھی اور سکھّوں کی پے در پے تباہ کن شکستوں پر اہلِ ایمان کے دل ابھی شادمانی اور مسرّت کے گہوارے میں جھُول رہے تھے کہ مولانا ولایت علی کی آمد آمد کے مژدۂ جانفزا نے پُوری ریاست میں فرحت و

انبساط کی نئی رَو دوڑا دی۔ تحریک کے ممتاز ترین کارکن مولانا فیاض علی، مولانا یحییٰ علی اور مولانا اکبر علی آپ کے ہمراہ تھے۔ مولانا ولایت علی کے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ بھی ساتھ آئے تھے جنھیں غالباً مولانا عنایت علی نے بڑے حضرت کے پاس اسلامی ریاست کے قیام اور سازگار حالات کی مفصّل اِطلاع دے کر بھیجا تھا اور انھیں تشریف لانے اور زمامِ امارت خود آکر سنبھالنے کی دعوت دی تھی۔ بڑے حضرت ہزارہ میں داخل ہوئے تو نانگی کے مقام پر اسلامی فوج کے ایک دستے نے بندوقیں چلاکر اور نذریں پیش کر کے استقبال کیا۔ مانگلی سے مانسہرہ پہنچے تو وہاں قلعہ دار ریاست اللہ نے بندوقوں کی سلامی دی اور نذریں پیش کیں۔ یہاں مولانا عنایت علی نے مولوی مقصود علی کی کمان میں سواروں اور پیادوں پر مشتمل ایک دستہ بھیج دیا تھا، چھوٹی توپیں اور پرچم ان کے ساتھ تھا۔ اس دستے نے بھی قلعے سے باہر توپیں اور بندوقیں سر کر کے سلامی دی اور نذریں گزاریں۔

بڑے حضرت کی اگلی منزل لبر کوٹ تھی۔ یہاں سیّد ضامن شاہ رئیس کاغان اور محمّد امین خاں رئیس گڑھی خان خیل نے دو سو سواروں اور پیادوں کے ساتھ استقبال کیا۔ پھر ایک بار بندوقیں چلیں اور نذریں گزاری گئیں۔ مولانا عنایت علی خود باضابطہ فوج اور ہندوستانی مجاہدین کے ساتھ لبر کوٹ سے تقریباً چار ساڑھے چار میل کے فاصلے پر تنیشہ پہنچ گئے تھے۔ یہاں گرد و نواح سے آنے والے سینکڑوں افراد جمع ہو کر بڑے حضرت کی آمد کا بڑی بے تابی سے منتظر تھے۔ دونوں بھائی کھُلے میدان میں ملے۔ جوشِ عقیدت اور گرمیٔ محبّت کا عجب سماں تھا۔ فارسی کے ایک قلمی مکتوب میں جو سرحد سے ہندوستان بھیجا گیا تھا اس دَور کی دوسری سرگرمیوں اور اسلامی فتوحات کے تذکرے کے علاوہ بڑے حضرت کے استقبال کے ولولہ انگیز اور ایمان افروز مناظر کی عکّاسی کی گئی ہے۔ اس آخری منظر اور دونوں بھائیوں کی ملاقات کی تصویر کشی کرتے ہوئے مکتوب نگار لکھتا ہے:

"اس وقت ربِّ غفور کی جانب سے عجیب نُور جلوہ گر تھا اور برکتوں کی بارش ہو رہی تھی۔ دونوں جانب ہزاروں سپاہی اور مجاہد موجود تھے۔ ان کی بندوقوں اور قرابینوں کی آواز سے زمین والوں کے کان بہرے ہو گئے۔ لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ دونوں بھائیوں کی

ملاقات دشوار ہوگئی۔ آخر بڑی کوشش سے لوگوں کو الگ کیا گیا اور بھائیوں میں ملاقات کی صورت پیدا ہوئی۔ مصافحے اور معانقے کے بعد دونوں بھائی اسی میدان میں پیشانی زمین پر رکھ کر دیر تک جہانوں کے پروردگار کا فریضۂ شکر ادا کرتے رہے۔ لشکر بھی سجدے میں گر گیا اور سب دیر تک خدا کی حمد و ثنا کرتے رہے[1]۔"

استقبال کے یہ مناظر بظاہر بڑے حیران کن تھے۔ یہ نہ تو سید بادشاہ اور اُن کے ساتھیوں کا رنگ ڈھنگ تھا اور نہ غازی عنایت علی ہی نے کبھی ایسا کوئی مصنوعی اور دنیا دارانہ اہتمام کیا تھا۔ قوت و شوکت کا یہ مظاہرہ ملی مصلحتوں کا منت کش تھا۔ مادہ پرستی کے خوگر اور عظمت و جاہ کا دنیوی تصور رکھنے والے لوگ تزک و احتشام کے مظاہروں ہی سے مرعوب و متاثر ہوتے ہیں اور کسی شخص کی ظاہری سطوت و حشمت ہی کو دیکھ کر اُس کے آگے سر جھکاتے ہیں تحریکِ دعوت و جہاد کے رہنماؤں اور کارکنوں کے نمود و نمائش اور دھوم دھڑکوں سے پاک سادہ شب و روز دیکھ کر سرحد کے خوانین اور رؤسا میں یہ عجیب حقارت آمیز تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ یہ مولوی اور پیرزادے لوگ ہیں، کاروبارِ حکومت سے انھیں کیا سروکار! مسجدیں اور خانقاہیں سنبھالیں، حکومت کرنا تو ہم سرداروں کا حق ہے کہ سو پُشت سے ہماری لونڈی چلی آتی ہے۔ مولانا نے اس تاثر کو توڑنے کے لیے حکومت کے کاروبار میں بھی سید بادشاہ کے طرزِ عمل سے قدرے ہٹ کر انداز اختیار کیا اور سرکاری تقریبات کو بھی شوکت و احتشام کا رنگِ لطیف دے دیا۔ یہ اندازِ عمل محض حکومت کے ظاہری رنگ رُوپ تک محدود تھا اور وہ بھی ایک چھوٹے سے دائرے میں۔ خود ان کی اپنی زندگیوں میں ذرا سا بھی تغیر نہ آیا۔ وہ پہلے ہی کی طرح سادہ اور زہد و ورع سے عبارت تھیں۔ وہی سادہ کھانا پینا اور سادہ پہننا، عیش و عشرت کے قریب تک نہ پھٹکنا، اپنے آپ کو اللہ کا عاجز و حقیر بندہ تصور کرنا، اس کی طاعت و عبادت میں شب و روز مصروف رہنا، مسرت و شادمانی کے مواقع ہوں یا صبر و استقامت کی طلب کا گھڑیاں ہر حال میں اس کے آگے جبینِ بندگی خم کر دینا، اُس کا شکر ادا کرنا اور اُس سے مدد چاہنا، الغرض اُن کی انفرادی

---

[1] سرگزشتِ مجاہدین ص ۲۵۵

اور اجتماعی زندگی کا ایک ایک گوشہ اب بھی ان اوصاف سے پوری طرح مزیّن تھا جو اس گروہِ حق پرست کا شروع ہی سے طرّۂ امتیاز رہے تھے۔ اُن کے ان معمولات میں ذرا بھی فرق نہ آیا تھا جن کی بدولت اس تحریک سے تعلّق رکھنے والے برِّصغیر کے مسلمان معاشرے میں اس طرح پہچانے جاتے تھے جیسے کنکروں کے ڈھیر میں چمکتے ہوئے ہیرے ہر آنکھیں رکھنے والے کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔

——— اور اس وقت بھی وہ اپنی روایات کے مطابق اپنے آقا و مولا کے آگے فرشِ خاکی پر جبینِ نیاز رکھے پڑے تھے کہ یہ اسی کا فضل و کرم اور نصرت و تائید تھی جس نے اللہ کے ان کمزور اور بے مایہ بندوں کو کفّار کے مقابلے میں ہر میدان میں فتح یاب کیا تھا اور ایک ایسی ریاست وجود میں آگئی تھی جہاں کتاب و سنّت کا قانون نافذ تھا اور اسلام کا طرزِ حیات اجتماعی زندگی میں جڑیں پکڑ رہا تھا۔ جو برِّصغیر میں بڑھتی پھیلتی ہوئی تاریکیوں میں مینارِ نور بن کر اُبھر رہی تھی۔

سجدے سے سر اُٹھایا تو ہر آنکھ میں آنسو چمک رہے تھے۔ اب ہزاروں افراد نے عقیدت و احترام کے بے کراں جذبوں کے ساتھ بڑے حضرت کی خدمت میں نذرانے پیش کیے، تاہم کتنے ہی ایسے لوگ تھے جن کے ظاہر و باطن میں تضاد تھا۔ اُمید و رجا کی اس روشن و پُر شوق فضا میں بھی خوف ان کے دلوں پر چھایا ہوا تھا۔ وہ تصوّر ہی تصوّر میں اپنی خود ساختہ عظمتوں اور قیادتوں کے رنگ محل نگوں سار ہوتے دیکھ رہے تھے، لیکن اسلام کی اُبھرتی ہوئی قوّت کے اس نمائندے کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینے پر مجبور تھے کہ مستقبل میں اسی طرح زندہ رہ سکتے تھے۔ اُنھیں اب اُن لمحات کا انتظار تھا جب وقت کے سمندر میں سے مخالف لہر اس ننھّی سی ریاست کو نگلنے کے لیے اُٹھے گی اور وہ اس لہر پر سوار ہو کر اپنا سوچا سمجھا کردار ادا کریں گے ——— گھناؤنا کردار جو مفاد پرستوں اور ذاتی انا کے پجاریوں نے ملّی تاریخ کے ہر نازک موڑ پر ادا کیا ہے۔

۱۱ر اکتوبر ۱۸۴۶ء (۱۹ر شوال ۱۲۶۲ھ) اتوار کے روز دونوں بھائی فوج اور مجاہدین جلو میں لیے دارالحکومت اسلام گڑھ میں داخل ہوئے۔ قلعہ دار امام خاں کے حکم سے توپیں،

شادیانے بجے، توپیں اور بندوقیں سر کی گئیں اور پھر علماء، رؤسا، خوانین اور جاگیرداروں نے بڑے حضرت کی خدمت میں نذریں گزاریں۔ ۱۲ اکتوبر (۲۴ شوال) کو جمعہ تھا۔ نمازِ جمعہ کے اجتماع میں پوری ریاست سے ہر طبقے کے لوگ بڑی کثرت سے اُمڈ آئے تھے۔ اس نمائندہ اجتماع میں غازی عنایت علی نے کاروبارِ مملکت مولانا ولایت علی کے حوالے کر دیا۔ سب سے پہلے خود اُن کے ہاتھ پر بیعتِ امارت کی، پھر اعلیٰ سرکاری حکام، فوجی افسروں، علماء، خوانین اور عام مسلمانوں نے۔ یہ بڑا پُرجوش اور جذبہ انگیز تھا۔ بیعت سید بادشاہ کے طریقے کے عین مطابق تھی اور تقریباً انہی الفاظ میں جو اس طریقے کے لیے مخصوص ہو گئے تھے۔ بیعت کرنے والا کتاب و سُنّت کی خالص اور بے داغ تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے، اسلامی نظامِ حیات کو اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے، حق کا کلمہ بلند کرنے کی جدّوجہد میں بھرپور حصّہ لینے اور اسلامی ریاست کے تحفظ و بقا کے لیے زندگی کی ہر عزیز متاع حتیٰ کہ خود زندگی قربان کر دینے کا عہد و پیمان کرتا۔

بیعت کے بعد امیرِ ریاست نے غازی عنایت علی کی اُن خدمات اور جانفشانیوں کو سراہا جو اُنھوں نے اسلامی ریاست کے قیام اور اُس کے حُسنِ انتظام کے سلسلے میں انجام دی تھیں، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور غازی عنایت علی کو مجاہدین اور باضابطہ افواج کا کمانڈر انچیف بنانے اور ریاست کی وزارتِ عظمیٰ سونپ دینے کا اعلان فرمایا۔

○

اسلام گڑھ بظاہر زندگی کے نئے دَور میں داخل ہو چکا تھا۔ اُسے تحریک کے بہترین افراد کی رہنمائی حاصل تھی جو باکمال صلاحیتوں کے مالک تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے مایوسی اور افسردگی میں لپٹی ہوئی فضا میں ازسرِنو اُمید اور عزیمت کی جوت جگائی، سید بادشاہ کی تحریکِ جہاد کو پھر سے نئی زندگی دی اور سازگار لمحات کی لہو سے آبیاری کر کے ایک اسلامی ریاست کی داغ بیل ڈال دی۔ کوئی انقلاب برپا کرنا یا کسی ریاست کو وجود میں لے آنا بلاشبہ نہایت کٹھن کام ہے، لیکن اِس سے بھی مشکل تر کام اُس انقلاب یا ریاست کا تحفظ کرنا اور اُسے استحکام بخشنا ہوتا ہے۔ یہی کٹھن اور سخت مرحلہ اب اُن کی صلاحیتوں کو چیلنج کر رہا تھا۔ ان حضرات کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے یقیناً اُمید کی جا سکتی

تھی کہ وہ اس چیلنج کا کامیاب جواب دے سکیں گے لیکن حالات کا دھارا دیکھتے ہی دیکھتے بدل گیا۔

پنجاب میں تغیّر کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی۔ انگریز اس علاقے کی سیاست میں طاقتور عنصر بن کر اُبھر آئے تھے۔ پہلی جنگ میں شکست کھانے کے بعد سکھوں کی قوّت بالکل شل ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک طرف لاہور پر انگریزوں نے اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی، دوسری طرف وہ سکّھوں کی قوّت کو مزید کمزور کرنے کے لیے جمّوں کے گلاب سنگھ ڈوگرہ کو اُن کے مقابلے میں کھڑا کر رہے تھے۔ اُنھوں نے کشمیر اور بالائی ہزارہ کا علاقہ اُس کے ہاتھ بیچ دیا تھا[1] لیکن کشمیر کا گورنر امام الدّین (دربارِ لاہور کی خُفیہ ہدایت پر) کشمیر کو گلاب سنگھ کے حوالے کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اُدھر بالائی ہزارہ میں اس نئی اُبھرتی ہُوئی اسلامی قوّت نے اُس کا مستقبل مخدوش بنا دیا تھا۔ اب تک جتنی جنگیں ہُوئی تھیں اُن میں اپنے آپ کو مجاہدین کے مقابلے میں عاجز و ناتواں پایا تھا۔ اسلام گڑھ کے تعلّقات امام الدّین گورنر کشمیر سے اُستوار ہو چکے تھے۔ یہ صُورتِ حال اگر برقرار رہتی تو اسلام گڑھ اور کشمیر دونوں مل کر گلاب سنگھ کے لیے زبردست خطرہ بن سکتے تھے۔ اس رابطے کو توڑنا بھی ضروری تھا اور اسلام گڑھ کی بڑھتی ہُوئی قوّت کا توڑ کرنا بھی۔ بالائی ہزارہ تک اُس کی رسائی کا واحد راستہ کشمیر تھا اور کشمیر پر قبضہ کیے بغیر وہ کوئی اقدام نہ کر سکتا تھا۔ ناچار اُس نے انگریزوں کے دروازے پر دستک دی۔

انگریزوں کی آنکھوں میں اسلام گڑھ پہلے ہی کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ پنجاب اُن کے قدموں تلے آچلا تھا۔ سکھ اُن کے آگے ٹکنے کی صلاحیت سے عاری تھے۔ پنجاب پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں کا اگلا ہدف سرحد تھا۔ اسلام گڑھ کا وجود اور استحکام اُن کے اِس منصوبے اور مستقبل کے عزائم کی راہ میں سنگِ گراں بن سکتا تھا۔ خصُوصاً کشمیر کا مجاہدین کے ساتھ تعاون، جس کے آثار ہویدا ہو چلے تھے، اس علاقے میں

---

[1] یہ علاقے انگریزوں نے سکھوں سے تاوانِ جنگ کے طور پر حاصل کیے تھے اور پھر گلاب سنگھ ڈوگرہ کے ہاتھ ۷۵ لاکھ روپے میں فروخت کر دیے تھے۔ بالائی ہزارہ کا علاقہ گلاب سنگھ نے بعد ازاں سیالکوٹ کے کچھ علاقے کے عوض انگریزوں کو دے دیا۔

ایک ایسی آزاد قوت کو جنم دے سکتا تھا جو سکھوں سے کہیں زیادہ سخت جان اور تباہ کن ثابت ہوتی۔ پھر انگریزوں کے نزدیک ایک اور پہلو بھی بہت تشویشناک تھا۔ اسلام گڑھ کی ریاست ایک ایسی نظریاتی تحریک پر مبنی تھی جس کی جڑیں برِصغیر کے تقریباً ہر علاقے میں پھیلی ہوئی تھیں، خصوصاً شمالی، مشرقی اور وسطی صوبوں میں تو یہ جڑیں بہت گہری تھیں جہاں یہ تقریباً ہر شہر قصبے اور دیہات میں کسی نہ کسی درجے سرگرمِ نمو تھیں۔ یہی علاقے اُسے روپیہ، اسلحہ اور بنیادی افرادی قوت فراہم کر رہے تھے۔ انگریز خوب جانتے تھے کہ نظریات معاشرے کے ہر طبقے میں خاموشی سے اندر ہی اندر اس طرح پھیلتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ اُس کے اثرات کا دائرہ کتنا وسیع اور گہرا ہو چکا ہے۔ اِن اثرات سے چھاؤنیاں اور فوجیں تک محفوظ نہیں رہتیں، اس لیے کہ فوجی بھی آخر اسی معاشرے کے فرد ہوتے ہیں جس میں نظریات اور افکار و تصوّرات کی رَو کار فرما ہوتی ہے۔ اُن کا اُن سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ فوجوں کے اندر نظریات و تصوّرات کی یہ رواں دواں رو خود اپنے دائرے میں بڑی خطرناک ہوتی ہے اور اگر انہی افکار و نظریات کی اساس پر کوئی مضبوط اور مستحکم ریاست بھی موجود ہو تو کسی وقت بھی اس کے سہارے اور تعاون سے انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، چنانچہ اسلام گڑھ نے انگریزوں کے قلب و رُوح میں یہی خوف اور اندیشے بھر دیے تھے۔ وہ اُس ریاست کو قوت و استحکام سے ہمکنار ہونے اور برِصغیر میں اُن کے عزائم کے لیے چیلنج بننے سے پہلے ہی کچل دینا چاہتے تھے۔ گلاب سنگھ نے مدد چاہی تو اُنھوں نے فوراً ہامی بھر لی، مگر وہ اپنی افواج کو براہِ راست ملوّث نہ کر سکتے تھے کہ ابھی شمالی ہندوستان کے اس خطّے میں ایسے اقدام کے لیے شب و روز کی کئی مزید گردشیں درکار تھیں۔ اُنھوں نے اسے صرف "فنی" اور فوجی رہنمائی فراہم کی۔

دربارِ لاہور میں متعین انگریز ریذیڈنٹ ہنری لارنس خود فوج لے کر جمّوں پہنچا اور پھر کاسہ لیسانِ ازلی کے تعاون سے ڈپلومیسی کے ذریعے نواب امام الدین کو شیشے میں اُتار لیا[1]۔ یوں خون کا قطرہ بہائے بغیر گلاب سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ اب اُس کی فوجیں اسلام گڑھ

---

[1] ہنری لارنس نے یہ کارنامہ ملک فتح خان ٹوانہ کی مدد سے انجام دیا جو نواب امام الدین کا دوست تھا۔

کی طرف بڑھ سکتی تھیں حملے سے پہلے راستہ ہموار کرنا ضروری تھا۔ اس مقصد کے لیے مسٹر ایبٹ کو ہزارہ بھیج دیا گیا۔ اُس نے وہاں جاتے ہی علاقے کی سیاسی صُورتِ حال کا جائزہ لیا ۔ آپریشن کو دو مرحلوں میں تقسیم کیا اور پہلے مرحلے کے طور پر مجاہدین کو مقامی آبادی اور خوانین سے کاٹ دینے کا فیصلہ کیا عام آبادی اور خوانین میں ایسا عُنصر پہلے ہی سے موجود تھا جس نے اسلامی ریاست کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو کسی نظم وضبط اور پابندی کے قائل نہ تھے اور مدتوں سے غیر اسلامی زندگی کے خُوگر چلے آرہے تھے۔ اسلامی ریاست کے قیام سے نہ صرف ان کی آزادروی پر قدغنیں لگ گئی تھیں بلکہ ان کی بے مہار سرداریوں اور مفاد پرستیوں پر بھی ضرب پڑی تھی، وہ اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا رہے تھے اور حالات کی کروٹ کے منتظر تھے۔ ایبٹ نے اُن سے رابطہ پیدا کیا اور انھیں پھانسنے کے لیے حرص وآز کا دام بچھایا۔ روپے پیسے اور جاگیروں کا لالچ دیا۔ اخلاق کھوکھلے ہو جائیں، زندگی کا نصب العین نگاہوں سے اوجھل ہو جائے اور دنیوی مفادات، ملّت کی اعلیٰ قدروں اور روایات اور اُسے سربلندی وسرافرازی سے بہرہ یاب کرنے والی ہر متاعِ عزیز سے زیادہ محبوب ہو جائیں تو پھر انسان ترغیب وتحریص کے کسی بھی جال کا آسانی سے شکار ہو سکتا ہے، چنانچہ یہاں بھی یہی ہُوا۔ صیّاد نے جو دامِ تحریص پھینکا تھا مقامی خوانین اور سردار اُس کی طرف لپک پڑے۔ شومئی قسمت سے اسلام گڑھ نے انٹیلی جنس کا نظام قائم کرنے کی طرف کوئی توجّہ نہ دی تھی۔ وہ افکار وخیالات کی اندر ہی اندر چلنے والی رَو اور انگریزوں کی خُفیہ ساز باز سے بے خبر رہا۔ تین ہزار سپاہیوں پر مشتمل گلاب سنگھ ڈوگرہ کی فوج بارہ مولہ سے دیوان کرم چند کی کمان میں مظفّرآباد کی طرف بڑھی۔ سارے آپریشن کی کمان جنرل کاہن سنگھ مان کے ہاتھ میں تھی۔ فوج کے فیلڈ کمانڈر دو انگریز لیفٹیننٹ ایگنیو اور لیفٹیننٹ لمسڈن تھے۔ ڈوگرہ فوج کے ساتھ چھ توپیں اور گولوں کا بھاری ذخیرہ تھا۔ دوسری طرف ہرکشن گڑھ (ہری پور) میں متعین سکھ افسر گلاب سنگھ اٹاری والے کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ زیادہ سے زیادہ فوج فراہم کر کے فوراً یلغار شروع کر دے۔ اس طرح وہ مجاہدین کو دریائے کشن گنگا کے پار دو اطراف سے گھیر لینا چاہتے تھے۔

گلاب سنگھ کی فوج کے پہلے دستے نے ۲۱ر دسمبر ۱۸۴٦ء کی رات جنوبی گھاٹ سے دریا پار کیا۔ دن کے وقت جنگی تدبیر کے طور پر ظاہر یہی کرتا رہا کہ وہ شمالی گھاٹ سے دریا عبور کرے گا جو مظفر آباد کے شمال میں قلعہ کے قریب تھا۔ ڈوگرہ فوجوں کی نقل و حرکت سے مجاہدین چوکنے ہو چکے تھے اور سات ہزار مسلح جوانوں اور مجاہدین نے درۂ ڈب کے دونوں اطراف پہاڑوں میں مورچے جما لیے تھے۔ ڈوگرہ فوج کے مقابلے میں ان کے پاس ہلکے ہتھیار بھی کم تھے اور توپیں تو سرے سے تھیں ہی نہیں۔ ۲۴ر دسمبر تک تمام ڈوگرہ فوج دریا عبور کر چکی تھی۔ اب یہ دو کالموں کی صورت میں گڑھی حبیب اللہ کی طرف بڑھی۔ اس اثنا میں رئیس مظفر آباد کا بھائی لسٹڈن کے حکم پر اپنے پانچ سو ساتھی لے کر گڑھی حبیب اللہ خان کے نواح میں کمین گاہ میں بیٹھ گیا۔ مقصد یہ تھا کہ جونہی گڑھی کی فوج مجاہدین کی مدد کے لیے اقدام کرے وہ اس پر کمین گاہ سے نکل کر ٹوٹ پڑے۔

ڈوگرہ فوج کی مجاہدین کے ساتھ پہلی جھڑپ ۲٦ر دسمبر کو ہوئی۔ زبردست جنگ کے بعد سکھوں نے پہلی پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔ مجاہدین مورچے خالی کر کے پیچھے ہٹ گئے۔ اگلے تین میل حملہ آور فوج نے کسی مزاحمت کے بغیر طے کیے۔ آگے پھر چڑھائی تھی اور مجاہدین ان کے استقبال کے لیے مستعد کھڑے تھے۔ اِدھر رئیس مظفر آباد کا بھائی اپنی فوج لے کر کمین گاہ سے نکل آیا۔ مجاہدین ابھی اس نئی اُفتاد سے نپٹنے کی سوچ رہے تھے کہ دریائے کنہار کے دائیں کنارے سے توپیں اور زنبورکیں گولے اُگلنے لگیں۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا سکھ فوج پچھلی کی طرف سے بھی بڑھ رہی ہے، تاہم یہ سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ایک خفیہ اشارہ بھی تھا۔ گولوں کے چھوٹتے ہی اسلام گڑھ ریاست کے خوانین مجاہدین کا ساتھ چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ ریاست میں ہر جگہ بغاوت ہو گئی۔ بعض مقامات پر ریاست کے عمّال اور کارکن شہید بھی کر دیے گئے۔ پانسا پلٹ چکا تھا۔ مجاہدین تنہا رہ گئے تھے۔ معدودے چند مخلصین تھے جو بے اثر ہونے کے باوجود عہدِ وفا نبھا رہے تھے ——— لیکن مجاہدین حالات کے اس تغیّر سے ذرا پریشان نہ تھے۔ اُن کا مطمحِ نظر دُنیا کی سربلندیاں اور کامرانیاں نہ تھیں۔ اُن کی ساری جدّوجہد کا مقصود آخرت کی فوز و فلاح تھا اور اس منزل تک دنیا کی زندگی کو رضائے الٰہی

کے مطابق گزارنے اور حق کا بول بالا کرنے کی سعی و جہد میں جان کھپا دینے ہی سے پہنچا جا سکتا تھا۔ اس لیے وہ جو کچھ کر رہے تھے اسی مطلوب و مقصود کی خاطر کر رہے تھے۔

سید بادشاہ کے عہد ہی سے اُن کی یہ ریت چلی آرہی تھی کہ حالات سازگار ہوتے تو وہ اپنی ساری صلاحیتیں اسلام کو عملاً نافذ کرنے اور اُمّتِ مسلمہ کو کفر و باطل کی بڑھتی اُمڈتی ہوئی تہذیبی، نظریاتی اور مادّی یلغار سے بچانے میں جھونک دیتے اور جب حالات بگڑ جاتے، اپنے منافقت کا شکار ہو کر ساتھ چھوڑ جاتے اور دشمن آن گھیرتے تب بھی ذرا پروا کیے بغیر آخری دم تک راہِ حق میں تگ و دو جاری رکھتے اور جان نچھاور کرنے کا وقت آجاتا تو اس شان اور وقار سے جان دیتے جو مردانِ صدق و صفا کا ہمیشہ سطرۂ امتیاز رہا ہے۔ اب وہی لمحات سایہ فگن ہو چکے تھے اور حق یہ ہے کہ ان مردانِ حق نے اپنے قافلے کی ریت پر ذرا آنچ نہ آنے دی۔ وہ تنہا اور بے یار و مددگار ہو کر بھی مقابلے پر تُل گئے۔ ایک مورچے کے بعد دوسرے مورچے پر سخت لڑائی ہوئی۔ درۂ دُبّ پر ڈوگرہ فوج نے قبضہ کر لیا تو مجاہدین شنکیاری کے نواح میں درے کے مُنہ کے قریب ایک ڈھلوان پہاڑی پر مجتمع ہو گئے۔ ۶ جنوری ۱۸۴۷ء کو یہاں ڈوگرہ فوج سے آخری بار تصادم ہُوا۔

ان جھڑپوں اور لڑائیوں میں مجاہدین کی خاصی بڑی تعداد شہادت کے مرتبۂ بلند سے سرفراز ہو گئی تھی اور اب آخری فیصلہ کرنے کا وقت آگیا تھا۔ جس زمین پر مجاہدین کھڑے تھے اور جس کا وہ دفاع کر رہے تھے وہ ان کے پاؤں تلے سے نکل چکی تھی۔ چاروں طرف بغاوت کی آگ پھیل رہی تھی جس کے شُعلے دشمن کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ اب مولانا ولایت علی کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے یا تو وہ ایک ایک مجاہد کو کٹوا دیں اور پھر خود بھی خلعتِ شہادت پہن لیں یا پیچھے ہٹ کر دوبارہ حالات کے نئے سازگار سانچے میں ڈھلنے کا انتظار کریں اور اس دوران میں سرحد کے طُول و عرض میں دعوتِ حق کو پھیلانے اور مقامی آبادی کے فکر و نظر اور کردار کی تربیت و تزکیہ کا اہتمام کریں۔ مولانا ولایت علی نے برسوں کی جانفشانیوں کی حاصل تحریک کو خون میں نہلانے کے بجائے پہلا راستہ اختیار کیا۔ اس مقصد کے لیے واحد پناہ گاہ ستھانہ ہی کی تھی جس نے سخت جانکاہ لمحات میں بھی ان اربابِ شوق پر اپنا دامانِ عافیت

پھیلانے سے کبھی گریز نہ کیا تھا، اب تو سیّد اکبر شاہ زبریں ہزارہ کے حکمران بھی تھے، چنانچہ مولانا ولایت علی بڑے منظّم انداز میں پیچھے ہٹنے لگے۔

اور پھر تاریخ کے مسافر نے ایک پریشان کن منظر دیکھا۔ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی نے ہتھیار ڈال دیے تھے اور وہ اپنے لشکر سمیت سکھ فوج کی نگرانی میں لاہور جا رہے تھے۔ مجاہدین کی صرف ایک چھوٹی سی جمعیت، میر اولاد علی کی کمان میں فرار ہونے میں کامیاب ہو چکی تھی اور وہ ستھانہ پہنچ گئی تھی۔

فراق و وصال

ہزارہ سے لاہور اور لاہور سے عظیم آباد (پٹنہ) تک کا سفر دونوں بھائیوں نے بڑی دل گرفتگی اور بجھے بجھے عالم میں طے کیا۔ اُن کے چہرے صاف کہہ رہے تھے کہ سپر اندازی کے حادثے کا انھوں نے تصور ہی نہ کیا تھا، لیکن حالات کا گھراؤ اتنا شدید تھا کہ اس سے راہِ فرار ممکن ہی نہ تھی۔ انگریز افسروں نے واپسی کے راستے کلیتہً مسدود کر دیے تھے اور تصادم کے معنی مکمل اور یقینی تباہی کے تھے۔ انھوں نے انگریزوں سے گفت و شنید کی اور وہ انھیں ستھانہ جانے کے لیے راستہ دینے پر رضا مند ہو گئے، لیکن اس شرط پر کہ مجاہدین ہتھیار ڈال دیں اور تمام چھوٹا بڑا اسلحہ اُن کے حوالے کر دیں۔ دونوں بھائیوں نے ایک اقرار نامے پر دستخط کر دائے اور ہتھیار ڈال دیے، لیکن انھیں نہتا کر دینے کے بعد انگریز کمانڈر یہ کہہ کر عہد و پیمان سے پھر گیا کہ یہ افسر ایسا معاہدہ کرنے کے مجاز نہ تھے اور ہم اس معاہدے کی تعمیل کے پابند نہیں[1]۔ مولانا ولایت علی اور ان کے ساتھی انگریزوں کے اس فریب کا شکار ہو کر عظیم آباد پہنچے۔ اُن کے ساتھی وہیں منتشر کر دیے گئے اور دونوں بھائیوں سے دس دس ہزار روپے کے مچلکے لے کر انھیں دو برس کے لیے عظیم آباد کی حدود میں پابند کر دیا گیا۔

دو برس کا یہ عرصہ دونوں بھائیوں خصوصاً بڑے حضرت نے سخت اضطراب او...

[1] یہ مصنف کی اپنی رائے ہے جو اُس نے مختلف روایات کا تجزیہ کرنے کے بعد قائم کی ہے۔

ملال میں گزارا۔ اُن کی حالت اُس مچھلی کی سی تھی جسے پانی میں سے نکال کر پھینک دیا گیا ہو۔ جو حادثہ گزرا تھا وہ بجائے خود کچھ کم کربناک نہ تھا۔ سید بادشاہ کی برسوں کی محنت و مشقت اور تگ و دو کے نتیجے میں جو ریاست شعاعِ اُمید بن کر نمودار ہوئی تھی اور توقع تھی کہ اس کا نور رفتہ رفتہ پھیلتا چلا جائے گا، اُسے ایک بار پھر انہی لوگوں نے بے وفائی کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا جنھیں وہ ظلم اور وحشت کے اندھیروں سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ صورتِ حال کی اس کربناکی میں شدت اُس فریب نے پیدا کر دی جو انگریزوں نے اُن کے ساتھ کھیلا تھا۔ وہ ستھانہ پہنچ کر نئے سرے سے بساطِ عمل بچھانا چاہتے تھے، لیکن اب تو جیسے اُن کے بال و پر کاٹ دیے گئے تھے کہ ایک خاص دائرے سے آگے پرواز نہ کر سکتے تھے۔ اس کیفیتِ الم نے اُنھیں پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ بظاہر عظیم آباد میں تھے، لیکن اُن کا دل اُن کوہ و دمن میں اٹکا ہوا تھا جن کے گوشے گوشے میں اُن کے ساتھی اپنا اپنا فرض ادا کر کے ابدی زندگی سے ہمکنار سوئے پڑے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ برصغیر پر غلامی کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں اور آنے والا ہر دن اُس کے پاؤں میں ایک نئی آہنی زنجیر ڈالتا چلا جاتا ہے۔ تھوڑی بہت آزادی اگر کسی دائرے میں باقی رہ گئی تھی تو وہ بھی ختم ہو چلی ہے۔ وہ دَم گھونٹ دینے والی اس فضا میں زندہ رہنے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ ایک مقصد کے لیے زندہ تھے اور اس مقصد کے لیے یہاں رہ کر عملی جدّ و جہد نہ کر سکتے تھے۔ سرحدی خوانین کے ہاتھوں قافلۂ حق نے چرکے پر چرکے کھائے تھے، لیکن اس کے باوجود مولانا ولایت علی یہی سمجھتے تھے کہ جو کام اُن کے پیشِ نظر ہے وہ اسی آزاد سرزمین میں بیٹھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ پھر سید صاحب کی غیوبت اور ایک روز اُن کے ظاہر ہونے کے خیال نے بھی تحریک کو اس سرزمین سے جذباتی طور پر وابستہ کر دیا تھا۔ تیزی سے پھیلتی ہوئی تاریکی میں دعوت کے تقاضے فرض کے احساس اور جذباتی وابستگی نے اُن کے دل میں ایک ایسی آگ بھڑکا دی تھی جو انھیں ہر آن بے قرار رکھتی تھی۔ وہ اکثر دوپہر کے وقت اور راتوں کو کھلے آسمان تلے کھڑے ہو جاتے اور ہاتھ پھیلائے رو رو کر اس ملک سے نکلنے کی دعائیں کرتے۔ اس اضطراب اور بے قراری کے عالم میں سجدے میں گر جاتے اور فرشِ خاکی پر اپنی پیشانی رکھے دیر تک پڑے رہتے، گریہ اور شدید ہو جاتا، یہاں تک کہ ہچکی بندھ جاتی۔ زبان پر ایک ہی تمنا ہوتی کہ وہ ہندوستان کے دارالحرب سے نکل کر اُس فضا میں پہنچ جائیں، جا

جس میں قافلۂ حق کے شہیدوں کا لہو مشکبار ہے۔ کبھی کبھی درد بھرے مترنم لہجے میں یہ شعر پڑھا کرتے:

خدا کے واسطے اِک کی نکالو مت گلستاں سے
مرا دامن بندھے تو باندھ دو گل کے گریباں سے

لیکن اربابِ دعوت و عزیمت محض جذبات و احساسات کا مرقع نہیں ہوتے اور انہی کے اندر کھو کر نہیں رہ جاتے۔ وہ یقین و عمل کا پیکر بھی ہوتے ہیں اور اسی میں اپنی اور اُمّت کی زندگی پاتے ہیں. حالات کا دھارا چاہے کتنا ہی شوریدہ سر اور تُند سیر ہو وہ اُس کے کنارے اپنے خوبصورت جذبات، دلکش احساسات میں ڈُوبے محض بے بس تماشائی بن کر کھڑے نہیں رہتے، وہ اس کا رُخ بدلنے کی جدّ و جہد کرتے ہیں، مادّی ناتوانیوں اور وقتی ناکامیوں سے اُن کے حوصلے شکست نہیں کھاتے، وہ نتائج کو خاطر میں لائے بغیر نبرد آزما رہتے ہیں، نامساعد لمحات کی چٹانیں اُن کی راہ میں آکھڑی ہوتی ہیں تو ان کی عزیمت اپنا راستہ بنا لیتی ہے؛ چنانچہ شمع کی طرح پگھلا دینے والی اس جذباتی کیفیت میں بھی بڑے حضرت اپنے کام سے غافل نہ تھے۔ اُنھوں نے واپس آتے ہی تحریک کی زمامِ قیادت سنبھال لی تھی (جب تک وہ سرحد میں رہے مولانا فرحت حسین ہندوستان میں تنظیم کی راہنمائی کرتے رہے) اور عظیم آباد میں تبلیغ و ارشاد کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ کچھ مدّت کے بعد گرد و نواح کے دیہات و قصبات میں بھی دورے کرنے لگے۔ اُنھوں نے دعوت پھیلانے کے لیے مختلف علاقوں میں مبلّغین بھیجے اور اپنے خلفاء سے رابطہ قائم کیا، مولانا عنایت علی کو بنگال روانہ فرمایا، تزکیہ و تربیت کی مجالس اور درسِ قرآن و حدیث کے نئے نئے حلقے قائم کیے۔ صادق پور کی "خانقاہ" کے شب و روز پہلے بھی نہیں بدلے تھے اب اُن کے اندر جذب و شوق کے ولولے اور گہرے ہو گئے۔

بڑے حضرت کی یہ سرگرمیاں محکمے کی عائد کردہ پابندیوں کے منافی تھیں، حکّام اُن سے غافل نہ تھے، خصوصاً جب کہ شہر کے اندر جنگل خود موجود تھے اور اُن کے ایک ایک لمحے کی خبر اُوپر پہنچا رہے تھے، لیکن حکّام شاید نظر انداز کرنے پر مجبور تھے کہ یہ سرگرمیاں بظاہر اسی نوعیت کی تھیں جو دوسرے مشائخ کی خانقاہوں اور عام مسجدوں اور مدارس میں جاری تھیں۔ جہاد کے تذکرے سے بالکل خالی تعلیم و تبلیغ اور اصلاح کے رنگ سے مزیّن! البتہ بنگال میں

مولانا عنایت علی کی سرگرمیوں کا مختلف ردِّ عمل ہُوا۔ راج شاہی کے مجسٹریٹ نے اُنھیں ضلع سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ الزام یہ تھا کہ وہ بغاوت کے شُعلے بھڑکاتے ہیں، تاہم مولانا نے اپنا تبلیغی جہاد جاری رکھا۔ وہ حسبِ دستور مُسلسل دورے پر رہتے۔ ۱۸۴۹ء کے اواخر میں مجسٹریٹ کو پھر اطلاع ملی کہ مولانا عنایت علی جہاد کے لیے رضا کار بھرتی کر رہے ہیں۔ اُس نے فوراً تفتیش کا حکم دے دیا۔ مولانا عنایت علی کو خبر ملی تو وہ چُپکے سے عظیم آباد واپس چلے آئے۔

مچلکوں کی میعاد میں چند ماہ باقی تھے کہ بڑے حضرت کی زندگی میں ایک عجیب انقلاب رُونما ہُوا۔ اُنھوں نے تبلیغ و ارشاد کے دَورے ختم کر دیے۔ درس بھی وہ اب پابندی سے نہ دیتے۔ وہ اضطراب اور بے قراری بھی جاتی رہی تھی جس میں سرحد سے جبری واپسی کے بعد مبتلا ہو گئے تھے۔ زیادہ تر چُپ چاپ اور سوچوں میں کھوئے رہتے۔ پھر اُن کے ذوق وشوق اور رہن سہن کے انداز میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ دُنیوی عیش وعشرت کا ساز وسامان جسے اُنھوں نے کسی زمانے میں خود اپنے گھر سے نکال پھینکا تھا اب پھر اُن کی دلچسپیوں کا مرکز بن گیا تھا۔ اپنے دولت کدے کو صاف سُتھرا کر کے سنوارا سجایا۔ پائیں باغ کی روشیں جو تغافل کا شکار ہو چکی تھیں، پھر سے درست کروائیں۔ پھُول اور پَودے لگوائے۔ کمروں کو فرش فروش، جھاڑ فانوس اور دیگر اشیائے زینت سے آراستہ وپیراستہ کیا، اصطبل میں عمدہ عمدہ گھوڑے خرید کر باندھے اور عمدہ عمدہ رنگین کبوتروں سے کبوتر خانہ سجوایا۔ دیکھنے والے یہ سب کچھ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بڑے حضرت اور دُنیا داری کے یہ دھندے! ارادت مندوں کو اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آتا تھا۔ اُدھر معاندین کی صفوں میں اس انقلابِ احوال کا بڑے تمسخر بھرے اور استہزائیہ لب ولہجے میں ذکر ہو رہا تھا۔

"آخر زُہد وتقوٰی کا مُلمع اُتر گیا۔ بچارا مولوی کب تک مصنوعی خول اپنے اوپر اوڑھے رکھتا۔"

"ہر شے اپنی اصلیّت کو لوٹ کر رہتی ہے۔"

"سوچا ہوگا زاہد وعابد کا رُوپ دھار کر بے شمار مرید بنا لیے ہیں پسینے کی جگہ لہو نچھاور کرنے والے مرید۔ وہ کہیں جانے والے نہیں، سو اب عشرت کی بساط بچھاؤ اور مزے کرو۔"

سرکارِ دولت مدار تک اِس تبدیلی کی خبر پہنچی تو وہاں گمبھیر سکون کی لہر دوڑ گئی کہ مولوی اب دُنیا میں خوب پھنس گیا ہے، عیش و عشرت کی یہ زندگی زنجیرِ پا بن جائے گی اور کہیں جانے نہ دے گی۔ وہ یہ راز بھی جانتے تھے کہ مادّی تعیشات میں ڈوبے ہُوئے لوگ ترکِ وطن یا جنگ اور جہاد کی صعوبت ناک راہوں پر چلنے کا یارا نہیں رکھتے۔

○

مچلکے کی تاریخ ۲۳ جولائی ۱۸۴۹ء کو ختم ہُوئی اور اس کے ساتھ ہی بڑے حضرت عشرت سامانی کی اُس زندگی سے ہاتھ جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہُوئے جس کی بساط اُنھوں نے صرف چند مہینے پہلے بچھائی تھی اور جو اپنوں کی حیرت اور معاندین کے قہقہوں اور طنز کا موجب بن گئی تھی۔ تحریک کی زمام پھر اپنے چھوٹے بھائی (مولانا فرحت حسین) کے سپرد کی، کارِ حق کے سلسلے میں انھیں تفصیلی ہدایات دیں، مولانا فیّاض علی اور اپنے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ سے فرمایا کہ سفر کا سامان مکمل کر کے تمام اہل و عیال کو ساتھ لو اور ایک ہفتے کے اندر اندر گڈھانہ پہنچ جاؤ، وہاں ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ مولانا یحییٰ علی اور دیگر چند اصحاب سے کہا کہ وہ تیّار ہو جائیں اُنھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

مولانا عنایت علی بنگال میں تھے اُنھیں لکھ بھیجا کہ گھر ہوتے ہُوئے تم بھی سوات چلے آؤ۔

۱۳ شوال ۱۲۶۵ھ (یکم ستمبر ۱۸۴۹ء) کو بڑے حضرت نے اپنے چند منتخب ساتھیوں کے ساتھ گھر بار چھوڑا اور ہجرت کے راستے پر گامزن ہو گئے۔ اُن کی تیاریوں اور ہدایات سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی کشتیاں جلا کر چلے ہیں اور اب کبھی اپنے وطن واپس نہیں آئیں گے۔

بڑے حضرت عظیم آباد کو خیرباد کہہ کر نکلے تو اُن کا یہ سفر دیکھنے میں ایک تبلیغی سفر معلوم ہوتا تھا۔ صرف چند اصحاب ہم عناں تھے۔ پہلی منزل گڈھانہ تھی۔ یہ عظیم آباد سے سات کوس جانبِ مغرب ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ یہاں آپ نے تقریباً ایک ہفتہ قیام فرمایا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق مولانا فیّاض علی اور مولانا عبداللہ بھی تمام عیال و اطفال اور ناگزیر ضرورت کا اسباب اور متاع لے کر آپ سے آملے۔ اب پیچھے اُس مکان میں جو دو بڑے خاندانوں کا مسکن تھا صرف

پانچ مرد اور دو عورتیں رہ گئی تھیں۔ باقی سب اللہ کی راہ میں زندگی لٹانے چل کھڑے ہوئے تھے۔ مولانا فیاض علی وغیرہ کے ساتھ گھر کے لوگوں کے علاوہ اور بھی بہت سے اہلِ شوق و عزیمت آئے تھے اور پورا قافلہ دو اڑھائی سو افراد پر مشتمل تھا۔ گڈھانہ سے روانہ ہو کر کوٹلور پہنچے۔ یہ دانا پور اور ڈمراؤں کے درمیان ایک گاؤں تھا۔ اس کے رئیس حاجی امام علی نے اہتمام سے دعوت کرنا چاہی، مگر بڑے حضرت نے انھیں روک دیا۔ فرمایا: ہم صرف وہ ستو کھائیں گے جو آپ کے ہلواہے کھاتے ہیں۔ مجبوراً تعمیلِ ارشاد کی اور آپ نے تمام قافلے اور اپنے اہل و عیال کو وہی ستو کھلایا۔ آرہ پہنچے تو چودھری ہدایت بشیر رئیسِ اعظم نے بڑی پُر تکلف ضیافت کی تیاری کی، مگر انھیں بھی منع فرمادیا اور اُن سے چاول، دال اور دوسرا ضروری سامان لے کر خود کھچڑی پکوائی۔ آگے غازی پور تھا۔ یہاں مولوی محمد فصیح نے بڑا گرم جوشی سے استقبال کیا، قافلے کو مسجد میں ٹھہرایا، خواتین کو اپنے زنانہ مکان میں لے گئے اور بڑے حضرت کو اپنے حجرے میں جگہ دی۔ دونوں وقت زنانہ مکان سے کھانا لاکر ہاتھ دُھلاتے اور کھانا کھلاتے اور پس خوردہ تبرکاً اہل و عیال سمیت خود تناول کرتے۔ رخصت کے وقت خواہش ظاہر کی کہ آپ کا قاصد مجھ سے ملتا جایا کرے۔

یہاں سے رُخصت ہو کر قریہ قریہ شہر شہر دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیتے ہوئے قنوج پہنچے۔ یہ سید اولاد حسنؒ کا وطن تھا۔ جو نواب انور جنگ بہادر سید اولاد علی خاں قلعہ دارِ گولکنڈہ کے صاحبزادے اور امیر الملک والاجاہ نواب سید صدیق حسن کے والدِ گرامی اور سید بادشاہ کے خلفائے عظام میں سے تھے۔ بارہ تیرہ برس پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ نواب سید صدیق حسن اُس وقت بارہ تیرہ برس کے تھے۔ وہ اپنی ایک کتاب میں بڑے حضرت کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ میرے مکان پر تشریف لائے۔ اپنے اہلِ بیعت کو والدہ مرحومہ سے ملاقات کے لیے بھیجا۔ جامع مسجد قنوج میں چند جمعہ تک وعظ کیا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ کتاب بلوغ المرام ضرور پڑھنا۔ اُن کے وعظ میں جو اثرِ سریع مَیں نے پایا وہ کسی میں دیکھا نہ سُنا۔ اُن کے پاس بیٹھنے سے دل دُنیا سے سرد ہو جاتا تھا اور دین کا جوش تہِ دل سے اُٹھتا تھا۔ یہ مصرع مَیں نے انھیں کی زبان مبارک سے سُن کر یاد کر لیا تھا:

ہم طرز جنوں اور ہی ایجاد کریں گے

قنوج سے پھر سفر شروع ہُوا۔ گاؤں گاؤں اور شہر شہر میں حق کا نُور پھیلانے اور غفلت کیش زندگیوں میں اسلامی بیداری کی رُوح پھُونکتے ڈیڑھ برس کے عرصے میں دہلی پہنچے۔ یہاں بڑے حضرت تقریباً دو مہینے مقیم رہے۔ مسجد فتح پُوری کے قریب ایک عالی شان مکان میں فروکش ہُوئے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ جنات کے زیرِ اثر ہے، چنانچہ ویران پڑا تھا۔ روزانہ جامع مسجد یا کسی اور جگہ وعظ فرماتے۔ آپ کے مواعظ کی ہر طرف دُھوم مچ گئی۔ وہی شاہ اسمٰعیل شہید کا رنگ تھا جن لوگوں نے شاہ شہید کے وعظ سُنے تھے، اُن کی نگاہوں میں وہی دَور پھر گیا۔ ان وعظوں میں بڑا ہجوم ہوتا اور دہلی کے ہر طبقے کے افراد ہوتے۔ مشہور شاعر مومن خاں مومن سید بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے وہ بڑے حضرت کے وعظ بڑے ذوق و شوق سے سُنتے۔ آپ کی بیعت کر کے انھوں نے اپنے اس دعوتی و رُوحانی رشتے کی تجدید کی جو سید بادشاہ سے تیس سیّنتیس برس پہلے اُستوار ہُوا تھا۔ نواب زینت محل بیگم کے اُستاد مولوی امام علی بھی وعظ و ارشاد کی انہی مجالس میں متاثر ہوئے اور آپ سے بیعت کی اور انہی کے توسط سے آپ کا چرچا آخری مغلیہ تاجدار بہادر شاہ ظفر تک پہنچا بادشاہ نے شوقِ ملاقات کا اظہار کیا اور دعوت نامہ بھیج کر قلعہ معلّٰی میں بلایا۔ بڑے حضرت نے معذرت فرمائی، مگر بادشاہ نے بے حد اصرار کیا۔ بڑے حضرت اس اصرار کو ردّ نہ کر سکے اور دعوت قبول کر لی۔

مولانا پچھتّر آدمیوں کے ساتھ قلعے میں تشریف لے گئے۔ بادشاہ نے ایوانِ خاص میں جلوس فرمایا تھا۔ تخت سے اُتر کر لبِ فرش تک آپ کا استقبال کیا اور مصافحہ و معانقہ کیا۔ آپ کے ساتھیوں سے بھی ہاتھ ملائے۔ پھر بڑے حضرت کو اپنے ساتھ تخت پر بٹھایا۔ عطر اور پان سے تواضع کی اور پھر مزاج پُوچھا۔ وجہِ گزران دریافت کی تو آپ نے فرمایا: آپ ہی کے بزرگوں کا عطیّہ ہے۔ بادشاہ کی چشمِ تصور میں عروجِ رفتہ کا سماں پھر گیا اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بڑے حضرت کے صاحبزادگان اُن کے ساتھ تھے۔ سب سے چھوٹے فرزند مولوی محمد حسن ذبیح کی عمر پانچ برس تھی۔ انھیں بادشاہ نے گود میں بٹھا لیا اور پُوچھا کیا پڑھتے ہو؟ صاحبزادے نے کہا قرآن شریف۔ پھر بادشاہ کی فرمائش پر سورۃ بقرہ کا ایک رکوع پڑھ کر سنایا اور اُس کا ترجمہ کیا۔ بادشاہ بہت متعجب ہُوا۔ اُسے تعجب

کرنا ہی چاہیے تھا قلعے میں تو اس عمر کے بچے آنا کی گود میں کھیلا کرتے تھے اور پھر قرآن کریم تو وہ مقدس کتاب تھی جس کا مصرف قلعے میں برکت حاصل کرنے اور چوم کر ماتھے اور آنکھوں سے لگانے کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ تصور تو اُن کے ہاں ناپید ہو چکا تھا کہ قرآن زندگی کی رہنما کتاب ہے اور ہر چھوٹے بڑے مسلمان کے ایمان کا اوّل و آخر تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی کو اس کے احکام و فرامین کے سانچے میں ڈھالے۔ پھر آپ نے وعظ شروع فرمایا۔ حمد و ثنا کے بعد سورۃ الحدید کی آیت تلاوت فرمائی: اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ[1] (۲۰) بڑے حضرت نے وعظ و ارشاد کے لیے جو آیت منتخب کی وہ گرد و پیش کی فضا کے اعتبار سے اتنی موزوں تھی اور نفسیاتی لحاظ سے اس قدر مناسب کہ جب اُنھوں نے اس کی تشریح و تفسیر بیان فرمائی تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ آیت اسی خاص موقع و محل ہی کے لیے نازل ہوئی تھی۔ ایک عظیم الشّان خوبصورت قلعہ جس کے در و دیوار سے جاہ و جلال ٹپکتا تھا اور جو عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتا تھا اُس پر اجنبی سائے پوری طرح پھیل چکے تھے اور اُس کے اندر کی دُنیا ڈوبتے ہوئے سُورج کا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں سے جاری ہونے والا فرمان ایک دنیا پر ہیبت اور لرزا طاری کر دیتا تھا اور پُورا برِصغیر جس کے آگے سرنگوں ہو جاتا تھا، لیکن اُس کے مکیں اِس پُرفریب زندگی کا شکار ہو کر لہو و لعب میں کھو گئے اور تفاخر و تکاثر

---

[1] ترجمہ: خُوب اچھی طرح جان لو کہ یہ دُنیا کی زندگی کھیل کُود، دل لگی اور ظاہری نمود و نمائش، آپس میں ایک دوسرے پر تم لوگوں پر برتری جتانے اور مال اور اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس زندگی کی مثال ایسے ہے جیسے بارش ہوتی ہے تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشتکار خوشی سے پھُولے نہیں سماتے۔ پھر وہ کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو جاتی ہے اور پھر بھُس بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی متاعِ فریب کے سوا کچھ نہیں۔

کی اس بیماری میں مبتلا ہو گئے جو افراد ہوں یا خاندان اور قومیں جب اس میں مبتلا ہوتی ہیں تو ہلاکت کے گھاٹ اُتر جاتی ہیں۔ وہ زندگی کے حقیقی مقصد کو فراموش کر چکے تھے۔ اللہ نے جو اقتدار انھیں بخشا تھا اُس سے انھوں نے اللہ کی رضا کے مطابق کام نہ لیا۔ اِس کے برعکس اللہ سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کی۔ آخرت، اُس کا عذاب، اللہ کی رضا اور مغفرت اُن کی نظر سے اوجھل ہو گئی اور عروج و کمال کی وہ حسین و دلکش لہلہاتی زندگی جس پر اُنھیں بڑا ناز تھا اب زوال و انحطاط سے دوچار ہو کر بھُس کی طرح بے مایہ ہو چکی تھی اور یہ تو دُنیا کی عشرت سامانیوں کا دُنیا میں انجام تھا۔ کون کہہ سکتا تھا آخرت میں غفلت و سرکشی کی اس زندگی کی سزا کیا ہو گی! یہ انسان کی بدبختی ہے کہ وہ دُنیا کی پُرفریب زندگی میں کھو کر آخرت سے آنکھیں بند کر لیتا ہے، حالانکہ اس زندگی کو حقیقت پسندی سے دیکھے اور اُس کے مطابق اپنا معاشرتی و اخلاقی رویّہ متعین کرے اور فکر و عمل میں راہِ راست کو اپنائے تو دُنیا میں بھی اللہ کی رحمتیں اور برکتیں اس پر سایہ فگن رہتی ہیں اور آخرت تو اللہ نے اپنی رضا اور مغفرت کا سامان اپنے وفا کیش اور فرمانبردار بندوں ہی کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔

بڑے حضرت نے آیت کا ترجمہ کیا، پھر دُنیا کی رنگینیوں، آرزوؤں اور تمناؤں کا اسلامی نقطۂ نظر سے گہرا تجزیہ کیا اور پھر اس کی بے ثباتی کا بڑی وضاحت سے ایسا پُر اثر نقشہ کھینچا کہ سننے والوں کی نگاہوں میں گویا سارا منظر پھر گیا۔ اگرچہ بڑے حضرت کے ارشادات میں قلعے کے اندر پھیلے ہُوئے اخلاقی و معاشرتی اور تہذیبی و تمدّنی مفاسد اور اُن کے نتیجے میں رُونما ہونے والے سیاسی زوال اور تباہی کی طرف ذرا اشارہ نہ تھا پھر بھی سامعین تڑپ تڑپ گئے۔ بادشاہ، اس کے اہلِ خاندان اور اعیان و امرائے سلطنت ہر شخص اپنے آپ کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ اور جب بڑے حضرت دُنیوی زندگی کی بے ثباتی کا تذکرہ کرتے ہُوئے عَذَابٌ شَدِیْدٌ کی تشریح پر پہنچے تو وزیرِ اعظم نے کان میں کہا: بادشاہ سلامت کے سامنے عذاب کے بیان کا دستور نہیں، یہاں علماء اپنے وعظ میں صرف جنّت ہی کا ذکر کرتے ہیں۔ بڑے حضرت نے سُنی اَن سُنی کر دی اور عذابِ قبر، ہنگامۂ حشر اور دوزخ کا بیان ایسے مؤثر انداز میں کیا کہ بادشاہ، شاہزادے، نواب زینت محل، درباری امرا اور دوسرے حاضرین زار زار رونے لگے۔

وعظ ختم ہُوا تو بادشاہ نے کہا میں نے بھی ترکِ دُنیا کے باب میں کچھ شعر کہے ہیں۔ آپ نے سُننے کا اشتیاق ظاہر فرمایا اور شعروں کی تعریف کی۔ رخصت ہُوئے تو ریذیڈنٹ نے بادشاہ کے ایما پر شاہی محلاّت اور موتی مسجد وغیرہ کی سیر کرائی۔ قیام گاہ پر پہنچے تو بادشاہ نے کھانوں کے پچاس خوان شاہی مطبخ سے بھجوائے۔

رمضان کا مہینہ سر پر تھا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ بڑے حضرت رمضان قلعہ معلّٰی ہی میں گزاریں تاکہ قلعے کے لوگ ان کے پیچھے تراویح پڑھیں اور پُورا مہینہ ان کے مواعظ سے اپنی زندگیوں کے پیچ وخم سنواریں، لیکن انگریز ریذیڈنٹ سخت مضطرب تھا وہ بار بار لوگوں سے پُوچھ رہا تھا: مولوی صاحب کس مقصد سے آئے ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟ اس پرسش سے اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں انگریز رکاوٹ نہ کھڑی کر دیں، چنانچہ زیادہ قیام مصلحت کے خلاف سمجھا، بادشاہ کو پیغام معذرت بھیجا اور خود دہلی سے کُوچ فرما کر شام کے وقت جمنا کے پار پہنچ گئے اور یہیں ۱۲۶۶ھ کے رمضان کا چاند دیکھا۔ اب یہ قافلہ منزل بہ منزل کُوچ کرتے ہُوئے کھنہ (لدھیانہ) پہنچا اور وہاں ایک سرائے میں قیام کیا اور مولانا عنایت علی کے انتظار میں کئی دن گزارے۔

مولانا ولایت علی نے عظیم آباد چھوڑنے سے پہلے مولانا عنایت علی کو بنگال پیغام بھیج دیا تھا کہ وہ بھی گھر ہوتے ہُوئے سوات چلے آئیں۔ کھنّہ کے مقام پر ہم اُن کا انتظار کریں گے۔ یہی وہ دن تھے جب راج شاہی کے مجسٹریٹ نے اُن کی سرگرمیوں کی تحقیقات کا حکم دے دیا تھا۔ مولانا عظیم آباد چلے جانے کا فیصلہ کر چکے تھے کہ انھیں بڑے حضرت کا پیغام مل گیا۔ فوراً بنگال کا نظم قابلِ اعتماد کارکنوں کو سونپا اور وطن چلے آئے۔ یہاں اگلے چار پانچ مہینے ہجرت کی تیاریوں میں گزرے۔ والدۂ محترمہ نے ایک گاؤں، دوآب پور اراہٹ کا وثیقہ ان کے سپرد کیا جسے آپ نے سفرِ ہجرت کے مصارف کا بندوبست کرنے کے لیے تیس ہزار روپوں کے عوض فروخت کر دیا اور بعض دوسرے مواضع سے دستبردار ہو گئے۔ یُوں آلائشِ دُنیا سے دامن صاف کر کے اللہ کی راہ میں ۱۹ جون ۱۸۵۰ء کو وطن سے روانہ ہو گئے۔ ۷ محرم ۱۲۶۷ھ (۱۲ نومبر ۱۸۵۰ء) کو دونوں بھائیوں کی کھنّہ میں ملاقات ہُوئی۔ اگلی منازل دونوں بھائیوں نے مل کر

طے کیں چند اور اصحاب بھی اُن کے ساتھ تھے۔ کھنّہ سے روانہ ہوتے وقت مولانا ولایت علی نے بڑے صاحبزادے کو ہدایت کی اب قافلے کے لوگ تین تین چار چار کی ٹولیوں میں سفر کریں اور وہ خود مع اہل و عیال جلد جلد منزلیں طے کر کے پہنچ جائیں۔ کھنّہ سے سرحدِ آزاد تک کا سفر تقریباً تین ماہ میں طے ہُوا۔ مولانا ولایت علی اپنے چیدہ چیدہ ساتھیوں سمیت ۸ ربیع الثانی ۱۲۶۷ھ (۱۰ فروری ۱۸۵۰ء) کو ستھانہ پہنچے اور آٹھ روز بعد آپ کے اہل و عیال بھی پہنچ گئے۔ قافلے کے باقی اصحاب چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں اگلے کئی ماہ تک آتے رہے۔

○

بڑے حضرت اور اُن کے ساتھیوں کی آمد سے صدق و وفا کے بندوں میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میر اولاد علی نے مجاہدین کی قیادت بڑے حضرت کو سونپ دی تھی۔ سیّد بادشاہؒ کے عہد سے اب تک مقامی خوانین اور عام آبادی کے بارے میں جو تجربات پیش آئے تھے انھیں مولانا ایسا صاحب بصیرت شخص نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ دراصل بنیادی غلطی یہ ہُوئی کہ سیّد بادشاہ نے ہندوستان سے سرحدِ آزاد میں پہنچ کر دعوت و تبلیغ کا کام کیے اور تحریک کے مقاصد مقامی لوگوں کے دل و دماغ میں بٹھائے بغیر محض اس مفروضے پر سکّھوں سے جنگ چھیڑ دی کہ یہ لوگ مسلمان ہیں اور سکّھوں کے ہاتھوں زخم خوردہ، اس مہم میں لازماً ان کا ساتھ دیں گے کہ یہ جنگ برِصغیر کے مسلمانوں کی نہیں خود اُن کی اپنی جنگ تھی۔ تند و تیز حالات سے نبٹنے کے جذبے نے یہ حقیقت اُن کی نگاہوں سے اوجھل کر دی کہ محض جذباتی عقیدت بے بنیاد ہوتی ہے اور جذباتی رشتے جذبات کی بڑھتی گھٹتی ہُوئی لہروں کے ساتھ ساتھ متأثر ہوتے رہتے ہیں۔ جذبات اور صرف جذبات کے سہارے کوئی ٹھوس اور پائدار کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا اور نہ نرے جذباتی انسان کسی ایک مؤقف پر اس طرح جمے رہ سکتے ہیں کہ حالات کی آندھیاں اور طوفان چاہے کتنے ہی شدید اُٹھیں وہ اپنی جگہ سے ہلنے نہیں پاتے۔ جذبات بلاشبہ کسی تحریک اور دعوت کی کامیابی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن اُس کی اصل قوّت محض جذبات کے مدّوجزر پر چلنے والے نہیں، وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس تحریک اور دعوت کو حق سمجھ کر شعوری طور پر قبول کرتے ہیں اور اُس کے اصول و نظریات اور مقاصد اور اُن کی زندگیوں میں رُوح کی طرح رچ بس جاتے ہیں اور اُس

کے نصب العین کو پوری طرح سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیتے ہیں۔

ہندوستان میں یہ کام پہلے سید بادشاہ اور ان کے خلفا، مولانا ولایت علی اور دوسرے اصحاب برسوں کرتے رہے، تب جا کر ایسے کارکن تیار ہوئے جن کی اپنے مقصد سے لگن اور نصب العین سے اخلاص میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ جو تحریک کے مقصد پر دُنیا کی بڑی سے بڑی اور عزیز ترین متاع کو نچھاور کرنے پر ہمہ وقت آمادہ رہتے تھے اور جن کے قدم بے پناہ طوفانوں میں بھی نہ ڈگمگائے، جو مایوسی کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں بھی چراغِ عزیمت روشن کیے اپنی منزل کی طرف گامزن رہے، جنھوں نے تلواروں کے سائے میں نمازِ عشق ادا کی، تختۂ دار تک پہنچ گئے، لیکن کلمہ حق سربلند کرنے کی جدّوجہد سے باز نہ آئے، جنھیں نہ کوئی ذاتی اور خاندانی مفاد سوچ سمجھ کر اختیار کی ہوئی راہِ حق سے بھٹکا سکا اور نہ تحریص و ترغیب کے حسین دام اپنا شکار بنا سکے۔ ایک بار جس شخص نے تحریک کے سربراہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا پھر اُس کی گردن تو کٹ گئی مگر اُس نے مرشدِ راہِ حق کا دامن نہ چھوڑا۔ سرحدِ آزاد میں ایسی تربیتِ فکر و نظر اور تزکیۂ نفس و کردار کا اہتمام نہ ہو سکا۔ تحریک کی دعوت نہ تو مقامی آبادی کے دلوں میں پورے شعور کے ساتھ جاگزیں ہو پائی اور نہ اُس کی رگوں میں اسلام کے لیے مچلنے والے جذبات کو اخلاص کی وہ رُوح میسّر آسکی جو کسی فرد کو پورے جذبۂ طاقت و فا کے ساتھ اپنے نصب العین سے وابستہ رکھتی ہے۔ مقامی عام مسلمان تو قبائلی نظام میں کوئی قوت و اہمیت نہ رکھتے تھے جو کچھ تھے خوانین تھے۔ ان خوانین کی بھاری اکثریت نے اس دعوت و تحریک کا ساتھ دیا تو اس لیے نہیں کہ یہ اُن کے ایمان کا تقاضا تھا بلکہ اس لیے کہ اُنھیں اس دعوت کے ذریعے کسی نہ کسی رنگ اور درجے میں اپنی ذاتی اُمنگیں اور آرزوئیں پوری ہوتی نظر آتی تھیں۔ نتیجہ یہ کہ یہاں تحریک کو قدم قدم پر غدر اور بے وفائی کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلے پہل عام لوگ اور خوانین بڑے جوش اور جذبے کا اظہار کرتے، لیکن آہستہ آہستہ جذبات پر مصلحتیں اور مفادات غالب آتے چلے جاتے، چنانچہ جس نے بھی دعوتِ حق اور تحریکِ اصلاح و جہاد کا ساتھ دینے کا عہد بیعت کر کے کیا اُسی نے اپنے عہد کو توڑا۔ ہزاروں میں سے صرف چند سو، اللہ کے بندے

ایسے نکلے جو آخری دم تک مکمل اخلاص اور وفاداری کے ساتھ اپنے عہد پر قائم رہے۔ مولانا ولایت علی ایسا ذہین شخص اس تجربے کو بار بار دُہرانے پر تیار نہ ہو سکتا تھا۔ انھوں نے غالباً عظیم آباد ہی میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ سرحدِ آزاد پہنچ کر وہ مقامی مسلمانوں میں ایک کسان کی طرح زمین ہموار کرنے کی جدّ وجہد کریں گے۔ اُن کے فکر و نظر کو بدلیں گے، اُن کے کردار کو اسلام کے رنگ میں رنگیں گے اور اپنی ساری توجہ اُن میں دعوتی شعور اور جذبۂ اخلاصِ عمل پیدا کرنے پر مرکوز کر دیں گے اور جب تک اُن کی خاصی بھاری تعداد شعوری طور پر اُسے حق اور اپنے ایمان کا تقاضا سمجھ کر تحریک کے ساتھ وابستہ نہ ہو گی محاذِ جنگ نہیں کھولیں گے کہ نفاق اور بے وفائی کے پیکروں، مفاد پرستوں، مصلحت کیشوں اور ہر گرم و سرد جھونکے پر رُخ بدل دینے والوں کو لے کر زندگی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا معرکہ بھی سر نہیں کیا جا سکتا کُجا یہ کہ اُن کے بَل پر وقت کی بہت بڑی سامراجی قوّت کو جس کی جڑیں برِ صغیر میں اس کناری سے سرحدِ آزاد کے اندر تک گہری جم چکی تھیں، چیلنج کیا جا سکتا اور اُس کے مسلّط کردہ نظام کو بنیادوں سے اُکھاڑ کر اسلام کا نظام قائم کیا جاتا۔ اپنے اس فیصلے کے مطابق اُنھوں نے سرحد پہنچتے ہی کام شروع کر دیا۔ عام آبادی میں رُشد و ہدایت کا سلسلہ انھی خطوط پر جاری کیا جن خطوط پر وہ عظیم آباد میں بیٹھ کر جاری کر چکے تھے اور جس کے اثرات دُور دُور تک پھیل رہے تھے۔ درسِ قرآن و حدیث کے حلقے تشکیل دیے جو کتاب و سُنّت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تبلیغ و تلقین کرتے اور قلوب و اذہان میں حق کے نُور سے اُجالا کرتے۔ ستھانہ میں ہوتے تو خود نمازِ ظہر کے بعد درس دیتے اور فجر کے وقت سلوک و طریقت کے آداب سکھاتے۔ تربیت و تزکیہ کی ان سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مجاہدین روزانہ پریڈ اور ہتھیار استعمال کرنے اور جنگ لڑنے کی مشقیں کرتے۔ بے شک یہ پروگرام بڑا وقت چاہتا تھا مگر اس طویل راستے پر چلے بغیر چارہ نہ تھا۔ بدقسمتی سے مولانا عنایت علی کو اس طریقِ کار سے اختلاف تھا۔ وہ بلا تاخیر جنگ و جہاد کی راہ پر ہو لینا چاہتے تھے۔ اُن کے خیال میں مطلوبہ طاقت کی تیاری میں لگے رہنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ حالات بڑی تیزی سے بدلتے جا رہے تھے، وہ تو اس طویل پروگرام میں منہمک رہیں گے اور وقت کا تیز گام قافلہ اُنھیں پیچھے چھوڑ جائے گا۔ انگریز

اپنی جڑیں اور گہری جمالیں گے اور تحریک کے لیے عملی جدّوجہد کا میدان محدود سے محدود تر ہو کر رہ جائے گا۔

اِدھر ایک ایسا واقعہ رُونما ہُوا جس پر مولانا عنایت علی کو اپنے مؤقف کے درُست ہونے کا گویا ثبوت مل گیا۔ نواب امب نے مُجاہدین سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ مُجاہدین کا ایک قافلہ ستھانہ آ رہا تھا کہ نواب کے آدمیوں نے اُسے لُوٹ لیا۔ نواب چونکہ بہت سے دوسرے خوانین کی طرح وقت کے بہاؤ کو دیکھتے ہُوئے انگریزوں سے وابستہ ہو چکا تھا اس لیے یہی سمجھا گیا کہ یہ شرارت انگریزوں کے اشارے پر کی گئی ہے۔ یہ خیال بظاہر حیرت ناک تھا مگر بعید از حقیقت بھی نظر نہ آتا تھا۔ حیرت ناک اس لحاظ سے کہ دونوں بھائیوں نے عظیم آباد سے سرحدِ آزاد تک کا سفر مجاہدین سمیت خُفیہ نہیں کیا تھا۔ اُن پر انگریزوں کی نظر یقیناً رہی ہو گی، لیکن اُنھوں نے اس سفر میں ذرا مزاحمت نہ کی اور اُنھیں جانے دیا۔ یہاں تک کہ کھبّل کے مقام پر قافلے کے کچھ اُونٹ سامان سے لدے ہُوئے روک لیے گئے تو ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے اُنھیں واگزار کر دیا اور بحفاظت مالکوں تک پہنچا دینے کی ہدایت کی۔ یہ عنایت بے جا نہ تھی۔ وہ یقیناً جانتے تھے کہ قافلۂ حق کے یہ سرخیل سرحدِ آزاد میں جا کر آرام سے نہیں بیٹھ رہیں گے اور اب اُن کا تصادم کسی اور سے نہیں خود انگریز حکومت کے ساتھ ہو گا، لیکن سفر میں کسی قسم کی رکاوٹ غالباً اس لیے نہ کی کہ دونوں بھائی ہندوستان میں رہتے ہُوئے کہیں زیادہ خطرہ بن سکتے تھے۔ ان کی سرگرمیاں بظاہر عام تبلیغی نوعیّت کی تھیں[1] لیکن دوسرے مولویوں کے برعکس یہ سرگرمیاں مسلم معاشرے پر کہیں زیادہ دُور رَس اثرات ثبت کر رہی تھیں۔ جو لوگ ان کی دعوت قبول کرتے ان کے اندر دینی رُوح زندہ و تازہ ہو جاتی، اِسلامی بیداری کی رَو دوڑ جاتی اور وہ غیر اسلامی تہذیب و تمدّن اور رسوم و عقائد اور توہّمات کی اُس دلدل سے نکل آتے جس میں اُنھیں عُلمائے سُو نے دین کے نام پر پھینک دیا تھا اور جنھیں ہر سامراجی قوّت نے اپنے اقتدار کے دوام و تحفّظ کی خاطر ہمیشہ مفید سمجھا اور ان معمولات کی حوصلہ

---

[1] مولانا عنایت علی کے بارے میں تو اُنھیں یہ شکایت ملی تھی کہ وہ اپنے تبلیغی دوروں میں اعلانیہ جہاد کی تبلیغ کرتے اور رضا کار بھرتی کرتے ہیں۔

افہام ہے۔[1] دینِ خالص کو اپنانے اور دینی زندگی کے احیاء کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ لوگوں کے اندر اپنے اُوپر مسلط کافر حکومت سے نفرت اور اُس سے چھٹکارا پانے کا جذبہ پیدا ہوتا۔[2] اگر یہ جذبہ

---

[1] مسلمان ملکوں میں مغرب کی سامراجی حکومتوں کی وہ پالیسی ہماری اس رائے کی کھُلی شہادت ہے جو انھوں نے اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی میں مسلمانوں کو دینِ خالص سے بیگانہ کرنے اور بدعات و توہمات میں گم کرنے کے لیے اختیار کی۔ اس کی تازہ ترین شہادت سوویٹ روس میں ملتی ہے۔ وہاں مسلمانوں کو نماز روزے کی اجازت نہیں مگر غیر اللہ کے نام پر نذریں نیازیں دینے اور مزاروں کی زیارت و طواف کرنے کی اجازت دی جا چکی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمان انھیں اُمور کو دین سمجھ کر ان کے اندر کھوئے رہیں اور عالمِ اسلام میں خالص کتاب و سُنّت کی طرف پلٹنے اور اسلامی نظامِ حیات نافذ کرنے کی جو تحریکیں کام کر رہی ہیں اور جن کی دعوت کی لہریں سوویٹ یونین کے مسلمان علاقوں سے ٹکرا رہی ہیں اُن کی طرف متوجہ نہ ہونے پائیں۔

[2] اس تحریک کے مبلغ مسلمانوں کے دِلوں میں کافر حکومت اور اُس کے سائے میں زندگی بسر کرنے کے خلاف کس طرح نفرت کا بیج بوتے اور ایسی حکومت کے خلاف بغاوتِ عام کرنے اور ایسا ممکن نہ ہو تو اُس کی حدود سے ہجرت کر جانے کی ترغیب دیتے تھے، اُس کا اندازہ ایک واعظ کے اُس وعظ سے ہوتا ہے جس کا ذکر ولیم ولسن ہنٹر نے کلکتہ ریویو کے حوالے سے کیا ہے: "خدا کی حمد و ثنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے بعد ——

مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ہر ایسے مُلک سے ہجرت کر جائیں جہاں کافروں کی حکومت ہو اور جس میں حکمران اُنھیں اسلامی شریعت پر عمل پیرا ہونے سے روکیں۔ وہ ہجرت نہیں کریں گے تو جب موت کا فرشتہ اُن کی جان نکالنے آئے گا تو اُن سے پُوچھے گا: کیا خدا کی زمین اتنی وسیع نہ تھی کہ تم اپنے گھروں کو چھوڑ دیتے اور کسی اور ملک میں جا کر آباد ہو جاتے؟ یہ کہہ کر وہ ان کی جان بڑے اذیت ناک طریقے سے نکالے گا، پھر قبر میں اُن پر مُسلسل عذاب ہوتا رہے گا اور قیامت کے دن انھیں ابد تک کے لیے جہنّم کے دردناک عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔ خدا مسلمانوں کو ایسے ملک میں مرنے سے بچائے جس پر کافر حکمران ہوں۔ یہاں سے ابھی نکل جاؤ اور ایسے مُلک میں چلے جاؤ جہاں مسلمان حکمران ہیں۔ دینداروں کے مُلک میں جا بسو۔ ہجرت سے تمہارے تمام گناہ بخش دیے جائیں گے۔ اپنی ضروریاتِ زندگی کی پروا نہ کرو، خدا جو سب کو دیتا ہے جہاں کہیں بھی تم رہو گے وہیں تم کو بھی دے گا۔"

پھر واعظ وہ حدیثِ رسولؐ اپنے تبصرے کے ساتھ سناتا جس میں بنی اسرائیل کے ایک شخص کا ذکر ہوا ہے جس نے ننانوے قتل کیے تھے: "وہ ایک بزرگ کے پاس پہنچا، اپنے جرائم کا اقرار کیا اور راہِ نجات و مغفرت دریافت کی۔ بزرگ نے اُسے یہ کہہ کر مایوس کر دیا: ایک شخص کو بے گناہ قتل کرنے والا ہمیشہ کے لیے جہنّم کا سزاوار بن جاتا ہے۔ تُم نے تو ننانوے قتل کیے ہیں۔ تمھارے گناہ کبھی نہیں بخشے جائیں، تم یقینی طور پر جہنمی ہو۔ اُس شخص نے یہ کہہ کر اُس بزرگ کو بھی قتل کر دیا کہ جہاں ننانوے آدمیوں کا خُون بہایا ہے وہاں تمھارا اور سہی، پورے سو قتل تو ہو جائیں گے۔ ضمیر کی خلش اُسے پھر ایک بزرگ کی خدمت میں لے گئی اور سو قتلوں کا اعتراف کر کے اُس سے پُوچھا: میرے لیے بخشش کا کوئی راستہ ہے؟ بزرگ نے جواب دیا: ہاں، دِل کی گہرائیوں سے توبہ کر اور کفر اور گناہوں کی اس سرزمین سے ہجرت کر کے کسی اور مُلک میں چلا جا۔ اُس نے سُنا تو گناہوں سے توبہ کی اور اپنا مُلک چھوڑ دیا اور دوسرے مُلک کی راہ لی۔ لیکن ابھی راستے ہی میں تھا کہ زندگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ رحمت اور عذاب کے فرشتے اُس کی جان نکالنے آ پہنچے۔ رحمت کا فرشتہ کہتا تھا اس کی جان میں نکالوں گا کہ یہ اپنے گناہوں سے توبہ کر چکا ہے اور ہجرت کی راہ پر گامزن تھا، عذاب کے

(بقیہ اگلے صفحے پر)

مسلمان رعایا میں عام ہو جاتا تو برِصغیر میں انگریزی اقتدار کے لیے کسی وقت بھی پریشان کُن بن سکتا تھا۔ بنا بریں ان مؤثر شخصیتوں کی ہجرت اپنے اندر انگریزوں کے لیے طمانیت کا سامان رکھتی تھی۔ اُن کا خیال ہوگا کہ لوگوں میں اس تحریک کے ساتھ لگن اور جوش اور ولولہ انہی اصحاب کے دم سے ہے۔ یہ چلے گئے تو یہاں تحریک خود بخود آہستہ آہستہ مُرجھا جائے گی اور آخر کار دم توڑ دے گی۔ رہا سرحد میں پیدا ہونے والا خطرہ تو اُسے وہ فوجی کارروائیوں کے ذریعے سرحد ہی پر روک لیں گے اور مقامی آبادی کی مدد سے اس قوت کو کچل ڈالیں گے۔ مقامی خوانین اور رؤسا کی نفسیات، مزاج اور کردار سے اُنھیں اب گہری واقفیت ہو چکی تھی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اُنھیں اپنی ڈپلومیسی کا شکار بنانا کچھ بھی مشکل نہیں۔ نواب امب نے مجاہدین سے چھیڑ چھاڑ شروع کی تو اُس کے پیچھے بظاہر یہی ڈپلومیسی کار فرما تھی۔ اِس چھیڑ چھاڑ کا مقصد یہ تھا کہ مجاہدین آغاز ہی سے جنگ وجدال میں اُلجھ جائیں اور اُنھیں مقامی آبادی کو اپنے دوش بدوش لا کھڑا کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

امب کے حادثے پر مولانا عنایت علی کا ردِّ عمل وہی تھا جو ایک گرم مزاج فوجی جرنیل کا ہو سکتا ہے لیکن مولانا ولایت علی اِس مرحلے پر انگریزوں سے تصادم نہ چاہتے تھے۔ ان کا مؤقف وہی تھا جس کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے، یعنی مقامی آبادی میں تحریک کے مخلص و وفادار حامیوں کی مؤثر طاقت وجود میں لائے اور اُس کی خالص دینی بنیادوں پر تربیت و تنظیم کیے بغیر انگریزوں کے ساتھ جنگ چھیڑنا درست نہیں۔ جنگ جب بھی چھڑے گی طویل ہو گی اور اُسے ناقابلِ اعتماد مفاد پرست اور غیر مخلص ساتھیوں کی مدد سے جیتا نہیں جا سکتا۔ طریقِ کار کا یہ

(بقیہ صفحہ سے آگے) فرشتے نے کہا: تم ٹھیک کہتے ہو، اگر یہ شخص دوسرے مُلک میں پہنچ جاتا تو اس کی جان نکالنا تمھارا کام تھا لیکن وہ دینداروں کے مُلک میں پہنچنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ دونوں میں تکرار ہوتی رہی۔ آخر فیصلہ ہُوا کہ اُس زمین کو ناپا جائے جس پر وہ لیٹا ہُوا ہے، چنانچہ زمین ناپی گئی تو معلوم ہُوا کہ اُس شخص کا ایک پاؤں سرحد کے پار اسلامی مُلک میں پہنچ چکا ہے۔ رحمت کے فرشتے نے اُس کی جان نکالی اور اُسے خدا کے نیک بندوں میں شامل کر دیا۔ بھائیو، آپ نے سُن لیا اگلے جہان میں ہجرت کا کیا اجر ہے! خدا سے دُعا کرو وہ ہم سب کو ہجرت کرنے کی توفیق اور استطاعت عطا کرے ایسا نہ ہو کہ ہمیں کافروں کے مُلک ہی میں موت آجائے۔" (ہمارے ہندوستانی مسلمان)۔

(ص ۱۱۲ تا ۱۱۵)

اختلاف سنگین صورت اختیار کر گیا۔ تحریک کے کارکن تاریخ میں پہلی بار دو گروہوں میں بٹ گئے۔ بنگال کے زیادہ تر کارکن مولانا عنایت علی کے ہم نوا تھے اور صادق پور کے اکابر و دیگر اصحاب مولانا ولایت علی کے موقف کے حامی۔ ستھانہ کی چھاؤنی میں اکثر اس اختلاف پر بحث مباحثہ رہتا جو بڑھتے بڑھتے کشیدگی اور کش مکش کی صورت اختیار کر گیا اور ایک بار تو پریڈ کے وقت دونوں گروہوں میں لڑائی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ یہ بڑا نازک وقت تھا۔ مردانِ حق کی وہ قوت جو دونوں بھائیوں نے ایک طویل اور جانکاہ جدّوجہد کے بعد تیار کی تھی اب آپس میں ٹکرا چلی تھی۔ ایسا سانحہ اگر رُونما ہو جاتا تو پھر کسی دشمن کو ان کے خلاف صف آرا ہونے کی ضرورت نہ رہتی اور وہ عظیم الشان تحریک جو عظیم مقاصد لے کر اُٹھی تھی خود اپنے ہاتھوں تباہ ہو کر رہ جاتی۔ مولانا ولایت علی اس سنگین صورتِ حال پر سخت بے چین ہو گئے۔ دونوں گروہوں کے درمیان آ کھڑے ہوئے، دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پکار کر کہا: "بھائیو، سب مل کر بارگاہِ الٰہی میں امن و صلح کی دُعا کیجیے" اور پھر جو انھوں نے رقت بھرے الفاظ میں بلند آواز سے دُعا شروع کی تو دونوں صفوں سے چیخیں بلند ہونے لگیں، پھر یہ چیخیں آہستہ آہستہ سسکیوں میں بدل گئیں۔ دُعا ختم ہوئی، خطرہ ٹل گیا۔ اُسی وقت مولانا عنایت علی اپنے تین چار سو ساتھیوں کو لے کر منگل تھانہ سید عباس کے پاس چلے گئے۔ یہ ۲۷ رشعبان ۱۲۶۸ھ (۱۶ رجون ۱۸۵۲ء) کا واقعہ ہے۔

○

جماعت میں اختلاف اور مولانا عنایت علی کی علیحدگی کے اس حادثے نے تحریک کو بالکل معطل کر کے رکھ دیا۔ مولانا عنایت علی چھوٹے بھائی تھے اور دُنیوی لحاظ ہی سے نہیں دینی اعتبار سے بھی بڑے حضرت کے مضبوط دست و بازو تھے۔ جب سید بادشاہ نے انھیں ہندستان تبلیغ و ارشاد کے لیے بھیجا تھا مولانا عنایت علی اُن کے نائب کی حیثیت سے کام کرتے آئے تھے۔ سید بادشاہ کی شہادت کے بعد تحریک کی قیادت کا بوجھ مولانا ولایت علی کے کندھوں پر آ پڑا تو اس بوجھ کو اُٹھانے میں چھوٹے بھائی نے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سارے عرصے میں جتنا کام ہوا اُس میں وہ اپنے بڑے بھائی

کے معاون و رفیق بنے رہے اور اگر بڑے حضرت کو ان کی یہ رفاقت میسر نہ آتی تو کام اتنے وسیع پیمانے پر خصوصاً بنگال میں نہ ہوتا۔ تذکرۂ صادقہ میں لکھا ہے کہ "آپ کی سوانح کو مولانا ولایت علی علیہ الرحمۃ کے سوانح سے ایسا ہی تعلق ہے جیسے گوشت کو پوست سے۔ آپ کے سارے کارنامے مولانا کے فکر و ارشاد اور معیت کے نتائج ہیں۔ تنظیم ہو یا تبلیغ و مغازی، آپ نے مولانا کی زندگی میں نیابت اور امارتِ عسکری کے کارِ اہم کو غایت سرگرمی سے انجام دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر گھر کے اندر آپ جیسا دست و بازو مولانا علیہ الرحمۃ کو نصیب نہ ہوتا تو غالباً کام کے چلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔" ــــــ اور اب وہ دست و بازو گویا کٹ کر الگ ہو گیا تھا۔

جماعت کے اصحابِ دانش و نظر کے لیے تو صرف یہی بات اطمینان بخش تھی کہ دونوں بھائیوں کے درمیان خون کی خلیج حائل نہ ہوئی اور جو تلواریں اب تک دشمنوں کے خون میں غسل کرتی رہی تھیں وہ اپنوں کا لہو چاٹنے سے بچ گئیں، لیکن یہ حادثہ بڑے حضرت کے لیے بے حد کربناک تھا۔ اُن کی گھائل رُوح اُن کے قالبِ خاکی میں مرغِ بسمل کی مانند ہمہ دم تڑپتی رہتی۔ وہ اب بھی اپنے معمولات پر کاربند تھے۔ درسِ قرآن و حدیث، تبلیغ و ارشاد کے دورے، مشاہدہ و مراقبہ کے اعمال اور عسکری پریڈ وغیرہ روزمرہ کے پروگرام بدستور جاری تھے، لیکن اُن کا دِل بُجھ کر رہ گیا تھا۔ زندگی میں اُن پر بڑے بڑے جانگسل وقت آئے، لیکن انھوں نے کبھی اُن سے تاثر نہ لیا۔ نہایت خندہ رُوئی سے سنگین لمحوں کی آگ میں سے گزر گئے، مگر اس حادثے کے اثرات اس قدر شدید تھے کہ بے پناہ عزیمت اور قوتِ ارادی کا مالک اور راضی برضائے الٰہی رہنے کا خوگر ہونے کے باوجود وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئے۔ اُن کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ وہ صرف پانچ مہینے زندہ رہے اور پھر خناق کے عارضے میں مبتلا ہو کر ۲۲ محرم ۱۲۶۹ھ (۵ نومبر ۱۸۵۲ء) کو اپنے اللہ سے جا ملے۔ یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ۔ وفات کے وقت ۶۴ برس کی عمر تھی۔ یوں وہ عظیم انسان ستانہ کی خاک میں رُوپوش ہو گیا جس نے عظیم آباد کے ایک اُونچے خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی، نعمتوں میں پرورش پائی، جوان ہوا تو اُس جیسا کوئی نازک مزاج اور بانکا نہ تھا لیکن

جب حق کی راہ میں گامزن ہوا تو دورِ جاہلیت کی زندگی کا ایک ایک نقش اس طرح محو ہو گیا کہ کوئی شخص پہچان نہ پاتا تھا کہ یہی وہ نوجوان ہے جس کے بانکپن اور عشرت مزاجی کے چرچے ہر کہ ومہ کی زبان پر تھے۔ وہ حق کی راہ میں، ایثار و قربانی اور سرفروشی کا پیکر بنے، بڑھا تو اپنے پورے گھرانے اور عزیز و اقارب کو لے کر اس طرح بڑھا کہ تاریخ کے اوراق میں بہت کم خاندان اُن کے ہم سر نظر آتے ہیں۔ آج عظیم آباد ہی نہیں پوری ملتِ اسلامیہ کے عظیم فرزند کو اپنے وطن سے ہزاروں میل دُور غربت کے عالم میں نہایت سادگی کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر دل خونفشاں تھا۔

مولانا ولایت علی بلا شبہ اپنے عہد کے عظیم انسان تھے۔ اللہ نے انھیں بے بہا خوبیاں اور صلاحیتیں ودیعت کی تھیں جنھیں سید بادشاہ کی صحبت اور دعوتِ حق نے جِلا بخش دی تھی۔ ان کی زندگی زہد و تقویٰ، خشوع و خضوع، سادگی اور جہد و عمل کا مرقع تھی۔ ان کی صحبت کیمیا اثر تھی۔ ایک بار جس کو رفاقت نصیب ہو گئی اس کی زندگی کُندن بن گئی۔ اُن کی مجلس خدا والوں کی مجلس تھی۔ اُس میں بیٹھنے سے دل دُنیا کی دلچسپیوں سے بیزار ہو جاتا، دین سے محبت کے سوتے پھوٹنے لگتے اور آدمی حق کی راہ میں اپنے آپ کو وقف کر دینے کا ولولہ اور جوش دِل میں موجزن پاتا۔ اُن کے طور اطوار نہایت سادہ و دلآویز تھے اور ان کے کردار میں گُل و یاسمن کا حُسن تھا۔ وہ کسی شاعرانہ مبالغہ آرائی کے بغیر گفتار اور کردار میں اللہ کی برہان تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ اُن کی زندگی کا مقصد اور امتیازی رنگ تھا اور ایک بار انھوں نے اس راہ کو اپنایا تو زندگی کا آخری سانس تک اسی میں صرف کر دیا۔ اُن کی راتیں سجادے پر رکوع و سجود میں گزرتیں اور دِن دعوتِ حق کو غالب کرنے کی تگ و دَو میں۔ اُن کے وعظ و ارشاد میں بے پناہ اثر تھا۔ منبر پر کھڑے ہوتے تو وہ ایک ایسے خطیب کی حیثیت سے سامنے آتے جس کی باتیں دِلوں پر پڑے ہوئے پردے چاک کرتی ہوئیں اُن کی گہرائیوں میں اُتر جاتیں اور میدانِ جہاد میں اترتے تو ایک بہادر جرنیل کے اوصاف اُبھر آتے۔ اسپ سواری، تیراکی، تیراندازی، شمشیر زنی، قادر اندازی، پٹے اور بانے غرض فنِ حرب میں پوری مہارت حاصل تھی۔ بڑے ہی بہادر اور شجاع تھے۔ اُمورِ تمدن و سیاست اور

جنگی تدابیر میں خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ ان کی شخصیت میں گوناگوں خصوصیات سمٹ آئی تھیں۔

جمع الشجاعة والخشوع   لربه ما احسن المحراب فی المحراب[1]

ان للّٰہ عبادا فطنا   طلقوا الدنیا وخافوا الفتنا

فکروا فیھا فلما علموا   انھا لیست لحی وطنا

جعلوھا لجة واتخذوا   صالح الاعمال فیھا سفنا[2]

مولانا کا وجود بڑا ہی بابرکت وجود تھا۔ اس کی جھلک بارہا مختلف امور میں نظر آتی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی ارادت مند نے دس پندرہ افراد کی ضیافت کی۔ مولانا اپنے ساتھ طلبہ اور قافلے کا جمِ غفیر لے گئے، میزبان گھبرا گیا، لیکن مولانا کی دُعا کی برکت سے وہ پندرہ بیس آدمیوں کا کھانا سب پر پورا ہو گیا بلکہ کچھ باقی بھی بچ گیا۔ مولانا مستجاب الدعوات تھے۔ لوگ دُور دُور سے حاضر ہوتے اور دین و دنیا کی بھلائی کی دُعا کرواتے اور اکثر ایسا ہوتا کہ جس کے حق میں بارگاہِ خداوندی میں دُعا کرتے اُس کی مراد پوری ہو جاتی۔ مولانا یحییٰ علی کے والدِ گرامی مولوی الٰہی بخش، مولانا کی دعاؤں ہی سے اُن کے ہم نوا بنے۔ انھیں پہلے پہل مولانا کے مسلک سے سخت اختلاف تھا اور وہ بات چیت کے بھی روادار نہ تھے۔ اُن کے پانچوں صاحبزادے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور اس صورتِ حال سے سخت پریشان اور مضطرب رہتے۔ آخر مولانا کی دُعاؤں سے اختلاف و اضطراب کی یہ دیوار گر گئی۔ وہ کئی دنوں تک مسلسل دُعا کرتے رہے پھر ایک روز مولوی اکبر علی سے ارشاد فرمایا: اب اپنے والدِ محترم سے گفتگو کیجیے اللہ نے چاہا تو مفید رہے گی۔ مولوی اکبر علی نے حسبِ ارشاد اپنے والد کے ساتھ اُن مسائل پر مذاکرات کیے جن میں انھیں مولانا سے اختلاف تھا۔ جن اختلافات کے پیچھے تعصب، ضِد، ہٹ دھرمی، شرارت کارفرما نہ ہو بلکہ جو محض ناواقفیت اور لاعلمی پر مبنی ہوں،

---

[1] ترجمہ: اُن کی ذات میں شجاعت اور خشیت الٰہی دونوں جمع ہو گئی تھیں۔ یہ محراب در محراب کیا ہی خوبصورت تھا۔

[2] اللہ کے کچھ سمجھ دار بندے ایسے ہیں جنھوں نے دُنیا چھوڑ دی اور اُس کے فتنوں سے ڈر گئے۔ انھوں نے اس (دنیا کے) بارے میں غور و فکر کیا تو انھیں پتہ چلا کہ یہ ہمیشہ رہنے والی جگہ نہیں ہے۔ انھوں نے اسے سمندر کی طرح گردانا اور اعمال صالحہ کو اپنے لیے کشتی بنا لیا۔

وہ اصل حقیقت سامنے آتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اہلِ حق کا ہمیشہ یہی شیوہ رہا ہے کہ جونہی اُن پر اپنی غلطی آشکارا ہوتی ہے وہ اِس سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور راہِ حق و صواب کو قبول کرنے میں ذرا ہیٹی نہیں سمجھتے۔ یہی یہاں ہُوا۔ مولوی اکبر علی نے ایک ایک متنازعہ فیہ مسئلے پر گفتگو کی اور کتابوں سے ثابت کیا کہ مولانا ولایت علی حق پر ہیں؛ چنانچہ مولوی الٰہی بخش خود مولانا ولایت علی کے ہاں حاضر ہوتے اور فرمایا: مولوی اکبر علی سے باتیں ہوئی ہیں، اب ہمیں آپ سے کوئی اختلاف نہیں رہا۔ بس ہم ایک بات کہنا چاہتے ہیں جس روش پر آپ چل رہے ہیں وہ کانٹوں بھری ہے اور مصائب کو دعوت دینے والی ہے۔ مولانا ولایت علی کا جواب وہی تھا جو اہلِ عزیمت دیا کرتے ہیں۔ فرمایا: "ایک طرف اللہ اور اُس کے رسولؐ کی مرضی ہے اور دوسری طرف انگریزوں کا ڈر، ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟" مولوی الٰہی بخش نے اِس جواب پر مولانا کو دعائیں دیں اور ہر حال میں ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ یوں دُعا کی برکت سے دونوں خاندان شیر و شکر ہو گئے۔

مولانا بے حد رقیق القلب تھے۔ ہر وقت ملت کے درد میں محزون و ملول اس کے مداوا کی فکر میں ڈوبے رہتے۔ اکثر رات کے وقت تاروں بھرے نیلگوں چھت تلے کھڑے ہو کر دیر تک دُعا و مناجات اور گریہ وزاری میں مصروف رہتے۔ یہی کیفیت بسا اوقات دوپہر کے وقت طاری ہو جاتی اور چلچلاتی دھوپ میں کھڑے نہایت وارفتگی کے عالم میں اپنے آقا و مولا کے حضور اپنی بندگی و بے چارگی کا اظہار فرماتے اور اُس کی رحمت و کرم کے طالب ہوتے۔ اللہ نے اُنھیں عبرت نگاہ اور روشن و منور قلب عطا فرمایا تھا۔ جن باتوں کو آدمی دیکھتا اور کسی قسم کا تاثر لیے بغیر گزر جاتا ہے وہ ان کی دُنیائے دِل میں تلاطم برپا کر دیتیں اور تڑپنے پھڑکنے کی کیفیت پیدا ہو جاتی۔ ایک مرتبہ کسی رئیس کے یہاں مدعو تھے۔ خادم ایک شمع کے ذریعے فانوس اور قندیلیں روشن کر رہا تھا۔ قندیلیں روشن ہو چکیں تو اُس نے شمع گُل کر دی۔ بظاہر یہ ایک عام سا منظر تھا جو اُن دِنوں ہر بڑے گھرانے میں دیکھا جا سکتا تھا اور خود اُن کے اپنے گھروں میں بھی مدتوں اِس کا چلن رہا تھا، لیکن اس عام سے منظر نے مولانا کو اپنی جانب کھینچ لیا، اُن پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہو گئی۔ خیال کی ایک تڑپا دینے والی لہر اُٹھی اور زبان پر آ گئی۔ فرمایا: "اس مشعل

نے تمام قندیلیں روشن کردی ہیں اور اب خود روشنی سے محروم ہوگئی۔ یہی حال کہیں میرا نہ ہو جائے دین کی تھوڑی بہت روشنی مجھ سے پھیلی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو ہم خود بجھ جائیں اور میرے اندر دین کی روشنی باقی نہ رہے۔" یہ ذکر کرتے ہوئے ان پر گریہ طاری ہوگیا۔ دیر تک روتے رہے اور جو لوگ موجود تھے اُنھیں بھی رُلاتے رہے۔[1]

مولانا کی غذا، پوشاک اور رہائش نہایت سادہ تھی۔ لباس بالعموم پُرانا اور پیوند زدہ ہوتا اور چونکہ زیادہ تر دعوتی دوروں ہی میں رہا کرتے اس لیے اکثر غبار آلود رہتا، جہاں ذرا فرصت ملتی خود ہی اپنے ہاتھ سے دھو لیتے۔ غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ مل کر کھاتے اور اُنھیں کے ساتھ اُنھیں کی سی زندگی بسر کرتے۔ اور اسی ایک ادائے دلنواز نے کتنے ہی کٹر مخالفین کو سرگرم حامی و رفیق بنا دیا۔ گھر والوں پر بھی یہی رنگ چڑھ گیا تھا۔ اُن کی سادہ زندگی دیکھ کر عورتیں حیرت میں ڈوب جاتیں۔ جاگیروں اور گاؤں کے مالک تھے۔ شہری جائداد بھی وسیع تھی، لیکن گھر کے کسی فرد کو دیکھ کر اُن کی اس خوشحالی کا پتہ نہ چلتا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ سربراہِ خانہ کے دباؤ تلے اُن کے اندر یہ تبدیلی رُونما ہوئی تھی۔ کیا عورت کیا مرد ہر فرد بڑا صابر و شاکر اور دل کی گہرائیوں سے زندگی کے اس رنگ کا دلدادہ تھا۔ زمینوں اور جائداد سے جتنی آمدنی ہوتی وہ جماعت کے بیت المال میں داخل فرماتے۔ دوست احباب اور ارادت مند حاضر ہوتے تو اکثر بیش قیمت ہدیے لاتے۔ یہ تمام ہدیے بھی جماعت اور کارکنوں پر صرف کر دیتے۔ صادق پور کی مسجد میں طلبہ بھی پڑھا کرتے۔ اُن کے ساتھ مساوات سے پیش آتے جو کچھ ان کے اپنے بچے کھاتے وہی اُنھیں کھلاتے۔ ایک مرتبہ (مولانا فرحت حسین کے صاحبزادے) مولانا عبدالرحیم کی والدہ نے آٹے کا تھوڑا سا کھجور تیار کیا کہ بچہ بطور ناشتہ کھا کر پڑھنے جایا کرے گا۔ مولانا ولایت علی کو پتہ چلا تو بھاوج سے کھجور کا برتن منگوایا اور فرمایا: "تم عبدالرحیم کی ماں یہاں موجود ہو، تم نے تو اپنے لڑکے کے لیے

---

[1] یہ محض ایک خیالی اندیشہ نہ تھا جس نے مولانا ولایت علی کو گریہ وزاری پر مجبور کر دیا۔ دعوتی اور تحریکی زندگی میں انسان کبھی کبھار ایسے حادثے سے دوچار ہو جاتا ہے کہ اُس کی سعی و جہد سے بہت سے لوگ دعوت و تحریک کی طرف آتے ہیں اور حق سے روشناس ہوتے ہیں، لیکن ایک مرحلے پر پھر خود اُس کے اپنے اندر کا چراغ بجھ جاتا ہے اور وہ اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعائیں اہلِ ایمان کو تلقین فرمائی ہیں اُن میں سے ایک دعا کا پہلا حصہ اسی ثبات اور عزمِ راسخ سے تعلق رکھتا ہے: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الثَّبَاتَ فِی الْاَمْرِ وَالْعَزِیْمَۃَ عَلَی الرُّشْدِ اے اللہ میں تجھ سے دین کے کام میں ثابت قدمی اور ہدایت پر مضبوطی سے جمے رہنے کی التجا کرتا ہوں۔ ایک اور دعا یہ تلقین فرمائی: یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ۔ اے دلوں کے پلٹنے والے، میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھ۔

ناشتے کا سامان کر لیا، مگر جو طلبہ دین سیکھنے آتے ہیں اُن کی مائیں تو موجود نہیں ہیں کہ ان کے لیے ناشتے کا سامان تیار کر رکھیں، یہ کھجور ہمیں دے دو۔" نیک بخت خاتون نے برتن اُن کے حوالے کر دیا۔ آپ مسجد میں تشریف لے گئے اور سارا کھجور طلبہ میں تقسیم فرما دیا۔

دعوتِ حق قبول کرنے کے بعد آدمی میں کس قسم کی تبدیلی آنی چاہیے مولانا ولایت علی غالباً اُس دور میں اُس کا بہترین نمونہ تھے۔ اُنھوں نے ہر اُس شے سے کنارہ کشی اختیار کر لی جو دعوت حق کے تقاضوں سے میل نہ کھاتی تھی حتیٰ کہ ان باتوں سے بھی ہاتھ اُٹھا لیا جو تھیں تو مباح لیکن ان میں استغراق دعوت کے کاموں میں حارج ہو سکتا تھا۔ اُن کی زندگی سراپا انقلاب تھی۔ اس انقلاب سے پہلے شعر کہا کرتے تھے۔ منطق و فلسفہ اور مناظرہ اُن کا دل پسند مشغلہ تھا۔ اب یہ ساری باتیں خواب و خیال ہو گئی تھیں۔ گفتگو میں وہ مصنوعی عالمانہ انداز نہ رہا تھا۔ شاعری کی یہ حالت کہ کبھی وعظ و ارشاد میں جذبات اُبھرتے تو ایک آدھ شعر برجستہ فرما دیتے۔ منطق و فلسفہ کے الجھیڑوں کو تو گویا بالکل خیرباد کہہ دیا۔ مناظرے سے گریز کرتے کہ یہ محض علمی اکھاڑے تھے جہاں اہلِ علم و فضل ذہنی دنگل لڑا کرتے، اپنے علم کا مظاہرہ کرتے اور حریف کو تاویل اور چرب زبانی کا اڑنگا دے کر گرانے کی کوشش کرتے ہر فریق اپنی فتح کا اعلان کرتا۔ "شاگرد پیشہ" اپنے اپنے "پہلوان" کو داد دیتے اور بغلیں بجاتے ہوتے اپنے اپنے زاویوں اور گھروں کو سدھارتے اور بے چارہ سادہ لوح مسلمان حیران پریشان مسائل اور منطق کی بھول بھلیّوں میں بھٹکتا رہتا۔ مولانا ولایت علی کو حریف نے جب کبھی مناظرے کا چیلنج دیا، اُنھوں نے بے نیازانہ خاموشی اختیار کر لی۔ افہام و تفہیم ضروری سمجھتے تو علمی اکھاڑے جمانے کے بجائے نجی مجالس میں علمی گفتگو فرماتے اور اگر مخالف مناظرے پر تُلا ہی ہوتا تو معاملے کو اپنے خلفا کے سپرد کر کے الگ ہو جاتے۔ جو لوگ دعوت و عزیمت کی راہ اختیار کرتے ہیں، جن کے سامنے راہِ راست سے بھٹکی ہوئی خلقِ خدا کو رُشد و ہدایت سے بہرہ یاب کرنے کا کام ہوتا ہے اور جو اپنی زندگی دین کے اعلیٰ مقاصد کے لیے وقف کر چکے ہوتے ہیں وہ لوگوں کو آپس میں اُلجھانے اور ملّت کے اندر پھیلے ہوتے فکری انتشار میں اضافہ کرنے والے کاموں سے ہمیشہ مجتنب رہتے ہیں۔ یہی روش مولانا ولایت علی کی تھی۔ فضول بحث مباحثوں میں اُلجھنے اُلجھانے کے بجائے وہ اپنا سارا وقت حق کی راہ میں پیش قدمی کرنے کی تدبیریں سوچنے

اور انھیں عملی جامہ پہنانے میں صرف کرتے۔

اُس زمانے میں عُلماء کی مجالس اور علمی اکھاڑوں میں کس قسم کے عظیم مسائل پر بحث ہُوا کرتی تھی اور اُمّت کے یہ رہنما کس نوعیت کی علمی دلچسپیوں میں کھوئے ہُوئے تھے اور مولانا کا طرزِ عمل کیا تھا اُس کا اندازہ ایک واقعے سے ہو سکتا ہے۔ مولانا ولایت علی مستقل ہجرت کے ارادے سے روانہ ہو کر دہلی میں وارد ہوئے تو وہاں عُلماء میں یہ بحث جاری تھی کہ اُلّو حلال ہے یا حرام۔ بڑے بڑے اصحابِ علم اکھاڑے میں خم ٹھونکے کھڑے تھے اور چونچیں لڑا رہے تھے۔ اُنھیں بھی حضراتِ علماء نے بحث میں اُلجھانے کی سعی فرمائی مگر آپ نے یہ کہہ کر اس عظیم الشّان مسئلے میں دلچسپی لینے سے معذرت فرمادی کہ میں اُلّوؤں کے پیچھے نہیں پڑتا۔ اور واقعی جس شخص کے سامنے ملّت کی اصلاح، اسلام کی تہذیبی و معاشرتی قدروں کا احیا اور دم بدم پھیلتی ہُوئی غلامی کی سیاہ رات کا جگر چیر کر سحر لانے کا عظیم الشّان کام تھا وہ اس نوعیت کی فضولیات میں اپنی صلاحیتوں کا جھٹکا کیسے کر سکتا تھا؟ اُنھوں نے عُلماء کے حلقے میں چھائے ہُوئے فکری جمود کو توڑا۔ وہ کنویں کے مینڈک بنے ہُوئے تھے، اپنے حلقوں سے باہر جا کر علمی استفادے کی نہ اُن میں ہمت تھی اور نہ پسند ہی کرتے تھے۔ اپنے خول کے اندر سمٹ کر رہنے کی اس خُو نے اُن کی نگاہ اور دائرۂ عمل کو محدود کر کے رکھ دیا تھا۔ مولانا کے اندر علمِ حدیث کی پیاس اپنے استاذ اور رفیق شاہ اسماعیل شہیدؒ کے فیضان سے پیدا ہُوئی۔ پہلی ہجرت سے پہلے حج کو تشریف لے گئے تو وہاں کے عُلماء کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ پیاس بجھائی۔ مکّہ معظّمہ میں مشہور محدّث عبداللہ سراج سے سندِ حدیث حاصل کی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا نے حدیث کے لفظوں کی سند مجھ سے لی اور معانی کی سند میں نے مولانا سے حاصل کی۔ حج کے بعد یمن، نجد، عسیر، حدیدہ، مسقط، حضر موت اور بخارا کا دورہ کیا۔ یمن میں امام علی شوکانیؒ سے بھی حدیث کی سند حاصل کی۔ اور اُن کی تصنیفات سے برّصغیر کو روشناس کرایا۔ اس طرح اُس علمی و فکری بیداری کی تحریک کو آگے بڑھایا جو شاہ ولی اللہ نے شروع کی تھی اور جسے شاہ اسمٰعیل کی سرگرم شخصیت نے انقلابی راہ پر ڈالا تھا۔

یہ تو مولانا کی زندگی کے وہ پہلو تھے جن میں سے ہر پہلو، دیدہ و دل کو بے ساختہ اپنی جانب کھینچ لیتا ہے، اُن کا اصل کام سیّد بادشاہ کی دعوتِ اصلاح و جہاد کو از سرِ نو زندگی

بخشنا اور اس تحریک کو ایسے خطوط پر منظم کرنا تھا جنھوں نے اُسے ایک صدی سے بھی زائد عرصے تک فعال اور متحرک رکھا۔ اس دوران میں بڑے بڑے نشیب و فراز آئے، تحریک اور کارکنوں کو رُوح فرسا آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور وہ فی الواقع بِلا مارے گئے، تحریک کے آخری دَور میں بعض رہنماؤں اور کارکنوں میں خرابیاں بھی پیدا ہوئیں جیسا کہ ہر تحریک کے ساتھ پیش آتا ہے؛ تاہم یہ مولانا ولایت علی کے اندازِ تربیت اور طریقِ کار ہی کا اثر تھا کہ سخت نامساعد حالات میں بھی تحریک زندہ رہی اور اُسے مخلص رہنما اور کارکن ملتے رہے۔ مولانا کی اس عظیم صلاحیت اور کام کو تحریک کے کٹر دشمن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے۔ ولیم ولسن ہنٹر نے اپنی کتاب کے تقریباً پچاس ساٹھ صفحات میں مولانا کی چلائی ہوئی تحریک کا ذکر کیا ہے، اس کے چند اقتباسات کے آئینے میں اُن کے اس عظیم الشان کام کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے جس کے نتیجے میں یہ تحریک انگریز کے لیے زبردست خطرہ بن گئی تھی:

"۱۸۲۱ء میں امام صاحب (سید احمد شہیدؒ) نے اپنے خلفاء کو منتخب کرتے وقت ایسے آدمیوں کا انتخاب کیا جو بے پناہ جوش و خروش کے مالک اور بہت ہی مستقل مزاج تھے.... متعدد بار جب یہ تحریک تباہ ہونے کے قریب تھی، انھوں نے بار بار جہاد کے جھنڈے کو تباہی سے بچا کر از سرِ نو بلند کر دیا۔ پٹنہ کے خلفاء جو ان تھک واعظ، اپنے آپ سے بے نیاز، بے داغ زندگی بسر کرنے والے، انگریز کافروں کی حکومت کو تباہ کرنے میں ہمہ تن مصروف، روپیہ اور رنگروٹ جمع کرنے کے لیے ایک مستقل نظام قائم کرنے میں نہایت چالاک تھے، وہ اپنی جماعت کے ارکین کا نمونہ اور اُن کے لیے ایک مثال تھے۔ اُن کی بہت سی تعلیم بے عیب تھی اور یہ انھیں کا کام تھا کہ انھوں نے اپنے ہزاروں ہم وطنوں کو بہترین زندگی بسر کرنے اور اللہ تعالیٰ کے متعلق بہترین تصور پیدا کرنے کی ترغیب دی[۱]۔"

تحریک کے مرکز صادق پور کے بارے میں لکھتا ہے:

"انھوں نے پٹنہ کے دارالاشاعت کو باغیوں اور غداروں کی قیام گاہ میں تبدیل کر دیا اور اُس کے ارد گرد دیواروں اور حجروں کی کئی ایک بھول بھلیاں بناتی ہوئی تھیں جو

---

[۱] ہمارے ہندوستانی مسلمان، ترجمہ صادق حسین ص ۱۰۱، ۱۰۲

خفیہ دروازوں کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ غیر مشتبہ مقامات پر چھوٹے چھوٹے کمرے تیار کیے گئے جہاں وہ رازداری کے ساتھ مشورہ کرتے۔ پہلے خلفاء نے تو مجسٹریٹ کے وارنٹ گرفتاری کی مسلح ہو کر مدافعت کرنے کی دھمکی دی تھی، لیکن ان کے جانشینوں نے اپنی حفاظت کا طریقہ اس سے کم خطرناک پیچ دار راستوں، کمروں اور باہر جانے کے راستوں کی شکل اختیار کیا۔ آخر کار جب حکومت نے اس سازشی ادارے کے خلاف کارروائی کرنے کا ارادہ کیا تو اس عمارت کا نقشہ حاصل کرنا پڑا، گویا اُسے ایک قلعہ بند شہر کے خلاف کارروائی کرنا ہے۔

ہر ایک ضلع کے مبلغین متعصب لوگوں کے گروہ دارالاشاعت میں بھیجتے۔ اُن میں سے اکثر جن کے جوش کو پٹنہ کے لیڈر، اور بھی بھڑکا دیتے تھے، چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں سرحدی کیمپ کی طرف روانہ کر دیے جاتے۔ اُن میں سے زیادہ ہوشیار نوجوانوں کو زیادہ دیر تک زیرِ تربیت رکھنے کے لیے منتخب کر لیا جاتا اور جب وہ باغیانہ اُصولوں سے اچھی طرح واقف ہو جاتے تو انھیں اُن کے صوبے کی طرف ایک واعظ یا مذہبی کتب فروش کی حیثیت سے واپس کر دیا جاتا۔[1]"

مولانا ولایت علی اور اُن کے رفقاء نے تحریک کا جو پُر اثر لٹریچر تیار کیا اُس کے متعلق ہنٹر لکھتا ہے:

"انگریزوں کے خلاف ضرورتِ جہاد پر اگر وہابیوں کے نظم و نثر کی مختصر سے مختصر کیفیت لکھنے کی کوشش بھی کی جائے تو اِس کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ اِس جماعت نے بہت سا ادب پیدا کر دیا ہے جو انگریزی حکومت کے زوال کی پیشینگوئیوں سے پُر اور ضرورتِ جہاد کے لیے وقف ہے۔ ان کتابوں کے محض نام ہی سے اُن کے تمام و کمال باغیانہ ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ بعض تو ان میں حد سے زیادہ اشتعال انگیز ہیں اور مسوّدات کی صورت میں رازداری کے ساتھ ایک دوسرے تک پہنچائی جاتی ہیں۔ اُن میں سے بعض کی اشاعت بہت زیادہ کی گئی ہے اور اُن کا زہریلا اثر اُن کے پڑھنے والوں تک محدود نہیں بلکہ مبلغین کے اس

---

[1] ایضاً ص ۱۰۳

گروہ کے ساتھ ساتھ بنگال کے ہر ضلع تک پہنچتا ہے جن میں تبلیغِ دین کی مہم پر جانے سے پہلے باغیانہ رُوح پھُونک دی جاتی ہے۔ اُن میں سے اکثر کتابیں تو علانیہ برطانوی ہندوستان کے بازاروں میں فروخت ہوتی ہیں۔ کتاب جتنی زیادہ سخت اور باغیانہ ہو، اتنی ہی عوام میں زیادہ مقبول ہوگی۔"[1]

سرحدِ آزاد کے فوجی ہیڈکوارٹرز تک روپے پیسے اور آدمیوں کی امداد کیسے پہنچتی تھی اس کی داستان بھی ہنٹر بیان کرتا ہے:

"سازشیوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک کام پٹنہ کے دارالاشاعت سے جس کو وہ اپنی خُفیہ زبان میں چھوٹا مال گودام کہتے تھے، مجاہدین کے سرحدی کیمپ تک جس کو وہ بڑا مال گودام کہتے تھے، رنگروٹ پہنچانا تھا۔ ایک بنگالی وہابی سے راستے میں ہزاروں تکلیف دِہ سوالات پوچھنے کا احتمال تھا۔ شمال مغربی صُوبے اور پنجاب کے وسیع علاقے میں اُس کو تقریباً دو ہزار میل کی مسافت طے کرنی پڑتی تھی۔ اُس کی اجنبیت ہر گاؤں میں اپنے قد اور اپنی زبان کی وجہ سے ظاہر ہو جاتی۔ لیکن اِس خطرناک کام میں انتہائی ہوشمندی سے کام لیا گیا۔ تمام راستے پر جماعت خانوں کا سلسلہ قائم کر دیا گیا اور اُن کا انتظام معتبر مریدوں کے حوالے کیا گیا۔ جرنیلی سڑک کو مختلف حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اِس طرح سرحد کیمپ کو جانے والا ہر باغی مختلف صوبوں میں بے خطر چلا جاتا تھا۔ اُس کو یقین تھا کہ ہر پڑاؤ پر ایسے دوست مل جائیں گے جو اُس کے لیے چشم براہ ہیں۔ جماعت خانے جو راستے میں پڑے، اُن کے منتظم مختلف طبقات کے لوگ تھے، مگر تمام کے تمام انگریزی حکومت کا تختہ اُلٹنے میں ہمہ تن مصروف۔ ایک مقامی سازشی اُن کا صدر ہوتا تھا۔ ایسے اشخاص کے انتخاب میں بہترین مردم شناسی کا ثبوت دیا گیا تھا کیونکہ ان میں سے کسی ایک نے بھی گرفتار ہونے کے خوف یا کسی بڑے سے بڑے لالچ سے اپنے پناہ شدہ امام کے خلاف گواہی دینے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔"[2]

مولانا ولایت علی کی زندگی میں (جب وہ سرحد میں تھے) اور وفات کے بعد ہندوستان میں تحریک کی رہنمائی، دعوت کی توسیع، فوجی ہیڈکوارٹر (سرحدِ آزاد) کو لڑاکا افرادی قوت اور

---

[1] ایضاً ۹۹ تا ۱۰۱ [2] ایضاً ۱۳۵ - ۱۳۶

مالی وسائل کی فراہمی کا جن اصحاب (مولانا فرحت حسین، مولانا یحییٰ علی، مولانا احمد اللہ، مولانا مبارک علی وغیرہ)[1] نے انجام دیا وہ مولانا ہی کے تربیت یافتہ تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان سب حضرات نے اپنے اپنے دور میں اس تربیت کی مدد سے بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ اُس ذمہ داری کو نبھایا جو اِن پر آپڑی تھی۔ دعوت کے جس تنظیمی ڈھانچے کا ذکر ہنٹر نے بڑے خوفناک الفاظ میں کیا ہے وہ خود مولانا ولایت علی نے قائم کیا تھا۔ ہجرت کر کے سرحدِ آزاد جانے سے پہلے وہ اِس ڈھانچے کو مکمل کر چکے تھے اور اِس نے وہ کام شروع کر دیا تھا جس نے آگے چل کر ہندوستان میں ایک عظیم الشان خفیہ انقلابی تنظیم کی صورت اختیار کر لی۔ مولانا ولایت علی کے انتقال سے ایک عظیم مصلح، سرگرم داعی اور مربی اُٹھ گیا۔ وہ بلاشبہ اُن افراد میں سے تھے جو انتہائی ناسازگار حالات میں بھی مایوسی کا شکار ہوئے بغیر عمل کی راہیں نکال لیتے ہیں اور ان راہوں پر چل کر تحریک کو ایک ایسی قوت میں تبدیل کر دیتے ہیں جو اپنے عہد کی اجتماعی زندگی پر انمٹ نقوش ثبت کرتی ہے۔ اُنھوں نے برِصغیر میں تحریکِ اصلاح وجہاد کو ایک ایسی ہی قوت میں بدل ڈالا تھا۔ بلاشبہ وہ اپنے عہد کے انتہائی خداترس، پرہیزگار اور عالمِ باعمل تھے۔ اُنھوں نے علماء کے حلقے میں چھائے ہوئے فکری جمود کو توڑا۔ زندگی میں انقلاب آنے کے بعد اُن کا ایک ایک لمحہ دینِ حق کی نصرت و حمایت میں گزرا اور اُس کی خاطر وطن اور گھربار تک چھوڑ دیا اور پردیس میں راہِ حق میں جدوجہد کرتے ہوئے انتقال فرمایا۔ ان کی زندگی بھی اربابِ عزیمت کے لیے قابلِ رشک تھی اور موت بھی۔ ایسی زندگی پر جو جہاد وغزا میں گزرے اور ایسی موت پر جو ہجرت کے عالم میں آئے کون سا دل ہے جو رشک نہیں کرے گا۔ وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ (النسآء۔ ۹۹) اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کر کے نکلے اور پھر اُسے موت آلے تو اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ اور انھی جذبات کا اظہار مولانا محمد سعید نے تاریخِ وفات کہتے ہوئے ان الفاظ میں کیا تھا:

---

[1] ان میں مولانا یحییٰ علی سب سے نمایاں تھے جب سے ہوش سنبھالا، سفر وحضر اور جنگ وامن میں ہمیشہ مولانا کے ساتھ رہے اور ان سے اکتسابِ فیض کرتے رہے۔

وَلایت علی العالم المتورّع
توفّی بالہجرۃ لِلدِّین ناصرٌ
وَھٰذَا الّذی قد طاب حیًّا و مَیتًا
فَارّخ قلبی طاب غازٌ مُّھاجرٌ
۱۲۶۹ھ

مردِ غازی

مولانا ولایت علی کے انتقال کے بعد مولانا عنایت علی منگل تھانہ سے اپنے ساتھیوں سمیت ستھانہ تشریف لے آئے اور سب نے انھیں بالاتفاق امیر تسلیم کر لیا۔ اب وہ اپنی پالیسی کو مرضی کے مطابق جامۂ عمل پہنا سکتے تھے۔ اگلے چھ برس بڑے ہنگامہ خیز تھے۔ انگریزوں کے ساتھ کش مکش کا آغاز نواب امب جہاں داد خاں کے ساتھ تصادم سے ہوا۔ مجاہدین نے ۳ دسمبر ۱۸۵۲ء کو علاقۂ امب پر شب خون مارا اور عشرہ و کوٹلہ پر قبضہ کر لیا۔ انگریز جو چند روز پہلے ہی حسن زئی پٹھانوں کے خلاف، جنھوں نے دو انگریز مار ڈالے تھے، کوہِ سیاہ کی پہلی مہم سے فارغ ہوئے تھے۔ اپنے حلیف کی مدد کے لیے میدان میں آ گئے۔ زبردست جنگ کے بعد مجاہدین کو عشرہ اور کوٹلہ خالی کرنا پڑے۔ مولانا عنایت علی ستھانہ پہنچے اور وہاں سے سوات گئے۔ ستھانہ کے سید اکبر شاہ والیٔ سوات تھے۔ مولانا کا خیال تھا کہ سوات کی مدد سے انگریزوں کے خلاف مضبوط محاذ بنایا جا سکتا ہے۔ سید اکبر شاہ صاحبِ عزیمت بزرگ تھے۔ اور اخلاص و وفا میں پورے سرحد میں اُن کا کوئی حریف نہ تھا، لیکن وہ مُلّا عبد الغفور اخوند صاحب سوات کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہ اُٹھا سکتے تھے اور یہ صاحب حق کی پکار سے زیادہ اپنی مصلحتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ پورے آزاد سرحد میں غالباً یہ واحد مذہبی پیشوا تھے جن کے اثر و رسوخ کا دائرہ وسیع بھی تھا اور مستحکم بھی، لیکن دنیا پرست خوانین کی طرح انھیں بھی تحریکِ اصلاح و جہاد سے کوئی قلبی لگاؤ نہ تھا۔ مصلحت کے دھارے پر سوار حق و باطل کی اس کش مکش کو دیکھتے رہتے جو مجاہدین اور انگریزوں کے درمیان برپا تھی۔ کبھی مصلحتیں تقاضا کرتیں تو مجاہدین کے

دوش بدوش آ کھڑے ہوتے اور کبھی اِن مصلحتوں کا اشارہ ہوتا تو مجاہدین کو طوفانی منجدھار میں چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔

اخوند سوات سے مایوس ہو کر مولانا ستھانہ واپس آ گئے۔ اب اُنھوں نے ایک ایسا فیصلہ کیا جس نے مجاہدین کی سرگرمیوں کا رُخ ہزارہ کے علاقے سے موڑ کر سمہ اور پشاور کی طرف موڑ کر دیا۔ حالات کچھ ایسی صُورت اختیار کر رہے تھے کہ ستھانہ میں بیٹھ کر صرف محدود سرگرمیاں ہی جاری رکھی جا سکتی تھیں، چنانچہ مولانا نے ستھانہ چھوڑ دیا اور منگل تھانہ کو اپنا مرکز بنا لیا۔ اب یوُسف زیئوں کے تعاون سے وہ انگریزوں پر پشاور تک ضرب لگا سکتے تھے۔ انگریز بھی حالات کی نزاکت کو سمجھتے تھے۔ ۱۸۵۲ء میں راولپنڈی میں مقیم نمبر ۴ دیسی پیادہ فوج کے ساتھ مجاہدین کی خط کتابت پکڑی جا چکی تھی۔ (ان خطوُط سے انگریزوں کو پہلی بار معلوم ہُوا کہ بنگال سے مجاہدین کے ہیڈ کوارٹر تک روپیہ اور آدمی پہنچانے کا ایک نظام موجود ہے) اس کا مطلب یہ تھا کہ مجاہدین ان فوجوں میں نفوذ پانے کی جدّوجہد کر رہے تھے جو ان کے مقابلے میں سرحدوں پر مختلف چھاؤنیوں میں متعیّن تھیں۔ اُن کے لیے یہ انکشاف دھماکے سے کم نہ تھا۔ ۴ دیسی فوج کے کئی جوان پکڑے گئے۔ اُن کا کورٹ مارشل ہُوا اور سزائیں دی گئیں، لیکن تحریکیں مقدموں اور سزاؤں سے نہیں دبا کرتیں، اس تحریک کے اثرات دوسری چھاؤنیوں اور فوجوں تک پھیلتے جا رہے تھے حتیٰ کہ جنوبی ہندوستان کی چھاؤنیاں بھی محفوظ نہ رہی تھیں، چنانچہ انگریزوں نے مجاہدین کی قوّت کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور آنے والے برسوں میں ان کی ساری تگ و دَو اسی نُقطے پر مرتکز رہی۔

اِدھر مولانا عنایت علی کی تیاریوں اور معرکہ آرائیوں کا رنگ بھی کچھ اور تھا۔ اوکنلے کے بقول اُنھوں نے اپنے ساتھیوں کے دِل میں انگریز کافروں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا نہ رکھی۔ مجاہدین روزانہ قواعد کرتے بلکہ بعض اَوقات دِن میں دو مرتبہ۔ قواعد میں فضائلِ جہاد کے متعلق نظمیں پڑھی جاتیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد بہشت کی شادمانیوں کے بارے میں وعظ کیے جاتے اور اُنھیں تلقین کی جاتی کہ صبر و استقامت سے اُس وقت کا انتظار کرو جب برطانوی ہند کی تسخیر کی موعودہ ساعت آ پہنچے گی[1]

۱۔ سرگذشتِ مجاہدین ص ۱۸۹

یہ سارا دَور کتنا ہنگامہ خیز تھا اس کی داستان ہنٹر کی زبان سے سُنی جا سکتی ہے:

"مَیں اُن بے عزتیوں، حملوں اور قتل و غارت کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا جو ۱۸۵۶ء میں سرحدی جنگ کا باعث ہُوئے۔ اس دوران میں مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزی حکومت کے خلاف متواتر اکسائے رکھا۔ ایک ہی بات سے حالات کا بڑی حد تک اندازہ ہو جائے گا۔ یعنی ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک ہم علیحدہ علیحدہ سولہ فوجی مہمّیں بھیجنے پر مجبور ہُوئے جس سے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار ہو گئی تھی اور ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۰ء تک اُن فوجی مہموں کی گنتی بیس تک پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی مجموعی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی تھی بے قاعدہ فوج اور پولیس اس کے علاوہ تھی۔"[1]

رستاخیز کے اس عالم میں سرحدِ آزاد کے کوہ و دمن میں اور برِ صغیر کی شاہراہوں پر سفر کرتی ہُوئی مجاہدین کی ٹولیاں جہادیہ نغمے گاتیں تو والہانہ ذوق و شوق کی ایک برقی رَو سی فضا میں دوڑ جاتی۔ نغمے شعری لحاظ سے معیاری نہ ہوتے، لیکن ان کے اندر جوشِ حمیّتِ اسلامی، یقین و ایمان سے معمُور جذبات اور حق کو سربلند دیکھنے کی تڑپتی ہُوئی آرزوئیں اس طرح رچی بسی ہوتیں کہ جو بھی سُنتا جھُومنے لگتا۔ ایک جہادیہ نغمہ تو اتنا پُرجوش تھا کہ مجاہدین اُسے اکثر الاپا کرتے اور اس کی بازگشت آنے والے دو عشروں میں انگریز کی عدالتوں میں بھی سُنی گئی۔

فرض ہے تم پہ مُسلمانوں جہادِ کفّار
اس کا سامان کرو جلد، اگر ہو دیندار
جس کے پیروں پہ پڑے گردِ صفِ جنگِ جہاد
وہ جہنّم سے بچا، نار سے ہے وہ آزاد
اے برادر تو حدیثِ نبوی کو سُن لے
باغِ فردوس ہے تلواروں کے سایے کے تلے
جو رہِ حق میں ہُوئے ٹکڑے وہ نہیں مرتے ہیں
بلکہ وہ جیتے ہیں جنّت میں خوشی کرتے ہیں

---

[1] ہمارے ہندوستانی مُسلمان ص ۳۸ - ۳۹

حق تعالےٰ کو مجاہد وہ بہت بھاتے ہیں
مثلِ دیوار جو صف باندھ کے جم جاتے ہیں
دِل سے اس راہ میں پیسہ کوئی دیوے گا اگر
سات سو اُس کو خدا دیوے گا روزِ محشر
مال و اَولاد کی، جورُو کی محبّت چھوڑو
راہِ مولا میں خوشی ہو کے شتابی دوڑو
دینِ اِسلام بہت سُست ہُوا جاتا ہے
غلبۂ کُفر سے اِسلام مٹا جاتا ہے
دوستو جب تمھیں مرنا ہی مقرر ٹھہرا
پھر تو بہتر ہے کہ جاں دیجیے در راہِ خُدا
سیکڑوں جنگ میں جاتے ہیں تو پھر آتے ہیں
سیکڑوں گھر میں بھی رہتے ہیں تو مر جاتے ہیں
مَوت کا وقت معیّن ہے تو سُن اے غافل
مَوت سے ڈر کے بھلا ہو گا تجھے کیا حاصِل
طمعِ دنیا کے لیے دیکھو ہزاروں یہ سپاہ
چھوڑ گھر، سر کو کٹاتے ہیں، نہیں کرتے آہ
ہے عجب یہ کہ مُسلمان بھی کہلاتے ہو
جھُوٹے حیلے رہِ اَللّٰہ میں بتلاتے ہو
گر رہِ حق میں نہ دی جان تو پچھتاؤ گے
اور پیمبرؐ کو یہ منہ کیا بھلا دکھلاؤ گے
اے خداوندِ سماوات وزمیں، ربِّ عباد
اب مُسلمانوں کو دے جلد سے توفیقِ جہاد
ہند کو اس طرح اِسلام سے بھر دے اے شاہ

کہ نہ آوے کوئی آواز بُجز اَللہ اَللہ

پہلے ایک شخص دردو سوز میں ڈوبی مترنّم آواز میں ہانک لگا کر ایک شعر پڑھتا اور پھر سب مل کر کورس گاتے: "فرض ہے تم پہ مسلمانوں جہادِ کفار"۔ ہنٹر لکھتا ہے کہ یہ جہادیہ نغمے برطانوی شاہراہوں پر کھُلے عام گائے جا رہے تھے، سوال یہ ہے کہ انگریزوں نے انھیں کیوں کر برداشت کیا؟ کیا حکومت کے آدمی اُن کی رپورٹ نہیں کرتے تھے؟ اس کا جواب ہنٹر ہی کی ایک اور تحریر میں ملتا ہے: (۱۸۵۲ء میں سرحدِ آزاد میں گرم جنگ کا آغاز ہوا) "اسی زمانے میں پٹنہ کے مجسٹریٹ نے یہ رپورٹ دی کہ اس شہر میں باغی جماعت کے آدمیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس انگریزی صوبے کے دارالحکومت کے مجاہدین شہر میں بغاوت کی علانیہ تبلیغ کر رہے ہیں۔ پولیس بھی انھیں دیوانوں کی طرف دار تھی"۔ غالباً یہی کیفیت ہر جگہ تھی کہ عام پولیس والے سرکار کے دیسی ملازم مجاہدین کی ان سرگرمیوں سے صرفِ نظر کرتے رہتے تھے۔ آخر وہ بھی اسی معاشرے سے تعلق رکھتے تھے۔ قدرتاً عام آدمی کی ہمدردیاں تحریک کے ساتھ تھیں۔ مُلک پر انگریزوں کے بڑھتے اندھیروں سے سب خوفزدہ اور متنفر تھے اور ہر ایسی کوشش کو دل سے پسند کرتے جو ان اندھیروں سے مُلک کو نجات دلوانے کے لیے کی جا رہی تھی۔ پھر یہ نغمے جس انداز سے پڑھے جاتے وہ خود دلوں کی دُنیا اور اس میں امڈنے والے جذبات کو تند و سبک سیر دریا کی موجوں کی طرح ایک ایسے رُخ پر بہائے جاتے کہ مخالفت کا خیال کم ہی دل میں آتا۔

۱۸۵۲ء سے ۱۸۵۶ء تک انگریزی افواج کی پے بہ پے یلغار کے باوجود مجاہدین مقابلے میں ڈٹے ہوتے تھے۔ مقامی آبادی اور خوانین بار بار دغا دیتے رہے، مگر مولانا عنایت علی اور اُن کے ساتھی مورچے جماتے کھڑے تھے۔ وہ جب موقع پاتے مقامی آبادی کو غیرت کے کچوکے دے کر اپنے ساتھ ملاتے اور انگریزوں اور اُن کے حلیفوں پر یورش کر دیتے۔ یہ صورتِ حال انگریزوں کے لیے بڑی پریشان کن تھی۔ آخر انھوں نے پُوری قوت کے ساتھ حملہ کر کے مجاہدین کے ٹھکانوں کو تباہ کر دینے اور مولانا عنایت علی کو زندہ یا مُردہ گرفتار کرنے کی ٹھان لی، لیکن ابھی نئے منصوبے کے مطابق عملی اقدام نہ کیا تھا کہ ہندوستان میں جنگِ آزادی کی آگ بھڑک اُٹھی اور انگریزوں کو اپنی ساری توجہ اس آگ میں بھسم ہوتے ہوئے انگریزی اقتدار کو بچانے کی طرف

مبدّل کرنا پڑی۔ بدقسمتی سے حرّیت پسند متحدہ محاذ نہ بنا سکے اور ہر لڑائی انھوں نے افراتفری میں لڑی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ وہ ہر محاذ پر فاتح بن کر ابھرے۔ جولائی کے وسط تک حرّیت پسند ہر جگہ پسپا ہو رہے تھے۔ ادھر مولانا عنایت علی نے نارنجی کو مرکز بنا لیا تھا۔ یہ پہاڑ کی چوٹی پر بڑا مستحکم مقام تھا اور اب وہاں سے میدانی علاقوں پر چھاپے مار رہے تھے۔ صورتِ حال کو ہاتھوں سے نکلنے سے بچانے کے لیے انگریزوں نے فوری اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میجر واگھن کی کمان میں برطانوی فوج مردان سے بڑھی اور شیخ جانا گاؤں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ ۲۱ جولائی ۱۸۵۷ء کی صبح وہ نارنجی کے سامنے نمودار ہوئی۔ نارنجی کے دو گاؤں تھے ایک زیریں اور دوسرے بالائی۔ زیریں گاؤں کو گھیر کر واگھن نے تباہ کر ڈالا لیکن فوج ساری رات مارچ کرتی ہوئی آئی تھی، خطرہ تھا کہ رات مجاہدین چھاپہ نہ ماریں، چنانچہ انگریزی فوج نے گاؤں جلانے ہی پر اکتفا کیا اور دن ہی دن میں واپس چلی آئی۔

دو ہفتے بعد یکم اگست کو میجر واگھن پوری تیاری کے ساتھ چودہ سو سپاہی لیے پھر نارنجی پہنچ گیا۔ اب کہ وہ توپیں اور ہاتھی بھی ساتھ لایا۔ اُس نے شیوہ کو مرکز بنایا۔ گاؤں کی شمالی سمت نالہ بہتا تھا۔ اُس کے کنارے توپیں گاڑیں اور گولہ باری شروع کر دی گئی۔ فوج کا ایک حصّہ جنوب کی سمت سے نارنجی کی طرف بڑھا اور دوسرا مشرقی سمت سے۔ خود واگھن نے زیریں گاؤں میں مورچے گاڑ رکھے تھے۔ مجاہدین کو ۳۰ جولائی ہی کو پتہ چل گیا تھا کہ انگریزی فوج دوسرے حملے کی تیاری کر رہی ہے۔ اُس روز یومِ عرفہ تھا۔ ۳۱ جولائی کو نمازِ عید کے بعد خطبے ہی میں مولانا عنایت علی نے اعلانِ جہاد کر دیا اور قریہ قریہ اطلاعات بھیج دیں۔ پھر مجلس مشاورت بیٹھی جس نے فیصلہ کیا کہ امیرِ جماعت (مولانا عنایت علی) نارنجی چھوڑ کر چھپا گئی چلے جائیں جو نارنجی سے کچھ فاصلے پر پہاڑوں کے اُوپر ہے۔ یہ بھی طے پایا کہ مجاہدین آخری دم تک مقابلہ کریں گے، چنانچہ بڑی سخت جنگ کے بعد انگریزوں نے بالائی نارنجی پر قبضہ کر لیا۔ چھ سو مجاہدین میں سے خاصی بڑی تعداد شہید ہو گئی، ان میں نمبر ۵۵ پیادہ فوج کے وہ سپاہی بھی تھے جنھوں نے مردان میں بغاوت کی تھی۔ کچھ لوگ انگریزوں سے مقابلے میں مارے گئے تھے، کچھ کو ساداتِ کاغان نے دغا دے کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ جو لوگ ان دونوں مذبحوں سے بچ نکلے

تھے وہ مولانا عنایت علی کے پاس آگئے تھے۔ اب اُن میں سے بھی اکثر نے اپنی جان لڑتے ہوئے نچھاور کردی تھی۔ تین چار سو آدمی فرار ہوجانے میں کامیاب ہو گئے۔ فاتحین نے گاؤں میں تباہی مچادی۔ ایک بھی مکان سلامت نہ چھوڑا، بہت سے مستحکم مکانوں کی دیواریں ہاتھیوں سے مسمار کرادی گئیں۔ تین آدمی گرفتار ہوئے جنھیں بعدازاں موت کی سزا دے دی گئی۔

○

مولانا عنایت علی نے مشیروں کے مشورے پر حملے سے ایک روز پہلے ہی نارنجی چھوڑ دیا تھا اس لیے انگریزوں کی اس مہم کا اصل مقصد پھر بھی پورا نہ ہو سکا۔ مہم تو ختم ہو گئی۔ مگر ابتلا کے بادل اُمڈ آئے جو طلوع ہونے والے ہر سورج کے ساتھ گمبھیر ہوتے جارہے تھے۔ مولانا نارنجی سے نکلے تو پھر کہیں ٹھہرنے کو جگہ نہ ملی۔ مقامی خوانین نے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ یہ ہمیشہ سے اُن کا ہنجار چلا آتا تھا۔ مجاہدین کو دشمن کے مقابلے میں طاقتور اور فتحیاب ہوتا دیکھتے تو اُن کی رفاقت کا دم بھرنے لگتے اور جب پانسہ پلٹ جاتا تو وہ بھی ساتھ چھوڑ جاتے۔ قول وقرار، عہد و پیمان، ایمانی اخوت اور دیرینہ روابط اور دوستانہ تعلقات کسی کا پاس نہ کرتے۔ کافروں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہوئے اُن کا ضمیر ذرا خلش محسوس نہ کرتا۔ سکھوں نے بھی اُن کی اِسی نفسیاتی کیفیت سے فائدہ اُٹھایا تھا اور انگریز بھی فائدہ اُٹھا رہے تھے۔ وہ مجاہدین کو جنگ کے میدان میں شکست دیتے اور اُنھیں کچلنے کا باقی کام مقامی خوانین پر چھوڑ دیتے۔

یہی صورتِ حال اب پیدا ہو چلی تھی۔ مولانا عنایت علی نارنجی سے وادیٔ چپلہ میں کن گلئی گئے، وہاں سے چنگلئی پہنچے اور پھر دو کھاڑہ۔ انگریز تعاقب کر رہے تھے۔ مولانا منگل تھانہ کے قلعے کو مرکز بنانا چاہتے تھے، مگر وہ انگریزوں کی یورش سے محفوظ نہ تھا، چنانچہ چنئی کا رُخ کیا۔ دراصل وہ اپنے آپ کو کہیں محفوظ نہ پا رہے تھے۔ کہیں انگریزوں کے حملے کا خطرہ تھا اور کہیں خوانین کا عناد کارفرما تھا۔ وہ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور انعام پانے کے لیے اِکا دُکا مجاہدین کو شہید بھی کر چکے تھے۔ غیرت وحمیت اور ایمان ویقین کے چراغ گُل ہو جائیں تو سینوں میں دل نہیں پتھر باقی رہ جاتے ہیں اور انسان ہر وہ کام کر گزرتا ہے جو غیرت وایمان کی ذرا سی تو بھی اگر سینے میں موجود ہو تو اس کا تصور بھی نہیں کر پاتا۔ مجاہدین مدتوں منگل تھانہ کے سیدوں کے پشت پناہ

بنے رہے تھے، انھیں قبائلی لڑائیوں میں حریف قبائل کی چیرہ دستیوں سے بچانے آتے تھے لیکن سب سے پہلے سید عباس رئیسِ تھانہ منگل اور اُس کے بھائی سید یوسف میاں گُل کی تلواروں ہی نے نہی مجاہدوں کا خُون چاٹا۔

مصیبت بالائے مصیبت ہندوستان سے پیسہ آنا بند ہو گیا اور مجاہدین کی زندگی اور سرگرمیوں کا سارا انحصار انہی وسائل پر تھا جو ہندوستان کا بیس (BASE) انھیں فراہم کرتا تھا۔ جنگِ آزادی کی وجہ سے راستے مخدوش ہو چکے تھے۔ خود صادق پُور اور اُس کے مکینوں کی کڑی نگرانی کی جا رہی تھی۔ امیرِ جماعت مولوی فرحت حسین بسترِ مرگ پر پڑے تھے اور صادق پُور کے دیگر افراد مولانا احمد اللہ، شاہ محمد حسین اور مولوی واعظ الحق نظر بند کیے جا چکے تھے اور رقوم وغیرہ کا بندوبست اِنھیں اصحاب کے ہاتھ میں تھا۔ انگریزوں نے دریائے سندھ کے تمام گھاٹوں اور کوہستانی راستوں پر کڑے پہرے بٹھا رکھے تھے، چنانچہ بعض ذیلی مراکز سے اپنے طور پر ناظمین نے روپیہ بھیجا تو قاصد سرحد پار کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ کچھ مدت ساہوکاروں سے قرض لیکر گزارے، مگر اِدھر فوج کی طرف سے تنخواہ کا تقاضا بڑھا، اُدھر ساہوکاروں نے قرض کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ مولانا عنایت علی کے پاس جتنی کچھ قابلِ فروخت چیزیں تھیں سب بیچ ڈالیں اور ساہوکاروں کو ادا کیا پھر بھی قرض باقی رہ گیا۔ بہت سے مجاہدین خور و نوش کی ضرورتوں سے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ مگر سیکڑوں افراد کا انتظام کیسے ہو سکتا تھا۔ نوبت فاقہ کشی تک پہنچ گئی۔ تذکرۂ صادقہ میں مولانا عبد الرحیم نے ان دِنوں کا نقشہ بڑے جذباتی مگر صحیح انداز میں کھینچا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کے غدر کی وجہ سے راہ پُرخطر تھے۔ شہر سے باہر نکلنا دشوار تھا۔ املاک تہلکہ میں تھے۔ جانوں کو امن نہ تھا۔ پھر کس کو ہوش تھے اور کیوں کر ممکن تھا کہ سرحد کے پار فاقہ کشوں کے لیے کوئی سامان کیا جا سکتا؟ مسلسل فاقہ کشی نے حال تباہ کر دیا۔ درختوں کی کونپلوں اور پتّیوں پر اصحابِ صُفہ کی سُنّت ادا ہونے لگی۔ چند ماہ مسلسل غلّے پر نظر تک نہ پڑی۔ اجابتیں خُون آلود ہونے لگیں۔ آپ کے پاس جو کچھ نقود تھے۔ آپ مہاجرین اور انصار پر صرف کر چکے تھے اور وہ تھا ہی کیا؟ اُونٹ کے مُنہ میں زیرہ! اب ساتھیوں کی بدگمانیاں اور طعنے شروع ہو گئے

زندگی تلخ تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ اگلی امم مضطر ہو کر متیٰ نصر اللہ (مدد کب آئے گی) پکار اٹھی تھیں........"

مولانا عنایت علی چینیٔ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ نور بانڈو کے مقام پر پہنچے تھے کہ بیمار ہو گئے۔ ضیق النّفس کے مریض پہلے ہی تھے۔ فاقہ کشی اور درختوں کے پتّے اور کونپلیں کھانے سے مرض اور بڑھ گیا۔ اسی اثنا میں شدید بخار نے آلیا اور بے ہوشی طاری رہنے لگی۔ حالت قدرے سنبھلی تو ساتھی چارپائی پر اٹھا کر چینیٔ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں حالت بگڑ گئی اور بخار بہت تیز ہو گیا۔ مولانا نے کاغذ اور قلم دوات طلب کی، شاید وصیت لکھنا چاہتے تھے۔ مگر اس کی نوبت نہ آئی سکراتِ موت کے لمحات نے آلیا۔ اکلوتے صاحبزادے حافظ عبد المجید نے گلوگیر آواز میں پوچھا: "حضرت، ہمیں کس پر چھوڑے جاتے ہیں، آپ کے بعد امیر کون ہو؟" لیکن مولانا کسی اور عالم میں تھے، آنکھیں آسمان سے یوں لگی ہوئی تھیں جیسے اُسے چیر کر کہیں دُور دیکھ رہی ہوں گورا چہرہ جو سخت ریاض و مشقت اور مصائب و شدائد کی زندگی سے گندم گوں ہو گیا تھا چمک اُٹھا تھا۔ پھر ہونٹ پھڑپھڑائے اور بقول "تذکرہ صادقہ" کے الفاظ میں "اَللّٰھُمَّ بالرَّفِیقِ الْاَعْلیٰ سے زبان تر کرتے ہوئے سجن المومن سے جنت نعیم کی طرف رحلت فرما گئے۔" چہرہ آپ سے آپ دائیں طرف ڈھلک گیا۔ اُن کی ساری زندگی کعبے کا رُخ کیے، کعبے کی منزل کی طرف سفر کرتے ہوئے گزری تھی۔ مرنے کے بعد بھی اُن کا رُخ کعبے کی طرف تھا، جیسے پیچھے رہ جانے والوں سے کہہ رہے ہوں کہ اپنی منزل کو فراموش نہ کرنا، اپنا رُخ اُس کی طرف کیے چلتے رہنا اور کسی رکاوٹ اور صعوبت کو خاطر میں نہ لانا اور جو عہد اللہ سے باندھا ہے اُسے ہر حال میں سچّا کر دکھانا، اہلِ ایمان کی یہی نشانی ہے کہ وہ عہد باندھ کر اُس سے پھرتے نہیں ہیں۔ من المومنین رجال صدقوا ما عاھدوا اللہ علیہ فمنھم من قضیٰ نحبہٗ ومنھم من ینتظر وما بدلوا تبدیلا۔ وفات کے وقت چھیاسٹھ ستاسٹھ برس کی عمر تھی اور تاریخ غالباً ۸ شعبان ۱۲۷۴ھ / ۲۴ مارچ ۱۸۵۸ء تھی۔

مولانا عنایت علی نے ۹۔۱۲۴۸ھ میں سید صاحب کی حج سے واپسی پر اپنے

اہلِ خاندان کے ساتھ اُن کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ یوں زندگی کے پینتیس چھتیس برس اُس دعوت کو سربلند کرنے میں گزارے جو سید بادشاہ لے کر اُٹھے تھے۔ بڑے بھائی کی طرح اُنھیں بھی سید بادشاہ نے میدانِ جہاد سے دعوت کا کام جاری رکھنے کے لیے ہندوستان بھیج دیا تھا۔ وطن واپسی کے بعد ایک ایک لمحہ اس فریضے کی ادائیگی میں گزارا جو سید صاحب نے انھیں سونپا تھا۔ سید صاحب شہید ہو گئے اور تحریک کا پرچم مولانا ولایت علی نے سنبھالا تو مولانا عنایت علی بڑے بھائی کے دست و بازو بن گئے۔ بڑے حضرت نے انھیں بنگال میں متعین فرمایا۔ وہاں اُنھوں نے ایسی سرگرمی اور پِتّہ ماری سے کام کیا کہ بنگال کا قریہ قریہ دعوتِ حق کا گڑھ اور مجاہدین کی افرادی قوت کا سرچشمہ بن گیا۔ آپ نے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح راحت و عیش میں پرورش پائی تھی، لیکن اس زندگی کو چھوڑ کر دُنیا سے بے رغبتی اور محنت و جفاکشی کو اس طرح اپنایا کہ پھر اس لذتوں بھری زندگی کی طرف کبھی رُخ پھیر کر نہ دیکھا۔ مال و دولت اور جائداد اپنے لیے نہ تھی بلکہ دعوت، تحریکی ساتھیوں اور خلقِ خدا کی خدمت کے لیے وقف تھی۔ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے) کا نمونہ تھے۔ کریم النفس تھے۔ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (کافروں پر سخت اور آپس میں رحیم و مہربان) کی تفسیر آپ پر صادق آتی تھی۔ کسی سے دشمنی تھی تو اللہ کے لیے تھی اور محبت اور دوستی تھی اللہ کے لیے۔ پوری زندگی حلم و تواضع اور صبر و استقامت سے عبارت تھی۔ بڑے ہی متوکل علی اللہ انسان تھے۔ سنگین ترین حالات میں بھی مایوسی اور بے دلی کا شکار نہ ہوتے، حق کی راہ میں ہر وقت سینہ سپر رہتے۔ نہایت شجاع اور فعّال و متحرک رُوح سینے میں تھی۔ جنگی اسٹریٹجی کے ماہر تھے۔ میدانِ کارزار میں ایسی جانبازی دکھاتے کہ دشمنوں کا کھڑا کھیل بگڑ جاتا اور میدان کا رنگ پلٹ جاتا۔ آپ کی یہی وہ صلاحیتیں تھیں جن سے کام لیکر آپ نے اسلام گڑھ کی ریاست تشکیل دی۔ افسوس کہ مفاد پرست خوانین اور رؤسا نے سِکھوں اور انگریزوں کے ساتھ ساز باز کر کے اور اپنے عہد و پیمان سے پھر کر ان کے منصوبوں کو ناکام بنا دیا اور اسلامی ریاست کو بالکل ابتدائی برسوں ہی میں سکھوں کے ہاتھ سے ختم کروا دیا ورنہ یہ ریاست نہ صرف سرحد کے مسلمانوں کی سربلندی کا باعث ہوتی بلکہ برصغیر کے افق پر بھی اسلام

کے لیے نئے دَور کا سُورج بن کر اُبھرتی۔

○

مولانا عنایت علی کے انتقال نے مقامی خوانین رؤسا اور انگریزوں کی راہ سے بڑی رکاوٹ دُور کر دی جسے وہ اپنی آئے دن کی مشترکہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے دُور نہ کر سکے تھے۔ مولانا کے صاحبزادے حافظ عبدالمجید کی زبان میں لکنت تھی اس لیے مجاہدین نے مولانا نوراللہ کو امیر منتخب کر لیا۔ انگریزوں نے مجاہدین کو نئے حالات میں سنبھلنے کا موقع نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ میجر جنرل سڈنی کاٹن کی کمان میں پانچ ہزار جوانوں پر مشتمل انگریزی فوج ۲۵ اپریل کو ان علاقوں کی طرف بڑھی جو مجاہدین کی قوت کا مرکز تھے۔ تکلی خوانین کی ایک بڑی تعداد اُن کے ساتھ تھی۔ پہلے پنجتار کو توپوں سے گولہ باری کر کے مکمل طور پر تباہ کیا (۲۷ اپریل ۱۸۵۸ء) پھر چنگلئی کا رُخ کیا اور اُسے پنجتار ہی کی طرح ملبے کے ڈھیر میں بدل ڈالا۔ اب منگل تھانہ کی باری تھی اور آخر میں ستھانہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ستھانہ کی اراضی پر کیا اور کھبل کے اتمان زئیوں نے تسلط جما لیا جو اس جنگی مہم میں انگریزوں کا ہراول دستہ بنے ہوتے تھے۔ انگریزوں نے مختلف قبائل سے عہد لیا کہ وہ ہندوستانی مجاہدوں کو اپنے ہاں جگہ دیں گے نہ انھیں اپنے علاقوں میں سے گزرنے اور ہندوستان کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی اجازت دیں گے۔

مجاہدین کو اب پھر ایک نئے مرکز کی ضرورت تھی اور وہ بھی سیّد اکبر شاہ کے بیٹوں اور بھتیجوں نے مہیا کیا۔ ستھانہ سے دس پندرہ کوس کے فاصلے پر ملکا اپنی آغوش وا کیے کھڑا تھا۔ مولوی نوراللہ نے یہاں مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔ اِسی دوران میں اُن کا انتقال ہو گیا اور میر مقصود علی نے جو وطن گئے ہوئے تھے، واپس آکر قیادت سنبھال لی۔ انھوں نے مجاہدین کی از سرِ نو تنظیم کی۔ ڈیڑھ برس کے بعد اُن کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب اس عظیم منصب کے لیے نگاہِ انتخاب مولانا ولایت علی کے بڑے صاحبزادے مولانا عبداللہ پر پڑی جو اُسی زمانے میں گھر بار چھوڑ کر دوبارہ سرحد پہنچ گئے تھے۔[1] چنانچہ انھیں اتفاق رائے سے امیر منتخب کر لیا گیا۔ (۱۸۶۲ء / ۱۲۷۸ھ)

اُنیسویں صدی کا چھٹا عشرہ اپنے جلو میں بلاؤں کا ہجوم لے کر آیا تھا، ساتواں عشرہ اسلامی جذبوں اور فولادی قوتوں کے تصادموں اور ابتلا و استقامت کی نئی داستانیں لیے آگے بڑھ رہا تھا۔

---

[1] مولانا عنایت کو امیر بنے کچھ ہی مدت ہوئی تھی کہ مولانا عبداللہ اور مولانا یحییٰ علی کو اُن سے اختلاف پیدا ہو گیا، چنانچہ انہیں مولانا فرحت حسین نے عظیم آباد بلا لیا تھا۔

تیسری منزل

انڈمان

زخمی ناگ

رات ختم ہو چلی تھی۔ پچھلے پہر خوشگوار ہوا چلنے کے بعد حبس پھر بڑھ رہا تھا۔ فضا کا بدلتا ہوا رنگ غمازی کر رہا تھا کہ سورج شعلے برساتا طلوع ہو گا۔ سارجنٹ عزن خان نے مشرق کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اُفق پر صبح کی سفیدی نمودار ہو رہی تھی... وہ حسبِ معمول گشت پر نکلا اور اُس نے اپنا گھوڑا پانی پت کی جانب جرنیلی سڑک پر ڈالنے کے لیے موڑا۔ اچانک وہ چونک گیا۔ کوئی اذان دے رہا تھا۔ اُس نے آواز پر کان لگا دیے۔ پانی پت کی مسجدوں کے مینار ابھی سوئے پڑے تھے۔ آواز جنگل سے آ رہی تھی۔ وہ کھڑا سوچتا رہا اس ویرانے میں اذان دینے والا کون ہے؟ اور اتنی سویرے!!! اُس کی نگاہیں آواز کا تعاقب کر رہی تھیں۔ لحظہ بہ لحظہ پھیلتی ہوئی روشنی میں جرنیلی سڑک، ہلکی سی لکیر کی صورت ڈیڑھ دو فرلانگ آگے دو رویہ درختوں اور جھاڑیوں کے ہجوم میں غائب ہو گئی تھی۔ پندرہ بیس منٹ گزر گئے، مگر سارجنٹ کسی بُت کی طرح جامد، خیالوں میں کھویا رہا۔ آخر سوچ کی گہرائیوں سے اُبھر کر گھوڑے کو آہستہ سے ایڑ لگائی، مگر فوراً ہی باگیں کھینچ لیں اُس نے دیکھا کچھ ہیولے سے درختوں اور جھاڑیوں میں سے نکلے ہیں اور اُس کی سمت بڑھے چلے آ رہے ہیں۔

وہ چار آدمی تھے اور پیدل۔ وضع قطع درویشوں کی سی — پست قامت، سیاہی مائل رنگ اور چھوٹی چھوٹی ڈاڑھیاں۔ گرد و غبار میں اَٹے ہوئے چہروں اور

کپڑوں سے ظاہر ہوتا تھا وہ کئی روز سے پا بہ سفر ہیں اور کالے کوسوں کی منزلیں کاٹتے چلے آرہے ہیں۔ عزت خان ان کے خدوخال دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ پانچ سال پہلے کے واقعات لوحِ ذہن پر اُبھر آئے۔ اِن دنوں وہ بے قاعدہ سوار فوج میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا جوالا مکھی پھٹ پڑا اور پھر اس کی چنگاریاں سرحد میں بھی بھڑک اُٹھیں۔ اُسے چند روز ٹریننگ دے کر ستھانہ کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ عزت خان، ہوتی مردان کے ٹپہ کمال زئی کا رہنے والا تھا۔ ادھیڑ عمر کا یہ پٹھان، مجاہدین کی ان سرگرمیوں سے باخبر تھا جو ۳۰ سال سے سرحدی علاقے میں جاری تھیں۔ پہلے ان سرگرمیوں کا ہدف سکھ تھے جو آگ اور خون کی ہولی کھیل کر پورے علاقے میں دہشت پھیلا رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں مسلمانوں کی آبرو محفوظ تھی نہ جان و مال اور مسجدیں۔ انگریزوں نے پنجاب فتح کیا، تو مجاہدین کا تصادم ان سے شروع ہو گیا عزت خان نے سُنا تھا کہ مجاہدین نے انگریزی سرکار کا ناک میں دم کر رکھا ہے، مگر ستھانہ کی جنگ (۴ مئی ۱۸۵۸ء) میں انھیں پہلی مرتبہ لڑتے دیکھا۔ انگریزی فوجیں فتح یاب ہوئیں مجاہدین کی بڑی تعداد خلعتِ شہادت سے سرفراز ہو گئی۔ بعض لاشیں دیکھ کر عزت خان کو خیال آیا وہ ان کو ہوتی مردان اور شیخ جانا میں دیکھ چکا ہے ــــــ اور اب پانی پت کے تاریخی میدان میں ویسے ہی چہرے پھر نظر آرہے تھے۔

سارجنٹ فوراً سمجھ گیا یہ وہی مجاہد ہیں جن کی بدولت پانچ سال پہلے اس پر ترقی کی راہیں کھلی تھیں۔ جنگِ ستھانہ ختم ہوتے ہی انگریزوں نے باصلاحیت سپاہی منتخب کر کے پلٹن توڑ دی۔ عزت خان ان سپاہیوں میں شامل تھا جن پر ان کے غیر ملکی آقاؤں کی نگاہِ انتخاب پڑی تھی۔ اس جنگ میں وہ ضمیر کی ادنیٰ سی خلش کے بغیر اپنے مسلمان بھائیوں کو گولیوں کا چارہ بناتا رہا۔ اس خدمت کے صلے میں حکومت نے اُسے پولیس سارجنٹ بنا دیا۔ وہ گزشتہ چار سال سے ضلع کرنال میں متعین تھا اور آگے بڑھنے کا ایک اور موقع اُس کے ضمیر پر دستک دے رہا تھا۔

اجنبی مسافروں نے اُس کے قریب سے بے دھیانی میں نکل جانا چاہا، مگر

عزن خان نے انھیں روک لیا اور خالص پٹھانی لہجے میں پوچھا:
"کہاں سے آرہے ہو؟"

مسافروں نے اُس پر ایک نظر ڈالی اور اس کے تیور دیکھ کر ایک لمحے کو ان کے چہروں پر تذبذب اور تشویش کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ پھر ان میں سے ایک مسافر نے جو اپنے ساتھیوں سے زیادہ ہوشیار اور پھرتیلا تھا، جواب دیا: "لاہور سے" اس کا لہجہ بنگالی ہونے کی صاف چغلی کھا رہا تھا۔

"لاہور میں کیا کرتے تھے؟" عزن خان نے ایک اور سوال کیا۔
"پڑھتے ہیں" اُنیس بیس سال کے دوسرے نوجوان نے اعتماد سے کہا
"مگر میں نے تمھیں شیخ جانا میں دیکھا تھا" عزن خان نے تیزی سے کہا اور اُس کا ردِ عمل پڑھنے لگا۔

نوجوان ان تیز تیز نگاہوں سے گھبرا گیا۔ عزن خان نے اپنا لہجہ فوراً بدل لیا:
"جوان! تم گھبرا گئے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ میں بھی مسلمان ہوں، اللہ رسول کا ماننے والا۔ سیّد بادشاہ اور اُن کے غازیوں کا عقیدت مند۔"

مسافروں کے چہرے مسرّت کے نور سے دمکنے لگے۔ وہی نوجوان کہنے لگا:
"کاکا! آپ سے کیا چھپانا، ہم سیّد بادشاہ ہی کے خادم ہیں۔ کافروں نے ہم سے ہمارا مُلک چھین لیا، ہندوستان، دارالحرب بن چُکا جہاں زندگی بسر کرنا مسلمان پر حرام ہے اور اُسے دارالاسلام میں بدلنے کی جدّوجہد کرنا اس کا دینی فرض ہے۔ ہم وہی فرض پورا کر رہے ہیں۔ بنگال کے رہنے والے ہیں، ملکا سے آتے ہیں، رضا کار ہیں۔ پرسوں ہم تھانیسر میں منشی محمد جعفر کی مسجد میں ٹھہرے تھے۔ روپے پیسے اور رضا کاروں کا انتظام کرنے وطن واپس جا رہے ہیں، دو ماہ بعد پھر لوٹیں گے اور جہاد میں شریک ہو جائیں گے۔ اللہ نے آپ کو احساس بخشا ہے، کافر کی نوکری پر لعنت بھیجیں اور غازیوں کا ساتھ دیں۔ اسلام کو آپ جیسے بہادروں اور دلیروں کی ضرورت ہے۔"

"آپ درست کہتے ہیں۔ جب سے انگریزوں نے سیّد بادشاہ کا مرکز استھانہ

تباہ کیا' سوچ رہا ہوں یہ زندگی کس کام کی؟ مجاہد سر کٹا رہے ہیں اور میں تن آساں پیٹ کا کتا' انگریز کی چاکری میں مصروف کبھی کبھی جی میں آتی ہے نکل کھڑا ہوں اور غازیوں سے جا ملوں' مگر گھر کی ذمہ داریاں زنجیر پا بن جاتی ہیں۔'' غزن خان نے جواب دیا۔ اُس نے رضا کاروں کے چہروں پر ایک بار پھر نظر دوڑائی۔ یہ نظر شفقت و محبت کی گرمی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ذرا دیر چپ رہنے کے بعد پھر بولا: ''غازی بھائی' میرے لیے دُعا کریں۔ واپسی پر مجھ سے ضرور ملیں۔ کچھ کام نبٹانے ہیں' ان سے فارغ ہوتے ہی نوکری پر لات مار کر تمہارے ساتھ آملوں گا۔''

رضا کاروں کی خوشی بے پایاں اور بے کنار تھی' کہنے لگے: ''دین و دُنیا کی بھلائی اسی راستے کی آبلہ پائی میں ہے۔ ہم واپسی پر آپ سے ضرور ملیں گے۔''

وہ سلام کہہ کر رخصت ہونے لگے۔ مگر غزن خان بولا: ''نہیں بھائی! میرے ہاں چلو' پانی پت میں بھی سیّد بادشاہ کے مرید رہتے ہیں' ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔''

رضا کاروں نے معذرت کی' مگر غزن خان کے بار بار اصرار پر اُس کے ساتھ ہو لیے۔ پولیس چوکی پہنچتے ہی غزن خان نے آواز دی: رام لال! ....ایک لمبا تڑنگا سپاہی لمبے لمبے ڈگ بھرتا آیا۔

''انہیں حوالات میں بند کر دو۔'' غزن خان نے رضا کاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا اور ساتھ ہی بندوق چھتیالی۔

چاروں کا رنگ فق ہو گیا۔ اگلے لمحے وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑے تھے۔

○

اب اُنہیں اپنی سادہ لوحی کا احساس ہوا۔ وہ ایک ایسے راز سے پردہ اُٹھا بیٹھے تھے جس سے پوری تحریک پر قیامت ٹوٹ سکتی تھی۔

دو تین گھنٹے بعد غزن خان مسکراتا اور بڑی بڑی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا ان کے پاس

آیا۔ انہوں نے اس کی منت سماجت کی' اللہ کا واسطہ دیا' مسلمان ہونے کے ناطے اُس کے جذبات سے اپیل کی' مگر اُس کے دل و دماغ پر پڑے ہوئے حرص و ہوا کے دبیز پردے چاک کرنے میں ناکام رہے۔ وہ اُن کی باتوں پر ہلکے ہلکے قہقہے لگاتا اور مسکراتا رہا۔ اُس کے دِل میں مچلنے والی خوشی' آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ سرحد میں مجاہدین نے گزشتہ کئی برسوں سے انگریزوں کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ سب جانتے تھے کہ انہیں ہندوستان سے روپیہ اور رنگروٹ فراہم ہوتے ہیں' لیکن پتہ نہ چلتا تھا یہ کام کون لوگ اور کس طرح کر رہے ہیں۔ منگل تھانہ کی تباہی میں کچھ کاغذات ہاتھ لگے تھے۔ اُن میں کئی نام تھے' مگر ان ناموں والے لوگ کہیں نہ تھے۔ غزن خان کو ایک ایسا سراغ مل گیا تھا جس کے ذریعے انگریز' تحریک پر تباہ کن ضرب لگا سکتے تھے۔ وہ شاندار مستقبل کے خواب دیکھنے لگا۔ اُس کے آقا اس انکشاف پر یقیناً رقص نشاط کر اٹھیں گے اور پھر اعلیٰ مناصب اُس کے قدموں تلے ہوں گے۔ سرکار دربار میں کرسی ملے گی اور جب وہ کرنال سے رخصت ہوگا تو جاگیر کا مالک بن چکا ہوگا۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کچلنے کے بعد اپنے وفاداروں پر نوازشات کی جو بارش کی تھی' اُس کے پیش نظر غزن خان کا خواب محض خشک و بے نم تمناؤں کا نتیجہ نہ تھا۔

رضا کاروں نے جب دیکھا کہ غزن خان پر منت سماجت کا کوئی اثر ہوتا ہے نہ خدا کے واسطے ہی سے اس کا دل پسیجتا ہے' تو انہوں نے ترغیب و تحریص سے کام لینا چاہا۔ پیشکش کی کہ روپیہ چاہتے ہو' تو یہیں تھانیسر میں اُس کا انتظام کر سکتے ہیں' مگر غزن خان تو اُونچی ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ وہ ایسی فرومایہ پیش کش کب خاطر میں لاتا؟ اُس نے رپورٹ تیار کی یہ لوگ حکومت کے دُشمن میں اور مجاہدوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دو مہینے کے لیے واپس گھر جا رہے ہیں۔ کہتے ہیں سرحد پر بھاری جنگ ہونے والی ہے۔ مجھے بھی اُنہوں نے اس جنگ میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ تھانیسر میں مولوی محمد جعفر نمبردار کی مسجد میں ٹھہرے رہے اور انہیں جانتے ہیں۔

انبالہ کے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر مسٹر اسٹیفن کی عدالت میں ان کا مقدمہ پیش ہوا۔ ان لوگوں نے اپنے اُوپر عائد کردہ الزامات سے انکار کیا اور کہا ہم محض مسافر ہیں سارجنٹ نے پیسے طلب کئے تھے اور انکار پر ہمیں پکڑ لیا۔ ۱۸ مئی ۱۸۶۳ء کو مسٹر اسٹیفن نے انہیں رہا کر دیا۔ اُس نے اپنے فیصلے میں لکھا ؛ چھان بین کے بعد واضح ہوا کہ یہ چار آدمی معمولی مسافر ہیں۔ سارجنٹ غزن خان اپنے بیان کے سوا اور کوئی ثبوت ایسا پیش نہیں کر سکا جس پر ان غریب الوطن مسافروں کو سزا دی جائے۔

رضاکاروں کی رہائی سے غزن خان کو خفت اُٹھانی پڑی۔ شاندار مستقبل کے ہوائی قلعے ہوا ہی میں تحلیل ہو گئے۔ وہ زخمی ناگ کی طرح غصے میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ دِل میں کینے اور انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی اور اُس نے ان الزامات کی صحت کا ثبوت پیش کر کے برِصغیر کے مسلمانوں کی اس دینی تحریک کو تباہ کروا دینے کا تہیّہ کر لیا جو مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اُمید اور عزیمت کا واحد چراغ تھی اور جسے ہزاروں مردانِ حق نے سخت رُوح فرسا حالات اور کُفر کی روز بروز بڑھتی اور اُمڈتی آندھیوں میں اپنا خون دے کر روشن رکھا تھا۔

○

کالے آلتھے کا گان

مجاہدین کے مرکز ملکا میں اُن دِنوں بڑی گہما گہمی تھی۔ ساداتِ ستھانہ نے ستھانہ، اتمان زئیوں سے واپس لینے کا منصوبہ بنایا تھا اور مجاہدین بھی اس مہم میں شریک ہو گئے۔ سادات کا یہ گھرانا، سرحدِ آزاد میں واحد گھرانا تھا جس نے مجاہدین کا خوشحالی اور تنگ دستی، جنگ اور امن، زمانے کے ہر قسم کے حوادثات اور نشیب و فراز میں بے تامّل ساتھ دیا تھا۔ اس رفاقت کی انہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ اکثر سرحدی قبائل اُن کے دشمن ہو گئے۔ اُن کی بستیاں اور اراضی، محض اِن غریب الدیار مردانِ حق کی وجہ سے ان قبائل کی ترکتازوں اور غارتگریوں

کا شکار ہوتی رہیں، حتّٰی کہ اسی رفاقت ہی کے جرم میں انگریزوں نے اُن کے پُر رونق شہر تباہ کر دیے، لیکن اُن کی پیشانی پر کبھی بَل نہ آیا اور انھوں نے اخلاص و وفا کی شمع روشن ہمیشہ بلند رکھی۔

رفاقت کا یہ عہد انھوں نے سیّد احمد شہیدؒ کی زندگی میں باندھا تھا۔ بد عہدی اور تلوّن مزاجی، قبائلی سرداروں کی گُھٹّی میں پڑی تھی۔ سیّد احمدؒ، سرحدِ آزاد میں تشریف لائے تو بڑے بڑے خوانین نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، انھیں امام و مرشد تسلیم کیا، لیکن سب نے دغا کی، کسی نے پہلے کسی نے بعد میں، مگر ستھانہ کے سادات کبھی متزلزل نہ ہُوئے۔ اپنے عہد پر پہاڑ کی طرح اٹل رہے۔ سیّد بادشاہ جب اپنے سینکڑوں گل و لالہ سمیت بالاکوٹ کے مشہد میں سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تو بقیۃ السیف کو ایک بھی سردار سر چُھپانے کی جگہ دینے پر آمادہ نہ تھا۔ دو چار نے کچھ مدت کے لیے جگہ دی بھی تو اپنے مفادات کی آبیاری کے لیے، اور جب مجاہدین نے ان کی ذاتی دشمنیوں میں فریق بننے سے انکار کیا، تو انھیں وہاں سے نکلنا پڑا۔ ایسی بے کسی کے عالم میں یہ ستھانہ کے سیّد اکبر شاہ ہی تھے جنھوں نے کسی غرض و مفاد کے بغیر انھیں اپنے مرکز، ستھانہ میں جگہ دی۔ اس طرح یہ مقام اس وقت تک اسلامی ریاست کا مرکز بنا رہا جب تک مجاہدین نے فتح گڑھ، فتح کر کے اُسے ریاست کا صدر مقام نہ بنا لیا۔

لیکن اس ریاست کو نہ خوانین برداشت کر سکتے تھے اور نہ انگریز چنانچہ انھوں نے مشترکہ تگ و دو سے اُس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور مجاہدین کے تمام اہم مراکز پر قبضہ کر لیا۔

مجاہدین کو اب نئے مرکز کی ضرورت تھی اور وہ بھی سیّد اکبر شاہ کے بیٹوں اور بھتیجوں نے مہیا کیا۔ قرعۂ فال مُلکا پر پڑا۔ یہ ستھانہ سے ۲۵ میل کے فاصلے پر مہابن کے اُونچے پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی گمنام بستی تھی۔ مہاجرین کی آمد اور اسلامی ریاست کا مرکز بننے سے ملکا کی آبادی بڑھ گئی۔ یہاں تک

کہ پرانی آبادی میں گنجائش نہ رہی اور قریب ہی نئی آبادی تعمیر ہوئی۔ عام عمارتیں، اور مجاہدین کے بیسے بارکیں پہاڑی طرز پر بنائی گئیں۔ ان بارکوں میں تین ہزار سے زیادہ مجاہدین رہ سکتے تھے۔ بارود کا کارخانہ بھی بنایا گیا، اس طرح گولہ بارود کی حد تک خود کفیل ہونے کی سعی کی گئی۔ راہِ حق کے ان فداکاروں کی آمد سے پہلے ملکا میں زندگی کا دریا بڑے سکون سے بہہ رہا تھا ــــ لیکن اب وہ ایک ایسی تحریک کا فوجی مرکز تھا جس کی طوفانی لہریں دہلی اور لندن کے ایوانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اب سکون کی جگہ تحرک اور جمود کی جگہ حق کی راہ میں تگ و دو اور جنگ و جہاد نے لے لی ــــ اس طرح سادات ستھانہ کی حق پرستی کے طفیل یہ گمنام بستی بھی ستھانہ کی طرح تاریخ کے اوراق میں نقشِ دوام بن کر دمکنے لگی۔

○

یہی ملکا جنگ کی تیاری میں ہمہ تن مصروف تھا۔ ریاست کے مختلف حصوں سے مجاہدین کے دستے آرہے تھے اور دارالحکومت میں چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ ملکا میں رضاکاروں کی آمدورفت بارہ مہینے جاری رہتی۔ ان میں تجربہ کار اور حالات کی سختیوں سے آشنا اور جنگ کی بھٹی میں تپ کر نکلے ہوئے پرانے رضاکار بھی ہوتے اور راہِ حق میں جان دینے کے جذب و جنوں سے سرشار نئے رضاکار بھی۔ پرانے رضاکار بالعموم تحریک کے کام سے ملکا اور انگریزی علاقوں کے درمیان آتے جاتے رہتے۔ نئے رضاکار جماعت کی فکر اور نصب العین سے متاثر ہو کر آتے اور تربیت کے بعد زیادہ تر صادق پور پٹنہ کے مرکز کی طرف سے بھیجے جاتے۔ یہ وہ نوجوان ہوتے جن کی زندگی، اسلام کے رنگ میں رنگی ہوتی اور جو پورے شعور کے ساتھ راہِ محبت میں گامزن رہتے۔ سرحدی علاقے سے نئے رضاکار عموماً تحریک کے قابلِ اعتماد کارکنوں کی معرفت آتے؛ تاہم بعض اوقات اکا دُکا رضاکار خود بخود چلے آتے۔ ان نووارد نوجوانوں کی نگرانی اور فکر و کردار کی تربیت کا پورا اہتمام کیا جاتا۔ ہنگامی حالات میں ایسے رضاکاروں کی تعداد بڑھ جاتی۔

یہی صورت اس وقت درپیش تھی۔ مقامی آبادیوں سے لوگ خاصی بڑی تعداد میں آ رہے تھے۔ پہاڑی انداز پر بنی ہوئی بارکیں جن کا بڑا حصّہ عموماً خالی رہتا، نوواردوں سے بھر چلی تھیں اور کڑی فوجی زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس وقت ملکا کے امیر مولانا ولایت علیؒ کے صاحبزادے مولانا عبداللہ تھے۔ عظیم باپ کے عظیم فرزند۔ ابھی بالکل نوعمر تھے کہ والدِ گرامی کے ساتھ جنگ و جہاد کی وادیٔ پُرخار میں قدم رکھا اور پہلے سکھوں اور پھر انگریزوں کے ساتھ لڑے جانے والے ہر معرکے میں صفِ اوّل میں رہے۔ وہ محض جنگجو ہی نہیں، بلکہ فوجی معاملات میں گہری بصیرت رکھنے والے ذہین جرنیل بھی تھے۔ اپنی اسی خوبی کی وجہ سے مولانا مقصود علی کی وفات کے بعد امیر منتخب ہوئے۔

ملکا میں زندگی بڑی کٹھن تھی۔ صبح سے عشا کے بعد تک مجاہدین اور رضاکار ہمہ تن مصروف رہتے۔ نمازِ فجر کے بعد امیر عبداللہ خود قرآن و حدیث کا درس دیتے اور جہاد کے فضائل و اہمیت اور راہِ حق میں شہادت کی ابدی سعادتیں بیان کرتے۔ پھر مجاہدین پریڈ اور فوجی مشقیں کرتے۔ کھانے اور نماز کے اوقات کے سوا اُن کا سارا دن فکر و کردار کی تربیت، ہتھیاروں کی دیکھ بھال اور عسکری تگ و دَو میں گزرتا۔ پچھلے پہر پھر پریڈ ہوتی اور فضائلِ جہاد پر نظمیں پڑھ کر مجاہدین کا خون گرمایا جاتا۔ یونٹ کے افسر اپنے جوانوں کو صبر و استقامت اور مہاجرت کی زندگی میں پیش آنے والے مصائب و مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے کی تلقین کرتے، ان کے دِلوں میں اُمید کی جوت جگاتے کہ ان کی قربانیاں اور جدّوجہد رنگ لا کر رہے گی۔ وہ وقت جلد آئے گا۔ جب ہندوستان میں اسلام کا غلبہ ہو گا اور انگریز اپنی ساری طاقت اور قہرمانی کے باوجود نکلنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ نمازِ عشا کے بعد طلایہ گرد دستے طلایہ گردی کرتے اور باقی ذکر و فکر اور تہجد میں مصروف ہو جاتے۔ ان لوگوں پر رھبان اللّیل و فرسان النّھار کی تمثیل بالکل صادق آتی تھی یعنی ان کے دن گھوڑوں کی پُشت پر گزرتے تھے اور راتیں

سچے ... سے کی پیٹھ پر۔

○

بیعت اور حلف کی تقریب بڑی سادہ اور مؤثر تھی۔ عصر کی نماز ہو چکی تھی اور مجاہدین ملکا کی مسجد کے کھلے صحن میں صفیں باندھے بیٹھے تھے۔ نو وارد رضاکار ایک ایک کر کے امیر المجاہدین کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ بیعت کے الفاظ تقریباً یکساں تھے۔ وہ عہد کر رہے تھے کہ تنگی ترشی اور سختی و راحت ہر حالت میں اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے، دشمن کو پیٹھ نہ دکھائیں گے، نکوکاری کی زندگی بسر کریں گے اور برائیوں سے مجتنب رہیں گے، مجاہدین کے راز کو راز رکھیں گے اور اس امانت میں خیانت اور تحریک کے مقاصد سے غداری نہیں کریں گے۔ منظر بڑا رقت انگیز تھا۔ حلف اٹھاتے وقت رضاکاروں کی آواز بھرا جاتی، آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے اور احساس کا طوفان سینوں میں مچلنے لگتا۔ احساس اس بات کا کہ وہ عظیم ذمہ داری قبول کر رہے ہیں، ایک ایسی راہ پر چلنے کا عہد کر رہے ہیں جہاں ہر طرف کانٹے ہی کانٹے بکھرے ہوئے ہیں اور آدمی لالہ و گل کا تصور ہی نہیں کر پاتا۔ حق کا راستہ کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا، مگر خدا کے یہ بندے جس عالم میں اس راستے پر چلنے اور قربانیاں دینے کا حلف اٹھا رہے تھے، وہ تاریخ کا ایک ایسا دور تھا جب پورے عالمِ اسلام میں تاریکیاں اُمڈی چلی آئی تھیں۔ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہر جگہ گھات لگائے بیٹھے تھے اور اس گھات میں ہر جگہ خود مسلمان ان کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ خصوصاً ہندوستان کی حالت اور بھی الم ناک تھی۔ یہاں اسلامی اقتدار کا چراغ گُل ہو چکا تھا اور ایک ایسے سامراج نے اپنے گہرے پنجے گاڑ دیے تھے جس کے آگے دوسری سامراجی قومیں پانی بھرتی تھیں۔ ایسے عالم میں اس راستے پر چلنے اور نشیب و فراز کی پروا کیے بغیر آگے بڑھتے رہنے اور مایوس اور پست ہمت ہو کر ہتھیار نہ ڈالنے کا حلف اٹھانا بچوں کا کھیل نہ تھا۔ یہی احساس تھا جس نے ہر شخص کے دل میں جذبات کا

طُوفان بپا کر دیا ــــ اور وہ آنکھوں کے جھرنوں سے اُبل پڑنے کو بے تاب تھا۔

حمزہ خان کا فیروز خان جب حلف اُٹھانے آگے بڑھا، تو مجاہدین کی نگاہیں اُس پر جم کر رہ گئیں۔ وہ اُنتیس بیس سال کا خوبصورت چاق چوبند نوجوان تھا۔ تقریباً پونے چھ فٹ قد، دُبلا پتلا، مگر صحت مند اور توانا، گورا رنگ، کتابی چہرہ، عقابی ناک اور کرنجی بلوریں آنکھیں۔ ہلکی ہلکی مونچھوں اور چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی نے چہرے کو اَور دِل کش بنا دیا تھا۔ مجاہدین اس سج دھج کے نوجوان اپنے حلیف قبائلی لشکروں میں تو کئی دیکھ چکے تھے، لیکن اُن کی اپنی صفوں میں شامل ہونے والا یہ پہلا دیسی نوجوان تھا۔ کسی کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ معلوم ہوتا۔ حلف اُٹھاتے وقت اس کی آواز میں لرزش کے بجائے کڑک تھی جیسے دِل کی گہرائیوں میں کوئی پُرجوش چشمہ موجزن ہو۔ الفاظ ادا کرتے وقت اُس کا چہرہ لال انگارے کی طرح دہکنے لگا۔

بیعت کی تقریب ہو چکی، تو امیر المجاہدین نے ہندوستانی رضاکار مختلف ہندوستانی یونٹوں میں متعین کر دیے اور فیروز خان سمیت دیسی رضاکار دیسی یونٹ میں جس کے کمان دار بہرام الدین بُنیری تھے۔

فیروز خان اُسی صبح امازئی ملکوں کے تعاون سے ملکا پہنچا تھا۔ وہ جلد ہی اپنے یونٹ میں گھُل مل گیا۔ اُس کی چال ڈھال سے نبرد جُویانہ انداز جھلکتا، اس کے ساتھیوں نے دو تین دن ہی میں ایک عجیب بات نوٹ کی۔ وہ لوگوں کی باتیں بڑے غور سے سُنتا۔ کوئی سی بات ہوتی اُس کا کھوج لگاتا اور اُس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ پہلے پہل تو انھیں یہ بات خاصی کھٹکی، مگر رفتہ رفتہ وہ یہ خیال کر کے مطمئن ہو گئے کہ فیروز خان کا یہ شوقِ تجسس اُس کی متحرک شخصیت کا جزو ہے۔ وہ کیمپ کے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتا اور راتوں کو پہرہ ہوتا یا طلایہ گردی، اپنا فرض بڑے ذوق و شوق اور اہتمام سے انجام دیتا۔ وہ بڑا ملن سار تھا۔ اُس کے ساتھ ایک ہی ملاقات میں اجنبیت کی دیواریں گر جاتیں۔ اُس کی باتوں

میں ایسی اپنائیت تھی کہ ہر شخص اُسے اپنے اعتماد میں لے لیتا۔ دیسی یونٹ ہی کے نہیں، ہندوستانی یونٹوں کے مجاہدین کے ساتھ بھی اُس نے دوستانہ تعلقات استوار کر لیے تھے۔ یُوں بھی یہ سب لوگ ایک برادری کے افراد کی طرح یگانگت کی زندگی بسر کرتے اور کوئی بھی دوسرے کو اجنبی نہ سمجھتا۔ فرصت کے اَوقات وہ اکثر ان دوستوں کے ساتھ گزارتا۔ اُن کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا، کوئی بیمار پڑ جاتا تو تیمارداری کرتا۔ اس طرح چند روز کے اندر اندر وہ ملکا کے شب و روز اور اس کے رازہائے نہاں کا محرم ہو گیا۔

○

جولائی کے دن تھے اور رِم جھم کا سماں، کالے سیاہ بادل فیلِ بے زنجیر کی صُورت جھُومتے، آسمان پر نمودار ہوتے، دیکھتے ہی دیکھتے گھنگھور گھٹائیں کوہ و دَمن پر چھا جاتیں اور پھر جو برستیں تو پہاڑوں میں ندی نالے بہہ نکلتے اور وادیاں شوریدہ سر دریاؤں کا رُوپ دھار لیتیں۔ پھر تیز و تند ٹھنڈی ہَوا چلتی اور تہی دامن بادلوں کو اُڑا لے جاتی۔ مطلع صاف ہو جاتا۔ پہاڑ اور وادیوں کی ڈھلوانیں نہائی دھوئی، دُھوپ میں چمکنے لگتیں۔ یہی دن تھے کہ خبر ملی شہزادہ مبارک شاہ نے اتمان زئیوں کو جو خط لکھا تھا، اُس کا جواب آگیا ہے۔ جواب اُن کی طرف سے تھا جو شہزادہ کے حامی تھے اور دو سال پہلے دو چار جھڑپوں کے بعد ستھانہ کی اراضی سے اپنے اصل مالکوں کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے۔ انھوں نے شہزادے کی سرداری تسلیم کر لی تھی اپنی پچھلی غلطیوں کی معافی چاہی تھی اور عُشر ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن مخالف گروہ خاموش رہا۔ شہزادے نے فوج کشی کا فیصلہ کر لیا۔ نقارے پر چوٹ پڑی اور پھر گاؤں گاؤں میں طبلِ جنگ گونج اُٹھے اور لشکر پھریرے لہراتا، میدان میں نکل آیا۔ مجاہدین کے دو یونٹ، نجف خاں اور بہرام الدّین نُبیری کی کمان میں ہم عناں تھے۔ روانگی سے پیشتر شہزادے نے ننگے سَر پٹکا گلے میں ڈالے، بڑے عجز و نیاز سے بارگاہِ الٰہی میں فتح و نصرت کی دُعا مانگی۔

لشکر روانہ ہُوا اور پھر بادل چھا گئے اور بُوندا باندی ہونے لگی۔ جُوں جُوں آگے

بڑھے، بارش تیز ہوتی گئی۔ ستھانہ کے درے تک پہنچتے پہنچتے بارش تھم گئی، مگر درے میں اتنا پانی تھا کہ لشکر کا گزر ممکن نہ رہا، چنانچہ وہیں بیٹھ کر پانی اُترنے کا انتظار ہونے لگا۔

اتمان زئیوں کو رات ہی خبر مل گئی کہ شہزادہ مُبارک شاہ لشکر لیے بڑھا چلا آتا ہے۔ حامی گروہ استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ استقبالی ڈھول اور شہنائیوں کی آواز درے تک آرہی تھی۔ جونہی پانی اُترا اور لشکر درے میں سے گزر کر کھلے میدان میں آیا، کیا اور کھبّل کے اتمان زئی رنگا رنگ روایتی پوشاکیں پہنے، ڈھول بجاتے، رقص کرتے نکل آئے۔ مخالفین بال بچّے اور سامان لے کر کشتیوں میں بیٹھے اور دریا پار تربیلا چلے گئے جو انگریز کی عمل داری میں تھا۔ شہزادے کے حامی ملکوں نے بتایا انگریزوں کے ایجنٹ رات ہی پہنچ گئے تھے اور انھیں گھر بار چھوڑ کر تربیلا چلے آنے کی ترغیب دینے لگے، لیکن اکثریت نے اُن کے جال میں آنے سے انکار کر دیا اور بہت تھوڑے آدمی فریب میں آئے۔

شہزادے نے ستھانہ پہنچتے ہی عام معافی کا اعلان کر دیا۔ کسی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ اس حسنِ سلوک نے اتمان زئیوں کا دِل موہ لیا۔ اُنھوں نے ستھانہ کی بستی بسانے اور قلعے کی تعمیر میں دِل وجاں سے تعاون کیا۔ قلعے کے تین پہلو اتمان زئی کی تین شاخوں اور چوتھا پہلو نواحی آبادی، برگ کے باشندوں نے تعمیر کیا۔ تعمیر شروع ہوتے ہی مجاہدین کے دستے واپس ملکا آگئے۔ لڑائی کی نوبت نہ آئی تھی، تاہم فیروز خاں پُوری مہم میں پیش پیش رہا۔

○

واپسی پر راستے میں فیروز خاں کو پہلی مرتبہ عجیب و غریب صُورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا۔ سُورج مغربی اُفق سے ہم آغوش تھا اور شفق کی سُرخی پہاڑوں اور ہرے بھرے جنگلوں پر غازہ سا مَل رہی تھی۔ ملکا دو ڈھائی میل دُور رہ گیا تھا۔ حسّاس دِل کے تار اس منظر سے آپ ہی آپ مرتعش ہو جاتے ہیں اور سوز و گداز میں ڈوبا

کوئی گیت فوّارے کی طرح اُبل کر فضا میں بکھرنے لگتا ہے۔ گیت جو کسی حادثے، جنگ یا محبت کی کسی داستان کے پس منظر سے ابھرتا اور تاریخ اور روایت سے رنگ لیتا ہے۔ ہزارہ کے ناصر خاں پر کچھ ایسی ہی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ وہ فیروز خاں کے دوش بدوش سُرخ و سیاہ قبا میں لپٹی ہوئی عروسِ شام کے سحر طراز نظارے میں مستغرق جا رہا تھا۔ چلتے چلتے اُس نے دائیں کان پر ہاتھ رکھا اور ہانک لگائی:

کالے آلتھے کاگان
سیداں چاک کتے قرآن
کالے آلتھے کاگان

سوز و گداز سے معمور دلکش و مترنم آواز فضا میں اُبھری تو یوں محسوس ہوا دِن کی ڈوبتی ہوئی نبضیں سنبھل گئی ہیں۔ مجاہدین جو اپنے خیالات میں کھوئے منزل کی دُھن میں چلے جا رہے تھے، چونک اُٹھے۔ ایک لمحے کے لیے سب کی نظریں گانے والے پر مرکوز ہو گئیں، مگر ناصر خاں ان نگاہوں سے بے نیاز بُلند آہنگی سے گاتا رہا۔

کالے کوڑے راہ تو بھلّے
سچے دین تے جُلّے
کالے . . . .
کالے آلتھے بیچ کسیاں
انہاں سیداں جاگاں وسیاں
کالے آلتھے . . . . . .
کالے کوڑے راہ تو بھلّے
سچے دین تے جُلّے
کالے آلتھے کاگان!

یعنی کالی فوج کے سپاہی کاغان میں اُترے۔ سیدوں نے قرآن پر

حلف اُٹھا کر اُن سے عہد کیا کہ وہ ان کی حفاظت کریں گے۔ وہ مجاہد باطل راستہ چھوڑ کر سچے دین کی راہ اختیار کر چکے تھے۔ کالی فوج کے سپاہی وادیوں میں اتر سے جہاں سے کوئی ان کا سراغ نہ لگا سکتا تھا۔ کاغان کے سیدوں نے ان کی پناہ گاہیں انگریزوں کو بتا دیں۔ کالے غلط راستہ ترک کر کے دین کا سچا راستہ اختیار کر چکے تھے۔

ناصر خاں ہر بند کے بعد "کالے آ لتھے" کی لمبی تان اُڑاتا تو اس کی صدائے بازگشت دیر تک پہاڑوں میں گونجتی رہتی۔ اُس نے جیسے پرانے زخم پھر تازہ کر دیے تھے۔ مجاہدین کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ پچھلے پینتیس چھتیس برسوں میں خود انھیں ایسے کتنے ہی زخم لگ چکے تھے، مگر گیت اُن کی نہیں، سچ کا راستہ اپنانے والے کچھ اور سرفروشوں کی رُودادِ الم سُنا رہا تھا۔

یہ جانباز، ۵۵ پیادہ فوج (نیٹو انفنٹری) کے سپاہی تھے جس کے دستے مردان اور نوشہرہ چھاؤنی میں متعین تھے۔ پشاور میں انہترویں اور دسویں دیسی فوج اور ریگولر رسالہ تھا۔ ان سب میں مجاہدین کے اثرات تھے اور ہر جگہ خُفیہ حلقے وجود میں آ چکے تھے جن کا تحریک کے سرحدی مرکز سے باضابطہ رابطہ قائم تھا۔ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی دیسی افواج میں آزادی کا شعلہ بھڑکا، تو سرحد میں سب سے پہلے نوشہرہ کی رجمنٹ متاثر ہُوئی اور ۲۱ رمئی کو اُس نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ آدھی رات کو یہ خبر پشاور پہنچی، انگریز افسروں نے فوری اقدامات کیے اور صبح ہوتے ہی تمام دیسی افواج سے ہتھیار لے لیے۔ اندیشہ تھا مردان خبر پہنچے گی، تو ۵۵ پیادہ ساری کی ساری باغی ہو جائے گی۔ ۲۳ رمئی کی شب، کرنل چیوٹ کی کمان میں، فوج مردان روانہ ہُوئی۔ وہاں نوشہرہ کی خبر نے پہلے ہی آگ لگا رکھی تھی، جُونہی معلوم ہُوا پشاور سے فوج آ رہی ہے، وہ مقابلے پر تُل گئے۔ گھمسان کی جنگ کے بعد ۵۵ نے شکست کھائی۔ اس کے ایک سو بیس جوان مارے گئے اور ڈیڑھ سو کے قریب زخمی ہو گئے۔ جو بچ رہے اُنھوں نے آزاد علاقے کی راہ لی۔

یہ لوگ سیدھے سوات پہنچے۔ اُن کا خیال تھا وہاں سے کمک لے کر انگریزوں سے

پرورش کریں گے۔ لیکن یہاں تقدیر کا قاضی اپنا فیصلہ صادر کر چکا تھا۔ مجاہدین کے حلیف، سوات کے بادشاہ سیّد اکبر شاہ عین اُس روز انتقال کر گئے جس روز میرٹھ میں آزادی کی جنگ چھڑی۔ ان کے جانشین کا مسئلہ ابھی طے نہ ہو سکا تھا۔ سوات کی سب سے طاقت ور شخصیت اخوند صاحب مُلّا عبدالغفور کی تھی اور ریاست کا انتظام انھی کے ہاتھ میں تھا۔ آزادی کی جدّوجُہد سے اُنھیں کوئی دلچسپی نہ تھی، چنانچہ حُریّت پسندوں کو ریاست کی حدود سے باہر دریائے سندھ کے پار دھکیل دیا گیا۔ یہاں سے اُن لوگوں نے کشمیر کا رُخ کیا۔ گرد و نواح کے زمیندار اور مَلک، ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر میجر بیچر کے بچھائے ہُوئے دامِ حرص و آز میں آ چکے تھے۔ انھوں نے ان غریب الوطنوں کو قدم قدم پر نقصان پہنچایا۔ ان کے پاس کچھ بھی تو نہ تھا۔ فاقہ کشی، بے رحم موسم اور اجنبی سرزمین۔ انگریز کے پِٹھّو سرداروں کے ہاتھوں بہت سے راستے ہی میں ختم ہو گئے اور بچ جانے والے ہولناک مصائب جھیلتے اور صعوبتیں اُٹھاتے کاغان پہنچے۔ یہاں کاغانی سادات نے اُن سے یہ وعدہ کر کے ہتھیار رکھوا لیے کہ وہ حفاظت کریں گے لیکن حلف دے کر پھر گئے اور ان مظلوموں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے اُن کی بھاری تعداد ایک پہاڑی نالے پر بے دردی سے بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کر ڈالی۔ نالے کا نام اُسی وقت سے ”شہید کٹّہ“ پڑ گیا۔ تین سو کے قریب گرفتار ہُوئے اور اُنھیں ہری پور میں گولیوں سے اُڑا دیا گیا۔ کاغانی سادات کی عہد شکنی اور غدّاری سے اُن کے خلاف ہر طرف نفرت کی لہر دَوڑ گئی اور یہ المیّہ داستان، رزمیہ کہانیوں اور لوک گیتوں کے رُوپ میں حجروں، پہاڑوں اور میدانوں میں گونجنے لگی۔

شامِ رنگیں پر رات کے چھاتے ہُوئے ملگجے اندھیرے سے متاثر ہو کر ناصر خان کی زبان پر یہی داستانِ الم آ گئی تھی۔ وہ اس دل گداز تاثر میں کھویا گیت الاپ رہا تھا اور اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ اُس کے ساتھی فیروز خاں پر کیا ردِّ عمل ہُوا ہے اور واقعی یہ ردِّ عمل عجیب تھا ـــــ اُس کا سُرخ و سفید رنگ، پیلا پڑ گیا اور دل بُری طرح سینے میں دھک دھک کرنے لگا۔ وہ چلتے چلتے لڑکھڑا گیا۔ مجاہد عظیم خان آگے بڑھ کر اُسے

سہارا نہ دیتا تو وہ گر پڑتا۔ عظیم خاں پہلے تو یہی سمجھا فیروز خاں نے ٹھوکر کھائی ہے، مگر اُس کے چہرے پر نظر پڑی تو حیران رہ گیا اور اُسے سہارا دیے کھڑا رہا۔ اچانک فضا میں اذان گونجی اَللہُ اکبر اَللہُ اکبر۔۔۔۔۔ رجمنٹ کا مؤذن ایک کھلی مسطح جگہ پر قبلہ رُو کھڑا اہلِ ایمان کو نیکی اور زندگی کی حقیقی فلاح کی طرف بُلا رہا تھا۔۔۔۔۔ ناصر خاں گاتے گاتے یکدم خاموش ہو گیا اور فضا اس غمناک سحر سے آزاد ہو گئی جو ناصر خاں کی آواز نے طاری کر دیا تھا۔ حزنیے کا طلسم ٹوٹتے ہی فیروز خاں سنبھل گیا۔ مجاہدین رُک گئے اَور صفیں باندھ کر اُس ذاتِ واحد کے آگے جُھک گئے جس کی عظمت و کبریائی کا کلمہ بلند کرنے کے لیے انھوں نے اپنا گھر بار اور عیش و آرام تج دیا تھا اور زندگی کی ان تلخیوں کو از خود دعوت دی تھی جس کی لذّتِ شاد کامی صرف اربابِ حق و عزیمت ہی جان سکتے ہیں۔

عِشا کے قریب یہ لوگ ملکا پہنچے۔ فیروز خان ساری رات بے قراری کے عالم میں جاگتا رہا۔ خلافِ معمول تہجّد کے لیے بھی نہ اُٹھا۔ اُس کے دِل میں زبردست کش مکش برپا تھی۔ اُسے باپ نے لکھا تھا: "خاندان کی عزّت اور آن کا معاملہ آن پڑا ہے۔ ملکا جاؤ، وہاں اخوند زادہ عبداللہ رہتا ہے، اس کی مسجد میں جا کر ٹھہرو اور کھوج لگاؤ، اُسے آدمی اور روپیہ کہاں سے مِل رہے ہیں۔ جب تک ساری معلومات حاصل نہ کر لو واپس نہ آؤ۔" وہ انگریز کی سرحدی چوکیوں سے بچتے بچاتے سرحدِ آزاد میں داخل ہُوا تھا۔ یہاں قدم قدم پر مجاہدین اور ان کے ہمدرد و ہم نوا تھے جن کی نگاہیں ہر آنے جانے والے پر رہتی تھیں۔ وہ سارے خطرات انگیز کرتے ہُوئے یہاں پہنچا تھا۔ اُس نے چند روز کے اندر اندر مجاہدین کا اعتماد حاصل کر لیا اور بہت سی اہم معلومات فراہم کر لی تھیں۔ اُس نے ان لوگوں کو اپنے مقصد اور نصبُ العین کا سچا عاشق اور مخلص و بے ریا پایا تھا۔ وہ بڑے سچّے، ایک دوسرے کے غم گُسار اور بہی خواہ، حق پرست، متقی، پاکباز اور تہجّد گزار تھے۔ دِن رات حق کا بول بالا کرنے کی جدّوجہد میں منہمک رہتے۔ وہ ان کی سیرت و کردار اور ذوق و شوق سے

بے حد متاثر ہُوا تھا..... کئی مرتبہ اس خیال سے اُس کا دِل بے چین ہو جاتا اور وہ اپنے آپ سے پُوچھتا: "کیا تم ایسے پاک باز لوگوں کی جاسوسی کرنے آتے ہو جنھوں نے اپنی زندگیاں حق کی راہ میں وقف کردی ہیں ...؟" مگر پھر اگلے ہی لمحے باپ کے الفاظ ذہن میں گونجنے لگتے: "خاندان کی عزت اور آن کا معاملہ آن پڑا ہے" ان الفاظ کی گونج رفتہ رفتہ اس کے دل و دماغ پر چھا جاتی، اس کی سوچیں دم توڑ دیتیں اور اُس کا سلگتا ہُوا ضمیر خاندانی عزت کی برفانی سِل تلے دب کر ٹھنڈا ہو جاتا اور وہ اپنے مشن پر اور زیادہ مضبوطی سے کاربند ہو جاتا۔

یہی کیفیت اس وقت بھی اُس پر طاری تھی۔ خیالات پَرا باندھے اُس پر ہجوم کر رہے تھے۔ وہ اب تک مجاہدین کو جُل دیتے آیا تھا، لیکن اب اُس کی حالت اُس چور کی سی تھی جسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ کئی بار اُس نے ان خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کی جیسے ڈر ہو کہ ابھی کوئی اُس کے ذہن میں جھانک کر انھیں پڑھ لے گا، مگر وہ کنکھجورے کی طرح چمٹے ہُوئے تھے۔ مؤذن کی صدا اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ نے طلوعِ سحر کی خبر دی۔ فیروز خان بستر سے اُٹھا، اُس کا انگ انگ دُکھ رہا تھا اور چہرے سے وہ کئی دِن کا بیمار نظر آتا تھا۔

اُس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور خاصا کامیاب بھی رہا مگر سہ پہر ایک اور حادثہ پیش آیا۔ بارکوں میں یہ خبر آناً فاناً پھیل گئی کہ ہندوستان سے مجاہدین کی ایک چھوٹی سی جماعت صحیح سلامت آپہنچی ہے۔ لوگ مسجد کی طرف دوڑے جہاں یہ جماعت اُتری تھی۔ ہر شخص اپنے گھر والوں کی خیر و عافیت معلوم کرنے کا مشتاق تھا۔ ذوقِ تجسس، فیروز خاں کو بھی کھینچ لے گیا۔ قافلے میں مجاہد اشرف الدین بھی تھا جسے تین رضا کاروں کے ساتھ گزشتہ مارچ میں ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ وہ ایک ایک رفیق سے گلے مِلا۔ اچانک اُس نے فیروز خان کو دیکھا اور ٹھٹک کر رہ گیا۔ نوجوان کے خدوخال ہُوبہو، پانی پت کے اس سارجنٹ سے ملتے تھے جس نے اُسے تینوں ساتھیوں سمیت دھوکا دے کر پکڑ لیا تھا۔ اسی کی طرح لمبا تڑنگا، بلی کی سی آنکھیں،

عقابی ناک، چہرے کی اُبھری ہڈیاں۔ فرق تھا تو صرف عُمر کا۔ اشرف الدین ٹکٹکی باندھے فیروز خان کو دیر تک گھورتا رہا۔ فیروز خان بھی اُسے یُوں گھورتے دیکھ کر گھبرا گیا اور جب اشرف الدین ایک اور ساتھی سے بغل گیر ہُوا، تو وہ موقع پا کر مجمع سے کھسک گیا۔

مِلتے مِلاتے شام ہو گئی۔ مغرب کی نماز پڑھ کر اشرف الدین مسجد سے نکلا تو اس نوجوان کا چہرہ دوبارہ نگاہوں میں پھر گیا۔

اور پھر اُس نے تصوّر ہی تصوّر میں سارجنٹ عزن خان کو اپنے سامنے کھڑے دیکھا۔ دونوں کے چہرے مُہرے میں ذرا بھی تو فرق نہ تھا۔ اشرف الدین اپنی بارک میں پہنچا تو ساتھیوں کے ساتھ بات چیت میں لگ گیا۔ لیکن اُس کا دھیان اُس نوجوان ہی میں بٹا رہا۔ سونے کے لیے لیٹا، تو بھی اُسی کا خیال ذہن پر مسلّط تھا طرح طرح کے سوال اُس کے دِل میں اُٹھتے۔ کہیں یہ نوجوان اُس مکّار کا بیٹا تو نہیں؟ ممکن ہے یہ شباہت محض اتّفاق ہو، آخر دُنیا میں بہت سے لوگ ہم شکل بھی تو ہوتے ہیں نہیں، دال میں کچھ نہ کچھ ضرور کالا ہے ....." اُس کے دِل نے جیسے گواہی دی اور اُس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ صبح سویرے چھان بین کرے گا یہ شخص کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے اور کب آیا ہے؟

لیکن صُبح جب وہ دیسی یُونٹ کی بارک میں پہنچا، تو فیروز خان غائب تھا۔

ملکا کی آخری ہچکی

انگریز، مجاہدین کو ہمیشہ کے لیے کُچل دینے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ ان کا وجود، برطانوی حکومت کے لیے ایسے خنجر کی طرح تھا جس کی نوک کسی شخص کے پہلو پر رکھی ہو اور ہاتھ کی ایک پُر زور جُنبش اُسے چیر کر رکھ دے۔ پچھلے سال بھر سے وہ محسوس کر رہے تھے کہ مجاہدین، خطرناک قوّت بنتے جا رہے ہیں۔ ایک انگریز افسر کے بقول جس طرح سیّد احمدؒ کے پشاور پر قبضہ کرنے سے پنجاب خطرے میں پڑ گیا تھا وہی کیفیت اب پیدا ہو چکی تھی۔ ستھانہ میں قلعہ تعمیر ہُوا، تو گویا انگریز ...

منصُوبے پر عمل کرنے کا بہانہ ہاتھ آگیا، حالانکہ وہ خود تسلیم کرتے تھے کہ ستھانہ انگریزی علاقے میں نہیں آزاد علاقے میں ہے۔ شہزادہ مُبارک کے عمّ زاد بھائی شہزادہ محمود شاہ نے باپ (سیّد عُمر شاہ) کے مرنے کے بعد انگریز کی نوکری کر لی تھی جنگِ آزادی کے زمانے میں انھوں نے درخواست کی کہ اُن کا آبائی علاقہ ستھانہ انھیں واپس دے دیا جائے، مگر گورنر نے یہ درخواست اس بنیاد پر مسترد کر دی کہ ستھانہ، انگریزی سلطنت سے باہر ہے اور جو چیز حکومت کی ملکیت نہیں وہ کسی شخص کو کیسے دی جاسکتی ہے؟ اپریل ۱۸۶۳ء میں شہزادے نے پھر عرض گزاری کہ انگریز بے شک اُس کی مدد نہ کریں، اُسے خود ستھانہ پر قبضہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ جواب ملا اس سے کہہ دو اس قسم کی بات نہیں سُنی جائے گی۔ لیکن جب دونوں عمّ زاد بھائیوں نے مل کر ستھانہ پر قبضہ کر لیا، تو پشاور سے دہلی تک ہل چل مچ گئی۔ ادھر سے اُدھر ڈاک دوڑنے لگی، کمانڈر انچیف سر ہیوروز کو اعتماد میں لیے بغیر پنجاب کے گورنر سر رابرٹ منٹگمری اور گورنر جنرل لارڈ ایلگن نے بطورِ خود حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ کسی کو خیال نہ آیا کہ ستھانہ پر سادات کا قبضہ، آزاد علاقے کے قبائلیوں کا اپنا معاملہ ہے اور اس میں مداخلت کا کوئی اخلاقی جواز ہے نہ قانونی۔ فیصلہ کرنے کے بعد سر ہیوروز کو مطلع کیا۔ اُس نے فوجی نقطۂ نظر سے اس فیصلے سے اختلاف کیا، مگر سُنی اَن سُنی کر دی گئی۔ چھاؤنیوں میں احکام پہنچ گئے۔ اکتوبر کے اوائل میں سات ہزار انگریزی افواج مع توپ خانے کے تربیلا سے دربند تک دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ کیل کانٹے سے لیس کھڑی تھیں۔ مہم کی کمان جنرل چیمبرلین کر رہا تھا۔

○

انگریزی افواج کے اجتماع سے بظاہر معلوم ہوتا تھا اُن کا ہدف ستھانہ ہے، مگر دراصل وہ ملکا پر آخری بار ضربِ کاری لگانا چاہتے تھے۔ فوجی منصوبے کے مطابق اُنھیں جدونوں کے علاقے کی طرف سے ملکا پر پیش قدمی کرنا تھی۔ اُن کا خیال تھا جدون گزرنے کی اجازت دے دیں گے۔ آگے امازئیوں کا پرگنہ تھا جس کا خان والیٔ امب دست نگر [illegible] کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ جدونوں کی دونوں شاخوں (اسالا جدون [illegible]

اور منصور جدون) کے خوانین اور مَلک طلب کیے گئے، لیکن اُنھوں نے راستہ دینے سے انکار کر دیا اور صاف صاف کہہ دیا: ہم مُسلمان ہیں اور اپنے مُسلمان بھائیوں، خصوصاً آلِ رسولؐ کے گھرانے کی بربادی میں تمھارا ہاتھ نہیں بٹا سکتے، کوئی اور راستہ تلاش کرو، ہمارے علاقے کا رُخ کیا تو ہماری بندوقیں تمھارا خیر مقدم کریں گی۔

جنرل چیمبرلین غضب ناک ہو گیا۔ خوانین رُخصت ہو گئے تو افواج کو حکم دیا کہ کُوچ کے لیے تیار ہو جائیں اور جدون مزاحمت کریں تو ان کے دیہات توپوں سے آگ برسا کر راکھ کر دیں۔ بگل بجنے لگے۔ کیمپ میں ہلچل مچ گئی، اور پھر کُوچ کا بگل بجا۔ فوج کا ہراول حرکت میں آ گیا۔ لیکن یہ ایک مجنونانہ اقدام تھا۔ بگل بجنے کی آوازیں سارے پہاڑی علاقوں میں گونج گئی تھیں۔ جدون سرداروں نے جاتے ہی اپنے قبیلوں کو ہشیار کر دیا تھا اور وہ مرنے مارنے پر تُلے بیٹھے تھے۔ جدون علاقہ تیس پینتیس میل تک پھیلا ہُوا تھا اور سارے کا سارا راستہ چڑھائی کا تھا۔ اس راستے سے قبائلی غیرت کو چیلنج دے کر لڑتے بھڑتے گزرنا کوئی مذاق نہ تھا۔ جدون کو نبرد آزمائی پر آمادہ دیکھ کر جنرل کے حواس ٹھکانے آ گئے۔ اس نے حرکت میں آئی ہُوئی افواج کو واپسی کا حکم دے دیا۔

قبائلیوں کو ہموار کرنے کا کام پشاور کے کمشنر سر رینل ٹیلر کو سونپا گیا تھا۔ یہاں سے کورا جواب ملا تو اُس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بدل دیا اور خدو خیل پرگنے کے راستے چنگلئی، کن گلئی اور کوتل اشرف گنڈو ہوتے ہُوتے ملکا پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ خدو خیل میں سڑک تعمیر ہونے لگی۔ چنگلئی میں غلّے اور اسلحے کے گودام بھی بن گئے۔ مجاہدین نے گوریلا سرگرمیاں شروع کر دیں۔ جتنی سڑک بن جاتی، موقع ملتے ہی اُسے تباہ کر دیتے۔ ایک رات وہ چنگلئی کے انگریزی کیمپ پر بھی چڑھ دوڑے، کیمپ میں تباہی مچا دی اور گودام لُوٹ لیے۔ ادھر خدو خیل میں پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ تم انگریز کی رعایا تو ہو نہیں، پھر اُنھیں اپنی زمین میں کیمپ بنانے کی چھُوٹ کیوں دے رکھی ہے؟ ان سرگرمیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ٹیلر کو یہ دوسرا راستہ بھی ترک کرنا پڑا۔

اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور وہ وادیٔ چملہ سے جاتا تھا۔ وادیٔ چملہ کے لوگوں کو ستمہ کے خوانین نے انگریزوں کے شیشے میں اتارا۔ آگے بونیر تھا۔ انگریزوں نے سدم کے رئیس عجب خاں سے ساز باز کی جو کامیاب رہی۔ اُس کے بھائی کی بونیر کے مَلکوں سے رشتہ داری تھی۔ اس ناطے سے عجب خاں نے انھیں یہ کہہ کر ہموار کر لیا کہ انگریز صرف ملکا تباہ کرنا چاہتے ہیں، تمھاری آزادی پر کوئی آنچ نہ آئے گی، پیسے لو اور چُپ چاپ بیٹھے تماشائے فلک دیکھو۔ تیرہ ہزار روپے پر سودا ہوگیا۔

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

اِدھر ٹیلرا اور اُس کے گماشتے، ضمیر و ایمان کا سودا کرنے میں مصروف تھے، اُدھر امیر المجاہدین مولانا عبداللہ نے سادات ستھانہ کے سرخیل سید عمران شاہ، شہزادہ مُبارک اور جماعت کے اہلِ الرائے پر مشتمل مجلسِ شوریٰ طلب کر لی تھی۔ اس زمانے میں ملکا میں مجاہدین پندرہ سولہ سو سے زیادہ نہ تھے اور وہ بھی نیم مسلح۔ زیادہ تر تلواروں، کلہاڑیوں، نیزوں اور گنڈاسوں پر انحصار کرتے۔ بندوقیں بہت کم لوگوں کے پاس تھیں اور وہ بھی توڑے دار چقماقی بندوقیں۔ دوسری جانب دشمن وقت کے جدید ترین ہتھیاروں، رائفلوں اور توپوں سے مسلح تھا۔ اجلاس میں صُورتِ حال کا مفصّل جائزہ لینے کے بعد دو اہم فیصلے کیے گئے۔ اوّل یہ کہ امیر المجاہدین اور سید عمران شاہ کے دستخطوں سے اعلانِ جہاد جاری کیا جائے اور گرد و نواح کے تمام مَلکوں، خوانین اور علما کے نام بھیج دیا جائے۔ دوم فوری دفاعی اقدامات کیے جائیں۔ ستمہ کی طرف سے آنے والے تمام راستے ناقابلِ گزر بنا دیے جائیں تاکہ کوئی قبیلہ انگریزوں کے ساتھ جا بھی ملے تو انگریزی افواج ملکا تک آسانی سے نہ پہنچ سکیں۔ انھیں قدم قدم پر شدید مزاحمتوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے۔

فیصلے پر فوراً عملدرآمد شروع ہوگیا۔ پرانے درخت کاٹ کاٹ کر راستوں میں ڈالے جا رہے تھے، جگہ جگہ گہری خندقیں کھودی جا رہی تھیں، جہاں پہلے ہی گڑھے تھے انھیں خار و خس سے ڈھانپا جا رہا تھا، پہاڑیوں کے اُوپر درختوں اور جھاڑیوں

کی اوٹ میں مورچے بنائے جا رہے تھے جہاں مجاہدین گھات میں بیٹھ کر انگریزی افواج پر حملے کر سکیں۔ دوسری طرف اعلانِ جہاد تمام قبائل میں پھیل گیا تھا۔ منبر و محراب پر اس کا ذکر تھا، حجروں میں اس کا چرچا۔ ڈھنڈورچی اُسے گاؤں گاؤں عام لوگوں تک پہنچا رہے تھے۔ عجیب جوش انگیز سماں تھا۔ انگریزوں نے تو بڑے بڑے خوانین سے ساز باز کر کے مجاہدین کو مقامی آبادی سے بالکل کاٹ دینے کا منصوبہ بنایا تھا، یہاں معاملہ ہی اُلٹ گیا۔ منادی زور زور سے ڈونڈی پیٹتا اور پکارتا:

"کفار کی فوج، مسلمانوں کے ملک میں قتل و غارت کا بازار گرم کرنے آ پہنچی ہے اسلام آپ کو پکار رہا ہے۔ کمرِ ہمت باندھیے اور چملہ پہنچ جائیے۔ مجاہدین درے کی چوٹی پر قدم جمائے بیٹھے ہیں، آپ سرپٹی اور (چینگلئی) پر اپنے مورچے جمالیجیے۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ دیر نہ کیجیے، ورنہ بدقماش کفار سارا کوہستانی علاقہ پامال کر ڈالیں گے اور اُسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیں گے۔ کفارِ ناہنجار بڑے عیار اور دغا باز ہیں۔ وہ کہیں گے ہمیں تم سے کوئی سروکار نہیں، ہمارا جھگڑا ان ہندوستانیوں سے ہے، ہم ان کا قلع قمع کر کے چلے جائیں گے اور تمہارے ملکی معاملات میں دخل نہ دیں گے۔ وہ روپے کا لالچ بھی دیں گے۔ ان کے فریب میں نہ آئیے۔ دشمن ایک بار قدم جما لیتا ہے، تو پھر اسے نکالنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسلام اور ایمان کی پکار پر لبیک کہیے، بلاتاخیر اُٹھ کھڑے ہوئیے، ورنہ پھر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

نقارے کی بلند آہنگ چوٹ کے ساتھ ساتھ منادی کی پرجوش پکار پھیلتی چلی جاتی۔ جہاں بھی یہ آواز پہنچتی آگ سی لگ جاتی۔ ہر خطے سے لوگ ہتھیار سجائے فوج در فوج محاذِ جنگ پر پہنچنے لگے۔ انگریزوں نے سارا منصوبہ خفیہ رکھا تھا۔ چملہ اور بونیر کے خوانین کے ایمان و ضمیر کا سودا بھی انھوں نے چھپے پردوں میں کیا۔ اُن کا خیال تھا وہ وادئ چملہ سے گزر کر اہلِ بونیر کے سر پر اچانک جا پہنچیں گے اور پھر بونیری خوانین اپنے اپنے ہم قوموں کو یہ کہہ کر رام کر لیں گے کہ انگریز صرف ہندوستانیوں کا استیصال کرنے آئے ہیں، وہ تمہارے مال و جان اور املاک سے کوئی تعرض نہیں کریں گے۔ اہلِ بونیر اتنے سے

مختصر نوٹس پر اگر لڑنا بھی چاہیں گے تو کچھ نہ کر سکیں گے، لیکن مجاہدین اور ساداتِ ستھانہ کی بصیرت اور فوری اقدامات نے ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ وہ نئی صورتِ حال سے سٹپٹا کر رہ گئے۔ خوانین کا تو یہ حال تھا کہ انھیں اپنے ہم قوموں کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہ رہا۔ وہ انگریزوں سے اب بھی ملتے اور مشوروں میں شریک ہوتے، مگر اس طرح چھپ چھپا کر کہ کسی پر ان کا بھید نہ کھلے۔

○

۱۶ اکتوبر کی رات تھی۔ جنرل چیمبرلین اور سر رنیل ٹیلر، صوابی کیمپ میں بڑی بے چینی سے بیٹھے خوانین کا انتظار کر رہے تھے۔ جنرل کے سامنے، جنگی نقشہ پھیلا ہوا تھا جس پر لالٹین کی مدھم روشنی پڑ رہی تھی۔ وہ پریشانی کے عالم میں بار بار نقشے پر نظر دوڑاتا ٹیلر کی نگاہیں خیمے کے دروازے پر مسلسل گڑی تھیں اور بے قراری میں بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ پھر خیمے کا پردہ اٹھا، اردلی نے اندر داخل ہو کر سیلوٹ کیا اور خبر دی "عجب خاں اور اس کے ساتھی آ گئے ہیں"۔ جنرل چیمبرلین غیر شعوری طور پر اچھل پڑا۔ "انھیں لے آؤ"۔ اس نے حکم دیا۔ چند لمحے بعد تین قد آور تنومند پٹھان خیمے میں داخل ہوئے۔ سر رنیل ٹیلر اور جنرل دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ باری باری ہاتھ ملائے اور پھر سب خیمے میں بچھے ہوئے فرش پر بیٹھ گئے اور باتیں شروع ہوئیں۔

جنرل: "خان صاحبان! یوسف زئیوں، بونیر وال اور گرد و پیش کے دوسرے قبائل کے نام اعلان تیار ہو چکا ہے۔ مختصر سا ہے۔ یہ کہ ہم کسی قبیلے کو نقصان پہنچانے کا ارادہ نہیں رکھتے، صرف ہندوستانیوں کے مرکز تک پہنچنا چاہتے ہیں، سیدھا راستہ وادیٔ چملہ اور بونیر سے گزرتا ہے۔ اس لیے ہمیں امید ہے کہ آپ لوگ مزاحم نہ ہوں گے۔ ہماری لڑائی صرف ہندوستانیوں سے ہے۔ اب یہ آپ خوانین کا کام ہے کہ ۱۸ کی شام تک یہ اعلان تمام علاقوں میں پہنچ جائے"

عجب خاں: "ہم پوری کوشش کریں گے اور امید ہے مقامی آبادی رکاوٹ نہیں بنے گی"

ٹیلر: "مگر خان! پہاڑوں میں نقارے بجنے کی بہیم آوازیں آرہی ہیں ہمیں پرچہ ملا ہے مجاہدین نے کوئی اعلانِ جہاد کیا ہے اور اس اعلان کی گاؤں گاؤں، ڈونڈی پیٹی جارہی ہے اور جنگی نقارے بج گئے ہیں۔"

بگڑہ کے رئیس، احمد خان نے اپنی جیب میں سے ایک میلا سا مڑا تڑا ہُوا کاغذ نکالا اور ٹیلر کو دیتے ہُوئے کہا: "ہاں صاحب! یہ اعلانِ جہاد اخوند زادہ (امیر المجاہدین عبداللہ) اور سید عمران شاہ نے مجھے بھیجا ہے۔ ایسی دعوت دوسرے خوانین اور رئیسوں کو بھی ملی ہے، مگر ہمیں یقین ہے اس کا کچھ زیادہ اثر نہ ہوگا۔ جب قبائل کو پتہ چلے گا، انگریز اُن پر چڑھائی نہیں کر رہے نہ ان کے علاقے میں کسی قسم کی کوئی مداخلت مقصود ہے، تو جنگی نقاروں کی یہ آوازیں استقبالیہ شادیانوں میں بدل جائیں گی۔"

زید اللہ خان: "صاحب لوگ فکر نہ کریں۔ ہم اپنے قومی مزاج کے شناسا ہیں۔ یہ نقارے اور جوش و خروش محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جونہی ہمارے لوگوں پر انگریزی افواج کا مقصدِ یلغار واضح ہوگا، وہ اخوند زادہ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ ہم پختون صرف انہی لوگوں سے لڑتے ہیں جو ہمارے مال و جان، عزت و آبرو اور مذہب پر حملہ کرتے ہیں۔ آپ کو جب ہمارے معاملات سے کوئی سروکار نہیں، تو لوگوں کا سر نہیں پھرا کہ خواہ مخواہ آپ سے ٹکرائیں گے۔ بس ایک دفعہ انھیں یقین ہو جاتے ......"

ٹیلر: "ہاں اب یہ آپ صاحبان کا کام ہے کہ اپنے لوگوں کو باور کرائیں۔ میرے خیال میں بہتر ہوگا ہر گاؤں اور بستی میں جرگے بلائے جائیں اور انھیں اپنے اعتماد میں لیا جائے۔"

عجب خاں: "ہم یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکے ہیں۔ آپ مطمئن رہیے۔ اونٹ آپ کے حق میں بیٹھے گا۔"

ٹیلر: "ایک بات ذہن میں رہے، ہمارا "اعلانِ مقاصد" ۱۸ اکتوبر کی شام کو تمام علاقوں میں پہنچ جاتے، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔"

پھر وہ نقشے پر جھک گئے اور حملے کے راستے اور یلغار کی تفصیلات پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنے لگے کہ انگریزی افواج کو کہاں کہاں مقامی لشکروں کی مدد درکار ہوگی اور مجاہدین کے حملے کا امکان کس کس مقام پر ہے۔ تینوں خان واپسی کے لیے خیمے سے نکلے، تو آدھی رات ہو چکی تھی۔

○

۱۸ اکتوبر کو جنرل چیمبرلین نے اپنی افواج کو کوچ کا حکم دے دیا۔ سب سے پہلے ہراول دستوں نے حرکت کی جو نواکلئی میں خیمہ زن تھے۔ پھر صوابی بیس کیمپ کی فوج خود جنرل کی کمان میں روانہ ہوئی۔ جنرل نے پہلے درہ دربند کا رخ کیا لیکن تھوڑی دور جا کر رخ بدلا اور پرمولٹی کی طرف ہولیا۔ نواکلئی کے ہراول دستے بھی پرمولٹی پہنچ گئے تھے؛ چنانچہ درے میں پیش قدمی شروع ہو گئی۔ کل فوج پانچ ہزار ایک سو پیادہ سپاہیوں، دو سو سواروں اور دو سو اسی توپ خانے پر مشتمل تھی۔ ایک ہزار کا لشکر کمشنر ٹیلر کے ماتحت تھا اور اس کے ساتھ تیرہ توپیں تھیں۔ مقامی خوانین کے بے شمار دستے ان کے علاوہ تھے۔ مزید یہ کہ دربند، تربیلا، ٹوپی، ایبٹ آباد، رستم اور مردان وغیرہ میں بھی فوج چاق چوبند کھڑی تھی اور ضرورت پڑنے پر فوراً بھیجی جا سکتی تھی۔

منصوبے کے مطابق کرنل وائلڈ کے ذمے چملہ پہنچ کر راستے کی دیکھ بھال کا انتظام کرنا تھا تاکہ فوج کسی تاخیر اور خرخشے کے بغیر آگے بڑھ سکے۔ لیکن حالات، خلافِ توقع اتنی تیزی سے بدل گئے کہ سارے منصوبے پر پانی پھرتا نظر آیا۔ ۲۰ اکتوبر کی آدھی رات تک تو بار برداری کا ایک جانور بھی نہ مل سکا۔ پھر انگریزی فوج ساری رات کوچ کرتی ہوئی چودہ پندرہ میل چوڑی سرسبز و شاداب وادی میں سے بلا مزاحمت گزر کر درہ امبیلا میں داخل ہوئی۔ تو بونیری سرپٹی پہاڑ پر درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے جا بجا مورچے قائم کر چکے تھے۔ جیسے ہی فوج آگے بڑھی، انھوں نے آتش باری شروع کر دی۔ اس دوران میں مزید بونیری قبائل اور مجاہدین گڑھ پہاڑ پر جمع ہونے

لگے اور خطرہ پیدا ہو گیا کہ اگر پیش قدمی جاری رکھی تو وہ واپسی کا راستہ کاٹ دیں گے۔ انگریزوں کو مجبوراً درے ہی میں پڑاؤ ڈالنا پڑا۔ کچھ دستے میل دو میل آگے بڑھ گئے تھے۔ ان کی شامت آگئی۔ سخت نقصان اُٹھانے کے بعد آدھی رات کو کہیں واپس کیمپ تک پہنچ سکے۔

۲۱؍ اکتوبر کا سُورج جنرل چیمبرلین کے لیے پریشان کُن خبریں لے کر آیا۔ جن قبائل پر انگریزوں کو پُورا اعتماد تھا اور ان کے سرداروں نے یقین دلایا تھا کہ وہ اس مہم میں اُن کا ساتھ دیں گے، وہ تذبذب کا شکار ہو چکے تھے۔ مجاہدین نے پراپیگنڈے کے محاذ پر جو اسٹرٹیجی تیار کی تھی وہ کامیاب رہی تھی۔ قبائل میں ہر طرف انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی اور قبائلی روایات کے مطابق گاؤں گاؤں میں طبلِ جنگ بج رہا تھا اور قبائلی جوان، انگریزوں سے جہاد کرنے کے نشے میں سرشار مجاہدین کے دوش بدوش آ کھڑے ہوئے تھے۔ امبیلا کی گھاٹی میں خیمہ زن انگریزی افواج پر ان کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ادھر پنجاب اور دہلی میں اعلیٰ انگریز حکام محاذِ جنگ کی خبروں کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے جو منصوبہ تیار کیا تھا اُس کے مطابق انگریزی فوجوں کو اب تک وادیٔ چملہ سے گزر جانا چاہیے تھا، لیکن ۲۲؍ اکتوبر کی دوپہر تک انھیں کچھ خبر نہ تھی کہ محاذ پر کیا ہو رہا ہے۔ شام کے قریب انھیں جنرل چیمبرلین کا تار ملا۔ اُس نے خبر دی تھی: "فوج رُکنے پر مجبور ہو گئی ہے" ____ لاہور اور دہلی دونوں جگہ پریشانی اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔

اسی روز جنرل چیمبرلین نے چملہ اور بونیر کے خوانین کا اجلاس پھر طلب کیا۔ نئی صُورتِ حال پر دیر تک غور و خوض ہوتا رہا۔ خوانین نے تسلیم کیا کہ وہ اپنے لوگوں کو مجاہدین کی حمایت سے باز رکھنے میں ناکام رہے ہیں۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کیا کیا جائے؟ عصیم خاں عاشہ زئی، احمد خان نسوزئی اور زید اللہ خان نے رائے دی کہ وادیٔ چملہ کا درمیانی راستہ چھوڑ کر کوگا سے گزرنے والی راہ اختیار کی جائے۔ انھوں نے تفصیل سے بتایا یہ راستہ پہاڑوں کے بیچوں بیچ ملکا جاتا ہے۔ جنرل چیمبرلین نے

علاقے کے نقشے کا گہرا مطالعہ کیا اور چیخ اُٹھا: "اس راستے سے پیش قدمی ناممکن ہے خان صاحبان! تم ہمیں ایسا مشورہ دے رہے ہو جس سے ہماری پوری فوج تباہ ہو کر رہ جائے۔"

تینوں خوانین نے اسے اپنی نیّت پر حملہ سمجھا۔ اُن کا مُنہ، مارے غُصّے کے سُرخ ہو گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا وہ جنرل کے اس وار کو پی جانے کی کوشش کر رہے ہوں، مگر ٹوپی کے رئیس افضل خان اتمان زئی سے نہ رہا گیا۔ اس نے کھرے لہجے میں کہہ دیا: "جنرل! دو راستے ہیں۔ ایک درے کا، ہمّت ہے تو اسے عبور کر لو۔ دوسرا کوگا کا۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں۔ آخر تم اتنی بڑی سلطنت کے مالک ہونے کے باوجود بے سروساماں ہندوستانیوں اور غریب مقامی کاشت کاروں کے پیچھے پہاڑوں میں کیوں دوڑتے پھرتے ہو؟ انھیں برباد کر بھی لیا، تو کون سی نیک نامی پا لوگے؟ اور اگر شکست سے دوچار ہو گئے تو دُنیا میں تمھاری عزّت کوڑی کی رہ جائے گی؟"

جنرل چیمبرلین اور ٹیلر پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔

○

۲۲ر اکتوبر کو قبائل نے کھلم کھلا اعلانِ جنگ کر دیا۔ پہلے بونیری قبائل میدان میں آئے، پھر باجوڑ قبائل نکلے اور ان کے بعد سوات کے اخوند عبدالغفور اپنے عقیدت مند قبائل کے ساتھ مجاہدین سے آ ملے۔

سانپ کے مُنہ میں چھچھوندر، نگلے تو اندھا اُگلے تو کوڑھی۔ یہی حالت انگریزوں کی تھی۔ اگر فوج کو واپس بلاتے تو ہوا اکھڑتی تھی اور پیش قدمی کرتے تو تباہی کا سامنا تھا۔ انگریزی فوج ایک گہری گھاٹی میں تھی جس کے دونوں جانب اُونچے پہاڑ کھڑے تھے۔ انگریزوں نے کیمپ کی حفاظت کے لیے ان پہاڑوں پر دائیں بائیں کئی مورچے بنا لیے جن کے اوپر بونیری رات دن منڈلاتے اور حملے کر کے تباہی مچاتے پھر رہے تھے۔ جُوں ہی وہ شب خُون مارتے، انگریزی توپیں آگ اُگلنے لگتیں۔ جنگل کے تاریک منظر میں پہاڑوں پر دائیں بائیں جلتی ہُوئی آگ ستاروں کی

طرح روشن نظر آتی۔ نیچے وادی میں دُور تک پھیلی ہُوئی انگریزی فوج ایک دھندلی سی لکیر دکھائی دیتی۔ پھر خود ایک انگریز افسر کے اپنے الفاظ میں "اللہ اللہ کے خوفناک نعروں سے وادی اور پہاڑ گونج اُٹھتے" دِلوں میں دہشت اور اضطراب رینگنے لگتے۔ نعرے ابھی فضا میں تحلیل بھی نہ ہو پاتے کہ درختوں کے پیچھے سے گولیاں برسنے لگتیں۔ انگریزی سپاہی جواب میں فائر کرتے، مگر مجاہدین بلندی پر ہونے کی وجہ سے محفوظ رہتے جب کہ ان کی گولیاں انگریزی صفوں میں تباہی مچا دیتیں۔ ابھی وہ گولیوں کی بارش سے سنبھل نہ چکتے کہ مجاہدین درختوں میں سے نکل آتے اور دَوڑتے ہُوئے انگریز سپاہیوں پر ٹوٹ پڑتے۔ تلواروں کی غچا غچ اور بندوقوں کی کھڑکھڑاہٹ سے فریقین کی جانب سے اُٹھنے والی آوازیں اور مہیب ہو جاتیں۔ انگریز سپاہی سنبھل کر بندوقوں کی باڑھ مارتے، لیکن اس عرصے میں مجاہدین اپنا کام کر چکے ہوتے، چنانچہ وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتے۔ میدانِ جنگ کی ہنگامہ خیزی آہستہ آہستہ دم توڑ دیتی۔ بس زخمیوں کی پانی پانی کی مدھم سی آوازیں گاہے گاہے اُٹھتی ہُوئی سنائی دیتیں اور پھر خاموشی چھا جاتی۔

انگریزی سپاہی ابھی اطمینان کا سانس بھی نہ لے پاتے کہ دوسرے پہلو سے پہاڑوں کی ڈھلوان سے لڑھکتے ہُوئے پتھر پھر سے مجاہدین کی آمد آمد کا اعلان کر دیتے۔ رات کی تاریکی میں ایک بار پھر مشعلیں روشنی پھیلاتیں اور رائفلیں چلنے لگتیں۔ وادی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہنگامۂ جنگ پھر مچ جاتا جسے پہاڑوں کی صدائے بازگشت اور زیادہ بھیانک اور خوفناک بنا دیتی اور پھر آتش و آہن کا تبادلہ ہونے لگتا۔ گھمسان کی جنگ کے بعد مجاہدین اپنے زخمی اٹھائے اتنی ہی تیزی سے واپس ہو جاتے جس تیزی سے حملہ آور ہوتے۔ پہاڑی ڈھلوانوں سے پتھروں کے لڑھکنے کی آواز دُور سے دُور تر ہوتی چلی جاتی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ مطلع صاف ہو چلا ہے، لیکن کتنی مُدّت کے لیے؟ اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ ہوتا۔

یہ روزمرہ کا معمول ہو چکا تھا۔ مجاہدین ان مورچوں کو توڑنے کی سرتوڑ جدوجہد کر رہے تھے جو انگریزوں نے وادیٔ چملہ کے دائیں بائیں، پہاڑوں پر جما رکھے تھے۔ دو مورچے "کریگ پکٹ" اور "ایگل نیسٹ" تو چار بار انگریزوں کے ہاتھ سے نکلے اور ہر بار سخت نقصان اُٹھانے کے بعد ان پر دوبارہ قبضہ کیا جا سکا۔ قبائلیوں کی بے پناہ یورش اور مجاہدین کے پے دَر پے حملوں سے انگریزی افواج کی سلامتی سخت خطرے میں تھی۔ جنرل چیمبرلین مزید کمک کے لیے تار پر تار دے رہا تھا اور پنجاب اور سرحد کی چھاؤنیوں سے دِن رات فوجیں بھیجی جا رہی تھیں۔ ۴ر نومبر کو یہ کیفیت تھی کہ پنجاب کی فوجی چوکیاں سب کی سب خالی ہو چکی تھیں اور حکومت پنجاب والیٔ سرائے کی حفاظتی فوج کے ایک حصّے کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ یہی نہیں ملٹری پولیس کا بڑا حصّہ بھی سرحد روانہ کر دیا گیا تھا۔ آمد و رفت کا سلسلہ خطرے میں پڑ گیا تھا اور ملٹری پولیس کو اس کی حفاظت کا کام سونپا جا رہا تھا۔

اس صُورتِ حال سے پنجاب گورنمنٹ کے ہاتھ پَیر پھُول گئے تھے۔ ۸ر نومبر کو اُس نے سخت اضطراب کے عالم میں جنرل چیمبرلین کو تار بھیجا: "جنرل! اگر تمھیں سولہ سو پیادہ فوج بھیج دی جائے تو پیش قدمی کر سکو گے؟" جنرل حالات کے نرغے میں اس بُری طرح پھنس چُکا تھا کہ وہ ۱۲ نومبر کو جواب دے سکا: "پیش قدمی کی صِرف ایک صُورت ہے۔ ہمیں دو ہزار پیادہ فوج اور کچُھ توپیں مہیا کی جائیں، لیکن ملکا پر کامیاب حملہ اسی وقت ممکن ہے جب راہ میں آنے والے قبائل کے ساتھ صلح صفائی ہو جائے۔"

انگریزی فوج کی حالت روز بروز زبوں تر ہوتی جاتی تھی۔ فوج پر فوج بھیجی جا رہی تھی، حتیٰ کہ وَسط نومبر تک پنجاب کی چھاؤنیاں خالی ہو چُکی تھیں اور میاں میر کے کمانڈنگ آفیسر کو گورنر کے لیے ۲۴ سپاہیوں کی گارد کا انتظام کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ مہم مکمل کرنے کی آخری تاریخ ۱۵ر نومبر مقرّر کی گئی تھی، مگر یہاں ۱۴ر نومبر تک یہ حال تھا کہ فوج درّے میں گیارہ بارہ میل کے ٹکڑے میں پھنسی ہُوئی تھی اور

آگے بڑھنے کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ مجاہدین، مقامی قبائلیوں کے پُرجوش تعاون سے انگریز فوج پر تابڑ توڑ ضربیں لگا رہے تھے۔ مقامی نوجوان جُرأت و شجاعت کی حیران کُن مثالیں پیش کر رہے تھے۔ ستر ستر، اسّی اسّی جوان پورے راستے کو بلاک کر کے رکھ دیتے، شعلے اگلتی ہوئی توپوں پر ٹوٹ پڑتے اور توپچیوں کو قتل کر دیتے اور توپیں خاموش ہو جاتیں۔ مٹھی بھر لوگ اچانک تلواریں لہراتے اس شدت سے حملہ آور ہوتے کہ برطانوی فوجی پسپا ہونے پر مجبور ہو جاتے۔ انگریزی فوجوں پر دہشت سی چھا چلی تھی۔ ان کی سر توڑ کوشش یہ تھی کہ وہ درے سے نکل کر کھلے میدان میں جنگ کا نقشہ جمائیں اور جدید ہتھیاروں سے کام لیں۔ پیش قدمی کے دوران جو چوکیاں پہاڑوں پر دائیں بائیں قائم کی گئی تھیں، اُن کی حفاظت بجائے خود ایک اہم مسئلہ بن چکا تھا۔ ۱۴ر نومبر کو جنرل چیمبرلین نے حکومت پنجاب سے مزید ڈیڑھ ہزار فوج کی درخواست کی۔ اسی روز برطانوی ہند کے کمانڈر انچیف نے لاہور پہنچ کر لڑائی کی نگرانی اور سربراہی اپنے ہاتھ میں لے لی۔

۱۸ر نومبر کو مجاہدین نے ایک چوکی پر قبضہ کر لیا۔ دوسرے دن انھوں نے کریگ پکٹ پر حملہ کیا اور زبردست جنگ کے بعد برطانوی فوج کو پہاڑ سے نیچے دھکیل دیا۔ ایک سو چودہ سپاہی زخمی یا ہلاک ہوئے۔ اسلحہ اور گولہ بارود کی بہت بڑی مقدار مجاہدین کے ہاتھ لگی۔ صورتِ حال اس قدر نازک ہو گئی کہ کریگ پکٹ کو واپس لینے کے لیے جو دستہ مقرر کیا گیا اُس کی کمان جنرل چیمبرلین نے خود کی۔ خونریز جنگ کے بعد چوکی واپس تو لے لی گئی لیکن اس کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ افسروں کے علاوہ ایک سو اٹھائیس سپاہی میدانِ جنگ میں کام آئے اور چار سو پچیس مجروح ہوئے۔ خود جنرل چیمبرلین بُری طرح زخمی ہوا اور اُسے علاج کے لیے واپس آنا پڑا۔ اب کمان میجر جنرل گارووک نے سنبھالی۔

۱۹ر نومبر تک حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ جنرل نے حکومتِ پنجاب کو ایک طویل تار دیا۔

"ہمیں کمک کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے فوجی دن رات مشقت اور سختیاں برداشت کر رہے ہیں۔ دشمن تازہ دم قوت محاذ پر بھیج رہا ہے ایسے حوصلہ شکن حالات میں اس کا مقابلہ کا رسے دارد ہے۔ ہمیں سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ سپلائی بحال رکھنے کے لیے فوجی دستہ فراہم کرنا اور زخمیوں کو واپس بھیجنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ تازہ دم فوج، دل برداشتہ اور زخم خوردہ دستوں کی جگہ لے سکے تو ان دستوں کو میدانی علاقے میں بھیج کر ان سے امداد کا کام لیا جا سکتا ہے۔"

۲۰ر نومبر کو نمبر ۲۳ دیسی پیدل فوج اپنے انگریز افسروں کے ساتھ کیمپ میں پہنچ گئی۔ انگریزی فوجیوں کے ٹوٹتے ہوئے حوصلوں کو سہارا مل گیا۔ ہر شخص پُر اُمید تھا کہ اس فوج کی آمد سے مجاہدین پر خوف طاری ہو جائے گا۔ اگلے روز جمعہ تھا۔ مجاہدین کا معمول تھا وہ جمعہ کے دن خاص طور پر حملہ آور ہوا کرتے تھے۔ اُس روز انھوں نے خلافِ معمول کوئی حملہ نہ کیا اور انگریز فوجیوں کی اُمید یقین میں بدل گئی ـــــ لیکن بہت جلد یہ یقین محض ایک خوش خیالی ثابت ہُوا۔ کوہستانی علاقے کے قبائلی بھی آ موجود ہُوئے۔ ایک سردار نصیحت لال خان باجور، تین ہزار آدمی اپنے ساتھ لایا۔ حاجی آف کُنہار نے پانچ سَو مجاہدین بھیجے۔ وہ یہ عہد کر کے آتے تھے کہ یا غازی کہلائیں گے یا شہید۔

ان مجاہدین نے آتے ہی انگریزی افواج میں آفت مچا دی۔ تازہ دم انگریزی فوج بھی بگڑتے ہُوئے حالات کے شکنجے میں جکڑ کر رہ گئی۔ دسمبر کے آغاز میں انگریزوں کی حالت اس قدر پتلی ہو گئی کہ نو ہزار سے زائد فوج مَوت کے مُنہ میں کھڑی تھی۔ زخمیوں پر زخمی روزانہ واپس بھیجے جا رہے تھے۔ ان میں افسر بھی تھے اور عام سپاہی بھی۔ دسمبر کا دوسرا ہفتہ شروع ہو گیا، لیکن مجاہدین کے

جوش وخروش کا وہی عالم تھا۔ دُور دُور تک بجنے والے طبلِ جنگ کی مدّھم آدازیں ان کے اس جوش وجذبہ کی غمازی کر رہی تھیں۔ ادھر دہلی تک تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ کمانڈر انچیف کی ہر تدبیر بے جان ثابت ہو رہی تھی اور وائسرائے لارڈ ایلجن اس انتہائی نازک صُورتِ حالات سے دِل برداشتہ ہو کر بسترِ مرگ پر پڑا زندگی کے آخری دن گن رہا تھا۔

○

دو مہینے کی خوُن ریز اور جانکاہ جدّوجہد کے بعد انگریزوں نے محسوس کر لیا کہ درۂ امبیلا سے گزرنا ممکن نہیں اور اس پر اصرار کیا تو وہ پوُری فوج کا قبرستان بن کر رہ جائے گا۔ اُنھوں نے اب کے وسیع پیمانے پر ضمیروں کی خرید وفروخت کا بازار گرم کیا اور لاکھوں روپے جھونک دیے ——— اور جو کام انگریز کی فوجیں اور ہتھیار نہ کر سکے وہ ان کی ڈپلومیسی اور اپنوں کی غدّاری اور ضمیر فروشی نے کر دیا۔ یہ سب کچھ اس قدر خفیہ انداز میں ہُوا کہ مجاہدین کو اس کی ہَوا تک نہ لگنے دی گئی۔ فریقین مورچے جمائے بیٹھے تھے، مجاہدین کے کمانڈر انگریزی افواج پر ایک بڑا شب خوُن مارنے کا فیصلہ کر چکے تھے کہ ایک روز اچانک کوہِ گڑھو کی چوٹی سے آوازہ بلند ہُوا: "لوگو! اپنے آپ کو بچالو، انگریزی فوج درے سے نیچے اترنے کا فیصلہ کر چکی ہے اور بڑے سازوسامان کے ساتھ حرکت میں آگئی ہے"۔ یہ کارستانی ان خوانین کی تھی جو انگریزوں کے ساتھ تھے اور پوشیدہ اپنے ہم قوموں پر دامِ فرنگ میں پھانسنے کے لیے ڈورے ڈالتے رہتے تھے۔ اب یہ لوگ اپنے ناپاک منصوبے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اور کئی بونیری سرداران کے ساتھ مل چکے تھے اور یہ ساری کارروائی سوچے سمجھے منصوبے کے ساتھ کی گئی تھی۔ آواز کا بلند ہونا تھا کہ تمام قبائلی سراسیمہ ہو کر بھاگ نکلے۔ اُدھر اخوند صاحب سوات اس سازباز کا شکار ہو کر اپنے مریدوں کو لیے بونیر کی جانب کے درے میں چلے گئے اور امبیلا اور اس کے گردونواح کا سارا علاقہ

خالی ہوگیا۔ یہ اقدام گویا اس بات کی علامت تھا کہ وہ انگریزوں کی راہ میں مزاحمت سے دستبردار ہوگئے ہیں۔ اب وہ اسی صورت میں لڑیں گے جب انگریز براہِ راست بونیر پر حملہ کریں گے، لیکن انگریزوں کو سوات اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف اس نظریاتی قوت کی اینٹ سے اینٹ بجانا چاہتے تھے جس کی جڑیں ان کی اپنی عملداری میں دُور دُور تک اور گہری پھیلی ہُوئی تھیں۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سرداروں نے بھی اس برگشتگی کو بھانپ کر محاذ چھوڑ دیا اور باقی ماندوں میں بے اعتمادی کا بیج بو گئے۔ کہاں تو یہ حالت تھی کہ دسمبر کا دوسرا ہفتہ شروع ہونے تک ہر طرف عزیمت و شجاعت کا جوش و خروش تھا اور کہاں چند روز کے اندر اندر یہ کیفیّت ہوگئی کہ چاروں طرف بے اعتمادی اور انتشار کا دَور دَورہ تھا۔

۱۰ر دسمبر تک یہ بے اعتمادی اور انتشار کُھل کر سامنے آگیا۔ بونیری قبائل کا بڑا جرگہ پشاور کے کمشنر کے "آستانے" پر حاضر ہُوا۔ وہ مجاہدین سے علیحدہ ہو جانے کی اچھی قیمت وصول کرنا چاہتا تھا، لیکن انگریز جانتے تھے کہ فریق مخالف اگر ایک مرتبہ اپنے مؤقف سے ڈگمگا جائے تو پھر وہ کبھی جم کر کھڑا نہیں ہو سکتا، پسپائی اُس کا مقدر بن جاتی ہے؛ چنانچہ کمشنر نے جرگے کی پیش کردہ شرائط مسترد کر دیں اور اپنی طرف سے جو شرائط پیش کیں اُنھیں قبائلیوں نے قبول نہ کیا۔ انگریزوں نے اُنھیں فیصلے پر مجبور کرنے کے لیے فوجی دباؤ ڈالا۔ ۱۵ر دسمبر کو لالو پر شب خون مارا اور چار سو آدمی ہلاک کر دیے۔ ۱۶ر دسمبر کو اُنھوں نے امبیلا کی بستی پر حملہ کیا اور اُسے آگ لگا دی، دو سَو آدمی زخمی یا ہلاک ہُوئے۔ اس کارروائی کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ قبائلی جو بزعم خویش اپنی شرائط پر معاہدہ کرنا چاہتے تھے فوراً سمجھ گئے کہ زمین ان کے قدموں تلے سے نکل چکی ہے۔ معاہدہ اپنی شرائط پر نہیں، انگریزوں کی شرائط پر کرنا ہوگا۔ دوسرے ہی دن حاضر ہُوئے اور کمشنر سے درخواست کی کہ ضروری احکام صادر فرمائے جائیں۔ آخر معاہدہ

سے ملے پا گیا۔ بونیری، انگریزوں کے ساتھ اس بات پر متفق ہو گئے کہ مجاہدین کو ان کی رہائشی غاروں ہی میں جلا ڈالا جائے گا۔

سیم وزر کی آنچ سے قبائل کا اتحاد کہرے کی طرح ہوا میں اُڑ گیا تھا۔ اب تنہا مجاہدین یا ساداتِ ستھانہ رہ گئے تھے۔ انھوں نے دشمن کی فوج کو اپنی لاشوں کے ڈھیر لگا کر روکنے کی کوشش کی۔ دو سو سرفروش مجاہدین کی دو جمعیتیں میدان میں بھیجنے سے پہلے امیر المجاہدین عبداللہ نے خطاب کیا اور کہا: "بھائیو، ہر مجاہد کا جسم زخموں سے لالہ زار بن جانے والا ہے، لیکن تم جانتے ہو کہ ہمارے چمن کی یہ بہار ہمیشہ تازہ رہے گی۔ دشمن جنگ کے لیے آیا ہے، اس کے مقابلے سے ہٹنا ہمارے لیے گناہ ہے۔ تمھارے جسم پارہ پارہ ہو جائیں تو بھی پروا نہ کرو۔ دُشمن کو پیٹھ دکھانا ہمارے لیے کسی صُورت زیبا نہیں۔ تم جس آزمائش میں پڑنے والے ہو، اس کی ہولناکیوں سے مَیں بے خبر نہیں، لیکن لوہا جب تک پگھل نہیں جاتا اس سے جنگی ہتھیار نہیں بن سکتے۔"

پھر حضرتِ امیر نے بارگاہِ ایزدی میں ہاتھ بلند کیے اور دُعا کی: "الٰہی تُو بے بھالوں کا کارساز ہے۔ تیرے سوا ہم کسی کی پناہ نہیں ڈھونڈتے۔ زور اور قوت تیرے ہاتھ میں ہے۔ ہم ناچیز مسکین کیا کر سکتے ہیں؟ تُو غریبوں اور بے کسوں کا مددگار ہے۔ تیرے سوا کسی سے یاوری کی اُمید نہیں۔ اس جنگ میں صرف تیری مدد درکار ہے۔ یہ مجاہد تیری راہ میں صفیں باندھ کر کھڑے ہو گئے ہیں، تُو اپنی رحمت سے انھیں زور اور قوت بخش سکتا ہے۔ تُو نے اہلِ ایمان کے لیے نصرت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ مالک! دشمنانِ دیں پر ہمیں فتح عطا کر۔ مَیں ان غریب الوطن بے کسوں کو تیرے حوالے کرتا ہوں۔ یہ سب تیری راہ میں جان کی قربانی پیش کریں گے۔ ملکی فوج ہمارا ساتھ دینے کو تیار نہیں تو ہمیں کیا پروا ہے، اس کارزار میں فقط تُو ہمارا مددگار ہے۔"

امیر عبداللہ نے دُعا ختم کی۔ اُن کے آنسو رواں تھے۔ پھر مجاہدین

سے کہا "میرا اسلام قبول کرو، اللہ تمہارا مددگار ہو۔" مجاہدین نے سلام کا جواب دیا اور عرض کی: "ہم سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہو تو معاف فرما دیجیے۔"

"میں نے خدا کے لیے تمہاری ہر خطا معاف کی، تم بھی میری خطائیں معاف کر دو۔" امیر نے باوازِ بلند جواب دیا۔

پھر قربانی و سرفروشی کا ایک ایسا منظر دیکھنے میں آیا جس کی مثالیں تاریخ میں خال خال ہی ملتی ہیں۔ انگریزی فوجیں ورسے ہیں ملکا کی طرف بڑھیں تو مجاہدین تلواریں علم کیے ان پر ٹوٹ پڑے۔ توپیں آگ اُگلنے لگیں اور بندوقوں کے مُنہ کھُل گئے۔ فضا دھویں سے تیرہ و تار ہو گئی۔ مجاہدین توپ و تفنگ سے بے خوف اپنے سے چالیس گُنا فوج سے نبرد آزما تھے۔ مقامی لوگ پہاڑ کی بلند دیوار پر کھڑے اس منظر کا تماشا کر رہے تھے۔ امیر عبداللہ کا خیال تھا شاید ان لوگوں کی ایمانی غیرت اور اسلامی حمیت پھر سے بیدار ہو جائے، لیکن مجاہدین ایک ایک کر کے سب شہید ہو گئے اور قربانی اور شجاعت کا یہ ولولہ انگیز منظر بھی ان کے دِلوں میں لذّتِ شوق پیدا نہ کر سکا۔ حرص وطمع، بے وفائی اور بے ضمیری کی لعنتیں زندگی کی حرارت اسی طرح سلب کر لیتی ہیں۔ ساتھ دیا بھی تو صرف ستھانہ کے سادات نے۔ اخوند صاحب سوات کوتل پر بیٹھے لڑائی کا رنگ دیکھ رہے تھے۔ وہ جاں سپاری و بے چارگی کے اس منظر کی تاب نہ لا سکے اور بے قراری کے عالم میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے، ایک ایک سے کہتے جاؤ ان بہادروں کی مدد کرو۔ کبھی ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرتے "الٰہی اسلام کو فتح عطا کر" —— لیکن اب یہ دوڑ دھوپ اور دُعائیں کب کام آسکتی تھیں! تگ ودو کے جو لمحات تھے ان کا گلا تو اخوند صاحب نے خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹ دیا تھا۔ ایک بار دِل کی آگ سرد پڑ جائے تو پھونکیں اور دَم دُعائیں اُسے پھر سے روشن نہیں کر سکتیں۔ دو سَو کے دو سو مجاہدین کٹ گئے۔ اب ملکا تک راستہ بالکل صاف تھا۔ ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ

ملکا کے دَر و بام سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

○

اِبتدائے عشق

کینہ ور غزن خاں نے جولائی سے وسط اکتوبر تک کا عرصہ کانٹوں پر گزارا۔ وہ بے قراری کے عالم میں اپنے بیٹے کا منتظر تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے، اُس کی بے چینی بڑھتی جاتی تھی۔ اُس نے بیٹے کو بھیجا بھی تو خطرناک مشن پر تھا۔ طرح طرح کے ڈراؤنے اور منحوس خیالات اُس کے ذہن میں پھنکارنے لگتے۔ کیا خبر وہ مجاہدین تک پہنچ بھی پایا یا نہیں اور پہنچ گیا تو کہیں اُن کے ہاتھ نہ لگ گیا ہو! اس تصوّر سے ایک سرد سی لہر ریڑھ کی ہڈی میں رینگنے اور دِل ڈوبنے لگتا، مگر وہ جلد ہی اپنے آپ کو یہ کہہ کر سنبھالتا نہیں میرا بیٹا بڑا ہوشیار ہے، مجھ سے بھی زیادہ ..... چیتے کی طرح کائیاں، خطرناک مواقع سے نبٹنا بھی جانتا ہے اور اجنبیوں سے گھُل مِل کر رہنا بھی۔ وہ ضرور کامیاب و کامران واپس آئے گا۔ انھی خیالات کے ہجوم میں اُس کے شب و روز کٹ رہے تھے کہ ایک روز بیٹا آ پہنچا۔ اُس کا ہشّاش بشّاس چہرہ غمّاز تھا کہ وہ سرخرو ہو کر آیا ہے۔ غزن خان نے لپک کر سینے سے لگا لیا۔ سینہ جو باپ کی شفقت سے زیادہ ان ناپاک اغراض کی گرمی سے اُبل رہا تھا جن کی خاطر اُس نے بیٹے کی زندگی اور ایمان و ضمیر داؤ پر لگا دیے تھے۔ اور جب بیٹے نے باپ کو اپنے ایڈونچر کی رُوداد سُنائی، تو اُس نے فرطِ مسرّت سے اُس کا ماتھا چُوم لیا اور پُکار اُٹھا: "فیروز خان! تم نے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے، تمھارا خاندان ہی نہیں، انگریزی سرکار بھی اس پر فخر کرے گی۔"

اچانک فیروز خان کے ہنستے مُسکراتے چہرے پر اُداسی کا ہلکا سا سایہ چھا گیا۔ شاید اُس کا ضمیر مُرغِ بسمل کی طرح تڑپ اُٹھا یا اُسے ناصر خاں کا گیت

یاد آگیا تھا۔ اُس نے بھی تو کاغانی سیّدوں کی طرح حلف اُٹھا کر مجاہدین کو دغا دی، لیکن یہ تاثر جلد ہی دم توڑ گیا۔ فیروز خان پہلے ہی کی طرح مُسکرا رہا تھا۔

اور جب باپ بیٹا ڈپٹی کمشنر کرنال کے بنگلے سے نکلے، تو وہ یُوں خُوش تھے جیسے ہفت اقلیم کی دولت ہاتھ آگئی ہو۔ اُن کی رپورٹ چونکا دینے والی تھی۔ فیروز خان نے بتایا کہ مجاہدین کا جال تمام ہندوستان میں بچھا ہُوا ہے جو ملکا کو رضاکار، روپیہ اور ہتھیار فراہم کرتے ہیں۔ وہ سرحد میں بڑے فخر سے کہتے تھے کہ ہندوستان میں بہت بڑے بڑے آدمی ہمارے ساتھ ہیں۔ اس سلسلے میں تھانیسر کے محمد جعفر نمبردار کا نام کچھ ایسے انداز میں لیتے جیسے وہ کوئی بہت بڑا نواب ہو۔ وہ اس کو اپنی زبان میں خلیفہ کہتے۔ محمد جعفر کا گھر شمالی ہندوستان میں مجاہدین کا اہم مرکز ہے۔

یہ وہ دن تھے جب انگریزی افواج درۂ چملہ میں پھنسی ہُوئی تھیں جنرل چیمبرلین تار پر تار دے کر کمک منگوا رہا تھا اور حکومت کے حلقے میں تہلکہ برپا تھا۔ اس نازک صورتِ حال سے رپورٹ کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ ڈپٹی کمشنر نے ضلع انبالہ کے حُکام کو تار کے ذریعے خبر دی، تھانیسر ان کی حدودِ اختیار میں تھا۔ رپورٹ کی ایک نقل انسپکٹر جنرل پولیس کو ملی، تو اُس نے ضلع انبالہ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کپتان پارسنز کو تحقیقات کا حُکم دیا۔ ضلعی حُکام نے مولوی جعفر صاحب کے مکان کی تلاشی کے وارنٹ جاری کر دیے۔ کپتان پارسنز پولیس کی بھاری جمعیّت لے کر رات کے وقت تھانیسر پہنچ گیا۔

○

مولوی محمد جعفر نمبردار اپنے گھر میں سوئے پڑے تھے کہ دروازے پر زوروں سے دستک ہُوئی۔ آدھی رات کے سناٹے میں آواز گونجی، تو ان کی آنکھ کھل گئی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہُوئی تھی۔ انھوں نے سمجھا کوئی خواب دیکھا ہے۔ اچانک دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا اور پھر آواز آئی۔ انھیں باہر بلایا جا رہا

تھا۔ وہ اُٹھے، بتی روشن کی۔ کمزور سے شعلے کی روشنی کمرے میں پھیلی اور اندھیرے سے گتھم گتھا ہوگئی۔ دہلیز کا دروازہ کھول کر باہر آتے۔ دیکھا پولیس نے مکان گھیرے میں لے رکھا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ نے انھیں خانہ تلاشی کا وارنٹ دکھایا اور بولا: "مولوی ہم تلاشی لینے آئے ہیں۔"

مولوی جعفر صاحب، پولیس دیکھتے ہی سمجھ گئے تھے بلاؤں کا یہ ہجوم بے سبب نہیں۔ انھوں نے اپنے چہرے سے کسی قسم کا کوئی تاثر جھلکنے نہ دیا۔ پرسکون لہجے میں کہا: "بڑی خوشی سے لیجیے۔ آئیے، اندر تشریف لائیے۔" انھوں نے دروازہ چوپٹ کھول دیا۔

"نہیں ہم پہلے بیٹھک کی تلاشی لیں گے۔" کپتان پارسنز نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹھک بھی حاضر ہے، پہلے گھر کے اندر تلاشی لے لیجیے ...." انھوں نے کہا۔

مگر پارسنز پہلے بیٹھک کی تلاشی لینے پر مُصر تھا۔ مولوی جعفر صاحب بیٹھک کے دروازے کی طرف بڑھے جو اندر دہلیز ہی میں کھلتا تھا اور زور سے پکارے: "عبدالغفور! دروازہ کھولو۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب تلاشی کے واسطے کھڑے ہیں۔"

سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بھنویں تن گئیں، خشمگیں آنکھوں سے اندھیرے میں گھورا اور چیخا: "یہ کیا تلاشی تلاشی کر رہے ہو؟" ——— لیکن مولوی صاحب نے سنی ان سنی کر دی۔ انھوں نے پھر آواز دی: "جلدی کرو جلدی۔ دروازہ کھولو، سپرنٹنڈنٹ صاحب منتظر ہیں، تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

یہ عبدالغفور، ہزاری باغ ضلع گیا (بہار) کا رہنے والا تھا اور مولوی صاحب کے ہاں کلرک تھا۔ اندر سے اٹھنے اور باتوں کی آواز آئی۔ دو آدمی بول رہے تھے۔ مولوی صاحب نے پھر پکارا: "عبدالغفور! سپرنٹنڈنٹ پولیس،

تلاشی لینے آئے ہیں۔ جلد دروازہ کھولو۔"

پولیس کا سنتے ہی اندر والے گڑبڑا گئے اور فوراً دروازہ کھول دیا۔ سپرنٹنڈنٹ سمیت کئی پولیس افسر اور سپاہی دندانہ وار بیٹھک میں گھس گئے اور لگے چیزیں اُتھل پُتھل کرنے۔ آخر ایک خط ان کے ہاتھ لگ گیا۔ منشی عبدالغفور اپنی جگہ سُن ہو کر رہ گیا۔ دوسرا ایک بنگالی لڑکا عباس تھا وہ بھی دم بخود، تلاشی لینے والوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ خط مولوی جعفر صاحب نے کوئی چھ گھنٹے پہلے محمد شفیع ٹھیکیدار انبالہ کے نام جماعتِ مجاہدین کے روپے کے سلسلے میں لکھا تھا۔ اسی خط کی وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ پولیس پہلے گھر کے اندر کی تلاشی لے تاکہ اسے ضائع کرنے کی مہلت مل جائے اور جب سپرنٹنڈنٹ کا اصرار بڑھا کہ وہ پہلے بیٹھک کی تلاشی لے گا، تو انھوں نے منشی عبدالغفور کو اشارۃً کہا کہ دروازہ کھولنے سے پہلے خط ضائع کر دو، مگر وہ گھبراہٹ میں اشارہ نہ سمجھ سکا۔ تلاشی کے دوران میں پولیس کو کچھ اور خطوط بھی ملے۔ منشی عبدالغفور اور عباس کو پولیس پوچھ گچھ کے لیے لے گئی۔ مولوی جعفر صاحب کو لے جانے کے لیے وارنٹ گرفتاری ضروری تھے جو اُس کے پاس نہ تھے، اس لیے ان سے کوئی تعرّض نہ کیا۔

پولیس، مولوی صاحب کے گھر سے نکلی تو صبح ہو رہی تھی۔ شہر میں آناً فاناً خبر پھیل گئی۔ مولوی صاحب شہر کے ایک ممتاز اور صاحبِ اثر و رسوخ فرد تھے، دوست احباب کا تانتا بندھ گیا۔ اُن کا پڑوسی قادا بھی اُن سے ملنے آیا۔ یہ اُن کے ایک دوست کا کرنال میں نوکر تھا۔ وہ دوست اُسی روز ڈپٹی کمشنر سے ملے تھے۔ اُس نے باتوں ہی باتوں میں ذکر کیا کہ مولوی جعفر صاحب کی مخبری ہوئی ہے اور اُن کے گھر کی تلاشی کے وارنٹ جاری ہو گئے ہیں۔ دوست کچہری سے فارغ ہو کر گھر پہنچے، تو قادا کو بلایا اور کہا: جاؤ منشی صاحب کو خبر کر دو، جانے کیا قصہ ہے۔ قادا نے بتایا: "میں رات عشا کے بعد خاصی دیر سے پہنچا۔ آپ

اس وقت سو چکے تھے، اس لیے تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا اور سوچا صُبح نماز کے وقت اطلاع کر دوں گا۔" قادا اپنی کوتاہی پر اظہارِ افسوس کرتا رہا، مگر تقدیر کا لکھا کون ٹال سکتا ہے؟ یہ ذراسی کوتاہی مجاہدین کی تاریخ کا الم ناک حادثہ بن گئی۔

○

"اماں! آپ کا بیٹا دین و ملّت کا جو کام کر رہا ہے، آپ سے مخفی نہیں۔ قادا کہتا ہے کسی نے مُخبری کی ہے۔ پولیس کاغذات لے گئی ہے۔ امبیلا کی جنگ میں صاحبوں کی جو درگت بنی اس پر وہ غصّے میں کھول رہے ہیں۔ میرے خیال میں اس وقت رُوپوش ہو جانا ہی مناسب ہے۔ ویسے آپ کا جو حُکم ہوگا، جعفر بجا لائے گا۔" مولوی صاحب اپنے گھر کے پچھلے کمرے میں اپنی والدہ سے مصروفِ گفتگو تھے۔ بیوی بھی پاس ہی چُپ چاپ کھڑی تھیں۔

بُوڑھی خاتون واقعی بیٹے کی سرگرمیوں سے بے خبر نہ تھیں۔ بے خبر ہوتیں بھی کیسے؟ خود انھوں نے اپنے جگر گوشے کو تحریک کے لیے وقف کیا تھا۔ ان کا گھرانا سیّد بادشاہ کے گھومنے پھرنے والے مُبلّغین کی تبلیغ سے متأثر ہو چُکا تھا۔ جب مولانا ولایت علی پہلی بار سرحد جاتے ہُوئے اس علاقے سے گزرے، محمد جعفر دس گیارہ برس کے بچے تھے۔ ان کی والدہ انھیں ساتھ لے کر مولانا کی خدمت میں پانی پت حاضر ہُوئیں اور عرض کیا میاں صاحب یہ بچّہ حق کی راہ میں پیش کرنے آئی ہُوں۔ مولانا ولایت علی نے اپنا دستِ شفقت ان کے سر پر پھیرا اور بیعت لی۔ تھانیسر کا یہ زمیندار گھرانا دنیاوی وجاہت کے اعتبار سے سارے علاقے میں ممتاز تھا۔ بیعت کے بعد کتاب و سُنّت کے فروغ اور احیائے اسلام کا علمبردار بھی بن گیا۔ مولوی جعفر صاحب جوان ہُوئے، تو تحریکی کاموں میں سرگرمی سے حصّہ لینے لگے اور تھانیسر شمالی ہندوستان میں تحریک کا ایک اہم ذیلی مرکز قرار پایا جہاں مجاہدین کی جماعتیں آتے جاتے ٹھہرتیں اور مولوی صاحب ان کے لیے ہتھیار اور روپیہ سرحد بھجواتے۔

ماں نے بیٹے کی بات سُن کر اُن کے سر پر دستِ شفقت رکھا اور بولیں،
"بیٹا! میری بھی یہی رائے ہے۔ اَللہ تمھارا حافظ و ناصر ہو۔"

بیوی بھی ساس کی ہم خیال تھیں کہ سر دست یہاں سے نکل جانا ہی بہتر ہے، کچھ مدّت کے بعد حالات سُدھر جائیں گے تو واپس آجائیے گا.....
جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں کس کو خبر تھی کہ ایک ایسا طوفان اُمڈا چلا آتا ہے جو تحریک کو پُورے مُلک کے اندر ہلا کر رکھ دے گا اور بندی خانوں، پھانسی گھروں اور انڈمان کے سواحل تک پھیلتا چلا جائے گا۔

والدہ اور بیوی کو رضامند پا کر مولوی صاحب گھوڑے پر سوار تھانیسر سے نکلے اور پپلی پہنچے۔ وہاں تحصیل اور تھانے میں ان کے احباب تھے۔ ان سے ملے اور مشورہ طلب کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ سبھی کی رائے یہ تھی کہ انبالے جا کر معلوم کرو یہ کیسا مقدّمہ ہے اور کس نے مُخبری کی ہے؟ مولوی صاحب بظاہر ان کے مشورے پر انبالے کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ شام ہونے کو تھی، کوئی میل بھر چلے ہوں گے کہ سُورج ڈُوب گیا۔ گہری تاریکی چھا گئی تو سڑک چھوڑ دی اور جنگل کے راستے ایک بجے رات، تھانیسر کے قریب اپنی زمینوں پر پہنچے۔ ان کی والدہ، بیوی بچّے اور چھوٹا بھائی محمد سعید قرارداد کے مطابق پہلے سے موجود تھے۔ والدہ اور بھائی سے آخری ملاقات کی اور بیوی بچّوں کو لے کر پہلے سے تیار بہلی میں بیٹھے اور ماں کی دُعاؤں کے سائے میں رُخصت ہوئے۔ علی الصّباح پانی پت پہنچے جہاں ان کی سُسرال تھی۔ بیوی بچّوں کو سڑک ہی سے رُخصت کیا۔ بہلی بان کو ہدایت کی کہ انھیں گھر چھوڑ کر بہلی خود لے لینا، مگر جب تک خطرہ ٹل نہیں جاتا، تھانیسر مت جانا۔

بیوی بچے چلے گئے، تو مولوی صاحب خود یکّے میں دہلی روانہ ہو گئے۔
اگلے روز (۱۴ دسمبر) دہلی پہنچے اور نصیر الدّین سوداگر کی کوٹھی میں ٹھہرے جو دہلی میں جماعت کا مرکز تھی۔ یہاں حسینی ساکن تھانیسر، حسینی ساکن پٹنہ اور

ایک بنگالی معظم سردار عرف عبداللہ پہلے سے فروکش تھے ۔ مؤخر الذکر دونوں حضرات پٹنہ سے کچھ اشرفیاں لے کر اُسی روز آئے تھے ۔ مولوی صاحب نے اشرفیاں حسینی تھانیسری کو دیں کہ انھیں "بڑے گودام" (ملکا) پہنچا دو ۔ دُوسرے دو ساتھیوں کو ساتھ لیا اور شکرم میں سوار ہو کر علی گڑھ کا رُخ کیا ۔ منصوبہ یہ تھا کہ علی گڑھ سے ریل گاڑی پکڑیں گے اور پٹنہ یا بنگال چلے جائیں گے ۔ اُن کا خیال تھا پولیس انھیں انبالہ، لاہور اور راولپنڈی وغیرہ کی طرف تلاش کرے گی اور مشرقی صوبوں کی جانب اُن کا دھیان نہ جائے گا ۔

○

مولوی جعفر کا جو خط پولیس کے ہاتھ لگا تھا وہ مرموز تھا ۔ اس میں تسبیحوں کے چھ ہزار سفید اور تین سو سُرخ دانے بھیجنے کا ذکر تھا ۔ خط پر مکتوب الیہ کا نام شیخ شفاعت علی لکھا تھا ، مگر پتہ شیخ محمد شفیع ٹھیکیدار گوشت ، میاں میر چھاؤنی کا درج تھا ۔ محمد شفیع ، شیخ محمد تقی کا بڑا بیٹا تھا جو سید احمد شہیدؒ کے مخلص مُرید تھے ۔ اُس کا مکان انبالے میں تھا اور دکان میاں میر میں ۔ پولیس نے دونوں مقامات پر چھاپے مارے اور لاہور میں شیخ محمد شفیع اور اس کے بھانجے داماد اور کارندے منشی عبدالکریم کو گرفتار کر لیا ۔ شیخ کے چھوٹے بھائی محمد رفیع سے بھی پوچھ گچھ کی ۔ وہ پہلے ہی مرحلے میں سرنگوں ہو گیا ۔ اُس نے بتایا شیخ شفاعت علی ، محمد شفیع کا خفیہ نام ہے اور اُس کا بھائی مجاہدین کی تحریک سے وابستہ ہے ۔

ایک اشارہ ملتے ہی کڑیوں سے کڑیاں ملنے لگیں ۔ مولوی جعفر صاحب کے گھر سے جو کاغذات پولیس کو ملے اُن میں دو آدمیوں ، الٰہی بخش اور محی الدین کے لکھے ہُوئے دو خط بھی تھے ـــــ حسینی تھانیسری گرفتار ہُوا تو مجاہدین کی ایک خفیہ اصطلاح کا پتہ چل گیا ـــــ حسینی کو مولوی جعفر صاحب نے دہلی میں اشرفیاں دی تھیں کہ انھیں سرحد پہنچا دے ۔ وہ بڑی احتیاط سے یکے میں سوار کرنال سے امرتسر جا رہا تھا ، پپلی کے قریب پہنچا تو وہاں نائب تحصیل دار

قاسم علی اور سارجنٹ برکت علی کے ہاتھ چڑھ گیا۔ یہ لوگ تھانیسر سے مختلف مکانوں کی تلاشی لے کر آرہے تھے۔ انھوں نے دیکھا یکّے کے پردے چھوڑے ہوئے ہیں۔ یکّہ بان نے اچانک گھوڑا تیز کر دیا۔ انھیں شک ہو گیا سارجنٹ نے گرجتے ہوئے کہا: ”یکّہ روکو۔“

یکّہ رُک گیا۔ دونوں گھوڑے دوڑاتے قریب پہنچے۔

”یکّے میں کون ہے؟“ نائب تحصیل دار پھنکارا۔

یکّہ بان گھگھیا گیا ”جناب مردانہ سواری ہے۔“ اُس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

سارجنٹ نے پردہ ایک طرف کیا —— ”اچھ.....چھ.....آ..... مولوی صاحب ہیں!“ اُس کے لہجے میں تمسخر بھی تھا اور حیرت بھی۔

”کہاں سے آرہے ہو؟“ نائب تحصیل دار گرجا۔

حسینی کے اَوسان خطا ہو گئے ”تھانیسر سے، اشنان کرنے گیا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔

”ہونہہ، اشنان کرنے گئے تھے، مُسلمان ہو کر؟ چلو نیچے اُترو، ہم تمھیں اشنان کراتے ہیں۔“ نائب تحصیل دار نے گھورتے ہوئے کہا۔ تلاشی لی گئی۔ اُس نے دوروئی دار صدریاں پہن رکھی تھیں۔ ان میں سے ۲۹۰ اشرفیاں سِلی ہوئی نکلیں۔ ہر اشرفی، کاغذ میں لپٹی تھی تاکہ جھنکار نہ ہو۔ یہ ٹھیک وہی تعداد تھی جو عبدالغفور کے نام محی الدّین نے اپنے خط میں لکھی تھی۔ مرموز زبان میں انھیں ۱۹۴ بڑے پتھروں اور ۹۶ چھوٹے پتھروں سے تعبیر کیا گیا تھا۔ اس طرح پولیس کو یہ کلید مل گئی کہ مجاہدین اشرفیوں اور روپوں کو مختلف چیزوں کے پردے میں بیان کرتے ہیں۔ مولوی جعفر صاحب نے شیخ محمد شفیع کے نام خط میں جن چھ ہزار سفید اور تین سو سُرخ دالوں کا ذکر کیا ہے، وہ بھی دراصل روپے اور اشرفیاں ہیں۔

جلد ہی اس کی تصدیق ایک اور خط سے ہو گئی۔ تھانیسر کا ڈاکخانہ پہلی

ہیں تھا۔ وہاں کے پوسٹ ماسٹر نے ایک خط پیش کیا جو عظیم آباد (پٹنہ) کے محی الدین نے تھانیسر کے عبدالغفور خاں اور پیرو خاں کے نام بھیجا تھا۔ خط میں اطلاع دی گئی تھی کہ میاں حسینی کو عظیم آباد سے سفید اور سرخ دانے دے کر بھیج دیا گیا ہے ..... اس طرح مجاہدین کے خفیہ جال کی ایک اور کڑی مل گئی اور عظیم آباد بھی پولیس کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔

○

۱۳؍ دسمبر کو کپتان پارسنز، بھاری پولیس کے ساتھ گرفتاری کا وارنٹ لے کر تھانیسر پہنچا، تو مولوی صاحب فرار ہو چکے تھے۔ بس پھر کیا تھا، پورے گاؤں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ پوری مسلمان آبادی کو گھروں سے باہر نکل آنے کا حکم دے دیا گیا۔ اُس روز کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ بادل چھائے ہوئے تھے، رات ژالہ باری بھی ہو چکی تھی۔ برفانی ہوا کے جھونکے جسم میں نیزوں کی انی بن کر چبھ رہے تھے۔ بوڑھے، بیمار، عورتیں اور بچے کھلے میدان میں کھڑے کپکپا رہے تھے۔ گھر گھر کی تلاشی لی گئی، مگر مولوی صاحب گاؤں میں ہوتے تو ملتے۔ مولوی جعفر صاحب کی بوڑھی والدہ، اُن کے بارہ تیرہ سالہ بھائی محمد سعید اور اُس کی بیوی سمیت پچاسوں مرد اور عورتیں گرفتار کر لی گئیں۔ پولیس جب گاؤں سے نکلی، تو ہر طرف تباہی کا منظر تھا، کسی کی کوئی چیز سلامت نہ رہی تھی۔ گرفتار شدگان کو تھانے لے جایا گیا جہاں ان پر سخت عذاب ڈھائے گئے۔ عورتوں کو مردوں کے سامنے بے آبرو کیا گیا۔ مولوی صاحب کی بوڑھی والدہ پر بھی ظلم توڑے گئے۔ پولیس کا ایک دستہ مولوی صاحب کی بیوی کو پکڑنے پانی پت پہنچا، مگر ان خاتون کی دلیر والدہ آہنی دیوار بن کر کھڑی ہو گئیں، اس طرح وہ ان کے چنگل میں گرفتار ہونے سے بچ گئیں۔ مولوی صاحب کی والدہ اور بھائی محمد سعید کے سوا کسی کو مولوی صاحب کی خبر نہ تھی۔ والدہ نے تو بڑی عزیمت کا ثبوت دیا اور سارا ظلم و تشدد سہ گئیں، مگر بھائی، پولیس کی سختیاں نہ برداشت کر سکا۔ اُسے ظالموں

نے آدندھے منہ لٹا کر "لتروں" کی مار دی۔ بارہ تیرہ برس کے لڑکے کی بساط ہی کیا تھی؟ دو تین ضربوں سے کھال اُدھڑ گئی، لہولہان ہو گیا اور پھر اس کی قوتِ برداشت دَم توڑ گئی۔ اُس نے بتا دیا کہ بھائی دہلی گئے ہیں۔

کپتان پارسنز اپنے شکاری کُتوں کو لیے دہلی کی طرف لپکا اور وہاں سے پہنچتے ہی آفت مچا دی۔ شہر کی ناکہ بندی کر دی۔ تلاشی اور پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ اسی پکڑ دھکڑ میں پتہ چل گیا کہ مولوی صاحب دو آدمیوں کے ساتھ علی گڑھ چلے گئے ہیں۔ کپتان نے فوراً علی گڑھ پولیس کو برقی تار کے ذریعے خبردار کر دیا اور مولوی صاحب اور ان کے ساتھی شہر میں داخل ہوتے ہی دھر لیے گئے۔ پارسنز علی گڑھ پہنچا تو حکم دیا کہ اسے پھانسی گھر میں بند کر دو۔ اب انھیں احساس ہُوا کہ فرار کی یہ تگ ودَو اللہ کی مرضی کے خلاف تھی۔ ایک ہُوک دِل میں اُٹھی: "یہ تمھارے ایمان کی کمزوری ہے، مسلکِ عشق اپنا کر جانچ کے وقت میدان سے بھاگ نکلنا سچے عاشقوں کا شیوہ نہیں ہے۔" شعور کی گہرائیوں سے کسی نے پُکارا۔

کوٹھڑی کے باہر چاروں طرف تہرا پہرا لگا دیا گیا تھا۔ رات گئے ایک پہرے دار نے پُوچھا: "پھانسی پانے والے مُجرم پر بھی ایک پہرا ہوتا ہے، تم نے ایسا کیا سنگین جُرم کیا ہے کہ تین تین پہرے لگا دیے گئے ہیں؟"

"جس کا مَیں غلام تھا اُس کے حُکم سے سرتابی کر کے بھاگ آیا ہُوں۔ وہ مجھ پر غضب ناک ہو گیا ہے، چنانچہ مجھے راستے ہی میں پکڑوا دیا ہے۔" مولوی صاحب نے جواب دیا۔

اگلے روز پارسنز نے مولوی صاحب کو بیڑیاں، ہتھکڑی اور طوق پہنایا، طوق میں زنجیر ڈالی اور دوسرے دو آدمیوں کے ساتھ شکرم میں سوار کر دیا۔ پولیس کا ایک مسلح سپاہی زنجیر پکڑ کر مولوی صاحب کے پیچھے بیٹھ گیا۔ پارسنز خود اور ایک انسپکٹر پولیس بھرے ہُوئے ریوالور لے کر دائیں بائیں ان کے جسم کے ساتھ جسم مِلا کر بیٹھ گئے۔ راستے میں پارسنز بار بار کہتا: "مولوی! ذرا

بھی ہلے جُلے تو اس طمنچے سے تمہارا بھیجا نکال دوں گا"۔ رات ان قیدیوں نے دہلی جیل میں گزاری اور اگلی صبح کرنال کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں کھانا پینا تو درکنار انھیں رفع حاجت کے لیے بھی نہ اُتارا گیا۔ نماز کا وقت آتا تو یہ لوگ تیمم کرکے بیٹھے بیٹھے نماز پڑھ لیتے۔ کرنال سے انبالہ پہنچے تو رات ہو چکی تھی۔ یہاں انھیں الگ الگ پھانسی گھروں میں بند کر دیا گیا۔ جس روز مولوی جعفر صاحب گرفتار ہُوئے۔ وہ ٹھیک وہی دِن تھا جب سرحد میں ملکا کو آگ لگائی جا رہی تھی

○

حسینی تھانیسری کی گرفتاری اور پوسٹ ماسٹر پپلی کے فراہم کردہ خط کے نتیجے میں پولیس کی توجہ عظیم آباد پر مرکوز ہو گئی تھی۔ مولوی جعفر صاحب کے ساتھ حسینی پٹنہ والا گرفتار ہو کر آیا، تو اُس نے اُس الٰہی بخش کا پتہ دے دیا جس کا لکھا ہُوا ایک خط مولوی جعفر صاحب کے گھر سے برآمد ہُوا تھا۔ یہ شخص پٹنہ میں جُوتوں کا بہت بڑا سوداگر تھا۔ حسینی نے بتایا کہ الٰہی بخش نے اُس کے ہاتھ ڈھائی ہزار کی ہنڈی، دہلی کے ایک کفش ساز علاؤالدین کو بھیجی تھی۔ انبالہ سے تار دیا گیا اور پٹنہ پولیس نے الٰہی بخش کے گھر پر چھاپہ مارا۔ تلاشی کے دوران ایسے کئی خطوط ہاتھ آئے جن سے ظاہر ہُوا کہ اُس نے مولوی جعفر صاحب اور دہلی کے متعدد اشخاص کو جُوتے اور دُوسری اشیا خریدنے کے لیے بڑی بڑی رقوم دیں۔ ایک خط تو "شاہ کلید" ثابت ہُوا۔ یہ مولانا یحییٰ علی صادق پوری نے فخر الدین ساکن آرہ کے نام لکھا تھا۔ اس کا اندازِ تحریر بالکل وہی تھا جو منشی عبدالغفور کے نام محی الدین کے خط کا تھا۔ اس طرح یہ اہم ترین انکشاف ہُوا کہ محی الدین، مولانا یحییٰ علی کا خفیہ نام ہے جو پُوری جماعت کے سردار ہیں۔ اب تحقیقات صادق پور کی طرف مُڑ گئی۔ ۲۱ جنوری ۱۸۶۴ء کو کپتان پارسنز، پولیس اور مسلّح فوج کا ایک دستہ لیے پہنچ گیا اور مقامی کلکٹر اور مجسٹریٹ الیگزنڈر اور دوسرے اعلیٰ افسروں کی معیت میں ۲۲ جنوری کو رات کے آخری پہر صادق پور کا محاصرہ کر لیا۔

صادق پور جس کے چپے چپے سے مغلیہ دور کے رؤسا کی عظمتِ رفتہ کے آثار ہویدا تھے، اب ان اہلِ صدق و صفا کا مسکن تھا جنھوں نے اپنی زندگیاں حق و صداقت کی راہ میں وقف کر دی تھیں۔ لیکن ہر طرف سناٹا طاری تھا۔ ایسا سناٹا جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ بائیں ہاتھ پر مغلیہ طرز کی وسیع و عریض عمارت چلی گئی تھی۔ عمارت باہر سے بڑی ویران نظر آتی تھی۔ اس میں کہیں زمانے کے ہاتھوں نے شکست و ریخت کے زخم بھی لگا دیے تھے۔ دیواروں پر کائی جمی ہوئی تھی۔ ان کا رنگ رُوپ بالکل وہی تھا جو برسات کے بعد ہر اینٹ چونے کی عمارت کا ہو جاتا ہے۔ اس عظیم مگر قدیم رنگ و حُسن کی حامل عمارت میں مسجد کے مینار سر اٹھائے نمایاں نظر آ رہے تھے۔ مسجد کا اندرونی حصہ بالکل سادہ تھا۔ اس کے اردگرد سکونتی مکانات طلبہ کے لیے مدرسہ، مسافروں کا مہمان خانہ اور خاندانی قبرستان تھا۔ یہی عمارت اور اُس کی مسجد اس عظیم الشّان تحریک کا مرکز تھی جس نے دُنیا کی سب سے بڑی طاقت کو پریشان کر رکھا تھا۔ اس مرکز کو تحریک کی زبان میں قافلہ یا کارواں سرائے کہتے تھے۔ ملک کے اطراف سے رضاکار جذب و شوق سے دلوں میں سمیٹے یہاں پہنچتے، تعلیم و تلقین کے ذریعے تحریک کے افکار و نظریات ان کے دِل و دماغ میں جاگزیں کیے جاتے اور راہِ حق میں جدّوجہد کرنے اور مر مٹنے کا جذبہ بھرا جاتا۔ اعلیٰ ذہنی صلاحیتیں رکھنے والوں کو مبلّغ بنایا جاتا جو تعلیم و تربیت سے فارغ ہو کر سارے مُلک میں چکر لگاتے اور دعوتِ دینی کو پھیلاتے۔ عام رضاکار ضروری امور کی تربیت پا کر یا تو سرحدِ آزاد میں چلے جاتے یا انھیں اپنے اپنے علاقوں میں متعیّن کر دیا جاتا، اس طرح وہ اس مشینری کا اہم رُکن بن جاتے جو حکومت کی نگاہوں سے پوشیدہ خلیج بنگال سے پشاور اور ملکا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب یہ مرکز اور اس کی منظم کردہ تحریک دونوں زبردست طوفان کی زد میں تھے۔

صبح مشرقی اُفق سے سورج اُبھرا تو کپتان پارسنز پولیس کے ہمراہ عمارت کے اندر داخل ہُوا۔ خاندان کے سربراہ مولانا احمد اللہ لیفٹیننٹ گورنر کے ایک جلسے میں شریک ہونے کلکتے گئے ہوئے تھے۔ مولانا یحییٰ علی گھر پر تھے انھیں ساتھ لے کر مولانا عبدالرحیم کے گھر آئے اور تمام کاغذات، مسوّدات اور بہی کھاتے قبضے میں کر لیے۔ گھر میں ایک صاحب عبدالغفّار موجود تھے۔ انھیں بھی پولیس نے تفتیش میں شامل کر لیا۔ اُنھوں نے بتایا وہ مولانا عبدالرحیم کے خادم ہیں۔ ان کے آقا، الٰہی بخش کے ساتھ انھی کے نام سے لین دین کرتے ہیں۔ مولانا عبدالرحیم کے گھر سے ایک خط برآمد ہُوا جس میں کُچھ ایسے لوگوں کے نام لکھے ہُوئے تھے جن کے متعلق انگریزوں کو علم تھا کہ وہ سرحد میں اُن کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ اس سے یہ کڑی مل گئی کہ صادق پور کا سرحد کے ساتھ براہِ راست رابطہ قائم ہے۔ عبدالرحیم صاحب سے صبح سے شام تک پُوچھ گُچھ ہوتی رہی۔ آخر اُنھیں اور عبدالغفّار کو گرفتار کر لیا گیا۔ مولانا یحییٰ علی سے دس ہزار کی ضمانت لے لی گئی۔

تحقیقات کا دائرہ بنگال تک پھیل چُکا تھا، ہر جگہ پکڑ دھکڑ جاری تھی۔ ڈھاکے سے سلیم الدّین اور امین الدّین نامی دو گواہ کشاں کشاں لائے گئے۔ وہ سرحدی جنگوں میں حصّہ لے چُکے تھے۔ انھوں نے اہم انکشافات کیے۔ بتایا کہ مولانا عبدالرحیم صاحب کا گھر ہندوستان میں تحریکِ مجاہدین کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اور خُفیہ اصطلاح میں قافلہ یا قافلہ گاہ کہلاتا ہے۔ بنگال اور بہار سے سرحد جانے والے رضاکار اور مجاہد یہیں ٹھہرا کرتے ہیں۔ وہ خود بھی سرحد جاتے ہُوئے یہاں ٹھہرے تھے۔ مولانا یحییٰ علی تحریک کے سربراہ ہیں اور جو لوگ "قافلہ" میں آتے ہیں، مولانا اُن کی اخلاقی اور فکری تربیت کرتے اور انگریزوں سے جہاد کرنے کی فضیلت پر وعظ کہتے ہیں..... اس طرح کڑیاں مکمّل ہو گئیں۔ مولانا یحییٰ علی کی ضمانت منسُوخ ہو گئی۔ ۸ر فروری کو انھیں گرفتار کر کے مولانا عبدالرحیم اور عبدالغفّار

کے ساتھ جیل میں ڈال دیا گیا۔ مارچ کے اوائل میں یہ تینوں قیدی، لوہے میں جکڑے انبالہ پہنچا دیے گئے۔

○

اِمتحانِ عشق

انبالہ جیل کے پھانسی گھر پہلے اس طرح کبھی آباد نہ ہُوئے تھے جس طرح وہ ۱۶ر دسمبر ۱۸۶۳ء کے بعد آباد ہُوئے۔ پہلے پھانسی پانے والے قیدی بیک وقت دو تین سے زیادہ نہ ہوتے اور پھانسی کی اکثر کوٹھڑیاں ویران رہتیں، لیکن اب جس تیزی سے یہ کوٹھڑیاں بھرتی جا رہی تھیں اُسے دیکھ کر یُوں معلوم ہوتا سرکارِ انگلشیہ کو مزید بنوانی پڑیں گی۔ سب سے پہلے تین قیدی ان کوٹھڑیوں میں آباد ہُوئے۔ مولوی محمد جعفر صاحب، حسینی عظیم آبادی اور معظم سردار عرف عبداللہ بنگالی۔ پھر کرنال سے عبدالغفور اور حسینی تھانیسری اور لاہور سے شیخ محمد شفیع اور عبدالکریم لائے گئے۔ دو مہینے بعد عظیم آباد سے مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، میاں عبدالغفار اور الٰہی بخش پہنچ گئے اور پھر تو گویا تانتا بندھ گیا۔ انہی میں کمارکلی کے قاضی میاں جان اور دہلی کے سوداگر نصیرالدین اور علاؤالدین تھے۔ دسمبر سے اپریل تک وہ پکڑ دھکڑ رہی کہ انبالہ جیل ہی نہیں، پنجاب، دہلی، اودھ، بہار اور بنگال کے جیل خانے بھی بھر گئے۔ پشاور سے خلیج بنگال تک کوئی بھی ایسا شخص اس داروگیر سے نہ بچ سکا جس کا برائے نام تعلق بھی تحریک سے پایا گیا۔ اندھا دُھند گرفتاریوں کے ساتھ ہی لوگوں کو گواہ بنانے اور ان سے اقبالِ جُرم کرانے کی کارروائی پُوری بربریت کے ساتھ شروع ہو گئی۔

○

مولوی محمد جعفر کو انبالہ جیل میں آئے دُوسرا دِن تھا۔ وہ صبح کی نماز

بند کر بیٹھے ہی تھے کہ کپتان پارسنز، ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس میجر بمفیلڈ اور ڈپٹی کمشنر انبالہ کپتان ٹائی پہنچ گئے۔ داروغۂ جیل نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا ۔ تینوں صاحب اندر داخل ہوئے۔

"ویل مولوی، آخر تم قابو آ ہی گئے؟ اب سلامتی چاہتے ہو تو اس سازش کے متعلق ٹھیک ٹھیک بتا دو" کپتان پارسنز نے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتا" انھوں نے کہا۔

"کچھ نہیں جانتا؟ تم سب کچھ جانتے ہو۔ بہتر ہے خود ہی بتا دو"

مولوی صاحب نے پھر وہی جواب دُہرا دیا۔ پارسنز غصّے سے آگ بگولا ہو گیا اور پھٹ پڑا: "سیدھی طرح بتا دو، ورنہ ہمیں اگلوانا بھی آتا ہے"

مولوی صاحب خاموش کھڑے اُس کا مُنہ دیکھتے رہے۔ اس "گستاخی" پر پارسنز آپے سے باہر ہو گیا۔ ہاتھ میں بید تھا۔ مولوی صاحب پر دیوانہ وار برسانے لگا۔ کپتان ٹائی اور میجر بمفیلڈ، کوٹھڑی سے باہر نکل کر کھڑے ہو گئے۔ بید مارنے کی آواز سُن کر گرد و پیش کی کوٹھڑیوں میں بند بلاکشانِ عشق نے سلاخوں سے لگ کر دیکھنے کی کوشش کی، مگر کوٹھڑیاں اس طرح بنی ہوئی تھیں کہ وہ آواز ہی سُن سکتے تھے۔ پارسنز، گوروں کے لہجے میں اول فول بک رہا تھا اور بید برسا رہا تھا۔ ہر ضرب اتنی شدید تھی کہ ہاتھی پر پڑتی تو وہ بھی بلبلا اُٹھتا، مگر مولوی صاحب گُم صُم، ضرب پر ضرب سہتے رہے۔ پُشت، بازوؤں اور ٹانگوں پر بدھیاں پڑ گئیں اور خُون رِسنے لگا، لیکن ان کے مُنہ سے اُف تک نہ نکلی۔ اس حیرت ناک قوتِ برداشت پر پارسنز بالکل باؤلا ہو گیا۔ وہ جوشِ جنوں میں پیٹتا اور چنگھاڑتا رہا، یہاں تک کہ مولوی صاحب مار کھاتے کھاتے گر پڑے۔ پارسنز گالیاں بک رہا تھا بتاؤ، بتاؤ..... مولوی صاحب زمین پر پڑے مار کھا رہے تھے اور چُپ تھے۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا، اُس کی طاقت جواب دے گئی، مگر مولوی صاحب سے ایک لفظ نہ اُگلوا سکا۔ مایوس ہو کر باہر نکلا۔ داروغہ

سنے کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ پارسنز اور اُس کے ساتھی اپنی ناکامی پر تلملاتے پھنکارتے چلے گئے۔

مولوی صاحب مار سہہ تو گئے، مگر انھیں اندازہ ہو گیا کہ یہ لوگ زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اُن کے ذمّے رمضان کے کچھ روزے تھے۔ دُوسرے دن سے انھوں نے ان کی قضا رکھنی شروع کر دی۔

اگلے روز وہ روزے سے تھے کہ علی الصباح پارسنز پھر آ دھمکا اور مشقِ ستم شروع کر دی، مگر کچھ دیر کے بعد خود ہی ہاتھ روک لیا۔ انھیں جیل سے نکالا اور بگھی میں بٹھا کر ڈپٹی کمشنر ٹائی کے بنگلے پر لے گیا۔ وہاں ٹائی اور میجر ہفیلڈ دونوں موجود تھے۔

کپتان پارسنز کے برعکس ان دونوں کا رویّہ بدلا ہُوا تھا۔ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ ٹائی کہنے لگا: "مولوی! تم بڑے سمجھ دار ہو، اپنے علاقے کی ممتاز شخصیت۔ ہم تحریری وعدہ کرتے ہیں اگر جہاد میں شریک دُوسرے لوگوں کے متعلق بتا دو، تو ہم تمھیں وعدہ معاف گواہ بنا کر رہا کر دیں گے اور اعلیٰ منصب بھی دیں گے۔"

میجر ہفیلڈ نے بھی تائید کی اور کہا: "خُوب ٹھنڈے دِل سے سوچ لو۔ حکومتِ انگلشیہ نے ملکا کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے، تمھارے اکثر رضاکار مارے گئے، پچاسوں پکڑے گئے ہیں۔ اُنھوں نے تمھارے خلاف گواہی دی ہے کہ تم بہت سے دُوسرے لوگوں کے تعاون سے ملکا کو روپیہ اور مجاہدین مہیا کرتے تھے۔ ان کی شہادت پر تمھیں پھانسی دی جا سکتی ہے۔ ہم تمھاری جان بچانا چاہتے ہیں، اپنے معاونین کے نام بتا دو۔ چھوٹ جاؤ گے۔"

مولوی جعفر صاحب ان کی "خیر خواہانہ" باتیں چُپ چاپ کھڑے سُنتے رہے۔ گذشتہ روز کی مار پیٹ سے اُن کا سارا جسم پھوڑے کی طرح

دُکھ رہا تھا اور وہ ہتھکڑیوں، بیڑیوں اور طوق کا بوجھ اُٹھائے بمشکل کھڑے تھے۔ افسروں کے تیور کہہ رہے تھے ادھر انکار کرو گے اُدھر ہم رُوئی کی طرح تُوم کر رکھ دیں گے، لیکن انھوں نے کسی تامّل کے بغیر اُن کی پیش کش ٹھکرا دی۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں۔" اُن کا ایک ہی جواب تھا۔

"یہ شخص یُوں نہیں مانے گا۔" کپتان پارسنز نے اپنے ساتھیوں سے انگریزی میں کہا: "ڈنڈا ہی اس کے کَس بَل نکالے گا۔"

"ہاں یہ لاتوں سے ٹھیک ہوگا۔" بمفیلڈ نے کہا۔

پارسنز، مولوی صاحب کو ایک الگ کمرے میں لے گیا جہاں پولیس کے چار پانچ مُسٹنڈے بیٹھے تھے۔ اُس وقت صُبح کے آٹھ بج رہے تھے۔ پارسنز کمرے میں داخل ہوتے ہی چیخا: "اسے پکڑ لو......" وہ خونخوار بھیڑیوں کی طرح جھپٹے اور مولوی صاحب کو اَوندھے مُنہ فرش پر دے پٹکا اور پھر جو زدوکوب کیا ہے تو خدا کی پناہ۔ کمرے کے در و دیوار لرز اُٹھے۔ مار مار کر تھک جاتے، تو سانس لینے رُکتے اور تازہ دم ہو کر مولوی صاحب کو لتروں، لاتوں اور بیدوں سے پھر دُھنکنے لگتے۔ سارا دن اسی وحشیانہ مار پیٹ میں گزر گیا۔ مولوی صاحب کی زبان پر بس ایک دُعا جاری تھی: "خداوندا! یہ وقتِ امتحان ہے، مجھے اس میں ثابت قدم رکھ۔" مولوی صاحب روزے سے تھے۔ زدوکوب نے پیاس بھڑکا دی۔ زبان خُشک تالو سے لگ گئی۔ حلق میں کانٹے چُبھنے لگے۔ کئی بار نیم غشی کی سی حالت طاری ہُوئی۔ اس کے باوجود وہ فولاد کی طرح سخت اور ناقابلِ شکست تھے۔ رات کے آٹھ بج گئے اور مار پیٹ جاری تھی۔ آخر مایوس ہو کر انھیں جیل خانے پہنچا دیا گیا۔ بنگلے سے باہر نکلے تو اُنھوں نے درخت کے پتّوں سے روزہ افطار کیا۔ سارا جسم زخموں سے چُور تھا، مگر مردِ حق کی گردن اب بھی بُلند تھی۔ انگریز افسر انھیں سرنگوں کرنے میں ناکام رہے اور پھر وعدہ معاف گواہ بنانے کی ترغیب دینے کی اُن کو

کبھی جرأت نہ ہو سکی۔

ستم گر دوسرے کمزور افراد پر یہی ظالمانہ حربے آزما رہے تھے۔ جیل خانے اور تھانوں کی حوالاتیں بُوچڑ خانے بن گئی تھیں جہاں لوگوں کو عذاب کے شکنجے میں جکڑ کر ان کا ایمان و کردار ذبح کیا جاتا۔ قانون و آئین طاق پر رکھ دیا گیا۔ سینکڑوں لوگ ظلم و تشدد سے نجات پانے اور پھانسیوں سے بچنے کے لیے گواہ بن گئے۔ اپریل تک گیارہ اشخاص کے خلاف مقدمے تیار کر لیے گئے۔

○

سوانگ

پولیس ان گیارہ "مجرمانِ عشق" کو مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کرنے لے گئی، تو ایک دُنیا انھیں دیکھنے اُمڈ آئی۔ سب سے آگے مولوی محمد جعفر تھے۔ عمر تقریباً ۲۸ سال، اُونچا قد، مضبوط ہاڈ کاٹھ، بھاری بھرکم جسم، سانولا رنگ چہرے کے خدوخال سے عزیمت اور سخت جانی کا رنگ نمایاں۔ ان کے پیچھے مولانا یحییٰ علی اور قاضی میاں جان تھے۔ مولانا یحییٰ علی کی وضع قطع اور چہرہ مُہرہ ہی بتا رہا تھا کہ وہ ان بلاکشوں کے قائد و رہنما ہیں عمر ۴۲ سال مُتوسّط قد، گورا رنگ، گٹھا ہُوا جسم، قید و بند کی صعوبتوں کے باوجود قلب مطمئن کی آئینہ دار نُور میں ڈُوبی بلند پیشانی، خوبصُورت چھوٹی ڈاڑھی اور چہرے پر چیچک کے نشان۔ قاضی میاں جان ساٹھ برس کے معمّر بزرگ تھے۔ رنگ سیاہی مائل، جسم نحیف و ناتواں۔ لیکن توانا رُوح کی غمّازی کرتا ہُوا چہرہ۔ پھر مولانا عبدالرحیم تھے۔ پورے چھ فٹ قد، مضبوط و توانا جسم، کھلتا ہُوا گندمی رنگ، کتابی چہرہ، بھاری ڈاڑھی۔ ان کے ساتھ میاں عبدالغفّار تھے۔ کالا رنگ، گول چہرہ، ناک کے دائیں طرف ایک نشان، پانچ فٹ سے بھی کم قد، عمر ۲۵ برس۔ ان کے پیچھے محمد شفیع (عمر ۲۸ برس) عبدالکریم (۳۵ سال) عبدالغفور

(۲۵ سال) حسینی ولد محمد بخش (۲۵ سال) حسینی ولد میگھو (عمر ۳۵ سال) الٰہی بخش ولد کریم بخش (عمر ۲۴ سال) تھے۔ یہ لوگ بیڑیاں پہنے، ہتھکڑیاں لگائے، گردوپیش سے بے نیاز، اپنی دنیا میں مست عجب شان سے چلے جارہے تھے۔ بیڑیوں کی وجہ سے قدم اُٹھانا دشوار تھا، مگر ایک دو کے سوا کسی کے چہرے پر گردِ ملال نہ تھی۔ کچہری میں تقریباً سبھی ملزموں کے رشتہ دار آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے چار مہینے کے بعد ایک دوسرے کی صورت دیکھی۔ بعض نے ملنے کی کوشش کی، مگر پولیس مزاحم ہوگئی۔

مولوی محمد جعفر کی والدہ، بیوی بچے اور بھائی محمد سعید بھی موجود تھے۔ محمد سعید دوسرے گواہوں کے ساتھ پولیس کی حراست میں تھا۔ اُس کا رنگ پیلا زرد اور جسم لاغر ہوچکا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دور سے دیکھتے رہے — پھر محمد سعید نے ایک ہمدرد سپاہی سے ہولے ہولے کچھ باتیں کیں۔ وہ سپاہی بڑھ کر ان کے پاس آیا اور بولا "محمد سعید نے آپ کو پیغام دیا ہے کہ پولیس نے مار پیٹ کر مجھے آپ کے خلاف گواہ بنا لیا ہے۔ عدالت میں میں اپنے بیان سے منحرف ہوجاؤں گا۔" مولوی صاحب ذرا دیر سوچ میں پڑ گئے۔ پھر بولے: "اُس سے کہو میری قید اور رہائی کا انحصار صرف تمہارے بیان پر نہیں، وہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم حلفیہ بیان دے چکے ہو تو اب انحراف سے تمھیں دروغ حلفی کی سزا ہوجائے گی۔ میں پہلے ہی پھنسا ہوا ہوں۔ تم بھی پھنس گئے تو بوڑھی والدہ صدمے سے ہلاک ہوجائیں گی۔ بہتر یہ ہے اپنے بیان پر قائم رہو۔"

عدالت میں انکشاف ہوا کہ محمد شفیع کا چھوٹا بھائی محمد رفیع اور قاضی میاں جان کا بھائی قاضی مراد علی بھی جبر و تشدد کی تاب نہ لاکر اور پھانسی کی دھمکیوں سے ڈر کر پولیس کے گواہ بن گئے ہیں۔

مجسٹریٹ کی عدالت نے مسلسل سماعت کی اور پچاس گواہیاں

ہوئیں۔ گواہ۔ پولیس کی نگرانی میں آتے اور رٹے رٹائے بیان دیتے۔ محمد سعید پیش ہوا تو وہ اپنے پہلے بیان سے منکر ہوگیا۔ صاحب لوگ مارے غصّے کے ہونٹ چبانے لگے مگر صغر سِنی کی وجہ سے سزا نہ دی اور اس کا نام گواہوں میں سے کاٹ دیا۔ بنگالی لڑکے عباس کو مولوی جعفر نے پالا تھا۔ وہ بیان دینے آیا تو مولوی صاحب کی صورت دیکھ کر رٹا ہوا بیان دینے سے ہچکچایا۔ محمد سعید کے انحراف کا غیظ و غضب بھی اس بے چارے پر ٹوٹ پڑا۔ اُسی رات اُس کو اتنی بُری طرح مارا کہ چند روز کے بعد خُون تھوکتا ہُوا مرگیا۔ کپتان پارسنز نے مشہور کیا کہ وہ بیماری سے مرا ہے۔

پیشی کے دوران نماز کا وقت آیا۔ مولوی جعفر صاحب نے عدالت سے نماز پڑھنے کی اجازت مانگی، مگر نہ ملی۔ مجسٹریٹ بہادر فرمانے لگے: "تم لوگوں کے لیے مقدمہ ملتوی نہیں کیا جائے گا؟" انھوں نے کہا: "بے شک آپ مقدمہ ملتوی نہ کریں، اپنی کارروائی جاری رکھیں، گواہوں کے بیانات لیتے رہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ہماری غیر حاضری میں گواہوں کے بیانات نہ سُننے سے ہمیں جو نقصان ہوگا اس کے ذمّہ دار ہم خود ہوں گے۔ ہم یہ نقصان تو برداشت کر سکتے ہیں، مگر نماز قضا نہیں کر سکتے۔"

"تم لوگ باہر نہیں جا سکتے۔" مجسٹریٹ نے غصّے بھری آواز میں جھلا کر کہا۔

"بہت خُوب۔" مولوی جعفر صاحب نے کہا اور پھر سب لوگ زمین پر تیمم کر کے کھڑے ہوگئے۔ مولانا یحییٰ علی نے امامت کی اور دس آدمیوں نے ان کی اقتدا میں نماز پڑھی۔ پولیس اور فوج کے دو سو مسلح جوان بندوقیں بھرے اور سنگینیں چڑھائے ان لوگوں کے پیچھے کھڑے منتظر حکم تھے۔ عدالت میں تماشائی بھی تھے اور اخبارات کے نامہ نگار بھی۔ سب یہ عجیب و غریب نظارہ دیکھ رہے تھے۔ اللہ کے بندے ہر قسم کے خوف و خطر سے بے نیاز اپنے خالق و آقا سے راز و نیاز میں محو تھے۔ مسلسل تین روز ان لوگوں

نے نمازِ ظہر اسی طرح برسرِ عدالت پڑھی۔ آخر چوتھے دن مجسٹریٹ نے حکم دیا کہ ایک ایک آدمی کو دو سپاہیوں اور ایک نائک کی حفاظت میں باہر لے جایا جائے اور کچہری کے متّصل باغ میں نماز پڑھوا کر واپس لایا جائے۔ اس شان سے یہ مقدمہ سات دن ہوتا رہا۔ مجسٹریٹ نے فردِ جرم عائد کر کے مقدمہ سیشن سپرد کر دیا۔

اب تک یہ لوگ پھانسی گھروں میں الگ الگ قید تھے۔ کوٹھڑیاں کیا تھیں، قبریں تھیں۔ نہایت تنگ و تاریک، پانچ فٹ لمبی اور چار فٹ چوڑی۔ آسمان سے باتیں کرتی ہوئی چھت جس میں ایک چھوٹا سا روشن دان تھا کہ آدمی سانس لے سکے۔ رات دن میں ایک بار اس کا دروازہ کھلتا۔ تین سپاہی جمعدار، باورچی اور سقہ کو ساتھ لے کر آتے۔ باورچی کے ہاتھ میں روٹیاں اور دال ہوتی، سقہ پانی سے بھری ہوئی مشک اُٹھائے ہوتا، بھنگی کے ہاتھ میں گملا ہوتا۔ ایک سپاہی دروازہ کھولتا۔ باورچی دو روٹیاں اور کچھ دال دیتا، سقہ کوزے میں پانی بھرتا اور بھنگی گملا صاف کرتا اور پھر یہ لوگ اگلی کوٹھڑی کی طرف چلے جاتے۔ چار مہینے ان لوگوں نے سخت عذاب میں گزارے۔ سیشن سپرد ہونے کے بعد انھیں ایک جگہ بند کر دیا گیا جہاں پہلی بار آسمان کی صورت دکھائی دی۔

قافلۂ شوق کے راہرو یکجا ہوئے، تو ساری مصیبتیں اور رنج و محن کی کلفتیں دُھل گئیں۔ قیدِ تنہائی بھی رُوحانی فوائد سے بھرپور تھی، لیکن اب میرِ کارواں کی صحبت تو گویا حاصلِ زندگی بن گئی۔ شیخ محمد شفیع اور عبدالکریم قید و بند کے مصائب سے کچھ زیادہ ہی متاثر تھے۔ وہ کسی قدر کشیدہ خاطر اور ملول رہتے۔ لیکن باقی نو اصحابِ محن نہایت شاداں و فرحاں تھے۔ ہر شخص صبر و استقامت کا پہاڑ تھا اور رضائے الٰہی پر مسرور اور خوش۔ لیکن میرِ کارواں کی کیفیت سب سے جُدا تھی۔ چہرہ ہر وقت روشن اور منور رہتا۔

زبان ذکرِ الٰہی سے معطر اور جب وجدانی کیفیت طاری ہوتی، تو حافظ

اور شاہ نیاز کے اشعار پڑھنے لگتے۔ اکثر حضرت خُبیبؓ بن عدی کے وہ اشعار زبان پر رہتے جو اُنھوں نے تنعیم کے میدان میں کفارِ مکّہ کے ہاتھوں پھانسی لگنے سے پہلے کہے تھے اور اس موت کی خبر اور حضرت خُبیبؓ کا سلام خود جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں مدینہ منورہ پہنچایا تھا:

وَلَستُ اُبالی حین اُقتل مسلماً
علیٰ ایّ شقّ کان فی اللّٰہ مصرعی
وَذَالِك فی ذات الالٰہ وَاِن یشاء
یبارك علیٰ اوصالِ شلوٍ ممزّعِ

"جب مَیں اللہ کی راہ میں مسلمان کی موت مر رہا ہُوں، تو مجھے اس بات کی کیا پروا کہ کس کروٹ پر جان دیتا ہُوں اور یہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے ــــ کہ وہ چاہے تو جسم کے پراگندہ اعضا کو برکت اور بالیدگی عطا کر دے۔"

راتیں نماز اور ذکر و دُعا میں گزرتیں۔ کبھی کبھار بڑے جذب و سوز میں ڈوبی لَے میں سیّد احمد شہیدؒ کے فراق میں درؔد کا قطعہ پڑھا کرتے:

اتنا پیغام دردؔ کا کہنا!
جب صَبا کوُئے یار میں گزرے
کون سی رات آپ آئیں گے؟
دِن بہت انتظار میں گزُرے

○

اپریل کے آخر میں سیشن عدالت نے مقدمے کی سماعت شروع کی۔ مولانا یحییٰ علی تو نہ صفائی پیش کرنے کے حق میں تھے نہ وکیل کرنے کے۔ مولانا ولایت علی کے نوجوان صاحبزادے محمد حسن ذبیح اور مولانا مُبارک علی نے (جنھوں نے مولانا احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد تحریک کی قیادت سنبھالی) ان کا اور مولانا عبدالرحیم

کا مقدمہ لڑ رہے تھے، ان کے اصرار پر اُنھوں نے وکالت نامے پر دستخط کیے، لیکن مقدمے کی پوری کارروائی میں کبھی دلچسپی نہ لی۔ عدالت برسرِ اجلاس ہوتی اور مولانا بالکل چُپ چاپ یادِ خدا میں مصرُوف رہتے۔ بعض اوقات سوالات کے جواب بھی مولانا عبدالرحیم دیتے۔ یوں لگتا تھا عدالت خود ایک فریقِ مقدمہ ہے اور ملزموں کو سزا دینے پر تُلی ہُوئی ہے۔ مولانا یحییٰ علی اور مولانا عبدالرحیم کے وکیل مسٹر پلاؤڈن نے جیل میں اپنے مؤکّلوں سے مُلاقات کی درخواست دی۔ سیشن جج نے نامنظور کر دی، جوڈیشیل کمشنر کے پاس اپیل کی تو وہ بھی مسترد ہو گئی۔ آخر پلاؤڈن نے یہ معاملہ گورنر کے سامنے رکھا اور وہاں سے منظوری آئی۔ اس طرح دو ہفتے صرف وکالت نامے پر مؤکّلوں کے دستخط لینے میں ضائع ہو گئے۔

مقدمہ بے بنیاد نہ تھا۔ سب لوگ تحریکِ مجاہدین کے سرگرم کارکُن تھے، لیکن ان الزامات کا قانونی ثبوت پیش کرنا مشکل تھا اور جو شہادتیں پیش ہُوئیں وہ خود بول بول کر کہہ رہی تھیں کہ وہ بناوٹی اور سکھلائی پڑھائی ہُوئی ہیں۔

ملزموں پر دفعہ ۱۲۱ تعزیراتِ ہند کے ماتحت مقدمہ چلایا گیا۔ استغاثہ یہ تھا کہ ستھانہ اور ملکا کے ہندوستانی مجاہدین، برطانوی حکمران کے دشمن ہیں اور اس کے خلاف جنگ کر چکے ہیں۔ مُلزم، مجاہدین کو روپیہ اور آدمی فراہم کرتے رہے؛ حالانکہ وہ برطانوی رعایا ہیں۔ اس طرح اُنھوں نے جان بُوجھ کر غدّاری اور اس عہدِ اطاعت و وفا کی خلاف ورزی کی جو رعایا کے ہر مخلص اور وفادار فرد کے دِل میں اپنے حکمران کے لیے موجزن رہنا چاہیے۔

مسٹر پلاؤڈن نے اعتراض کیا: "مائی لارڈ، شہادت کہتی ہے غیر مُلکی دُشمنوں نے دُشمنی پر مبنی جو اقدامات کیے، ملزموں نے ان اقدامات میں اُن کی مدد کی یا ایسا کرنے کی کوشش کی۔ یہ جرم دفعہ ۱۲۱ تعزیراتِ ہند کے تحت نہیں آتا۔ دفعہ ۱۲۱ صرف ان اقداماتِ جنگ پر لاگو ہوتی ہے جو برطانوی رعایا، برطانوی علاقوں کے اندر عمل میں لائے۔ ستھانہ اور ملکا بہرحال برطانوی علاقے سے باہر اور آزاد

علاقے ہیں۔"

سیشن جج ہربرٹ ایڈورڈز نے اعتراض مسترد کر دیا۔

پلاؤڈن نے دوسرا اعتراض پیش کیا: "میرے چھ موکلوں (مولانا یحییٰ علی، مولانا عبدالرحیم، حسینی، تھانیسری، حسینی عظیم آبادی، عبدالغفار اور الٰہی بخش) میں سے پانچ کے خلاف اس عدالت میں مقدمہ نہیں چل سکتا۔ انبالہ ڈویژن کی عدالتیں لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے ماتحت ہیں اور میرے پانچ موکل، عظیم آباد کے رہنے والے ہیں جو گورنر بنگال کے ماتحت ہے۔ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ ۲۶ اور ۲۷ کے مطابق جرائم کی تحقیقات یا تو ان اضلاع میں ہونی چاہیے جہاں ان کا ارتکاب ہوا، یا اُن اضلاع میں جہاں ان کے نتائج برآمد ہوئے۔ دفعہ ۲۸ کے ماتحت شرکت اور اعانت کی صورت بھی یہی ہے۔"

جج صاحب کو اس سے کیا دلچسپی تھی کہ قانون کیا کہتا ہے؟ وہ تو انگلشیہ سرکار کی طرف سے سزا دینے پر مامور ہوتے تھے۔ انھوں نے یہ اعتراض بھی مسترد کر دیا۔

شہادتیں وہی رٹی رٹائی تھیں؛ البتہ ان میں خاصے انکشافات تھے۔ مثلاً مولوی جعفر صاحب کا خفیہ نام پیرو خاں یا پیرو خلیفہ تھا۔ مولانا عبدالرحیم، رحیم بیگ کہلاتے۔ رضاکاروں اور مجاہدوں کے لیے مختلف خفیہ اصطلاحیں تھیں، مثلاً: رنگروٹ یا رضاکار ——— خدمت گار، بیوپاری، مسافر، سانڈ اور جہادی کہلاتے۔ پٹنہ کو چھوٹا گودام اور ملکا اور ستھانہ کو بڑا گودام کہتے۔ ہنڈی اور نقد رقوم کے لیے بالترتیب "سفید پتھر" اور "کتابوں کی قیمت" کی اصطلاح استعمال کرتے۔ جنگ ان کی زبان میں مقدمہ کہلاتی۔ امیرالمجاہدین مولانا عبداللہ کو بابو صاحب، بابو جان یا میاں جان کہہ کر پکارتے۔ مولانا یحییٰ علی کی جو تصویر ان شہادتوں سے اُبھر کر سامنے آئی وہ بڑی حد تک درست تھی: وہ ہندوستان میں تحریک کے پیشوا ہی نہ تھے، عالم فاضل اور خطیب، زبردست انتظامی صلاحیتوں کے مالک

ملک بھر میں پھیلے ہوئے مبلغین جو رضا کار مرکز میں بھیجتے ہیں، ان کی فکری و عملی تربیت کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے دیوانہ وار محبت، شرک و بدعات سے نفرت اور انگریز کی کافر حکومت کے خلاف جہاد کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور پھر مجاہدین کے کیمپ میں بھیج دیتے ہیں۔ ملک کے طول و عرض میں قائم تحریک کے مراکز سے خط کتابت کرتے، دستاویزات کو خفیہ زبان میں ترتیب دیتے اور لکھتے ہیں اور اس طرح بڑی بڑی رقوم بلاخوف و خطر تحریک کے ہیڈ کوارٹرز سے ملکا تک پہنچ جاتی ہیں۔

استغاثہ کے گواہوں نے اپنے بیانات میں تحریک کے وسیع جال کے بہت سے حلقوں کا انکشاف بھی کیا اور بے شمار اصحاب کو اس "سازش" میں ملوث کیا۔ انہی بیانات کی بنیاد پر اگلے دس برس، پورے ہندوستان میں دارو گیر کا بازار گرم رہا۔ زیادہ تر شہادتیں ان الزامات کی تقویت میں پیش کی گئیں جو ملزموں پر عائد کیے گئے تھے۔ مسٹر پلاؤڈن اور شیخ محمدؐ شفیع اور عبدالکریم کے وکیل مسٹر گڈآل نے اور مولوی محمدؐ جعفر نے جو اپنا مقدمہ آپ لڑ رہے تھے، گواہوں پر جرح کر کے ان الزامات کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا۔

صفائی کی طرف سے جو گواہیاں پیش ہوئیں وہ استغاثے کی شہادتوں سے کہیں زیادہ وزنی تھیں، لیکن بے سود۔ دس ملزموں کا جواب تو ان کے وکیلوں نے تحریری پیش کیا، مولوی محمدؐ جعفر نے زبانی لکھوایا۔ ان کا بیان بڑا پُرزور اور مدلل تھا۔ چند پیرے لکھے جا چکے تھے کہ سیشن جج بھنا اٹھا اور بڑے غصے میں چیخا: "یہ جواب اور دلائل بے فائدہ ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اپنے جرم کا اقرار کر لو اور عدالت سے رحم اور معافی مانگو۔ عدالت کی جانبداری صاف عیاں تھی۔ مولوی صاحب اس اندازِ انصاف پر کچھ دیر تو دم بخود کھڑے رہے، پھر بولے: "میں انصاف چاہتا ہوں اور آپ سے اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔"

مولوی صاحب نے اپنی صفائی میں دس بارہ آدمی بطور گواہ پیش کیے، لیکن

ان کا بیان نہ لیا گیا۔

گواہیوں وغیرہ کا ناٹک ختم ہُوا تو وکلا نے بحث شروع کی۔ مسٹر پلاوڈن نے بہت سی قانونی کتابوں اور نظائر سے ثابت کیا کہ مقدمہ محض ظلم و تعصب کا ساختہ پرداختہ ہے۔ تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت ان لوگوں کو سزا دی ہی نہیں جا سکتی۔ عدالت کے طرزِ عمل سے صاف مترشح تھا کہ کوئی وزنی سے وزنی دلیل بھی اُس کے آگے بیکار ہے۔ سیشن جج صاحب کسی دلیل اور نظیر کو درخورِ اعتنا سمجھتے بھی تو کیوں؟ فیصلہ تو پہلے ہی ہو چُکا تھا اور مقدمہ محض سوانگ تھا۔

○

حکمِ دار

۲ مئی ۱۸۶۴ء فیصلے کا دن تھا۔ موسم صُبح ہی سے سخت گرم تھا۔ سُورج جیسے جیسے اُفق سے بُلند ہوتا گیا، اس کی تمازت تیز ہوتی چلی گئی۔ اسی چلچلاتی دُھوپ میں مُلزم بیڑیوں، ہتھکڑیوں اور طوق میں جکڑے ہُوئے لائے گئے۔ فیصلہ سُننے ایک خلقت جمع ہو گئی تھی۔ ملزم عدالت میں داخل ہُوئے تو کمرہ کھچا کھچ بھرا ہُوا تھا۔ بہت سے لوگ باہر برآمدوں اور صحن میں موجود تھے۔ ملزم کٹھرے میں کھڑے ہو گئے۔ سیشن جج نے کُرسی سنبھالی، لوگ بیٹھ گئے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ ایسا سناٹا جس میں دہشت رینگتی محسُوس ہوتی۔ قانون کے مطابق چار اسیسر بھی حکُومت نے مقرر کر رکھے تھے۔ دو مُسلمان اور دو ہندو۔ ہربرٹ ایڈورڈز نے اُن سے کہا آپ نے مقدمے کی کارروائی سُنی، اپنی رائے لکھ کر پیش کیجیے۔ بھری عدالت میں لوگوں نے دیکھا ان کے چہروں پر غمناک پرچھائیں سی چھا گئیں۔ انھوں نے ملزموں کی طرف دیکھا تو آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں جیسے زبانِ خاموش میں کہہ رہے ہوں: ہم تمھاری رہائی کے خواہاں ہیں، لیکن جج سزا دینے پر تُلا ہُوا ہے۔ انھوں نے لرزتے ہاتھوں سے لکھ دیا: "ہمارے نزدیک جرم

مندرجہ فردِ قرارداد، ملزموں پر ثابت ہو چکا ہے۔"

اب ہربرٹ ایڈورڈز نے نفرت بھری نظر ملزموں پر ڈالی اور کہا "ملزمان محمد جعفر ولد میاں جیون، یحییٰ علی ولد الٰہی بخش اور محمد شفیع ولد محمد تقی کو سزائے موت مع ضبطیٔ جائداد دی جاتی ہے۔ پھانسی کے بعد ان کی لاشیں گورستانِ جیل میں دفن کی جائیں۔"

کمرے کا سناٹا اور گہرا ہو گیا۔ اکثر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے لیکن وہ جنھیں سزا سنائی گئی تھی، ان کا ردِ عمل بالکل مختلف تھا۔ مولانا یحییٰ علی کا نورانی چہرہ اور روشن ہو گیا تھا۔ سارے مقدمے کے دوران آیاتِ قرآنی ان کے وردِ زباں رہی تھیں، اب بھی وہ حسبِ معمول زیرِ لب قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ بس چہرہ بتا رہا تھا کہ انھیں دل کی مراد حاصل ہو گئی ہے۔ شہادت کی موت سے بڑھ کر قابلِ رشک مراد اور کیا ہو سکتی ہے؟ مولوی محمد جعفر کی مسرت بھی بے پایاں تھی۔ خود ان کے اپنے الفاظ میں اگر ہفت اقلیم کی بادشاہت بھی مل جاتی تو اتنی خوشی نہ ہوتی۔ اُن کی نگاہوں میں جنتِ فردوس پھر گئی؛ البتہ محمد شفیع کے چہرے کا رنگ بدل گیا؛ تاہم اُس نے جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

جج کی آواز پھر کمرۂ عدالت میں گونجی: "باقی آٹھ ملزموں عبدالرحیم، قاضی میاں جان، عبدالغفار، عبدالغفور، الٰہی بخش، حسینی عظیم آبادی، حسینی تھانیسری اور عبدالکریم کو حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور مع ضبطیٔ جائداد کی سزا دی جاتی ہے۔"

سزا کا اعلان کرنے کے بعد جج نے کھا جانے والی نظروں سے مولوی جعفر صاحب کو دیکھا اور کہا: "تم بہت عقل مند، صاحبِ علم، قانون دان اور اپنے شہر کے نمبردار ہو مگر تم نے اپنی ساری لیاقت اور ذہانت سرکار کے خلاف صرف کی، مَیں تمھیں پھانسی پر لٹکتا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا۔"

مولوی صاحب نے بڑے سکون سے جواب دیا: "جان دینا اور لینا

خدا کا کام ہے، تمھارے اختیار میں نہیں۔ وہ ربّ العزت قادر ہے کہ میرے مرنے سے پہلے تمھیں ہلاک کر دے۔" جج دانت کچکچا کر رہ گیا۔ پھانسی کا حکم دینے کے بعد وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا؟ باقی سزائیں تو اس کے بھائی بند پہلے ہی دے چکے تھے۔ ؎

تفصیلی فیصلہ ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔ مولانا یحییٰ علی کے بارے میں جج نے لکھا: "یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ یحییٰ علی ہی اس سازش کا کرتا دھرتا ہے جس کا انکشاف اس مقدمے کے دوران ہوا۔ وہ ایک مذہبی واعظ تھا اور انتہائی مقدس قاعدے کے مطابق پٹنہ کی مسجد سے اسلام کے قابلِ نفرت اصولوں کی اشاعت کرتا رہا۔ جہاد کی تبلیغ اور روپوں کی فراہمی کے لیے اس نے ماتحت ایجنٹ مقرر کر رکھے تھے۔ اس نے اپنی سازشوں سے برطانوی ہند کو ایک سرحدی جنگ میں دھکیل دیا۔ جس میں سینکڑوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ وہ مشہور عالم ہے، اس کے متعلق لاعلمی کا عذر نہیں پیش کیا جا سکتا، اس نے جو کچھ کیا سوچ سمجھ کر اور عزمِ راسخ کے ساتھ باغیانہ طریقے پر کیا۔ اس کا تعلق ایک موروثی باغی اور جہادی جنونی خاندان سے ہے۔"

مولوی جعفر صاحب کے متعلق لکھا:

"اس قیدی کی سخت حکومت دشمنی، باغیانہ تگ و دو اور اس کی شرارت انگیز قابلیت میں مبالغہ کرنا ممکن نہیں۔ یہ لکھا پڑھا شخص ہے اور اپنے گاؤں کا نمبردار۔ اس کے جرم میں کوئی شک نہیں اور اس میں کوئی تخفیف نہیں ہو سکتی۔"

محمد شفیع کے بارے اس نے فیصلے میں کہا: "یہ شخص اس سازش میں دستِ راست تھا۔ ہندوستان کے تمام شہروں میں اس کی ایجنسیاں

؎ مولوی صاحب کی بات الہامی ثابت ہوئی۔ ہربرٹ ایڈورڈز تھوڑے ہی عرصے بعد ناگہانی موت کا شکار ہو گیا۔

تھیں اور جرنیلی سڑک کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی انگریزی چھاؤنیوں میں اُس نے گوشت کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ پنجاب کے بڑے بڑے تاجروں کے ساتھ اس کے خاندانی یا تجارتی تعلقات تھے۔ وہ اپنے بڑھتے ہوئے ملازمین کے دائرے کا مرکز تھا جو شمالی ہند کے تمام حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے تجارتی کاروبار نے ہماری سرحد پار کی گڈریا اقوام کے ساتھ بھی اس کے تعلقات پیدا کر دیے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارا ملازم ہونے کی حیثیت سے جو عالمگیر اقتدار اسے حاصل ہو گیا تھا وہ اس کو ہماری تباہی اور بربادی کے لیے استعمال کرنے لگا۔ وہ اس سازشی جماعت کا شاہکار تھا اور مجاہدین کو روپیہ پہنچانے کے لیے اس نے ان مراعات کو جو فوجی ٹھیکیدار ہونے کی حیثیت سے حاصل تھیں نہایت چالاکی سے استعمال کیا۔ ۔ ۔ ۔"

مولانا عبدالرحیم کے سلسلے میں لکھا:

"رحیم قیدی کے متعلق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس کے مکان میں باغیانہ کام سرانجام پاتے رہے۔ اسی کے مکان میں بنگالی مجاہدین اکٹھے ہوتے اور رہتے تھے۔ اس کے خدمت گار عبدالغفار کے پاس خزانہ ہوتا تھا۔ وہی رنگروٹوں کے کھانے پینے کا انتظام کرتا اور مجاہدین کو روپیہ بھیجتا۔ اس کا سالا یحییٰ علی اس کے زنان خانے کے دروازے پر باغیانہ تبلیغ کرتا۔ یہ یحییٰ علی سے کم قابلیت رکھتا ہے اور زیادہ مشہور نہیں، لیکن حکومت کے خلاف جو کچھ اس سے ممکن تھا اُس نے کیا۔"

قاضی میاں جان کے متعلق جج نے لکھا: "اُس کا کام جہاد کی تبلیغ اور بنگال میں مجاہدین بھرتی کرنا تھا۔ وہ پٹنہ کے سازشیوں اور کوہستانی مجاہدین کا سرگرم کارکن تھا، وہ روپیہ جمع کرتا اور بھیجتا اور خطوط وغیرہ بھی پہنچاتا، چنانچہ نہایت اہم باغیانہ خطوط جو پٹنہ اور مُلکا سے آتے ہوئے تھے اس کے گھر سے برآمد ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے اس کے تین چار فرضی نام تھے۔"

باقی پانچ ملزموں کے متعلق اُس کے ریمارکس یہ تھے:

"پٹنہ کا حسینی ولد مگھو، الٰہی بخش کا نوکر ہے اور اس نے اِسے باغیانہ مقاصد کے لیے روپیہ پہنچانے پر ملازم رکھا۔ اُس نے یحییٰ علی کے حکم کے مطابق عبدالغفار سے اشرفیوں کی بڑی تعداد وصول کی اور انھیں اپنی واسکٹ میں سی کر دہلی لایا جہاں اُس نے حسب الحکم جعفر قیدی کے حوالے کر دیں۔ اس کے پاس چھ ہزار روپے کے منی آرڈر بھی تھے۔ وہ ان باغیانہ مقاصد کو اچھی طرح سمجھتا تھا جس کے لیے اُسے ملازم رکھا گیا تھا۔"

"عبدالکریم، محمد شفیع قصاب کا خفیہ ایجنٹ تھا اور باغیانہ مقاصد کے لیے پٹنہ کے منی آرڈروں کا روپیہ دلواتا۔ اس مقصد کے لیے وہ یحییٰ علی سے خط کتابت بھی کرتا۔"

"تھانیسر کا حسینی اس سازش میں محمد جعفر اور محمد شفیع قیدیوں کا خفیہ ایجنٹ اور دلال تھا۔ وہ ۲۹۰ اشرفیاں محمد شفیع کو دینے کے لیے جاتا ہوا پکڑا گیا۔ اس کا کام ان اشرفیوں کو ملکا کے دشمنوں تک پہنچانا تھا۔"

"عبدالغفور، پٹنہ میں یحییٰ علی کا مرید تھا جسے اُس نے جعفر قیدی کی مدد کے لیے تھانیسر میں متعین کر رکھا تھا ــــ وہ رنگروٹ بھرتی کرنے کے کام میں معاونت کے علاوہ یحییٰ علی کے ساتھ باغیانہ امور کے سلسلے میں خط کتابت بھی کرتا۔ الٰہی بخش کا کام جمع شدہ روپے کو تھانیسر میں مولوی جعفر کو بھجوانا تھا۔

○

فیصلہ سن کر نکلے تو کچہری کے احاطے میں خلقِ خدا بھری ہوئی تھی۔ کتنے ہی لوگ زار زار رو رہے تھے۔ بہت سے دم بخود ساکت کھڑے تھے۔ باہر نکلتے ہی کپتان پارسنز، مولوی صاحب کے پاس گیا اور بولا: "مولوی! تم کو پھانسی کا حکم ہوا ہے تم کو رونا چاہیے، تم کس واسطے بشاش ہے؟"

"شہادت کی اُمید پر" مولوی صاحب نے چلتے چلتے جواب دیا۔ "جو ایک مسلمان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے، تم اسے کیا جانو؟"

جیل خانے پہنچ کر پھانسی پانے والے تینوں "مجرمانِ عشق" کے عام کپڑے اتروا کر کیبر وارنگ کے کپڑے پہنا دیے گئے اور انھیں الگ الگ پھانسی کی کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا۔ باقی آٹھ مجرم عام قیدیوں کی بارکوں میں بھیج دیے گئے۔

گرمی شباب پر تھی۔ پھانسی کی تنگ و تاریک کوٹھڑیاں جہنم کا نمونہ بنی ہوئی تھیں۔ پہلی رات سخت عذاب میں کاٹی۔ اگلے روز ڈاکٹر نے حکم دیا کہ کوٹھڑیوں کے دروازے کھلے رکھے جائیں ۔۔۔ اور ایک ایک سپاہی ان دروازوں پر متعین کر دیا جائے تاکہ یہ لوگ کوٹھڑیوں سے باہر نہ نکلیں۔ پھانسی کی سزا سنائے جانے کے بعد یہ حضرات کوئی ڈھائی مہینے ان کوٹھڑیوں میں رہے۔ قیدِ تنہائی کے یہ ایام انھوں نے بڑے صبر و استقامت سے کاٹے۔ امیر کارواں کا تو رنگ ہی اور تھا۔ تنہائی کے اس عالم میں تختۂ دار کے کنارے پہنچ کر بھی ان کا فیض جاری تھا۔ جب بھی کوئی پہرہ دار سپاہی یا قیدی سامنے آتا، مسلمان ہوتا تو اُس کو توحید کی دعوت دیتے، قبر اور آخرت کے عذاب سے ڈراتے، مشرکانہ رسوم و عقائد سے باز رہنے اور فکر و کردار کو صاف ستھرا رکھنے کی تلقین فرماتے۔ پہرے دار سپاہی غیر مسلم ہوتا تو اس آیت کریمہ کا وعظ کرتے۔ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (کیا بہت سے خدا بہتر ہیں یا صرف ایک خدائے قہار) اللہ نے زبان میں ایسی تاثیر دی تھی کہ سننے والے کا دِل موم ہو جاتا اور آنکھوں کے سوتے پھوٹ پڑتے اور وہ لذّتِ حق و صدق میں اس طرح کھو جاتا کہ جب پہرے کی بدلی ہوتی تو اُسے اس صحبتِ جانفزا سے محرومی سخت شاق گزرتی۔ حضرت کی اس دعوت و ارشاد کے نتیجے میں کتنے پہرے والوں کی زندگیوں میں انقلاب آیا، کتنے لوگ موحّد ہو گئے اور کتنے باپ دادے کا دین چھوڑ کر اسلام کی آغوشِ لُطف و کرم میں آ گئے، مولانا عبدالرّحیم کے الفاظ میں "لا یعلمہ الا اللہ۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ آپ کا فیض کبھی بند نہ ہوا، آپ

کا جسم قیدی تھا، مگر دِل و زباں آزاد تھے۔ ان پر حقیقی حاکم کے سوا کسی کی حکومت نہ تھی۔"

اسی زمانے میں قاضی میاں جان فوت ہو گئے۔ وہ بلاکشانِ راہِ حق میں معمر ترین مردِ حق تھے۔ سیشن جج کی نظر میں مولانا یحییٰ علی اور مولوی محمد جعفر کی طرح صفِ اوّل کے مجرم تھے۔ مولانا ولایت علیؒ کے ہاتھ پر بیعت کر کے تحریک میں شامل ہُوئے اور آخر وقت تک اپنے عہد پر پُورے صدق و اخلاص کے ساتھ قائم رہے۔ گرفتاری کے بعد ان پر سخت مظالم ڈھائے گئے، لیکن بڑھاپے کے باوجود ہر عذاب اور اذیت مردِ مومن کی عزیمت اور شان کے ساتھ برداشت کی اور پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ آئی۔ اب وہ ہر آزمائش میں سرخرو ہو کر اپنے مولا سے جا ملے تھے۔ وفات سے ایک دن پہلے خواب دیکھا کہ جواہرات میں جڑا ایک تخت آسمان سے اُترا اور انھیں اس پر بٹھلا کر آسمان پر لے گئے۔ بلاشبہ وہ تخت فردوس سے ان کے لیے آیا تھا اور وہ اسی مرتبہ بلند کے مستحق تھے۔ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ ○

○

کوٹھی لُوٹ گئی

پھانسی دینے کی تیاریاں زور شور سے ہونے لگیں۔ پھانسی کے نئے ریشمی پھندے تیار کیے گئے۔ اِدھر یہ اہتمام ہو رہا تھا اُدھر یہ مردانِ حق انگریزوں کا تماشا بن گئے۔ روزانہ بیسیوں صاحب لوگ اور میم حضرات اپنے بچوں کی انگلیاں پکڑے انھیں دیکھنے آتے۔ دُوسرے عام سزائے موت پانے والوں کے برعکس انھیں شاداں و فرحاں دیکھتے، تو انگشت بدنداں رہ جاتے۔ اکثر پُوچھتے "تمھیں بہت جلد پھانسی ہو گی، تم اتنا خوش کیوں ہو؟"

"ہمارے مذہب میں خدا کی راہ میں ایسے ظلم سے مارے جانے پر درجۂ شہادت ملتا ہے، اس واسطے ہم خوش ہیں۔" یہ لوگ جواب دیتے۔

آہستہ آہستہ یہ بات انگریزوں میں عام ہو گئی کہ راہِ محبت کے یہ راہرو دار کا پھندہ چومنے کے لیے یوں بے قرار ہیں جیسے کوئی عاشقِ زار وصالِ محبوب کے لیے بے چین ہوتا ہے۔ بڑی بے تابی سے گھڑیاں گن رہے ہیں کہ کب وہ لمحہ آتا ہے جب ان کے دِل کی مُراد پُوری ہو گی۔ سرکارِ انگلیشیہ نے سوچا ایسے دُشمنوں کو مُنہ مانگی شہادت کی مَوت نہیں دینی چاہیے۔ انھیں کالے پانی بھیج کر مصائب اور سختیوں سے ہلاک کرنا چاہیے۔

مسٹر پلاوڈن اور گڈآل نے جوڈیشیل کمشنر کی عدالت میں سیشن جج کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دی تھی۔ ۱۶ر دسمبر کو ڈپٹی کمشنر انبالہ نے پھانسی گھروں میں جا کر جوڈیشیل کمشنر کا حکم سُنایا کہ تم لوگ پھانسی پانے کو بہت محبوب رکھتے اور شہادت سمجھتے ہو، اس لیے سرکار تمھیں تمھاری دِل چاہتی سزا نہیں دے گی۔ اُس نے تمھاری سزائے مَوت، حبسِ دوام بعبور دریائے شور سے بدل دی ہے۔

حکم سُنتے ہی تینوں کو پھانسی گھروں سے عام قیدی بارکوں میں منتقل کر دیا گیا۔ جیل خانے کے دستور کے مطابق ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال مونڈ دیے گئے۔ مولانا یحییٰ علی پر عجب کیفیت طاری تھی۔ اپنی ڈاڑھی کے کٹے ہُوئے بال اُٹھا کر بار بار کہہ رہے تھے: "افسوس نہ کر، تو خدا کی راہ میں پکڑی گئی اور اس کی خاطر کاٹی گئی۔"

قیدو بند کی مصیبتیں جھیلتے، مردانِ باخُدا کو آٹھ ماہ ہو چلے تھے۔ یہ سارا عرصہ سخت ابتلا میں گزرا، لیکن سزائے موت میں تخفیف کے بعد جو دَور شروع ہُوا، وہ پہلے سے کہیں زیادہ رُوح فرسا تھا۔ حبسِ دوام کی سزا انھیں دی ہی اس لیے گئی کہ مصائب و آلام کے انگاروں پر تڑپتے ہُوئے سِسک سِسک

کر جان دیں۔ جس عظیم مقصد کی خاطر یہ لوگ تختۂ دار کو چوم کر لوٹے، اُس کا چرچا جیل میں ایک ایک زبان پر تھا۔ جیل خانے کے ملازم اور قیدی جو بھی کسی کام سے ان کی کوٹھڑی کے آگے سے گزرتا، رُک جاتا، عقیدت و احترام سے نگاہیں جُھکا دیتا اور مُبارک باد کے پھُول نچھاور کرتا۔ اِن میں بہت سے وہ تھے جن کی زندگیوں پر چھائے ہُوئے تاریک پردے ان بلاکشانِ عشق کی نُورانی سیرتوں نے چاک کر دیے تھے، لیکن اکثریت ان لوگوں کی تھی جنھوں نے محض ان کا نام سُنا تھا۔ ان میں چور اور ڈاکو بھی تھے اور قتل اور دُوسرے اخلاقی جرائم میں ملوّث افراد بھی، مگر اللہ کے ان بندوں کی محبّت اُن کے دِلوں میں اس طرح گھر کر گئی کہ انھی کا ذِکر اُن کی محفلوں کی جان بن گیا۔ عجیب عجیب کرامات اُن کی طرف منسوب ہو رہی تھیں۔

مُبارک بادی کا یہ سِلسلہ دِن بھر رہا۔ رات حسبِ معمُول اُنھوں نے اپنے رب سے لَو لگائے رکوُع وسجُود میں گزاری۔ دُوسری صُبح، قرآن وحدیث کے درس سے فارغ ہُوئے ہی تھے کہ مجسٹریٹ اور ڈپٹی کمشنر کپتان ٹائی اور سپرنٹنڈنٹ پولیس پارسنز پہنچ گئے۔ سبھی مجرمانِ عشق شاداں وفرحاں تھے۔ میرِ کارواں ذِکرِ الٰہی میں منہمک اور چہرہ، قلبِ مضطرب کو ٹھنڈک اور سکینت بخشنے والے نُور سے روشن۔ کپتان ٹائی کا خُون کھَولنے لگا۔

"داروغہ!" وہ پاگلوں کی طرح چیخا۔ "اِس مولوی سے سخت تر مشقّت لو، ابھی میرے سامنے رہٹ میں جوت دو۔"

"بہت اچھّا، جناب۔" داروغہ جُھک کر آداب بجا لایا۔ اُس نے مولانا یحییٰ علی کو کوٹھڑی سے نکالا۔ دورویہ بارکوں میں سے ہوتے ہُوئے کھُلے کھیتوں میں پہنچے۔ ایک بہت بڑے کنویں پر رہٹ چل رہا تھا۔ آٹھ دس قیدی جُتے ہُوئے تھے۔ مولانا یحییٰ علی کو بھی ان کے ساتھ جوت دیا گیا۔ ستمبر کا سُورج جیسے جیسے اُفق سے بلند ہوتا گیا، آگ کی سی تمازت بکھیرنے لگا۔ مولانا

بڑے صبر و استقامت کے ساتھ مشقت میں مصروف تھے۔ دُوسرے لوگ تھک جاتے، تو باری باری سستانے بیٹھ جاتے، مگر حضرت کام میں لگے رہتے۔ جیل حُکام کے مقرر کردہ وقت پر سستانے یا پھر نماز کا وقت ہوتا، تو کام چھوڑتے۔ کھانے کے وقفے میں اپنے مشقتی ساتھیوں کو شرک و بدعت سے اجتناب اور اسلامی احکام کے مطابق صاف ستھری زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے۔

مولانا، سارا دن رہٹ کھینچتے رہے۔ دُوسرا دِن بھی اسی جان کاہ مشقت میں گزر گیا۔ تیسرے دِن سخت گرمی اپنا اثر دکھانے لگی اور پیشاب میں خُون آنے لگا۔ ساتھی مشقتیوں نے ہر چند کہا: حضرت! درخت تلے بیٹھ جائیے آپ کے حصے کی مشقت ہم انجام دے لیں گے۔ جمعدار بھی راضی تھا، مگر اس صاحبِ عزیمت نے کام چوری سے انکار کر دیا اور پہلے دن کی طرح صبر و شکر سے رہٹ چلاتے رہے۔

چوتھے دن جیل کا سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر بٹسن آیا۔ نو وارد قیدیوں کا ملاحظہ کیا۔ مولانا کو رہٹ میں جتے دیکھا اور جب پتہ چلا کہ انھیں پیشاب میں خُون آرہا ہے، تو داروغہ پر برس پڑا: "اس قیدی کو ایسے جان لیوا کام پر کیوں لگا دیا گیا ہے؟"

"مجسٹریٹ بہادر خُود لگا کر گئے تھے۔" داروغہ نے عرض کی۔

سپرنٹنڈنٹ جیل کی مجسٹریٹ سے اَن بَن تھی۔ اپنے حدودِ اختیار میں اس مداخلت پر چراغ پا ہو گیا۔ لمبی "ہُوں" کی اور دانت پیستے ہُوئے بولا: "اِسے وہاں سے فارغ کرو اور کسی اور کام پر لگاؤ۔" داروغہ نبی بخش اور نائب داروغہ رحیم بخش دونوں ان مردانِ حق کی عظمتوں سے واقف اور ان کی اُجلی شفّاف سیرت سے متاثر ہو چکے تھے۔ ان کی دِلی خواہش تھی کہ ان حضرات سے برائے نام مشقت لی جائے، لیکن مجسٹریٹ کے آگے کچھ پیش نہ جا سکتی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ نے گویا اُن کی خواہش پُوری کر دی۔ نبی بخش نے مولانا کو سُوت

کھوسنے کے ہلکے کام پر لگا دیا۔ مولوی محمد جعفر، مولانا عبدالرحیم اور محمد شفیع سے کاغذ کوٹنے کی مشقت لی جارہی تھی۔ محمد شفیع کو بھی سُوت کھوسنے کا کام دے دیا ـــــ مولوی محمد جعفر کو حکم ہُوا ردی کاغذ پھاڑ پھاڑ کر چوبچے میں پھینکتے رہو۔ مولانا عبدالرحیم اور دُوسرے اسیرانِ بلا کو بھی مختلف آسان کام سونپ دیے۔

مشقت کا کام اگرچہ ہلکا ہوگیا، مگر جیل آخر جیل تھی۔ پیٹ بھر کھانا بھی نہ ملتا۔ دو پتلی چپاتیاں اور وہ بھی ریت سے بھری ہُوئیں۔ روٹیوں کے ساتھ کبھی دال ہوتی اور کبھی ساگ کے موٹے موٹے ڈنٹھلوں کی ترکاری، گوشت، دُودھ، دہی اور گھی تو کسی قیدی کو خواب میں بھی دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ جو کچھ ملتا ناچار زہر مار کرتے، مگر پیٹ کی آگ نہ بُجھتی۔ یُوں لگتا کچُھ کھایا ہی نہیں۔ بھوک زیادہ ستاتی تو قیدی جیل کے احاطے میں اُگی ہُوئی گھاس پر لوُٹ پڑتے۔ گھاس ختم ہوگئی تو درختوں کے پتّوں کی باری آئی۔ ہر طرف بھوک، ہائے بھُوک کا شور تھا، مگر صبر و رضا کے یہ پیکر ہر سختی چُپ چاپ سہہ رہے تھے۔ جیل کی غیر صحت مندانہ فضا، گھاس پھُوس اور ناقص و ناکافی غذا رنگ لائی۔ اچانک تپِ محرقہ اور سرسام کی وبا پھُوٹ پڑی۔ قیدی مکھیوں کی طرح مرنے لگے۔ مولانا یحییٰ علی ایک مہینے سخت بیمار رہے۔ الٰہی بخش کے حواس جاتے رہے اور واہی تباہی بکنے لگا۔ اس کی گردن پر پلاستر لگایا گیا۔ میاں عبدالغفار بھی بیمار ہوگئے اور ان سب کو ہسپتال منتقل کرنا پڑا۔ صرف مولانا عبدالرحیم محفُوظ رہے۔ وہ اپنی مشقت بھی پُوری کرتے۔ دوپہر اور شام ایک ایک گھنٹے کی چُھٹی ملتی، تو ہسپتال جاکر بیمار ساتھیوں کی دیکھ بھال بھی کرتے، اُن کے نجاست آلُود کپڑے دھوتے اور تیمارداری کرتے۔ مولوی محمد جعفر کئی روز تک ہسپتال میں بے ہوش پڑے رہے۔ انگریزی دوائیں بے اثر ثابت ہُوئیں۔ آخر ڈاکٹر ٹیسن نے انھیں دیسی دوائیں استعمال کرنے کی اجازت دے دی جن سے وہ جلد ہی شفایاب ہوگئے۔ اکثر قیدی آناً فاناً

ختم ہوئے۔ اِدھر تپ چڑھا، اُدھر سرسام ہُوا اور بیمار چل بسا۔ بارکیں خالی کروا دی گئیں اور جیل سے باہر خیمے نصب ہو گئے جن کے چاروں طرف خاردار تاروں کی قدِ آدم باڑھ تھی، مگر بخار نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ قیدیوں میں موت کی دہشت پھیلی ہُوئی تھی۔ عزیزوں سے دُور، بے کسی کی حالت میں مَوت کا تصوّر سخت سوہانِ رُوح تھا، مگر وہ جنھوں نے اَللہ کے راستے میں دُنیاوی بکھیڑے تج دیے تھے، اُن کا رنگ ہی اَور تھا۔ مَوت ان کے لیے وصالِ محبُوب کا ذریعہ تھی اور وہ اُسے لبّیک کہنے کو ہر وقت تیار تھے، لیکن موت ان کی قسمت میں نہ تھی، اُن میں سے ہر فرد کو ابھی آزمائشوں سے گزرنا اور اپنے کردار کے نقوش، تاریخ کے صفحات پر چھوڑنا تھے، چنانچہ وہ ایک بار پھر مَوت کے مُنہ میں جا کر لَوٹ آئے۔ وبا تھمی، تو ایک چوتھائی قیدی، قیدِ حیات اور بندِ غم دونوں سے چھٹکارا پا چکے تھے۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جن کی قید دو دو چار چار ماہ رہ گئی تھی۔

○

بندی خانے کے شب و روز پھر پلٹ آئے تھے۔ ایک دِن مولوی محمد جعفر کا بھائی محمد سعید ان سے ملنے آیا۔ ڈیوڑھی میں مُلاقات ہُوئی۔ بھائی کو دیکھتے ہی دَوڑ کر ان سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ مولوی صاحب کا دِل دھک سے رہ گیا، تاہم بھائی کو دلاسا دیا۔ اُس نے روتے ہُوئے بتایا والدہ کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ فوت ہو گئیں۔ مولوی صاحب کی آنکھوں تلے ایک لمحے کے لیے اندھیرا چھا گیا اور پھر آنسو بہہ نکلے، زبان نے کہا...... اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ پھر مَوت کی تفصیلات معلوم کیں اور بھائی کو صبر اور ضبط کی تلقین کرتے رہے۔ مُلاقات کا وقت ختم ہُوا، تو دونوں بھائی گریاں اور بوجھل دِل کے ساتھ رُخصت ہُوئے۔

جعفر صاحب کے لیے یہ صدمہ بڑا ہی جانکاہ تھا، مرحومہ صبر و عزیمت کا پیکر تھیں۔ ان کا گھرانا سیّد احمدؒ کی تحریک سے وابستہ ہُوا، تو اُنھوں نے

ہر مرحلے میں صدق و اخلاص کے چراغ جلائے رکھے۔ عورتیں تو ہمات پرستی، عقیدت پسندی اور رسم و رواج کی کچھ زیادہ ہی اسیر ہوتی ہیں اور ان زنجیروں کو کاٹنا ان کے لیے آسان نہیں ہوتا، لیکن یہ اپنے خاندان کے مردوں سے بڑھ کر توحید و سنّت کی شیدائی تھیں۔ ابتلا کا جو سلسلہ بیٹے کی گرفتاری سے شروع ہوا اُسے ایک صاحبِ ایمان اور اپنے ربّ کی شکر گزار بندی کی طرح برداشت کیا۔ سیشن عدالت سے سزا یابی کے بعد ابھی بیٹے کی اپیل چیف کورٹ میں دائر تھی کہ ان کی ساری جائداد ضبط کر لی گئی تھی کہ ان کے دوسرے بیٹے کا حصّہ بھی انگریزوں کی آتشِ انتقام سے نہ بچ سکا۔ مولوی جعفر صاحب نے اپنی جائداد کا بڑا حصّہ اپنی بیوی اور بچّوں کے نام کر دیا تھا، مگر انگلشیہ سرکار کی لاقانونیت کے آگے کوئی قانون نہ ٹھہر سکا۔ زمینیں اور مکان چھن جانے کے بعد یہ خاتون اپنے رشتہ داروں کی دست نگر بن کر رہ گئیں، لیکن اپنی زبان کبھی شکوہ و شکایت سے آلودہ نہ کی۔ ہمیشہ دامنِ صبر مضبوطی سے تھامے رکھا۔ ایمان کی پختگی کا یہ عالم کہ سانپ نے کاٹا، تو عزیزوں نے کہا جوگی بلواتے ہیں وہ منتر پڑھے گا اور زہر اُتر جائے گا، مگر اُنھیں سختی سے روک دیا اور بولیں: "میرے گھرانے سے شرک و بدعت اور تعویذ گنڈے، مدت ہوئی اُٹھ چکے ہیں، اب میں اپنی جان بچانے کے لیے پھر سے اُنھیں اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دوں گی، ایسی بے ایمانی کی زندگی سے موت افضل ہے۔"

مولوی محمد جعفر کا صدمہ ان کے ہر رفیق نے اس طرح محسوس کیا جیسے خود اُس کی اپنی والدہ کا انتقال ہو گیا ہو۔ دن بھر سب اُداس اور دلگیر رہے۔ اُسی رات مولانا یحییٰ علی، مراقبے میں گئے۔ فارغ ہوئے تو مولوی صاحب! میں نے آپ کی والدہ کو دیکھا بڑی شان سے

شوکت سے ایک بلند تخت پر بیٹھی ہیں، پوچھا "یہ مرتبۂ عالی آپ کو کس سبب سے ملا ہے" فرمانے لگیں: "اپنے بیٹے کے مصائب پر صبر کرنے اور رضائے الٰہی کے آگے سر جھکا دینے پر میرے رب نے مجھے بخش دیا اور اس مرتبۂ بلند سے نوازا ہے۔"

○

جن دنوں مولانا یحییٰ علی اور ان کے ساتھیوں کا مقدمہ سیشن عدالت میں پیش ہوا اور ان اصحاب کو پھانسی گھروں سے نکال کر حوالات میں بھیجا گیا، ان کے پڑوس میں ایک نئے قیدی کا اضافہ ہوا۔ چہرے بشرے سے ذہین اور پڑھا لکھا نظر آتا اور آنکھوں کی چمک عیاری کا پتہ دیتی تھی۔ شاید نو گرفتارِ بلا تھا۔ ہر وقت بجھا بجھا اپنی دنیا میں کھویا رہتا۔ اڑوس پڑوس والوں پر نگاہِ غلط انداز تک نہ ڈالتا۔ پتہ چلا مجیب الدین نام ہے اور نارنول کا رہنے والا ــ تحصیلدار تھا اور رشوت ستانی کے جرم میں سرکار کا مہمان ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ جان آنی چلی گئی۔ پڑوسیوں کے معاملات میں دلچسپی لینے لگا۔ جب بھی ملنا ہوتا بڑے تپاک سے ملتا اور عجز و نیاز سے پیش آتا۔ مولانا یحییٰ علی کے آگے تو فرطِ عقیدت سے بچھ بچھ جاتا۔ محمد شفیع کے ساتھ اس کی گاڑھی چھننے لگی۔ اسی کے مشورے پر مولانا عبدالرحیم وکیل کرنے پر آمادہ ہوئے تھے ورنہ وہ مولوی محمد جعفر صاحب کی طرح اپنا مقدمہ خود ہی لڑنا چاہتے تھے۔

کوٹھی لٹنے کے بعد یہ حضرات یکجا ہوئے تو انھوں نے ایک بار پھر مجیب الدین کو اپنا پڑوسی پایا اور پھر اُس کی زندگی میں تبدیلی رُونما ہونے لگی۔ ان لوگوں نے اس انقلاب کو کچھ زیادہ اہمیت نہ دی۔ درحقیقت ان کی شخصیتیں اپنے اندر کچھ ایسی کشش رکھتی تھیں کہ جو بھی ان سے ملتا، ان کی طرف کھنچا چلا آتا۔ جیل میں ہر قسم کے لوگ تھے، مگر سب ان کی راہوں میں دیدہ و

دِل بچھاتے۔ مولانا یحییٰ علی تو گویا اُس عقیدت و محبّت کا مرکز تھے۔ پھانسی گھر میں جتنی مدّت رہے، نگاہ و دل کا فیض جاری رہا۔ کتنے ہی لوگ مسلمان ہو گئے اور کتنوں ہی نے شرک و بدعات اور ہندوانہ طور طریقے اور غیر اسلامی رسم و رواج چھوڑ دیے۔ قیدیوں میں مشہور تھا حضرت جس پر نظر کرتے ہیں، اُس کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ مجیب الدّین کی زندگی میں تغیّر اس لحاظ سے اپنے اندر کوئی چونکا دینے والا پہلو نہ رکھتا تھا۔ اب وہ ان لوگوں میں اچھی طرح گھُل مل گیا تھا۔ فرصت کے اوقات انھی کے ساتھ کاٹتا۔ جیل میں اس پر کوئی پابندی نہ تھی۔ جب چاہتا ان لوگوں میں آ کر بیٹھ جاتا، ذکر و فکر کی مجلسوں اور قرآن و حدیث کے درس میں شریک ہوتا......

ایک روز نائب داروغہ رحیم بخش تنہائی میں مولوی محمّد جعفر سے مِلا۔ کہنے لگا: "میاں صاحب ایک راز کی بات بتانے آیا ہُوں۔ اپنے ساتھیوں کو مجیب الدّین سے بچا کر رکھیے۔ یہ ڈپٹی کمشنر اور کمشنر کا فرستادہ ہے۔ انھی کے ایما پر اسے آپ کے پڑوس میں رکھّا گیا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں نا، یہ کتنی آزادی سے جیل میں مٹر گشت کرتا پھر رہا ہے۔ آپ کو خبر نہیں؟ یہ شخص آپ کے رفقا سے چوری چھُپے مِلتا رہتا ہے...... غالباً حکومت، تحریک کے کچھ اور افراد پر مقدّمہ چلانا چاہتی ہے۔ یہ آپ کے ساتھیوں کو ورغلا کر سُلطانی گواہ بنانے آیا ہے۔ حُکّام نے وعدہ کیا ہے اس مِشن میں کامیاب ہو گئے، تو تمھیں رہا کر کے نوکری پر بحال کر دیا جائے گا۔"

مولوی جعفر خود بھی اس شخص سے مطمئن نہ تھے۔ اُس کا رنگ ڈھنگ اور طور اطوار اُنھیں بُری طرح کھٹک رہے تھے۔ اب حقیقتِ حال سے پردہ اُٹھ گیا۔ معًا خیال آیا محمّد شفیع اور بعض دُوسرے ساتھیوں سے جیل کے حُکّام کا برتاؤ بالکل بدل چُکا ہے۔ وہ محمّد شفیع کو زردہ پلاؤ اور دُوسرے مُرغن اور لذیذ کھانے فراہم کر رہے ہیں۔ لانے والے کہتے تمھارے گھر سے آتے ہیں جب بھی کھانا

آتا وہ سب مِل کر کھاتے۔ یہ خصوصی نوازش بھی بسا اوقات جعفر صاحب کے ذہن میں کانٹا بن کر چُبھنے لگتی، مگر وہ اس انتظام کو داروغہ اور نائب داروغہ کی ہمدردی اور عقیدت پر محمول کر کے مطمئن ہو جاتے۔

رحیم بخش کے انکشاف پر مولوی صاحب کا ذہن فوراً عظیم آباد کی طرف مُڑ گیا۔ مقدمے کے دوران ہی میں ان کے وکیل پلاوڈن نے اُنھیں بتا دیا تھا اگر آپ لوگوں کی اپیل چیف کورٹ نے مسترد کر دی تو حکومت مولانا احمد اللہ پر بھی مقدمہ چلائے گی۔ سُلطانی گواہوں کی شہادت میں اُن کا ذکر بار بار آتا رہا تھا۔ "گویا مولانا پر مقدمہ چلانے کا فیصلہ ہو چکا ہے اور تحریک کے کارکُن ابھی مزید آزمائے جائیں گے۔" مولوی محمد جعفر نے جی ہی جی میں کہا۔ مولانا یحییٰ علی مشقت میں مصروف تھے، مولوی صاحب اُنھیں ایک طرف لے گئے اور نائب داروغہ کا بتایا ہُوا سارا قِصّہ گوش گزار کر دیا۔

اُسی روز جعفر صاحب نے مُنشی عبدالغفور سے پُوچھا: "یہ مجیب الدین کیسا آدمی ہے؟ تم لوگوں سے بڑی پینگیں بڑھا رہا ہے۔"

عبدالغفور نے بات ٹالنے کی کوشش کی، مگر مولوی صاحب نے آخر اُگلوا ہی لیا: "کہتا تھا ساری عمر جیل میں سڑتے رہنے کا کیا فائدہ؟ حکومت سے تعاون کرو، تمھاری سزا معاف ہو جائے گی۔"

"تعاون؟ کاہے کو؟"

"شاید کسی مقدمے میں گواہ مطلوب ہیں۔"

"تو وہ آپ لوگوں کو سُلطانی گواہ بنانا چاہتا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"پھر کیا ارادے ہیں؟"

"مَیں تو اس کی باتوں پر مُسکرا دیتا ہُوں، مگر محمد شفیع، الٰہی بخش اور عبدالکریم کے قدم لڑکھڑاتے نظر آتے ہیں۔"

"اور حسینی بھائیوں کا کیا حال ہے؟" ان کی مراد حسینی تھا نیسری اور حسینی عظیم آبادی سے تھی۔

"ابھی تک تو ثابت قدم ہیں، کون جانے کل کیا ہو گا؟ میاں صاحب! بہت کڑی آزمائش آپڑی ہے۔ حضرت صاحب اور آپ دعا فرمائیں اللہ فتنے سے محفوظ رکھے اور ہمارے قدم ڈگمگانے نہ پائیں۔"

"ہاں بھائی، واقعی کڑا وقت ہے۔ ہماری دنیا تو خراب ہو گئی، ایک دین باقی رہ گیا ہے، جھوٹے گواہ بن کر کہیں وہ بھی ہاتھ سے نہ گنوا بیٹھیں اور پھر دھوبی کے اُس کتے کی طرح ہو جائیں جو گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔"

○

مولوی جعفر صاحب اور مولانا یحییٰ علی دونوں دیر تک چپکے چپکے باتیں کرتے رہے، پھر مولانا عبدالرحیم اور میاں عبدالغفار بھی مشاورت میں شریک ہو گئے۔ طے پایا اپنے ساتھیوں کو اُس جال سے بچانے کی سر توڑ کوشش کی جائے جو عیار صیاد بچھا رہا ہے۔

حضرت صاحب (مولانا یحییٰ علی) کا معمول تھا نمازِ فجر کے بعد کچھ دیر روزانہ قرآن و حدیث کا درس دیتے۔ اب یہ درس، رات سونے سے پہلے بھی ہونے لگا۔ موضوع جو بھی ہوتا، بات اللہ کی راہ میں پیش آنے والے مصائب و آلام پر صبر و استقامت اور اُس کے ثواب و اجر پر ختم ہوتی۔ حضرت کی زبان میں اللہ نے ایسی تاثیر دی تھی کہ ایمان تازہ ہو جاتا، دلوں پر چھایا ہوا خوف و اضمحلال جاتا رہتا، آدمی اپنے اندر بڑی سے بڑی طاقت کے ساتھ ٹکرا جانے کی ہمت پاتا۔ دن کے اوقات میں بھی یہ حضرات اپنے کمزور ساتھیوں کے قریب رہنے کی کوشش کرتے، ان کے حوصلے بڑھاتے۔ لڑکھڑاتے قدموں کو سہارا دیتے اور دل و دماغ میں یہ بات بار بار بٹھاتے کہ ہماری لغزش پا ہمیں کہیں کا نہ چھوڑے گی۔ دُنیا تو برباد ہو ہی چکی ہے، آخرت بھی برباد ہو جائے گی۔ اس تگ و دو کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔

پھسلتے ہوئے قدم جم گئے، دِلوں میں عزیمت کی لو از سرِ نو جاگ اُٹھی، حق کی خاطر مصیبتیں اور سختیاں سہنے کا جذبہ پھر سے جواں ہو گیا۔ مجیب الدین کو اپنی ساری سازش خاک میں ملتی نظر آئی۔ اُس نے ڈپٹی کمشنر کو رپورٹ دی جب تک یہ چار حضرات موجود ہیں، کوئی کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔ رپورٹ ملتے ہی احکام جاری ہو گئے۔ یحییٰ علی، محمد جعفر، عبدالغفار اور عبدالرحیم فوری طور پر باقی چھ قیدیوں سے الگ کر دیے جائیں اور پھر اوّل الذکر تین قیدیوں کو لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا جائے۔ عبدالرحیم ابھی انبالہ جیل ہی میں رہیں گے۔

دوسری بارک میں منتقل ہونے سے پہلے حضرت صاحب نے پیچھے رہ جانے والے چھ ساتھیوں کو اللہ کی راہ میں ثابت قدم رہنے اور دشمن کے پھیلائے ہوئے دام کا ذکر کیے بغیر اُس سے ہوشیار رہنے، اپنے رب کا دامن کسی حالت میں نہ چھوڑنے اور مقصدِ زندگی سے وابستہ رہنے کی تلقین کی۔ ان لوگوں کے دل کی کیفیت ان کے چہروں سے پڑھی جا سکتی تھی۔ وہ سخت پریشان تھے اور یوں محسوس کر رہے تھے جیسے انھیں سمندر کے بیچوں بیچ پھینک دیا گیا ہو اور پہاڑ سی موجیں انھیں نگلنے کے لیے اُمڈی چلی آتی ہوں۔

سبھی ساتھی بے حد متاثر تھے۔ عبدالغفور کی پلکوں پر تو اشکوں کے موتی جھلملانے لگے۔ اُس نے مولانا یحییٰ علی کے گھٹنے تھام لیے اور عرض کی "حضرت دُعا فرمائیے۔ اللہ اس کٹھن راستے پر چلتے رہنے کی ہمّت و طاقت عطا فرمائے۔ آپ کا وجود ہمارے لیے طمانیت کا سرمایہ تھا، آپ کی حضوری میں ہمارے دِل سکینت اور ایمان کی تازگی حاصل کرتے تھے۔ آپ کے بغیر ہماری زندگیاں ابتلا کے اس ہولناک طوفان میں بے لنگر سفینے بن کر رہ جائیں گی۔ ملّاح اور رہبر سے محروم سفینے۔"

"میرے بھائی!" حضرت نے فرمایا۔ اُن کا لہجہ شفقت اور محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ "انسان فانی اور حقیر ہے اور اللہ کی ذات پائندہ و قادرِ مطلق۔ آدمی

کو چاہیے اُسی پر بھروسہ اور توکّل کرے کہ وہی سرچشمۂ طاقت ہے، وہی سمندر دں میں کشتیوں کو چلاتا اور بحر و بر کی ظلمتوں میں راہِ راست دکھاتا ہے۔ آپ لوگ اُسی سے لَو لگائیے، اُسی سے مدد طلب کیجیے، اُسی سے راہِ حق میں ثابت قدم رہنے کی دُعا کرتے رہیے۔ صبر اور نماز دو ہتھیار ہیں جن سے مسلمان بڑے سے بڑے دُشمن کو سرنگوں کر لیتا ہے" —— پھر حضرت نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور سب دیر تک نہایت عاجزی اور زاری سے دُعا مانگتے رہے۔

○

لاہور جیل کا عطیّہ

انبالہ جیل سے ان بلا کشانِ محبّت کی روانگی کا منظر بہت اثر انگیز تھا۔ جیل بھر میں خبر پھیل گئی تھی اور قیدی آتے جاتے ان سے مل رہے تھے۔ جیل خانے میں قیدیوں کے تبادلے عام ہوتے رہتے ہیں اور قید و بند کی زندگی کے خُوگر انھیں کبھی زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ خبر سُن کر کچھ تبصرہ ہوتا ہے اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے، لیکن یہ تبادلہ عام قیدیوں کا تبادلہ نہ تھا۔ جو بھی ملنے آتا رونے لگتا۔ ایسے نکوکار، خوش خصال، صاحبِ ایمان لوگ انھوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ وہ جن کا کردار، نُور کی کرنوں کی طرح ان کی تاریک زندگیوں میں اُجالا کر گیا۔ یہ قیدی ان کی زندگیوں کے لیے انقلاب کے نقیب ہی بن کر نہ آئے تھے، بلکہ بہت سی سہولتیں بھی ساتھ لائے تھے۔ گوشت، دُودھ، دہی اور گھی وغیرہ ضابطے کی رُو سے قیدیوں پر حرام تھے، لیکن انھیں جیل میں آئے کچھ ہی مدّت گزُری تھی کہ یہ نعمتیں، قیدیوں کو فراہم کرنے کے احکام جاری ہو گئے۔ قیدی اسے اِن بزرگوں کی کرامات سمجھتے تھے۔ (عجیب بات یہ کہ ان کے جاتے ہی یہ مراعات، قیدیوں سے واپس لے لی گئیں) مولوی محمد جعفر کی بیوی اور بچے بھی ان سے ملنے آئے۔ چھوٹا بھائی محمد سعید اور دُوسرے عزیز اُن کے ساتھ تھے۔ مولوی صاحب نے کوئی سوا برس بعد پہلی بار اپنے بچوں کو دیکھا۔ اُن

کا بیٹا محمد صادق اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ وہ اُسے بمشکل پہچان سکے۔ بچے تو اپنی معصوم دُنیا میں گم تھے جہاں رنج و غم کا احساس ہوتا ہے نہ مسرت و شادمانی کا ادراک۔ لیکن بیوی، بھائی اور دوسرے عزیز جانتے تھے کہ اب زندگی میں ملاقات قسمت ہی سے ہو گی۔ کون کہہ سکتا تھا جانے والا، انڈمان سے کبھی واپس بھی آسکے گا اور آ گیا تو ان الوداع کہنے والوں میں کوئی اس وقت زندہ سلامت بھی ہو گا۔ سب اشکبار آنکھوں سے اُنھیں الوداع کہہ رہے تھے۔ بیوی کی تو انتہائی ضبط کے باوجود دبی دبی سسکیاں نکل گئیں۔ مولوی صاحب صبر و استقامت کا پہاڑ تھے، مگر تھے تو انسان۔ جذبات کی پرچھائیاں آنکھوں کے آئینے میں جھلملانے لگیں، لیکن فوراً سنبھل گئے۔ بیوی اور عزیزوں کو صبر و سکوں کی تلقین کرتے اور تسلی دیتے رہے۔

○

تیس چالیس قیدیوں کا قافلہ ۲۲ فروری کو علی الصباح فجر کی نماز کے بعد جیل سے روانہ ہوا، تو فضا زنجیروں کی جھنکار سے گونج اُٹھی۔ گیروا لباس بدن پر تھا اور ہاتھوں اور پاؤں میں ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے زیور۔ سورج نکلا، تو کہر میں لپٹا اور ٹھٹھرتا ہوا۔ یخ بستہ ہوا کی وجہ سے سردی اور چمک اُٹھی تھی۔ قیدی پھٹے پُرانے سیاہ کمبل اوڑھے، ٹھٹھرتے، کپکپاتے دو دو کی قطار میں پا پیادہ چلے جا رہے تھے۔ دو گاڑیاں ساتھ تھیں۔ جب کوئی قیدی تھک جاتا، تو گارد کے سپاہی اُسے گاڑی میں بٹھا لیتے۔ اسی قافلے میں یہ تین اسیرانِ محبت بھی تھے۔ سوا برس کے بعد پہلی مرتبہ انھیں باہر کی کھُلی ہوا کھانے کا موقع مِلا تھا۔ یوں محسوس ہوا آزاد فضا میں ہاتھ اور پاؤں میں پڑی ہوئی زنجیریں کٹ گری ہیں۔ شہر سے دور نکل گئے، تو سپاہیوں نے بھی ضابطے کی پابندیوں پر زور دینا چھوڑ دیا۔ قیدی کسی بستی سے گزرتے، تو جو چاہتے خرید کر کھاتے اور ہنستے کھیلتے خوش خوش رواں دواں رہتے۔ بہلیاں، یکّے اور گاڑیاں، جرنیلی سڑک پر آ جا رہی تھیں۔ گاہے گاہے

پیدل چلتے ـــــ مسافروں کا بھی سامنا ہوتا۔ ایک جیل سے دُوسری جیل جانے ہُوئے قیدی اکثر دیکھنے میں آتے، اس لیے آنے جانے والے لوگ اس قافلے میں زیادہ دلچسپی نہ لیتے۔ بس دو ایک لمحے کے لیے رُکتے، حسب توفیق ہمدردی یا نفرت کے جذبات ان کے دل میں اُمڈتے اور پھر اپنی راہ لیتے۔ کسی کو خبر نہ تھی ان قیدیوں میں تین ایسے قیدی بھی ہیں جن پر کیڑے مکوڑوں کی سی زندگی بسر کرنے والے ہزاروں آزاد افراد قربان کیے جا سکتے ہیں، راستے کی خاک جن کی پابوسی پر نازاں ہے اور جن کے طفیل قیدیوں کے اس قافلے کا ذکر تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جانے والا ہے۔

قافلہ دِن بھر چلتا رہا۔ رات ایک تھانے میں گزاری۔ صبح مُنہ اندھیرے بیڑیاں کھڑکھڑاتے منزلِ مقصود کی طرف پھر روانہ ہو گیا۔ راستے میں پٹیالہ کے مہاراجہ مہندر سنگھ کی برات بڑے دُھوم دھڑکے سے جاتی ہُوئی ملی۔ صبح کا سہانا وقت تھا اور اخیر فروری کے گلابی جاڑے۔ سُورج مشرقی اُفق سے دُھند کی نقاب اوڑھے اُبھرا تھا، مگر اُس کی حِدت کے آگے یہ نقاب جلد ہی تحلیل ہو گیا اور سُورج کی شعاعیں سونے چاندی میں غرق ہاتھیوں اور گھوڑوں اور زرق برق لباس پہنے ہُوئے براتیوں پر پڑ رہی تھیں اور ان کے انعکاس سے آنکھیں خیرہ ہُوئی جاتی تھیں۔ ایک عجیب عبرتناک منظر تھا جسے ان مردانِ باخدا کی چشمِ بصیرت ہی دیکھ سکی ـــــ

"ایک طرف سونے چاندی، تاش بادلے اور ہیرے جواہرات کی چمک دوسری طرف بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کے لوہے کی دمک۔ اُدھر دوشالے، بانات اور کمخواب کا رنگ، اِدھر جوگیوں کا سا لباس اور سُرخ و سیاہ بوسیدہ کمبلوں کا فقیرانہ ڈھنگ۔ اُدھر ہاتھیوں اور گھوڑوں کی ہنکار اور اِدھر بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی جھنکار ـــــ اور آدمی کتنا سادہ لوح ہے کہ ظاہری احوال سے دھوکا کھا کر یا تو نشۂ تند میں بدمست ہو جاتا ہے یا اپنے آپ سے اور اپنے خدا سے مایوس۔ حالاں کہ دُنیا کی عزّت و ذلّت اور بلندی و پستی ایک ظاہری چیز اور چند روزہ کھیل

ہے۔ ظاہر کے پردے میں چھپی ہوئی حقیقت بے نقاب ہوگی تو کتنے ہی بلند و عظیم لوگ پست و نگوں سار نظر آئیں گے اور آج کے معیار کی رُو سے کتنے ہی پست و حقیر سربلندی اور عظمتِ ابدی سے ہمکنار ہوں گے۔"

مولوی محمد جعفر انہی خیالوں میں محو مہاراجہ کی برات دیکھتے رہے، یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

سفر کے دوران حضرت صاحب (مولانا یحییٰ علی) کے احوال سب سے جُدا تھے۔ ہر وقت ذکرِ الٰہی میں منہمک رہتے۔ قافلہ پڑاؤ کرتا، تو قیدیوں کو وعظ و نصیحت کرتے۔ ان کی صحبت و معیّت سے سارے مُسلمان قیدی اور نگران سپاہی، نمازی بن گئے۔ نماز کا وقت ہوتا تو قافلہ رُک جاتا اور سب، حضرت صاحب کی اقتدا میں باجماعت نماز پڑھتے۔ غیر مُسلم قیدی بھی بڑی عقیدت مندی سے پیش آتے۔ کہتے ہیں پارس لوہے سے چھُو جائے تو اُسے سونا بنا دیتا ہے۔ حضرت صاحب پارس تھے، ایک بار جو اُن سے چھُو گیا کُندن بن گیا۔

منزل پر منزل طے ہوتی رہی اور قافلہ لُدھیانہ، پھلور، جالندھر اور امرتسر ہوتے ہُوئے لاہور پہنچ گیا۔ شالامار باغ کے سامنے خوانچے والوں کا ہجوم تھا، قیدی اُن پر ٹوٹ پڑے۔ اپنی پسند کی چیزیں خریدیں اور جی بھر کر کھائیں۔ وہ جانتے تھے سنٹرل جیل کی بلند و بالا دیواریں جونہی انھیں اپنی سنگین بانہوں میں لیں گی ریت بھری روٹی اور دال کے شوربے کے سوا کچھ کھانے کو نہ ملے گا۔ حسرتِ شکم پوری کرکے آگے بڑھے۔ سنٹرل جیل کے دروازے پر پہنچے تو شام کے تین بج رہے تھے۔

انبالہ سے آنے والے تمام قیدی ایک قطار میں دروازے کے پاس بٹھا دیے گئے۔ پہلے جیل کا داروغہ آیا۔ وہ کشمیری ہندو تھا۔ اُس نے قیدیوں کی لمبی قطار پر پھیلتی ہُوئی نظر ڈالی اور پھر ان تین مردانِ حق کی طرف غور سے دیکھا جن کے چہرے پکار پکار کر کہہ رہے تھے یہ گرفتارانِ ہوس نہیں، اسیرانِ محبت ہیں۔

ہلکی سی پرچھائیں اُس کے گورے چٹے چہرے پر چھا گئی۔ دبی زبان میں اظہارِ افسوس کرتا رہا۔ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ جیل ڈاکٹر گھرے بھی آپہنچا۔ آتے ہی ان عشاقِ وفا کا ملاحظہ کیا، آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ دہاڑا: "ایک ایک آڑا ڈنڈا ابھی ان لوگوں کے پاؤں میں ڈال دو"..... یہ صاحب بہادر کی محض انتقامی کارروائی تھی، ورنہ پوری لاہور جیل میں کسی شخص کے پاؤں میں ایسا آہنی ڈنڈا نہ تھا۔ ان لوگوں کے لیے چلنا پھرنا اور اُٹھنا بیٹھنا دوبھر ہوگیا، پاؤں پسار کر سو بھی نہ سکتے، مگر ہر حال میں راضی برضا اور صابر و شاکر رہنے والے ان مردانِ عظیم کی زبان پر اب بھی کوئی حرفِ شکایت نہ تھا۔

○

ایک اور راہروِ محبت

صادق پور کے عظیم گھرانے پر آزمائش کے تیرہ و تار بادل روز بروز گھنیرے ہوتے جا رہے تھے۔ محبوب سے عشق و محبت کا جو شخص جتنا زیادہ مدعی ہوتا ہے اُس کی آزمائش اتنی ہی کڑی ہوتی ہے۔ اس گھرانے نے اُس رسم ورہِ محبت کو تازہ کیا تھا جس کی بِنا، تیرہ صدی قبل راہِ حق پر چلنے والے پہلے قافلے نے ڈالی تھی۔ یہ رسم اِس گھرانے کے اپنے ہی چشم و چراغ مولانا ولایت علی نے سید بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کر کے ڈالی تھی۔ سید بادشاہ کی شہادت کے بعد اسی خاندان نے ان کی جانشینی کا حق ادا کیا۔ احیائے دین اور جہادِ فی سبیل اللہ کی تقریباً ایک سو سال کے عرصے پر پھیلی ہوئی داستان اسی خانوادے کی قیادت میں دی جانے والی قربانیوں اور خود ان کی اپنی سرفروشیوں کی داستان ہے۔

سید صاحب کے بعد مولانا ولایت علی جانشین ہوئے اور جب مجاہدین کی طلب پر سرحد چلے گئے، تو ہندوستان کا مرکز ان کے چھوٹے بھائی مولانا فرحت حسین نے سنبھالا۔ وہ فوت ہوئے، تو ان کے عزیز مولانا یحییٰ علی نے کام جاری

رکھا۔ وہ خود بھی سرحد میں سکھوں اور انگریزوں کے خلاف لڑتے رہے تھے اور ان کے بھائی اور عزیز بھی۔ مولانا فرحت حسین کے انتقال پر واپس ہندوستان آئے اور تحریک کی زمامِ قیادت ہاتھ میں لے کر مجاہدین کو پیسہ اور رنگروٹ فراہم کرتے رہے۔ ان کے تمام قریبی عزیز اس کام میں ان کے معاون تھے۔ مولانا یحییٰ علی اور فرحت حسین صاحب کے صاحبزادے مولانا عبدالرحیم گرفتار ہوئے، تو تحریک کی سربراہی مولانا یحییٰ علی کے بڑے بھائی مولانا احمد اللہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔

مولانا احمد اللہ، سید بادشاہ کے خلیفہ تھے۔ اپنے دوسرے بھائیوں اور عزیزوں کے برعکس ہمیشہ پٹنہ ہی میں رہے۔ کبھی نہ سرحد گئے اور نہ وہاں کی معرکہ آرائیوں میں عملاً کوئی حصہ لیا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ تنخواہ دار سرکاری افسر اور بہت سے اعزازی مناصب پر فائز تھے۔ پھر گھرانے کے تمام مرد تحریک کے کاموں میں ہمہ تن مصروف تھے، اس لیے زمینداری اور جائداد کی دیکھ بھال اور پورے کنبے کے مصارف کا انتظام انھی کے ذمے تھا۔

مولانا، عظیم آباد کی بڑی با اثر شخصیت تھے۔ سرکاری حلقوں میں ان کی عزت و احترام کا یہ عالم تھا کہ ۱۸۵۷ء میں پٹنہ کے کمشنر ولیم ٹیلر نے انھیں احتیاطی تدبیر کے طور پر بے قصور گرفتار کر لیا تو حکومت نے اُسے معطل کر دیا۔ ولیم ٹیلر، پٹنہ ہی میں وکالت کر رہا تھا۔ مولانا یحییٰ علی اور اُن کے ساتھی گرفتار ہوئے اور مقدمہ چلا، تو یہ شخص بھی سرگرمِ عمل ہو گیا۔ اُدھر شہر میں مولانا کے کئی حاسد تھے۔ انھیں لوگوں نے ۱۸۵۷ء میں مولانا کی چغلی کھائی تھی۔ اب انھیں بھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ چیف کورٹ پنجاب نے مقدمۂ انبالہ کی اپیل کا فیصلہ ستمبر میں کیا، نومبر میں مولانا گرفتار کر لیے گئے۔

○

مولانا کے خلاف حکومت نے جو مواد جمع کیا اُس میں کوئی چیز اُنھیں

مجرم قرار دینے والی نہ تھی۔ انبالہ کیس کے ملزمین، خصوصاً الٰہی بخش ایسی شہادت دے سکتا تھا جس کی بنیاد پر انگلیشیہ سرکار، مولانا کو سزا دے کر اپنی آتش کینہ بجھا سکتی تھی، مگر نومبر کے بعد دسمبر بھی گزر چلا تھا اور پنجاب کے حکام ان ملزموں کو اپنے ڈھب پر نہ لا سکے تھے۔ اُدھر بنگال گورنمنٹ جلدی مچا رہی تھی۔ مقدمے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی، بس گواہوں کا انتظار تھا، وہ آتے تو مقدمہ شروع ہوتا۔ آخر دسمبر کے آخری عشرے میں مجیب الدین کی مایوس کن رپورٹ ملی اور حکام نے چند دن کے اندر اندر اُن چار قیدیوں کو اپنے ساتھیوں سے الگ کر دیا جو حکومت کے منصوبے میں زبردست رکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ ان کے دوسری بارک میں منتقل ہوتے ہی الٰہی بخش، محمد شفیع اور عبدالکریم سرنگوں ہو گئے (باقی تین قیدی۔ عبدالغفور، حسینی تھانیسری اور حسینی عظیم آبادی ...... کئی سال تک حکومت کے دباؤ کا مقابلہ کرتے رہے، لیکن آخر کاران کے قدم بھی پھسل گئے اور وہ ۱۸۷۱ء میں تحریک کے ممتاز کارکنوں کے خلاف چلنے والے مقدمے میں سرکاری گواہ بن گئے)

پنجاب سے الٰہی بخش، محمد شفیع اور عبدالکریم کے علاوہ پانچ اور گواہ پٹنہ پہنچ گئے تھے۔ الٰہی بخش چوں کہ پٹنہ کا تھا اور اندیشہ تھا کہ لوگ اس سے ملے تو منحرف نہ ہو جائے اس لیے پولیس اُسے چھپا کر لائی۔ پٹنہ سے ایک اسٹیشن ادھر کھگوال پر اُتار لیا اور وہاں سے برقع پہنا کر یکّے میں لائی۔ جب تک عدالت میں پیش نہ ہوا کسی کو اس کے آنے کی خبر نہ تھی۔ تمام سرکاری گواہوں کو پولیس کی نگرانی میں مجسٹریٹ کے بنگلے میں رکھا گیا۔ ۶ر جنوری ۱۸۶۵ء کو مولانا کا مقدمہ قائم مقام مجسٹریٹ مسٹر منرو کی عدالت میں پیش ہوا اور اس نے فردِ جرم عائد کر کے انھیں سیشن سپرد کر دیا۔

مقدمہ انبالہ کی طرح اس مقدمے میں بھی حکومت کا طرزِ عمل شروع ہی سے معاندانہ تھا۔ ابھی مقدمہ مجسٹریٹ کی عدالت ہی میں تھا کہ پٹنہ کا سیشن جج تبدیل کر دیا گیا۔ وہ منصف مزاج اور عادل تھا اور اس کی موجودگی میں حکومت مولانا احمداللہ

کو سزا نہ دلوا سکتی تھی۔

مقدمہ شروع ہُوا۔ گواہوں نے وہی رٹے رٹائے بیانات دیے۔ پہلے اِن کا ہدف مولانا یحییٰ علی اور اُن کے ساتھی تھے اور اب مولانا احمد اللہ۔ ایک گواہ نے بیان میں کہا کہ جس زمانے میں فیاض علی اور یحییٰ علی (دونوں مولانا کے بھائی تھے) کا پڑاؤ ستھانہ میں تھا عظیم آباد میں مولوی فرحت حسین (مولانا ولایت علی کے بھائی اور مولانا عبد الرحیم کے والد) اور مولوی احمد اللہ لوگوں سے روپے تحصیل کرتے اور اسلحہ اور سامان جمع کرتے۔ ایک اور گواہ نے کہا مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی کے دورِ امارت میں بھی ان کے مشیر تھے۔ ایک اور گواہ نے بتایا کہ مولوی احمد اللہ ان خفیہ جلسوں میں موجود ہوتے تھے جن میں مولوی یحییٰ علی تقریر کرتے اور رضا کاروں کو انگریزوں سے جہاد کرنے کی ترغیب دیتے۔ لیکن یہ شہادتیں سب بالواسطہ شہادتیں تھیں۔ الٰہی بخش کی شہادت واحد براہِ راست شہادت تھی۔ اُس نے تحریک کے ساتھ اپنی وابستگی اور صادق پور کے مرکزی رہنماؤں سے گہرے تعلقات کی لمبی داستان بیان کی۔ صادق پور کا مرکز جس طرح کام کرتا اور ملک بھر میں پھیلی ہُوئی شاخوں کو کنٹرول کرتا اور رضا کاروں کی تربیت کرتا اور ستھانہ بھیجتا تھا اس کی مفصّل رُوداد سُنائی۔ اُس نے بتایا کہ سرحد بھیجنے کے لیے رقوم اُسی کے پاس جمع ہوتی تھیں۔ یہ رقوم مولوی احمد اللہ کی معرفت جمع ہوتیں اور اُنھی کے حکم سے برآمد کی جاتیں۔ احمد اللہ کا عرفی نام عبد الغفار تھا۔ اُس نے یہ بیان دیا کہ جعفر کی طرف سے جو خطوط احمد علی کے نام سے آتے انھیں مولوی احمد اللہ ہی وصول کرتے۔

ساری گواہیاں جھوٹ کا طُومار تھیں۔ مولانا احمد اللہ نے تحریک میں عملی حصّہ مولانا یحییٰ علی کی گرفتاری کے بعد لیا جب قیادت کا بوجھ ان کے سر پر آن پڑا۔ اور یہ وہ زمانہ تھا جب پُورے برِّصغیر میں داروگیر کا بازار گرم تھا اور تحریک کے بے شمار کارکن پکڑے گئے تھے اور بے شمار رُوپوش ہو چکے تھے۔ ہر طرف

دہشت چھائی ہوئی تھی۔ حکومت کی صادق پورا اور اس کی سرگرمیوں پر کڑی نظر تھی ایسی حالت میں مولانا احمد اللہ تحریک کا جیسا کچھ کام کر سکتے تھے اس کا اندازہ کچھ مشکل نہیں۔ پھر گواہ سب وہ تھے جنھیں اس وقت گرفتار کیا گیا تھا جب کہ ابھی مولانا احمد اللہ نے تحریک کی زمام قیادت سنبھالی ہی نہ تھی۔ گواہوں کے بیانات اور وکیلِ صفائی کی جرح سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ وہ سب ایک جھوٹے مقدمے کے جھوٹے گواہ ہیں۔

گواہیاں اور ان پر جرح ہو چکی تو وکیلوں کی بحث شروع ہوئی۔ وکیلِ صفائی نے اپنے استدلال کی بنیاد اس اولے موقف پر رکھی کہ دفعہ ۱۲۱، ملک کے اندر جنگ کرنے کے ارادے سے تعلق رکھتی ہے۔ وکیل نے یہ نکتہ بھی اٹھایا کہ ایکٹ ۲، ۱۸۵۵ء کی دفعہ ۲۸ کے تحت کوئی شخص، دو آدمیوں کی شہادت کے بغیر بغاوت کا مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس مقدمے میں اس کے مؤکل کو صرف ایک الٰہی بخش کی شہادت پر ملزم قرار دیا گیا ہے۔ وکیلِ صفائی نے الٰہی بخش کی شہادت کی قدر و قیمت پر طویل بحث کی اور اس کے بخیے ادھیڑ دیے اور کہا "یہ شہادت اس لائق بھی نہیں کہ اسے ایک کتے کو بھی پھانسی دینے کے لیے کافی سمجھا جائے۔ اس شخص کو حبسِ دوام بعبور دریائے شور اور ضبطیٔ املاک کی سزا دی جا چکی ہے۔ ایسا آدمی اگر سرکار کے حق میں شہادت دیتا ہے تو اپنے مفاد کی خاطر دیتا ہے، قانون کی نظر میں جس کی کوئی وقعت نہیں۔" سیشن جج مسٹر اینسلے نے سارے دلائل مسترد کر دیے اور ۲۷ فروری کو فیصلہ سنا دیا: "احمد اللہ بغاوت کا مجرم پایا گیا ہے، اسے سزائے موت اور املاک ضبط کر لینے کی سزا دی جاتی ہے۔"

جس شہادت پر کسی کتے کو بھی موت کی سزا نہ دی جا سکتی تھی، اس کی بنیاد پر اپنے عہد کے ایک عظیم عالم و فاضل، ولی اللہ کو تختۂ دار پر لٹکا دینے کا حکم صادر ہو گیا۔

کلکتہ ہائی کورٹ میں سزا کے خلاف اپیل دائر کی گئی۔ ۱۲۔ اپریل کو اُس نے بھی فیصلہ سُنا دیا۔ سزائے موت، حبسِ دوام بعبور دریائے شور میں بدل دی اور املاک بحق سرکار ضبط کرنے کی سزا بحال رکھی۔

فیصلہ ہوتے ہی مولانا احمد اللہ طوق و سلاسل میں جکڑے کالے پانی بھیج دیے گئے۔ مقدمۂ انبالہ کے سزا یافتہ، ابھی لاہور جیل ہی میں تھے کہ مولانا جُون ۱۸۶۵ء میں انڈمان پہنچ گئے۔

○

رہ و رسمِ منزل

لاہور سنٹرل جیل میں پہلے پہل ان اصحاب کو الگ الگ بارکوں میں رکھا گیا۔ حضرت صاحب سے جُدائی، مولوی محمد جعفر اور میاں عبدالغفار پر بڑی شاق گزری، مگر پھر حکم ہُوا انبالہ جیل کے قیدی یکجا رکھے جائیں اور انھیں دوسرے قیدیوں سے ملنے نہ دیا جائے۔ یہ لوگ وبا زدہ جیل سے آتے ہیں، کہیں یہاں بھی بیماری نہ پھیلے۔ فراق کے بعد ملاپ کا منظر بہت مسرّت انگیز تھا۔ اُنھیں نمبر ۱ بارک میں رکھا گیا تھا۔ بارک کا جمعدار بڑا بھلا مُسلمان تھا، حضرت صاحب کی صحبت نصیب ہُوئی، تو انہی کا ہو کر رہ گیا۔ ان لوگوں سے برائے نام مشقت لیتا۔

انبالہ کا حلقۂ تربیت اب لاہور میں منتقل ہو چکا تھا۔ حضرت صاحب کا فیض یہاں بھی جاری ہو گیا۔ آپ قیدیوں کو پند و نصیحت کرتے۔ چونکہ زیادہ تر قیدی بدکاری، چوری اور ڈکیتی کے جرائم میں پکڑے ہُوئے آتے تھے اس لیے آپکے وعظ کا موضوع یہی رُسوا کن افعال ہوتے۔ قیامت کے اندھیروں اور دنیاوی زندگی کے ایک ایک لمحے کی پُرسش کا ذکر کرتے، دوزخ کے عذاب سے ڈراتے، توبہ کے فضائل بیان فرماتے، توحید کا درس دیتے اور نماز روزے کی تلقین فرماتے۔ رُوح کی ابدی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل اور حضرت صاحب

کی زبان پُر اثر! بقول غالب۔ ع

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

دِلوں کی دُنیا زیروزبر ہو جاتی

انبالے اور لاہور جیل کے زمانۂ قیام میں سینکڑوں چوروں اور ڈاکوؤں نے توبہ کی اور عہد کیا کہ اب ان بُرائیوں سے اپنا دامن کبھی آلودہ نہ کریں گے۔ صدہا موحّد اور نمازی بن گئے۔

لاہور سنٹرل جیل میں مرزی نامی ایک بلوچ ڈاکو مقید تھا۔ پُشتوں سے چوری اور ڈکیتی پیشۂ آبا چلا آتا تھا۔ نہایت قوی ہیکل تھا۔ جیل کے حُکّام اس کی شرارتوں اور نافرمانیوں سے سخت عاجز اور نالاں تھے۔ مشقّت بالکل نہ کرتا۔ سینکڑوں بید کھا چُکا تھا، مگر کبھی اُف تک نہ کی۔ ہر سزا کے بعد ذوقِ جرم اور جواں ہو جاتا۔ بیڑی اور ڈنڈا بیڑی، ہتھکڑی، طوق اور قیدِ تنہائی، غرض سرکش قیدیوں کا دماغ درست کر دینے والا جیل کا ہر حربہ آزمایا گیا، لیکن بے سُود و بے اثر! اُس کا تمرّد اور چیرہ دستیاں بڑھتی چلی گئیں۔ داروغہ اور جمعدار اُس سے ڈرتے۔ موقع پاکر وہ انھیں بھی ہتھکڑی سے پیٹ ڈالتا۔ خوش نصیبی اور سعادت مندی وقت کا انتظار کر رہی تھی۔ حضرت صاحب کا بستر اور اُس کا ایک ہی جگہ ہو گیا اور آپ کی پند و نصیحت سے تھوڑے ہی عرصے میں اس کی کیفیّت بدل گئی۔ زندگی کا پرانا خول اُس نے اُتار پھینکا۔ اب وہ بالکل نیا اِنسان تھا۔ شریف، خدا ترس اور صالح اِنسان۔ سرکاری مشقّت بے چوں وچرا کرنے لگا۔ اس عظیم کایا پلٹ پر داروغہ اور جیل کے حکّام متحیّر ہو کر رہ گئے۔ ہتھکڑی اور طوق وغیرہ اتار دیے گئے اور اُسے پارچہ بافی کے کارخانے میں بھیج دیا گیا جہاں بڑے بڑے میعادی قیدی کام کرتے تھے اور عُمدہ اور زیادہ کام کرنے پر سال میں دو ایک مہینے قید معاف بھی ہو جاتی تھی۔ آدمی ذہین تھا۔ پارچہ بافی کا کام بہت جلد سیکھ لیا اور نہایت عُمدہ کپڑا بُننے لگا۔ مولانا عبدالرّحیم لاہور جیل پہنچے تو وہاں اُنھوں نے اس مرزی بلوچ کو دیکھا۔ وہ پانچوں وقت نماز بڑی

پابندی سے پڑھتا اور اپنے گزشتہ اعمال کو یاد کر کے خوفِ خُدا سے اکثر روتا ـــــ وہ فی الواقع ولی بن چکا تھا ـــــ حضرت کا وجود قید خانے میں بالکل اُس چراغ کا سا تھا جس سے اندھیرے کافور ہو جاتے ہیں اور روشنی پھیل جاتی ہے۔ حضرت صاحب کے فکر و کردار کے چراغ سے سینکڑوں دِلوں سے چھاتے ہُوئے اندھیارے چھٹ گئے اور ہدایت کی روشنی سے معمُور ہو گئے۔ جیل کے اہل کار، حضرت صاحب کی اس کرامات پر حیران اور متعجب تھے۔ ہندو آپ کو دیوتا اور اوتار سمجھتے اور مُسلمان وَلی۔

○

قیدی ان مردانِ حق کیش کی قربانیوں اور سیرت و کردار سے بے حد متأثر تھے۔ ان کے لیے مصائب تک جھیلنے پر آمادہ ہو جاتے۔ گجر دم قیدیوں کی "پریڈ" ہوتی۔ قیدی اپنا بستر اور دوسرا سامان، کوٹھڑی سے باہر قطار میں قرینے سے رکھ کر بیٹھ جاتے ـــــ ایک روز سپرنٹنڈنٹ نے پریڈ کے وقت آتے ہی قیدیوں کی تلاشی کے احکام جاری کر دیے۔ تلاشی ہونے لگی۔ کسی کے پاس سے گھی نکلا اور کسی سے شکر۔ مولوی صاحب کی باری آئی، تو ان کے بستر میں سے تھوڑا سا نمک نکل آیا۔ جیل کی اِصطلاح میں مولوی صاحب کی "بدمعاشی" پکڑی گئی تھی۔ یہ ایک ایسا قصور تھا جس کی سزا میں بید لگائے جاتے۔ سپرنٹنڈنٹ نے کھا جانے والی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ مولوی صاحب سٹپٹا گئے کہ کیا جواب دیں۔ اچانک ایک قیدی بول اُٹھا: "جناب یہ بستر اور نمک میرا ہے۔ مولوی صاحب کا نہیں۔" مولوی صاحب نگاہ اُٹھائے بغیر آواز ہی سے پہچان گئے۔ یہ صندل کی آواز تھی جو انبالہ جیل سے ان کے ساتھ آیا تھا۔

"وہ کیسے؟" سپرنٹنڈنٹ نے پُوچھا۔

"حضور کے تشریف لانے سے پہلے مولوی صاحب اُور مَیں دونوں سنڈاس گئے تھے، اس اثنا میں حضور آ گئے، ہم جلدی سے دوڑ کر آئے، تو گھبراہٹ

سپرنٹنڈنٹ نے قہقہہ لگایا اور کہا: "تم مولوی کو بچاتا ہے؟ حیلہ! ابھی پتہ چلتا ہے یہ چیزیں کس کی ہیں"

جن لوگوں کی "بدمعاشیاں" پکڑی گئیں، انھیں بارک سے باہر لے جایا گیا اور بید مارے جانے لگے۔ سب "جرم ناسزا" کی سزا پا چکے، تو سپرنٹنڈنٹ نے صندل سے پوچھا: "یہ بستر اور نمک تمھارا ہے یا مولوی کا؟ سچ سچ کہو"

"ہے تو میرا، آگے آپ کو اختیار ہے مانیں یا نہ مانیں" صندل نے جواب دیا۔

"تم مولوی کی چمڑی بچانا چاہتا ہے..... مگر خیر، میں نے تم دونوں کو معاف کیا، آئندہ ایسی حرکت کی تو کھال اُدھڑ جائے گی" سپرنٹنڈنٹ نے کہا اور چلا گیا۔

○

حضرت صاحب اور اُن کے ساتھی لاہور جیل میں کوئی آٹھ مہینے رہے۔ اپریل کے اواخر میں سات آٹھ ماہ بعد پٹنہ سے مولوی محمد حسن، اپنے ماموں، مولانا یحییٰ علی سے ملنے آئے۔ وہ مولانا ولایت علی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے اور سولہ سترہ سال کے نوجوان تھے۔ انبالہ اور عظیم آباد کے دونوں مقدمات کی پیروی انھی نے کی تھی۔ وہ بڑی اہم خبریں لاتے تھے۔ انھی کے ذریعے پہلی مرتبہ ان اسیرانِ قفس کو پتہ چلا کہ مولانا احمد اللہ کو حبسِ دوام اور ضبطیٔ املاک کی سزا ہو گئی ہے اور الٰہی بخش، محمد شفیع اور عبدالکریم سرکاری گواہ بن گئے ہیں۔ مولوی محمد حسن نے یہ بھی بتایا کہ الٰہی بخش کو اس کی جائداد واپس کر دی گئی ہے اور انعام بھی ملا ہے، یہ خبر عام ہے کہ یہ سرکاری گواہ رہا کر دیے جائیں گے۔ حضرت صاحب نے ساری باتیں سُن کر صرف انا للہ پڑھا اور صبر و شکر کے فضائل بیان کرتے رہے۔

داروغۂ جیل اس ملاقات کے وقت موجود تھا۔ وہ کسی کام سے ادھر اُدھر ہوا تو مولوی محمد حسن نے ایک حیرت ناک انکشاف کیا: "حکومت

نے پیش کش کی ہے کہ بھائی جان (امیر المجاہدین مولانا عبداللہ) کو راضی کر کے واپس بلا لو، نہ صرف سزائیں معاف اور ضبط شدہ جائدادیں بحال ہو جائیں گی، بلکہ چھ لاکھ کی نئی جاگیر بھی ملے گی۔"

"پھر کیا خیال ہے؟" حضرت صاحب نے دریافت فرمایا۔

"بے شک مصائب کی آندھیاں تند و تیز ہیں، ابتلا بہت سخت ہے، بزرگ رخصت ہو گئے، کچھ سرحا میں ہیں اور رہے سہے زندانوں میں محبوس۔ اور ہم نوجوان کمزور اور ناتواں ہیں، لیکن اس پیش کش کو قبول کرنے کا خیال بھی ہماری خاطر میں نہیں گزرا۔ ہم نے اسے اتفاق رائے سے مسترد کر کے کہہ دیا ہے کہ مولوی عبداللہ صاحب کو واپسی پر رضامند کرنا ہمارے بس میں نہیں۔"

"شاید عبدالرحیم کو اسی منصوبے کے تحت ہم لوگوں سے الگ کر لیا گیا ہے۔" حضرت صاحب نے ہولے سے فرمایا۔ داروغہ پھر آ گیا تھا اور بات چیت کا رخ دوسری طرف مڑ گیا۔

○

اکتوبر ۶۵ء کے آخری دن تھے کہ حبسِ دوام کی سزا پانے والے قیدیوں کو انڈمان بھیجنے کے احکام جاری ہو گئے۔ سو سے زائد قیدیوں کا چالان تیار ہو گیا۔ دو دو آدمیوں کو ایک ساتھ ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔ سورج ابھی مشرقی افق سے جھانکنے ہی لگا تھا کہ جیل کا پھاٹک کھلا اور قیدی، ریلوے اسٹیشن کی طرف قطار اندر قطار چل کھڑے ہوئے۔ ایک ہاتھ، ہتھکڑی میں جکڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے انھوں نے سر پر رکھے ہوئے بستر تھامے ہوئے تھے۔ سپاہی جلدی مچا رہے تھے۔ "تیز چلو تیز، ورنہ گاڑی نکل جائے گی۔" حوالدار بار بار چیخ رہا تھا۔ حکمِ حاکم مرگِ مفاجات۔ بھاگم بھاگ اسٹیشن پر پہنچے اور پھر انھیں ڈبوں میں جانوروں کی طرح بند کر دیا گیا۔ موسم خاصا سرد تھا، مگر ایک تو راستے بھر دوڑتے رہنے اور پھر بند ڈبوں میں ٹھونس دینے سے قیدیوں کا پسینہ بہہ رہا تھا۔ ہوا نہ ہونے کے برابر تھی اور دم گھٹتا

محسوس ہوتا۔ خدا خدا کر کے گاڑی چلی۔ راستے میں رُک جاتی، تو یوں لگتا اب کبھی نہ چلے گی۔ سارا دِن گزر گیا، مگر پینے کو پانی ملا نہ کھانے کو روٹی۔ تقریبًا آٹھ بجے رات گاڑی ملتان پہنچی۔ دو تین بتیاں جل رہی تھیں جن کی روشنی چند گز سے آگے نہ جاتی۔ باقی سارا اسٹیشن اور گرد و نواح کا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا؛ البتہ کچھ فاصلے پر شہر میں دِیے ٹمٹماتے نظر آرہے تھے۔ یہاں قیدی اُتر گئے اور سر پر بستر اُٹھائے، اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے جیل پہنچے اور اسی طرح بھوکے پیاسے کوٹھڑیوں میں بند کر دِیے گئے۔

دو دِن ملتان جیل میں رہے اور پھر پانچ کوس پیدل چل کر دریائے سندھ کے کنارے گھاٹ پر پہنچے جہاں ایک اگنبوٹ پہلے سے منتظر تھا۔ جہاز پر سوار ہوتے ہی حکم ہوا دو دو کی قطار میں بیٹھ جاؤ۔ لائنیں لگ گئیں۔ بیڑی، ہتھکڑی اور آہنی ڈنڈے تو پہلے ہی زیبِ تن تھے، اب ایک اور زیور کا اضافہ ہوا۔ ایک بڑی موٹی سی زنجیر، بیڑیوں کے بیچ میں اس طرح ڈال دی گئی کہ کوئی شخص اپنی جگہ سے جنبش نہ کر سکتا۔ رفعِ حاجت بھی سارے رستے وہیں بیٹھے بیٹھے کرتے اور کھانا بھی وہیں کھاتے۔ قیدیوں کے ساتھ جو غیر انسانی سلوک جیلوں میں ہوتا رہا اُس نے اکثر قیدیوں کا احساس ہی مفلوج کر دیا تھا۔ انھیں اس نجاست کا کوئی احساس نہ تھا۔ لیکن حضرت صاحب اور اُن کے رفقا کے لیے یہ مرحلہ بڑا ہی صبر آزما تھا۔ اُن کی پاکیزہ رُوحیں سخت اذیت سے دوچار تھیں۔ برِصغیر کا سب سے بڑا دریا ان کے قدموں تلے بہہ رہا تھا، مگر حضرت صاحب اور ان کے ساتھی اس نجاست آلودہ ماحول میں بیٹھے رہنے اور تیمم کر کے اشاروں سے نماز پڑھنے پر مجبور تھے۔

گیارھویں دِن حیدر آباد سندھ پہنچے اور وہاں سے ریل کے ذریعے کراچی۔

کراچی جیل نسبتًا آرام دہ تھی۔ یہاں قیدیوں کو رات کے وقت بارکوں

ہیں بند نہ کرتے، بلکہ وہ کھلی فضا میں چٹائیوں پر جہاں چاہتے سو جاتے۔ پہریدار جیل کی فصیل پر گشت کرتے رہتے۔ ڈیڑھ برس کے بعد یہاں پہلی بار حضرت صاحب اور اُن کے رُفقاء دمکتے موتیوں سے جڑے سیاہی مائل نیلگوں چھتر کے نیچے سوئے، لیکن آرام کے یہ دِن جیسے پلک جھپکتے گزر گئے۔ آٹھویں روز انھیں بحری جہاز میں بوریوں کی طرح اُوپر تلے بھر کر بمبئی بھیج دیا گیا۔ جہاز ساحل سے تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ لہروں کے زبردست تلاطم نے قیدیوں کی حالت پتلی کر دی۔ دو تین دن ایک دُوسرے پر اُلٹیاں کرتے گزرے۔ بُرے حال۔ بمبئی پہنچے جہاں بیس پچیس میل دُور، تھانہ جیل کا سیاہ پھاٹک انھیں نگلنے کے لیے مُنہ کھولے کھڑا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا قلعہ تھا جو مرہٹوں نے بنایا تھا۔ یہ جیل ہندوستان کے تمام جیلوں سے سخت تصور کیا جاتا اور قیدی اس سے پناہ مانگتے تھے۔ جیل کا داروغہ تو بڑا مردم آزار اور بد دماغ تھا، لیکن نائب داروغہ ابراہیم بہت نیک دل تھا۔ حضرت صاحب کی نگاہِ حق بیں پڑی تو یہ آئنہ اور شفّاف ہو گیا۔ ابراہیم حتّی المقدور خاطر داری کرتا اور ہر ممکن سہولتیں بہم پہنچاتا۔ جیل سے چلتے وقت اُن کی بھاری بھر کم بیڑیاں اتروا کر برائے نام ہلکی ہلکی بیڑیاں ڈلوادیں۔

○

مومن کا جہان ہر کہیں ہے

جمنا جہاز ۸ دسمبر ۱۸۶۵ء کو بمبئی سے انڈمان روانہ ہُوا تو عرشے پر کھڑے ہُوئے قیدیوں نے سرزمینِ وطن پر آخری نظر ڈالی۔ ہر نگاہ اپنی ذات کے خول میں بند تھی۔ اس کی محبّت کا محور اس کا گھر بار، کھیتی باڑی، ماں باپ، بہن بھائی اور اولاد تھی۔ وطن سے رخصت ہوتے وقت یہی خیال ستا رہا تھا کہ وہ جیتے جی اپنے پیاروں اور ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ سکیں گے یا نہیں —— لیکن تین قیدی ایسے بھی تھے جن کی نگاہ و خیال میں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ تھی۔ ان کی محبت کا مرکز وہ دعوتِ حق تھی جس کے لیے

انھوں نے اپنی ہر وہ متاع قربان کر دی تھی جس کی خاطر ایک عام آدمی جیتا اور مرتا ہے۔ وہ اپنی کشتیاں جلا کر آرہے تھے۔ انھیں اس کی بھی فکر نہ تھی کہ وہ ایک اجنبی سرزمین میں جا رہے ہیں جہاں کے شب و روز نہ جانے کتنے صعوبت ناک ہوں گے۔ وہ مسلمان تھے اور مسلمان جہاں پہنچ جاتا ہے، اپنی دنیا آپ بنا لیتا ہے۔ انھیں صرف اس تحریک کا خیال تھا جسے ہزاروں مردانِ خدا نے اپنے پاک خون سے سینچا تھا اور جس کے کارکن پشاور سے مدراس تک ابتلا اور مصائب کے جانگسل دور سے گزر رہے تھے۔

جب تک ساحل نظر آتا رہا قیدی اپنے اپنے خیالات میں گم اسے دیکھتے رہے۔ نظروں سے اوجھل ہو گیا، تو کتنے ہی دلوں سے اٹھنے والی آہیں، آنسو بن کر ٹپک پڑیں۔ اب وہ تھے اور چاروں طرف حدِ نظر تک پھیلا ہوا پانی۔ سمندر رفتہ رفتہ طوفانی رنگ اختیار کرتا چلا گیا۔ اکثر قیدی بیمار ہو گئے۔ ایک بیچارہ پنجابی قیدی تو چل بھی بسا۔ سیلون کے قریب پہنچے، تو سمندر سخت متلاطم تھا۔ سینکڑوں ٹن کا جہاز، ننھے سے بے مایہ گیند کی طرح اچھل رہا تھا۔ کبھی پہاڑ کی طرح بلند و بالا موجیں ایک طرف سے آتیں، کبھی دوسری جانب سے اور اسے بری طرح ہلا کر رکھ دیتیں۔ کبھی وہ اس کے اوپر سے گزر جاتیں، یوں لگتا جہاز ابھی غرق ہو جائے گا۔ لوگوں کا برا حال تھا۔ وہ چیخ چیخ کر خدا کو پکار رہے تھے۔ کئی گھنٹے کے بعد طوفان تھما اور مسافروں کی جان میں جان آئی۔

۲۴ ویں روز ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو جہاز انڈمان کے پانیوں میں داخل ہوا۔ سینکڑوں چھوٹے چھوٹے ہرے بھرے جزیرے دور سے پھیلی ہوئی گہری سبز چادر دکھائی دیتے تھے۔

اب ساحل نظر آنے لگا تھا۔ قیدیوں کی بڑی تعداد عرشے پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ کیا دیکھتے ہیں بھینسوں کے جھنڈ کے جھنڈ پانی میں پھر رہے ہیں۔ قریب پہنچے، تو معلوم ہوا وہ بھینسیں نہیں، سیاہ پتھر ہیں۔ ایک کشتی میں پورٹ بلیئر کے

محافظ آ پہنچے اور جہاز لنگر انداز ہوگیا۔ پھر بڑی بڑی کشتیاں پہنچ گئیں اور قیدی اُن میں بیٹھ کر انڈمان کے صدر مقام رَوس کی طرف چل پڑے۔

کنارے پر جمِ غفیر کھڑا تھا۔ وضع قطع سے سب پڑھے لکھے مولوی اور منشی دکھائی دیتے تھے۔ سفید فاخرانہ لباس زیبِ تن تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے کے جرم میں عمر قید کی سزا بھگت رہے تھے۔ انھیں دوسرے ہزاروں افراد کی طرح ۱۸۵۸ء میں یہاں بھیج دیا گیا تھا۔ ان میں علماء، صُلحاء، مفتی، قاضی، ڈپٹی کلکٹر، مصنف، صدر امین، صدر الصّدور، رسالہ دار، صُوبہ دار اور جمعدار ہر طبقے کے افراد تھے۔ حضرت صاحب کی کشتی ابھی ذرا دُور ہی تھی کہ ایک آدمی کنارے پر سے بلند آواز میں پکارا: ”مولوی یحییٰ علی اور محمد جعفر بھی اس جہاز سے آئے ہیں؟“

”جی ہاں، آئے ہیں۔“ مولوی جعفر نے جواب دیا۔

یہ سُننا تھا کہ وہ لوگ پانی میں کُود پڑے اور ہنوں کو ہاتھوں ہاتھ کشتی سے اُتار لیا۔ ساحل پر قدم رکھتے ہی پہلی خبر یہ ملی کہ مولانا احمد اللہ چھ مہینے پہلے ۱۵ر جُون ۱۸۶۵ء کو یہاں پہنچ گئے تھے۔ یہ لوگ انھی کے بھیجے ہُوئے آئے تھے۔ حضرت صاحب کی آمد آمد کی خبر دو روز پہلے پہنچنے والے جہاز کے اُن قیدیوں نے دی تھی جو تھانہ جیل سے بمبئی تک ان کے ساتھ آئے تھے۔

مولانا احمد اللہ، انڈمان کے چیف کمشنر کے میر منشی سید اکبر زماں[1] کے مکان پر مقیم تھے۔ بندرگاہ سے یہ لوگ سیدھے وہیں گئے۔ مولانا کے ساتھ اور بھی کئی معززین منتظر تھے ——— مولانا احمد اللہ اور حضرت صاحب کی مُلاقات کا منظر بہت اثر انگیز تھا۔ گرم جوش معانقے کے بعد بیڑیاں کاٹ دی گئیں۔ عُمدہ

---

[1] اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ درس و تدریس شغل تھا پھر قلعہ آگرہ میں منشی ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد گرفتار ہُوئے اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ہُوئی۔ تقریباً بیس برس کے بعد رہا ہُوئے۔

لباس پہلے سے تیار رکھا تھا، گیروا کپڑے اُتار کر اور نہا دھو کر پہن لیا، پھر دسترخوان بچھ گیا جس پر انواع واقسام کے لذیذ کھانے چُن دیے گئے۔ تین برس بعد پہلی بار پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

○

جیل کے مصائب اور سختیاں ختم ہو چکی تھیں۔ حضرت صاحب کو سید اکبر زمان نے اپنے ماتحت ہلکا سا کام سونپ دیا تھا جسے وہ اپنے بڑے بھائی کی طرح گھر پر ہی بیٹھ کر انجام دیتے۔ میاں عبدالغفار نے نمبر سازی کا کام سیکھ لیا اور سید اکبر زماں کا ہاتھ بٹانے لگے۔ مولوی محمد جعفر کچہری میں نائب میر منشی لگ گئے۔ ان کاموں کی باقاعدہ تنخواہ ملتی۔ اللہ کے یہ بندے اس آسائش کے عالم میں بھی اتنے ہی شکر گزار تھے جتنے جیل کی دیوار کے پیچھے ہُوا کرتے۔ انھیں سختیاں بے صبر اور ناشکرا بنا سکیں نہ آسائشیں، تن آسان اور غفلت کیش۔ مولانا احمد اللہ خاموش کارکنوں میں سے تھے۔ سرکاری کام انجام دینے کے بعد زیادہ وقت قرآن مجید کی تلاوت، نماز اور ذکر و دُعا میں گزارتے اور اپنے ملنے جُلنے والوں کو توحید اور حُسنِ عمل کی تلقین فرماتے۔ ان میں قیدی بھی ہوتے اور پولیس اور پلٹن کے آدمی بھی۔ تقریباً ہر شخص موحّد، نماز روزے کا پابند اور تہجّد گزار بن گیا..... مگر حضرت صاحب، متحرک شخصیت تھے۔ کارِ سرکار سے فارغ ہو کر لوگوں کو قرآن و حدیث کی تعلیم دیتے، پند و نصیحت کرتے، گھر گھر پھرتے، عورتوں اور مردوں کو نماز سکھاتے، قرآن پڑھاتے، اُن کے دُکھ سُکھ اور موت فوت میں شریک ہوتے۔ اُن کی اس جدّ و جہد سے زندگیوں میں انقلاب آ گیا۔ لوگ پکّے نمازی بن گئے، شرک و بدعات کی رسوم ختم ہو گئیں، عقائد درست ہو گئے اور ہر طرف نیکیوں کی بادِ بہاری چلنے لگی۔

انڈمان پہنچے چند ہی مہینے گُزرے تھے کہ دونوں بھائیوں کو مولوی محمد حسن کا مکتوب ملا۔ انھوں نے اطلاع دی تھی کہ حکومت نے تمام جائداد ضبط

کر لی ہے اور پورے گھرانے کے مرد، عورتیں اور بچے عین عید کے روز اس طرح اپنے گھروں سے نکال دیے کہ صرف کپڑے ان کے جسم پر تھے، سوئی تک نہ لے جانے دی۔ یہی نہیں مسکونہ مکانات اور اجداد کی قبریں تک کھود کر پھینک دیں اور ان پر ہل چلا دیا۔ مولوی محمد حسن کے خط سے ظاہر ہوتا تھا سب مرد و زن سخت پریشان خاطر اور لڑکھڑا رہے ہیں۔ فطرتاً دونوں بھائیوں کو بھی صدمہ ہوا؛ تاہم مومنانہ حوصلے سے برداشت کیا۔ اُسی رات نبی کریمؐ نے مولانا یحییٰ علی کو زیارت سے مشرف فرمایا، تبسم کناں فرمانے لگے: "مکانوں کے انہدام سے مالکانِ مکان خصوصاً عورتوں کو بہت رنج والم ہوا ہے اور ہونا بھی چاہیے۔" پھر ارشاد فرمایا: "اِن آیات کو وردِ زباں رکھو:

وَبَشِّرِ الصّابرین الّذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا اِنّا لِلّٰہِ واِنّا الیہ راجعون ٥ اولئک علیھم صلوٰتٌ من رّبّھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون ٥

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ دشمنانِ خدا اس کے دوستوں کو اچھی طرح ستالیں اور پھر اس کا اچھی طرح بدلہ پائیں ..... اَللہ کا شکرِ عظیم کرو کہ تم ایسے امتحان کے لائق ٹھہرے۔"

آنکھ کھلی، تو آئینۂ دل سے رنج وغم کی دُھند چھٹ چکی تھی اور طبیعت میں بے حد انشراح تھا۔ بڑے بھائی کو اس مکاشفے سے آگاہ فرمایا اور اہلیہ کے نام خط میں پوری تفصیل لکھ کر انھیں صبر و استقامت کی تلقین فرمائی۔ اُس روز حضرت پر عجیب وجدانی کیفیت طاری تھی۔ وہ بار بار کہہ رہے تھے:

دریائے عشقِ خالق دونوں جہاں ہیں ہم
نام ونشان دارِ فنا کے ڈبا چکے
کفنی گلے میں ڈال کے تسمہ کمر کے بیچ
ہم جوگی ہوئے محرم اسرار کے لیے

اے خدائے من فدایت جانِ من
جملہ فرزندانِ خان و مانِ من

بچھڑا ساتھی

مولانا عبدالرّحیم کو حکومت نے انبالہ جیل ہی میں روک لیا تھا۔ یہ ایک نئی ابتلا کا پیش خیمہ تھا۔ امیر المجاہدین مولانا عبداللہ، اُن کے چچا زاد بھائی تھے۔ حکومت چاہتی تھی کہ وہ جہاد سے دستبردار ہو جائیں اور پٹنہ واپس چلے آئیں۔ مولانا عبدالرّحیم اُن کے ساتھ مذاکرات کا بہترین ذریعہ ہو سکتے تھے۔ حکومت نے پیش کش کی کہ اگر مولانا واپسی پر آمادہ ہو جائیں تو وہ سزائیں معاف اور املاک بحال کر دے گی اور مزید انعامات سے بھی نوازے گی، لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ مولانا عبدالرّحیم نے صاف اِنکار کر دیا۔ ان پر سخت دباؤ ڈالا گیا وہ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔ آمادہ ہو بھی جاتے تو مولانا عبداللہ اس پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیتے۔ یہ وہ مقصد تھا جس کے لیے سید صاحب اور ان کے ساتھیوں نے جانیں دی تھیں، جس کی خاطر اُن کے اپنے خاندان کے بزرگوں نے دُنیا کا راحت و آرام تج دیا تھا اور وہ تین عشروں سے مسلسل تگ ودَو اور جنگ و جہاد کی زندگی بسر کرتے آ رہے تھے اور خاندان کے کتنے ہی افراد اس راہ میں سینکڑوں دوسرے مجاہدین کے ساتھ سر کٹا چکے تھے۔ ایک ایسے نصب العین سے دستبرداری جسے وہ اپنے دین و ایمان کا بنیادی تقاضا سمجھتے تھے، نہ صرف اپنے اللہ سے باندھے ہُوئے عہد سے غدّاری تھی بلکہ تحریک کے ان ہزاروں کارکنوں سے بھی بے وفائی تھی جن کے خوُن سے سرحدِ آزاد کے پہاڑوں، میدانوں اور وادیوں کا چپّہ چپّہ لالہ رنگ ہو چکا تھا۔

اس منصوبے میں ناکامی کے بعد مولانا عبدالرّحیم کو لاہور جیل میں منتقل

کر دیا گیا۔ یہاں تقریباً ایک برس آٹھ مہینے سختیاں اور مصائب جھیلتے رہے۔ دمے کے مریض تھے جس نے اُن کی ابتلا کو کربناک رنگ دے دیا تھا۔ اپنی ناکامی پر انگریز حکام سخت جھنجھلائے ہوئے تھے۔ وہ شب و روز درپئے آزار رہتے۔ لاہور جیل کا سپرنٹنڈنٹ اور ڈاکٹر تو بڑا قسی القلب اور متعصب آدمی تھا، ہر وقت ایذا رسانی کی فکر میں رہتا۔ قیامِ لاہور کا سارا عرصہ جانگداز اذیت و کرب میں گزرا۔ رہائی کے بعد اپنی خاندانی یادداشت (الدرّ المنثور فی تراجم اھل الصادقپور) میں اس دورِ رنج و محن کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"میں وہاں کی تکالیف و مصائب کو کیا بیان کروں۔ ایک تو وہ مقام بذاتہٖ مخزنِ آلام ہے، دوسرے خاص عناد و عداوتِ حکامِ بالا دست۔ اس باب میں زبان و خامۂ اشہبِ تیز گام محض قاصر ہے"۔ بایں ہمہ سارا زمانۂ کرب اسی شانِ صبر و استقامت سے اپنے اللہ پر توکّل اور آسودگیٔ قلب کے ساتھ گزارا جو اس گروہِ اتقیا کا طرۂ امتیاز تھا۔

قصدِ ظالم بسوئے کشتنِ ماست
دلِ مظلومِ ما بسوئے خداست
او دریں فکر تا بما چہ کُند
من دریں فکر تا خدا چہ کُند

آخر لاہور سے روانگی کا حکم ہوا۔ قیدیوں کے قافلے کے ساتھ ریل گاڑی کے ذریعے مُلتان پہنچے۔ وہاں تقریباً ایک مہینہ رہے۔ جیل کے حاکم میں کچھ انسانی قدریں تھیں۔ سختیٔ ابتلا کے بادل قدرے چھٹتے نظر آئے۔ مرض میں بھی افاقہ رہا، لیکن جونہی کُوچ کا وقت آیا دمہ کا شدید دورہ پڑ گیا۔ ڈاکٹر نے بگڑتی حالت دیکھ کر طوق اور بیڑی وغیرہ کاٹ دینے کا حکم دیا۔ اس طرح تقریباً ایک من کا بوجھ اُتر گیا۔ صرف قیدی ہونے کی علامت کے طور پر ایک آہنی کڑا پاؤں میں ڈال دیا گیا۔ ملتان سے کوٹری تک کا سفر دریائے سندھ میں دُخانی

جہاز میں کیا۔ پھر ریل میں سوار ہو کر کراچی پہنچے۔ کراچی جیل میں ایک مہینہ گزارا۔ پھر بحری جہاز سے بمبئی پہنچا دیے گئے اور وہاں سے تھانہ جیل میں۔ یہاں جیل کی سختیاں اور صعوبتیں تو سخت اذیت ناک تھیں، چھوٹے بڑے حکام اور اہل کار بڑے سنگدل تھے، انسانیت کی تو شاید انھیں ہوا بھی نہ لگی تھی، تاہم دُمدمہ کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہے۔

نو دس مہینے بعد اسّی قیدیوں پر مشتمل قافلہ بحری جہاز سے انڈمان روانہ ہُوا۔ سبھی قیدی وطن کی سرزمین چھُوٹ جانے پر غم زدہ اور دل گیر تھے، لیکن مولانا عبدالرّحیم کا چہرہ مطمئن اور ہشاش بشاش تھا۔ دو برس کی جُدائی کے بعد وہ اپنے ساتھیوں سے ملنے والے تھے۔ حضرت صاحب کی ایمان افروز صحبت سے محرومی نے ان کی زندگی میں جو صبر آزما خلا پیدا کر دیا تھا، اب وہ پُر ہونے والا تھا۔ بحری سفر کا آغاز سخت اضطراب انگیز تھا۔ سارے قیدیوں کو جہاز کے تہہ خانے میں بنے ہوئے ایک پنجرہ نما کٹھرے میں بند کر دیا گیا۔ جہاز کو روانہ ہوئے چھ سات گھنٹے ہی گزرے تھے کہ قیدیوں کو دورانِ سر نے آلیا اور پھر اسہال اور اُلٹیاں شروع ہو گئیں۔ اس غلاظت نے اجابت اور پیشاب کے ساتھ مل کر کیچڑ کی صُورت اختیار کر لی جس میں قیدیوں کو رات دِن رہنا پڑتا۔

مولانا عبدالرّحیم اس نجس حالت میں بھی وضو اور تیمم کے بغیر کسی نہ کسی طور نماز ادا کرتے رہے۔ دُوسرے قیدیوں کو تو اس گندگی کا احساس نہ تھا، لیکن ان کا بدبُو کے مارے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ ایک ایک لمحہ قیامت سے کم نہ تھا۔ پھر اللہ نے اپنے مخلص اور صاحبِ صدق و وفا بندے کی دستگیری کی۔ جہاز کا ایک خلاصی سخت بیمار ہو گیا اور جان کے لالے پڑ گئے۔ جہاز کے کپتان نے محافظ پلٹن کے جمعدار شیخ قاسم کو بُلایا اور کہا دوائیں میرے پاس ہیں، مگر میں ڈاکٹر نہیں کہ علاج کر سکوں، تمھارے ساتھ کوئی ڈاکٹر ہو تو اُسے لے آؤ۔ پلٹن میں کوئی ڈاکٹر نہ تھا۔ جمعدار مولانا عبدالرّحیم کے کردار سے خاصا متاثر

تھا۔ دُوسرے قیدی یا تو آہ و فغاں میں مصروف رہتے یا اپنی قسمت کو کوستے اور گالیاں بکا کرتے، خدا کا نام شاذ ہی کسی زبان پر آتا۔ لیکن مولانا عبدالرّحیم کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ وہ مجسّم صبر و سکون تھے۔ اضطراب اور پریشانی کے بجائے طمانیت ان کے چہرے سے جھلکتی رہتی۔ قرآن کریم حفظ تھا، تقریباً ہر وقت زبانی تلاوت کرتے رہتے۔ کبھی کبھی حافظ وغیرہ کے اشعار ایسی دردناک لَے میں پڑھنے لگتے کہ لوگ نہ سمجھنے کے باوجود تڑپ اُٹھتے۔ جمعدار ان کے پاس آیا اور سارا ماجرا بیان کیا۔ انھوں نے ہر چند کہا کہ مَیں نہ حکیم ہُوں نہ ڈاکٹر، انگریزی دواؤں سے تو بالکل واقف نہیں، لیکن وہ نہ مانا۔ کٹھرے کا تالا کھول کر انھیں نکالا اور کپتان کے سامنے پیش کر دیا۔

کپتان نے پُوچھا: "تم ڈاکٹر ہو؟" قبل اس کے کہ مولانا عبدالرّحیم کچھ کہتے جمعدار بول اُٹھا کہ صاحب بہت اچھا ڈاکٹر ہے۔ کپتان اُنھیں مریض کے پاس لے گیا۔ اُس پر غشی طاری تھی۔ پیٹ پھُول کر مشک سا بن گیا تھا، پیشاب پاخانہ بند تھا اور مُنہ سے کف جاری۔ کوئی دم کا مہمان نظر آتا تھا۔ مولانا نے نبض دیکھی تو وہ ٹھیک رفتار سے چل رہی تھی۔ توکّل بر خدا کپتان سے پُوچھا: "دوائیں کہاں ہیں؟" وہ انھیں اپنے کیبن میں لے گیا اور ایک الماری کھول دی جو دواؤں کی شیشیوں سے بھری ہُوئی تھی اور ہر شیشی پر انگریزی میں چِٹ لگی ہُوئی تھی۔ مولانا انگریزی نہیں جانتے تھے۔ لاچار ایک ایک شیشی کھول کر دیکھنے لگے۔ جلد ہی روغنِ بیدِ انجیر کی شیشی مل گئی، تھوڑی سی تگ و دَو سے روغنِ بادیان اور روغنِ فودنج کی شیشیاں بھی ڈھونڈھ نکالیں۔ تینوں دوائیں لے کر مریض کے پاس آئے اور ایک تولہ روغنِ بیدِ انجیر میں دو تین قطرے روغنِ بادیان اور پیپرمنٹ ڈال کر مریض کے مُنہ میں ڈالا اور اُوپر سے نیم گرم پانی پلا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اسے بڑا سا عفونت بھرا اسہال آیا۔ پیٹ میں بھری ہُوئی ریح خارج ہو گئی، آنکھیں کھول دیں اور رفتہ رفتہ افاقہ ہونے لگا۔ کپتان بڑا خوش ہُوا۔ جمعدار نے مسکرا

نے سفارش کی کہ قیدی کو پنجرے سے نکال کر باہر رکھا جائے۔ کپتان نے حکم دیا کہ عبدالرحیم جمعدار کے پاس رہیں گے۔ اس طرح اس پاک دل، پاکیزہ صفت انسان کو نجاست بھرے اذیت ناک ماحول سے نجات مل گئی۔ پلٹن کے مسلمان سپاہی مولانا عبدالرحیم کے گرویدہ ہو گئے۔ وہ ہر وقت انھیں گھیرے رہتے۔ مولانا عبدالرحیم انھیں قرآن کی تعلیم دیتے اور نماز روزے کی تلقین کرتے، مشرکانہ رسوم و عقائد کی آلودگیوں سے ان کی زندگیوں کو پاک کرتے۔

نجاست کی مصیبت سے نکلے ایک آدھ دن ہی گزرا تھا کہ زبردست طوفان نے آلیا اور جہاز راستے سے بھٹک گیا۔ پے در پے اُمڈتی ہوئی ہولناک لہریں جہاز سے آکر ٹکراتیں تو یوں لگتا جیسے ابھی اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ جہاز ان لہروں پر اُوپر ہی اُوپر اُٹھتا جاتا اور پھر لہریں گزر جاتیں تو ایک زبردست دھچکے کے ساتھ نشیب کا رُخ کرتا اور بے پناہ ہچکولے کھانے لگتا، بسا اوقات تو اُلٹتے اُلٹتے بچتا، ابھی جہاز کے مسافران دھچکوں اور ہچکولوں سے سنبھل بھی نہ پاتے کہ پہاڑ ایسی موجیں پھر جہاز سے آن ٹکراتیں۔ ملاحوں اور قیدیوں کا بُرا حال تھا۔ ہر شخص زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ کپتان کے حوصلے بھی چھوٹ رہے تھے۔ بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ تھک ہار کر اُس نے آخری تدبیر کی۔ مستول وغیرہ کاٹ کر گرا دیے اور جہاز کو تختہ بند کر کے پیپے اور صندوق کی مانند سمندر میں چھوڑ دیا کہ جدھر چاہے جائے۔ سترہ دن یہ کیفیت رہی کہ کسی کو اپنا ہوش نہ تھا۔ خدا خدا کر کے طوفان تھما تو خلاصیوں نے تختے کھول دیے، جہاز کی مرمت کی اور اُسے راستے پر ڈالا۔ میٹھا پانی، دال چاول وغیرہ سب اشیائے خورد و نوش ختم ہو چلی تھیں، اگر ایک ہفتے اور ایسا ہی طوفانی موسم رہتا تو سب لوگ بھوک پیاس سے ہلاک ہو جاتے۔

آخر کار بائیس تئیس دن کا سفر ایک مہینے اکیس دن میں طے کر کے ۲۵ دسمبر ۱۸۶۷ء کو جہاز انڈمان کی بندرگاہ پورٹ بلیئر پہنچا۔ قیدی کشتیوں کے

ذریعے ساحل پر اُترے۔ مولانا احمد اللہ قیدیوں کی آمد کی خبر سُن کر گھاٹ پر آتے ہُوئے تھے۔ ساحل پر اترنے والے قیدیوں سے پُوچھا: "مولوی عبدالرّحیم بھی آپ کے قافلے میں آئے ہیں؟" ان سے ہندو مسلمان جہاز کا ہر شخص واقف تھا۔ اُنھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اتنے میں مولانا عبدالرّحیم کی کشتی بھی پہنچ گئی۔ مولانا احمد اللہ بلند آواز میں پکارے: "اس کشتی میں مولوی عبدالرّحیم بھی ہیں؟" مولانا کی آواز بہارِ جانفزا بن کر ان کے رُوح و قلب میں تیر گئی۔ وہ لبّیک کہتے ہُوئے کشتی سے کُودے اور مولانا سے بغل گیر ہو گئے۔ تین برس کی جُدائی کے بعد مُلاقات، ایک عجیب منظر تھا۔ مولانا عبدالرّحیم کا دِل خوشی کے مارے بلّیوں اچھل رہا تھا اور آنکھیں اشک بار تھیں۔ خوشی شرفِ ملاقات کی تھی اور غم اس عظیم ہستی کو انڈمان کا قیدی دیکھ کر۔

پھر مولانا یحییٰ علی، میاں عبدالغفّار اور دوسرے ساتھی پہنچ گئے۔ مولوی محمّد جعفر صاحب جزیرہ ہدو میں منتقل کر دِیے گئے تھے۔ وہ تین چار روز کے بعد خبر سُن کر آئے اور بِیتی ہُوئی صحبتیں تازہ ہو گئیں۔ بچھڑے ساتھی نے اپنے ایّامِ فرقت کی داستانِ غم سُنائی اور اصحابِ انڈمان نے اپنے شب و روز کی رُودادِ رُوح پرور۔

○

غرُوبِ آفتاب

مولانا عبدالرّحیم گھاٹ پر محرّر لگ گئے تھے اور زندگی کا دھارا صعوبت ناک گھاٹیوں سے گزرتا، راستے میں حائل چٹانوں سے ٹکراتا، خارزار وادیوں میں سر پٹکتا، قدم قدم پر نئی اُفتاد سے دوچار ہوتا ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ مرحلہ بھی تلخ کامیوں سے خالی نہ تھا، تاہم قید و بند کے رُوح فرسا مصائب اور شدائد سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ حضرت صاحب اور مولانا احمد اللہ کی صحبت و رفاقت ان کے لیے نکہت و لنُور کا سامان بن گئی تھی۔ ہر کام کی

کام سے فراغت پاتے ہی حاضرِ خدمت ہوتے ——— لیکن رُوحانی بہجت و نشاط کا یہ دَور بہت مختصر نکلا۔ انڈمان پہنچے دو مہینے ہی گزرے تھے کہ حضرت صاحب جنوری ۱۸۶۸ء کے اواخر میں بیمار ہو گئے۔ پندرہ روز ہسپتال میں رہے۔ مولانا عبدالرحیم کی ڈیوٹی دن رات کی تھی، انھوں نے بندرگاہ کے سربراہ سے اجازت لے لی تھی۔ وہ بارہ بجے سے تین بجے بعد دوپہر تک دفتر میں کام کرتے اور باقی سارا وقت حضرت صاحب کی خدمت میں حاضری دیتے۔ حضرت صاحب بیماری کے سارے عرصے میں ذکرِ الٰہی میں مصروف رہے۔ مرض بڑا شدید تھا۔ بُخار سے جسم پھُنک رہا تھا، گھُٹنے سُوج گئے تھے اور درد کی تڑپا دینے والی ٹیسیں رہ رہ کر اُٹھتیں، لیکن حضرت بڑے صبرو شُکر کے ساتھ انھیں برداشت کرتے۔ اس عالم میں بھی تبلیغ وارشاد کا فیض جاری تھا حضرت صاحب کے فضائل کا چرچا گُل و یاسمن کی خوشبُو بن کر پھیلا ہُوا تھا۔ لوگ عیادت کے لیے آتے تو انھیں کتاب و سُنّت پر قائم رہنے کی پند و نصیحت کرتے۔

مولانا احمداللہ بھی دن میں دو مرتبہ اپنے چھوٹے بھائی سے ملنے آتے۔ ہسپتال ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ آپ بے حد کمزور اور ضعیف ہو چکے تھے؛ تاہم کِسی کا سہارا لے کر آتے اور اپنے اس عظیم بھائی کی عیادت کرتے۔ ۲۰ فروری کو عصر تک حضرت صاحب کی طبیعت خاصی بہتر تھی۔ آپ نے نمازِ عصر بڑے خشوع وخضوع سے ادا کی۔ مولانا عبدالرحیم دفتر سے آئے تو حضرت صاحب بڑے ہشاش بشاش تھے۔ چہرے سے جیسے نور کی کرنیں پھُوٹ رہی تھیں۔ چار بجے کے قریب اچانک زبان میں لُکنت پیدا ہُوئی اور طبیعت سخت ناساز ہو گئی۔ ڈاکٹر نے دوا دی، لیکن وہ حلق سے نہ اُتری۔

مولانا عبدالرحیم نے آدمی دوڑایا کہ مولانا احمداللہ کو بلا لائے۔ اُن کے آتے آتے حالت اور بگڑ گئی۔ پانی حلق میں ڈالا گیا، لیکن وہ باہر آگیا ——— بایں ہمہ زبان ذکرِ الٰہی میں مصروف تھی۔ مولانا عبدالرحیم نے حضرت کا سر

اپنے زانو پر رکھ لیا اور وہ اسی عالم میں اپنے اللہ سے جا ملے۔ اس طرح علم و عمل کا آفتاب غروب ہو گیا۔ وہ مردِ مجاہد دُنیا سے اُٹھ گیا جس کی قائدانہ صلاحیتوں، صدق و اخلاص اور مقصدِ زندگی سے عشق کو دشمن تک نے خراجِ تحسین ادا کیا۔ وہ ولی اللہ فوت ہو گیا جس کی صحبت سے پریشان دل تسکین پاتے اور جس کی ایک نگاہ سے زندگی بدل کر رہ جاتی۔ وہ ایک عظیم انسان تھے۔ تقویٰ، اخلاص اور جہاد کے باب میں اسلاف کا نمونہ تھے۔ سیّد بادشاہ کے قافلے میں شریک ہوئے تو اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح اپنی پوری زندگی حق کو غالب کرنے کی جدّوجہد میں کھپا دی۔ وہ سرحد کے پہاڑوں میں انگریزوں کے ساتھ برسرِپیکار مجاہدین کی صفِ اوّل میں رہے اور جب ہندوستان میں تحریک کی قیادت کا بار اُن کے کندھوں پر پڑا تو اُسے ایسی آن بان کے ساتھ اُٹھایا کہ پُورے برِصغیر میں حوصلوں اور جذبوں کی زبردست لہریں دوڑنے لگیں —— اور جب قید و بند کی ابتلا میں گرفتار ہُوئے تو ہر سختی اور رنج و محن کو خندہ پیشانی سے صبر و شکر کے ساتھ انگیز کیا۔ مقدّمے کی ساری مدّت اس طرح کاٹی گویا انھیں اس سوانگ سے کسی قسم کا کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو مقدمہ لڑنا ہی نہ چاہتے تھے، ساتھیوں نے روکا ورنہ "اقرارِ جرم" کرنے پر بھی آمادہ تھے۔ سزائے مَوت، عمر قید میں بدلی تو ابتدا میں سخت مشقت کا کام ان سے لیا گیا آپ نے زبان پر شکوہ و شکایت لائے بغیر کرڑے سے کڑا کام کیا۔ عقیدت مند قیدی ہر چند کہتے کہ یہ خدمت وہ انجام دیے دیتے ہیں، لیکن نہ مانتے۔ فرمایا کرتے کہ قیامت کے دن تم ہماری مشقت کا بوجھ نہیں اُٹھاؤ گے۔ کام چور قیدیوں کو کام کرنے کی تلقین کرتے۔

ان کے نزدیک انسان کی ذات اخلاقی شکست و ریخت سے اسی طرح محفوظ رہ سکتی ہے کہ اُس کے قول و فعل میں مطابقت ہو۔ مسلمانوں سے کہتے کہ وہ اپنے عقائد و کردار کو اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالیں۔ وہ دُنیائے دُوں کی بے ثباتی اور اس کے عیش و آرام کی ناپائداری، ثوابِ آخرت

اور جنتِ نعیم کی پائداری کا نقش دِل و دماغ میں بٹھاتے اور فرماتے کہ ایک مُسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہے۔ قول و عمل کی ہم آہنگی اور اپنے اللہ پر غیر متزلزل یقین و ایمان اور زہد و ورع اور صِدق و اخلاص نے ان کی شخصیت کو ایسی کشش عطا کر دی تھی کہ جو ایک بار ان کی بات سُن لیتا اُنھیں کا ہو کر رہ جاتا۔ اُن کے انتقال کی خبر پھیلی تو لوگ مولانا احمداللہ کے مکان کی طرف چل کھڑے ہوئے جہاں رات ہی کو میّت لے آئے تھے۔ یُوں لگتا تھا پُورا جزیرہ رَوس اُمڈ پڑا تھا۔ دُوسرے جزائر کے حُکّام نے بھی اجازت دے دی تھی کہ جو شخص جنازے میں شریک ہونا چاہے اُسے فوراً سرکاری کشتی کے ذریعے رَوس پہنچا دیا جائے؛ چنانچہ مختلف ٹاپوؤں سے لوگ جوق در جوق آنے لگے۔ ان میں خاصی تعداد ہندوؤں کی بھی تھی۔

مولوی محمد جعفر ہردو میں تھے۔ انھیں حضرت صاحب کی بیماری تک کی خبر نہ تھی۔ اَللہ نے اس مردِ عظیم کے جنازے میں اس کے عظیم ساتھی کی شمولیت لکھ دی تھی۔ وہ انھیں عین اس وقت جزیرۂ رَوس لے آیا جب جنازہ تیار ہو چکا تھا اور نماز پڑھی جانے کو تھی۔ مختلف ٹاپوؤں سے آنے والوں کا تانتا اس طرح بندھا ہُوا تھا کہ تین مرتبہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی جس میں ڈھائی ہزار آدمی شریک ہُوئے۔ تقریبًا اتنے ہی غیر مسلم الگ مغموم و محزون کھڑے تھے۔ دفن کرتے وقت ہر شخص کا دل آپ کی محبت اور جُدائی میں پاش پاش تھا۔ گریہ و بکا اور سسکیوں کی آوازیں رہ رہ کر اُٹھ رہی تھیں ——— مجاہدین کی تحریک کے ایک درخشندہ عہد کو جب منوں مٹّی تلے دفن کر کے یہ لوگ واپس ہُوئے تو ہر آنکھ اشکوں کے گوہر برسا کر خراجِ عقیدت پیش کر رہی تھی۔

مولوی احمد کبیر پھلواروی نے اس سانحۂ ارتحال پر لکھّا:

چوں کہ یحییٰ علی ستودہ خصال
عالم و زاہد و محدّث بُود

گشت راضی خدائے پاک ازاُو
عزتش پیشِ قدسیاں افزود
رُوحِ پاکش گذاشتِ زِمجلسِ تن
راہِ ملکِ وصالِ حق پیمود
ہاتفِ سالِ اُو ز روئے الم
رضی اللہ رَبہٗ فرمود

○

طُوفانوں کے نئے مُسافر

بنگال کی ایک کمشنری میں کمشنر کے سرکٹ ہاؤس کے متّصل کھُلے میدان میں حاجت مندوں کا ہجوم تھا۔ کمشنر دَورے پر آیا ہُوا تھا۔ لوگ نزدودُور سے مقدّمے اور جھگڑے لیے حاضر ہُوئے تھے اور میدان میں اِدھراُدھر درختوں کے نیچے بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک بزرگ سُرخ رنگ کے ٹٹّو پر سوار آپہنچے۔ میانہ قامت، لمبی ڈاڑھی، چہرہ قدرے نحیف، لیکن گردیں اَٹے ہونے کے باوجود رُوحانیت کے نُور سے تابندہ، گاڑھے کے کپڑے زیب تن۔ دو باریش ساتھی پاپیادہ ہمراہ تھے۔ ادھیڑ عُمر کے، اور بزرگ ہی کی طرح درویش۔ بزرگ نے بڑ کے درخت تلے پہنچ کر گھوڑے کی لگام کھینچی اور قدرے مرتعش اور تھکی ہُوئی آواز میں سلام کیا۔ لوگوں نے نگاہیں اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھا۔ وہ اجنبی ہونے کے باوُجود اجنبی نہ تھے۔ گھوڑوں اور ٹٹّوؤں پر سوار یا پاپیادہ ایسے بزرگ اور نوجوان دیہات اور قصبوں میں آتے جاتے عام دکھائی دیتے تھے۔ وہ لوگوں سے ان کے کھیتوں اور کارگاہوں میں انفرادی ملاقاتیں کرتے۔ مسجدوں میں نمازیوں سے خطاب کرتے اور جہاں کہیں لوگوں کا ہجوم دیکھتے رُک جاتے اور انھیں اللہ اور رسولؐ کی طرف دعوت دیتے۔ غم و حُزن سے پاک امن و سلامتی کی زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے کہ اسی میں اُن کے دُکھوں اور مسائل

کا علاج تھا۔ یہ بزرگ سلامتی کا یہی پیغام لے کر آئے تھے۔
برگد تلے بیٹھے ہُوئے لوگوں نے سلام کا جواب دیا۔ بزرگ منحنی اور نحیف ٹٹو سے اُترے۔ ایک ہمراہی نے گھوڑے کی باگ تھامی، دُوسرے نے اس کی اگلی ٹانگوں میں سوسن کی رسّی باندھ دی اور پھر چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ آٹھ دس آدمی ان کے ارد گرد آ کھڑے ہُوئے اور بزرگ اس انبوہ سے باتیں کرنے لگے۔ اُن کی آواز میں خلوص بھی تھا اور دل میں گھر کر جانے والی تاثیر بھی۔ دیہاتی جیسے اپنے گرد و پیش کی زندگی بھول گئے۔ زر، زمین اور زَن کے جھگڑے جو انھیں یہاں کھینچ لائے تھے، سب شعور سے اوجھل ہو گئے۔ وہ ان کی پُراثر گفتگو میں ڈُوب کر رہ گئے تھے۔ بزرگ ان کی زندگی کے ایک ایک پہلو پر بڑے حکیمانہ انداز میں تنقید کر رہے تھے۔ غفلت و جہالت کی زندگی پر تنقید جس نے اُن کے ایمان و اخلاق اور سیرت و کردار کو چاٹ لیا تھا اور جو انھیں زوال و انحطاط کی پستیوں میں لیے جا رہی تھی۔ بزرگ نے انھیں رسم و رواج کی زنجیریں کاٹ دینے کی دعوت دی جن میں اُنھوں نے اپنے آپ کو جکڑ رکھا تھا۔
وہ کہہ رہے تھے: "بھائیو! اللہ کی نافرمانی چھوڑ دو۔ عبادت کرو تو اُسی کی۔ لَو لگاؤ تو اُسی ذاتِ واحد سے لگاؤ۔ اپنی حاجتیں طلب کرو تو اُسی سے کرو۔ نذر نیاز اُسی کی دو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتِ مُطہّرہ کی پیروی کرو اور حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کے سانچے میں اپنے آپ کو ڈھالو کہ اس کے بغیر ایمان و اسلام کا دعویٰ بے معنی ہے۔ میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کی رنگ رلیوں سے اجتناب کرو کہ اس سے سیرت و کردار پہ گہرے نقش پڑتے ہیں۔ آدمی اخلاقی اور ایمانی قوت سے محروم ہو کر شیطان کے دام کا آسانی سے شکار ہو جاتا ہے۔ بھائیو! جس طرح زمینوں اور مال و دولت کی فکر کرتے ہو اُس سے بڑھ کر دلوں کی حفاظت اور صحت و سلامتی کی فکر کرو۔ تمھیں نئے کپڑوں کی فکر دامن گیر رہتی ہے حالانکہ نئے کپڑے پہن بھی لو گے تب بھی تمھارے دل پُرانے ہی رہیں گے۔ کچھ ان کی جِلا اور تر و تازگی کا سامان بھی کرو! باجوں، تاشوں، ڈھول ڈھمکوں اور نفیریوں کا ہنگامہ تمھارے کان بہرے کر دے گا

اور پھر قرآن کی سچائیاں اُن پر اُچٹ کر رہ جائیں گی۔ یہ خود ساختہ میلے اور تہوار، ان کی نقلی لڑائیاں، ان کے فرضی ماتم، ان کی ناشائستہ دعوتیں سب اللہ اور اُس کے رسُولؐ کے نزدیک حرام ہیں۔ بھائیو! ریاکاری سے اپنا دامن بچاؤ، اخلاص کو اپناؤ، قول اور عمل میں ہم آہنگی پیدا کرو۔ اللہ اور اُس کے رسُولؐ کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہو تو اُن کے احکام پر بے چوُن وچرا چلو اور ان کے آگے سرِ اطاعت جھکا دو۔[1]

بزرگ دیر تک اِسلام کی صاف سُتھری دعوت پیش کرتے رہے: تکلّف سے پاک سادہ اور شیریں زباں، مگر مصلحتوں سے بے نیاز مضبوط لہجے ہیں۔ ان کا ٹٹوّ اگلی دو ٹانگوں پر پھُدک پھُدک کر میدان میں چرتا پھر رہا تھا۔ زین کے پیدا کردہ زخموں پر مکھیاں بیٹھ جاتیں، تو وہ دُم ہلا ہلا کر اُنھیں اُڑاتا۔ کبھی جھلاّ کر اُس مکھی پر منہ مارتا جو اُس کی ناہموار دُم کی رسائی سے باہر ہوتی اور پھر تکان سے چوُر حیوان دوبارہ چرنے میں مشغول ہو جاتا۔ سامعین جو پہلے اس کی باتوں میں ڈوبتے نظر آتے تھے، مشرکانہ رسم ورَواج اور غیر اِسلامی زندگی پر تنقید سُنتے ہی تلملانے لگے تھے۔ وہ تیوریاں چڑھاتے، بڑبڑاتے ہُوئے چلے گئے۔ آدمی کو اپنی کمزوریوں اور کج رویوں سے پیار ہوتا ہے اور اُن پر ذرا سی تنقید بھی مشکل ہی سے برداشت کرتا ہے۔ اور یہ کمزوریاں اگر مذہب کے نام پر دل میں جڑ پکڑ گئی ہوں تو انسان اور حساس ہو جاتا ہے۔ بزرگ کا وعظ بظاہر ناکام رہا تھا۔

"یہ شخص چاہتا ہے ہم اپنے باپ کی قبر کا چراغ گُل کر دیں۔" ایک نے جاتے جاتے تبصرہ کیا۔

"یہ ہمیں اپنی بچّیوں کی شادی بیاہ پر ڈھول ڈھمکوں اور عَورتوں کے ناچ گانے سے روکتا ہے۔" دوسرے نے کچھ ایسے لہجے میں کہا جیسے ڈھول ڈھمکے اور ناچ گانے برائیاں نہیں نیکی کے کام ہوں اور ان پر حرف زنی پناہ بخدا! اللہ اور رسُولؐ کی شان میں گستاخی ہو۔

---

[1] دی انڈین مسلمانز کا مصنف ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ان بزرگ کے وعظ کو اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتا ہے۔ لیکن اُن کا نام اُس نے نہیں لکھا۔ وہ لکھتا ہے بنگال اور بہار کے متصلہ اضلاع میں ایسے مبلغ، تبلیغی دورے کرتے عام نظر آتے ہیں۔

صرف ایک شخص نے موافقت کی: "کچھ بھی ہو بوڑھا قرآن پڑھے ہوئے ہے۔ وہ بھی تو کہتا ہے کہ کلامِ الٰہی کی رُو سے عبادت صرف اللہ کی کرنی چاہیے، واقعی عالمِ دین ہے!" اُس نے کہا دوسرے لوگوں نے اُسے گھور کر دیکھا۔ "تجھ پر بھی اس کا جادو ہو چلا ہے"، ایک نے چیخ کر احتجاج کیا۔[1]

بزرگ جانتے تھے مردانِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر رہا، لیکن ان کے چہرے پر مایوسی کی ذرا پرچھائیں نہ تھی۔ وہ ایک نہ تھکنے والے محنتی کسان کی طرح ایک مُدت سے نیکی کے بیج دِلوں میں بونے کا کام کر رہے تھے اور مطمئن تھے کہ اپنا فرض محنت اور دِل کی لگن سے انجام دیتے رہے ہیں، ان کی اس سعی و جہد میں برکت پیدا کرنا اللہ کا کام ہے۔

مجمع منتشر ہو گیا۔ بزرگ اور ان کے دو ساتھیوں نے وہیں برگد کے نیچے پڑاؤ ڈال دیا۔ پھر بزرگ سو گئے اور مُرید باری باری پنکھا جھلنے لگے۔ تھکا ماندہ ٹٹو بھی گھاس کی تلاش چھوڑ کر ایک درخت کے نیچے جا کھڑا ہُوا۔ دِن ڈھلے ذرا ٹھنڈک ہونے پر بزرگ اور اُن کے ساتھی نئی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ بزرگ ٹٹو پر سوار تھے اور مُرید اُن کی رکاب تھامے پا پیادہ۔

○

یہ بزرگ، سید بادشاہ کی تحریک کے ان ہزاروں مبلّغین میں سے ایک تھے جو

---

[1] ان اہلِ حق کے خلاف انگریز علمائے سُو کے ذریعے کس نوعیت کا پروپیگنڈا کر رہے تھے اس کا اندازہ ہنٹر کے اس قول سے ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں نے اس وعظ کا ذکر اپنے گاؤں کے مُلّا یا مؤذن سے کیا تو اُس نے یہ کہہ کر وعظ کا تاثر بالکل ختم کر دیا: "یہ شخص اُس جھوٹے امام کا پیرو ہے جس نے مقدس شہروں (مکہ و مدینہ) پر تلوار کے زور سے قبضہ کیا، حج کا راستہ مسدود کر دیا اور پاک گھر کے دروازے پر لکھ دیا: لاالٰہ الاّ اللہ سعُود رسُولُ اللہ لکھ دیا۔ ص ۶۶-۶۷ اوّل تو یہی بہتان ہے۔ کہ سید احمد شہید اور ان کے تحریکی ساتھی شیخ محمد بن عبدالوہابؒ اور ان کے مریدِ خاص سعود بن عبدالعزیز کے پیرو تھے۔ پھر یہ اس سے بھی بڑا بہتان ہے کہ سعود نے کوئی اپنا کلمہ وضع کیا تھا اور اُسے خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کیا تھا۔ انگریز کے پھیلائے ہُوئے ایسے ہی بہتان آج تک علمائے سُو، اہلِ حق پر لگاتے چلے آتے ہیں۔

ملک کے طول و عرض میں پچھلے چالیس پینتالیس برس سے گاؤں گاؤں شہر شہر جاکر زندگیِ نو کا پیغام دے رہے تھے۔ وہ اپنی جدّوجہد کو کامیابی و ناکامی کی میزان پر تولے بغیر سرگرمِ عمل رہتے۔ پتھر دِلوں سے بھی سابقہ پڑتا، لیکن غفلت و جہالت کے تہہ بہ تہہ پردوں کو چاک کرتے ہُوئے ایک بار بیج پڑجاتا تو وہ رفتہ رفتہ تناور درخت کی صُورت اختیار کرلیتا اور پھر تحریک کی جڑیں ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پھیلتی چلی جاتیں۔

ایک ایسے ہی مبلّغ عبدالرّحمٰن تھے۔ لکھنؤ کے رہنے والے۔ مولانا ولایت علی کے خلیفہ۔ ۱۸۴۰ء کے لگ بھگ تبلیغی دَورے پر بنگال کے ضلع مالدہ میں پہنچے یہاں انھوں نے فضا سازگار پائی۔ لوگوں میں خیر و صلاح قبول کرنے کی صلاحیّت نے انھیں بے حد متاثّر کیا۔ وہ مالدہ ہی کے ایک گاؤں نارائن پُور میں مقیم ہوگئے اور تحریک کا کام شروع کردیا۔ چند سال کے اندر اندر تحریک کے اثرات دُور دُور تک پھیل گئے۔ اب انھوں نے یہیں مستقل بس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک گھرانے میں شادی کرلی اور مَدرَسہ کھول لیا۔ گاؤں اور قرب و جوار کے کاشتکاروں اور زمینداروں کے لڑکے اُن کے پاس پڑھنے آتے۔ اس طرح نئی نسل اُن کے انقلابی افکار اور اُجلے کردار کی لَوبیں پروان چڑھنے لگی۔ پُرانی نسل کے لوگوں کی عقیدت و ارادت کا تو گویا وہ مرکز تھے۔ علاقے کے کئی زمیندار تحریک کے کام میں اُن کے معاون بن گئے۔ انہی میں نارائن پُور کے چودھری رفیق منڈل تھے۔ (اِس نواح میں منڈل چودھری کو کہتے ہیں) تحریک کے بڑے ہی پُرجوش اور سرگرم کارکن تھے اور اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل۔ وہ طویل عرصے تک تحریک کا کام کسی خلل کے بغیر سرانجام دیتے رہے۔ اُن کا گاؤں تحریک کے مبلّغین اور مرکز عظیم آباد جانے والے کارکنوں اور مجاہدین کا اہم پڑاؤ بن گیا۔ مرکزی رہنما بھی یہاں آیا کرتے۔ مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی اور مولانا فیاض علی[1] ایسے سیّد

---

[1] مولانا احمد اللہ کے بھائی تھے۔ ان سے چھوٹے اور مولانا یحییٰ علیؒ سے بڑے۔ مولانا ولایت علیؒ سے بیعت کی تھی۔ ان کے ہمراہ سکھوں کے ساتھ جنگوں میں حصہ لیا۔ مولانا کا انتقال ہُوا تو مولانا فرحت حسین نے انھیں عظیم آباد بلالیا۔ تذکرۂ صادقہ میں ہے: "جس روز سے کہ آپ نے بیعت دستِ مبارک پر بڑے حضرت (مولانا ولایت علی) علیہ الرحمۃ کے کی اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ سفر و حضر میں آپ اپنے مرشد کے

بادشاہ کے ممتاز خلفا اور تحریک کے رہنماؤں کی میزبانی کا شرف بظاہر اس چھوٹے سے فرومایہ گاؤں کو حاصل ہو چکا تھا۔

۱۸۵۳ء میں رفیق منڈل پر پہلی بار شبہ ہُوا۔ پولیس نے اُن کے گھر کی تلاشی لی تو کئی ایسے خطوط ہاتھ لگے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کا تعلق سرحد پار مجاہدین کے کیمپ سے ہے۔ ان خطوط سے یہ بھی آشکارا ہُوا کہ ۱۸۵۲ء میں پنجاب میں ہنٹبو انفنٹری میں بغاوت کی جو لہر اٹھی تھی اُس میں وہ بھی ملوّث تھے، چنانچہ گرفتار کر لیے گئے، مگر چونکہ وہ ایک دُور اُفتادہ گمنام گاؤں کے گمنام سے کارکن تھے اور بقول ہنٹر انگریزی حکومت ایسے معمولی سازشی آدمیوں کو اہمیت دینے کی عادی نہ تھی، اس لیے انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہُوئے چھوڑ دیا گیا۔ رہائی کے بعد رفیق منڈل نے تحریک کے تحفظ اور سلامتی کے لیے یہی بہتر سمجھا کہ وہ تحریکی سرگرمیوں سے الگ ہو جائیں۔ اُن کا پُورا خاندان اللہ کے رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ ایک لڑکا شکور محمد ستھانہ میں مجاہدین کی صفوں میں شامل تھا۔ دو لڑکے گاؤں ہی میں تحریک کا کام کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے بڑے صاحبزادے مولوی امیر الدّین کو تحریک کی ذمّہ داریاں سونپ دیں۔ مولوی امیر الدّین پہلے بھی کچھ کم سرگرم نہ تھے۔ علاقے کی رہنمائی کا بوجھ

بقیہ آگے) ہمراہ رہتے اور انواع قسم کی تکالیف اور مصائب مثل فاقہ کشی و آبلہ پائی و پیادہ روی منازلِ بعیدہ کی آپ نے اُٹھائی اور نہایت صبر و استقلال کے ساتھ ہر مصیبت کو برداشت کرتے، عسر و یسر میں نہایت کشادہ دِلی کے ساتھ نہایت صابر و شاکر رب کریم رہتے۔ آپ نے جو کچھ تکلیف راہِ خدا میں محض ابتغاءً وجہ اللہ (اللہ کی خوشنودی و رضا کے لیے) اٹھائی ہے، اُس کا بیان احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتا۔ جب چھوٹے حضرت (مولانا فرحت حسین) کا انتقال یہاں پٹنہ میں ہو گیا...... آپ پھر گھبرائے اور مع اہل و عیال کے یہاں سے روانہ ہو گئے اور ملک سوات و بُنیر کو پہنچے اور مالکِ حقیقی کی عبادت میں بقیہ عمر کو وہیں طے کیا۔ دنیا کی عیش و عشرت، مال و متاع، گاؤں گھر، عزت و آبرو، راحت و آرام جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا تھا...... آپ نے سب کو دُنیائے ملعونۂ سفلۂ جیفہ تصوّر فرما کر چھوڑ دیا اور بطلبِ دارِ آخرت و نعیمِ مقیم کے آپ نے تمام اپنی عمر کو دُور دراز کے سفروں میں بسر کیا اور آخر اسی مسافرت و مہاجرت کی حالت میں جان شیریں بجانِ آفریں سپُرد کی...... آپ بڑے سالک تھے اور سکوت و ذکر اللہ و دعا و اداے نوافل میں عمر بسر ہُوئی۔ آپ کے بیان میں وہ تاثیر تھی کہ لوگوں کے دِل ہل جاتے، غشی و بیہوشی سی طاری ہو جاتی۔ فنِ سپہ گری میں بھی پُوری مہارت تھی۔ (ص ۶۱ - ۶۲)

کندھے پر پڑا تو اپنی ساری صلاحیتیں اس بوجھ کو بحسن و خوبی اُٹھانے میں لگادیں۔ انھوں نے دعوتی کام کو ازسرِنو منظم کیا۔ گردونواح کے قصبات اور دیہات میں مبلّغین کا جال بچھا دیا۔ جگہ جگہ مسجدیں اور مدرسے بننے لگے۔ یہ علم کا گھر بھی تھے اور دعوت قبول کرنے والوں کی تربیت گاہیں بھی۔ تحریک کے لیے زکوٰۃ، صدقات و عطیات کے علاوہ نئے وسائل تلاش کیے ــــ اس سلسلے میں مُٹھی بھر اسکیم رائج کی۔ تحریک سے متأثر خاندانوں کی خواتین صبح و شام کھانا پکاتے وقت کنبے کے ہر فرد کی طرف سے ایک مُٹھی چاول الگ کسی برتن میں ڈال دیتیں اور یہ جمع شدہ جنس ہر جمعہ کو اُس شخص کے حوالے کر دی جاتی جو اس گاؤں سے رقمیں وصول کرنے کا ذمہ دار ہوتا۔ ہنگامی حالات میں خصوصی عطیات بھی حاصل کیے جاتے۔ ۱۸۶۵ء میں مولانا احمد اللہ کے مقدمے میں پہلی بار مولوی امیرالدین کا نام آیا۔ بعض لوگوں نے اُن کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا اور مالدہ کو بنگال میں تحریک کی ایک اہم شاخ قرار دیا۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد حکومتِ بنگال نے گرفتار کر لیا، لیکن پھر تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ رہائی کے بعد انھوں نے انتباہ کی پروا کیے بغیر اپنی دعوتی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ وہ بے دھڑک گاؤں گاؤں کا دورہ کرتے، دعوتِ جہاد دیتے، چندہ جمع کرتے اور مجاہد بھرتی کر کے عظیم آباد بھیجتے۔ ایک مرتبہ مرکز سے خلیفہ کے صاحبزادے بھی تشریف لائے اور ضلع کا دورہ کیا۔ ان کے حلقے میں مالدہ کے علاوہ اضلاعِ مُرشد آباد اور راجشاہی کے کچھ حصے بھی تھے۔ ان کی اعلیٰ کارکردگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سرحد کی ایک چوکی پر ۴۳۰ مجاہدین متعین تھے ان میں دس فی صد سے زائد مولوی امیرالدین کے حلقے سے تعلّق رکھتے تھے۔

مالدہ کے پڑوس میں دریا کے پار بھاگل پور کمشنری (صوبہ بہار) کا حلقہ راج محل تھا جس کے امیر راج محل کے نواحی گاؤں اسلام پور کے چودھری ابراہیم منڈل تھے۔ بڑے ہی متقی اور پرہیزگار اور تحریک کے فعّال اور بے لوث کارکن ـ صادق پوری ہی کے کسی بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ خوشحال گھرانے کے فرد تھے، دیانت و امانت اور حق پرستی کی چاروں طرف دھاک بیٹھی تھی اور ان اوصاف نے

نھیں اس علاقے کی پُرکشش شخصیت بنا دیا تھا۔ مالدہ اور راج محل کی طرح بہار اور بنگال سے لے کر شمالی ہند اور اُدھر جنوبی ہند میں حیدر آباد تک بہت سے چھوٹے بڑے حلقے خُفیہ، مگر سرگرم جدّوجہد میں مصروف تھے۔ یہ دو حلقے تاریخ میں اس لیے نمایاں ہو گئے کہ ابتلا کی نئی لہر نے انھیں اپنی زد میں لے لیا تھا۔

عظیم آباد کا مرکز پے بہ پے اُٹھنے والے طوفانوں میں اب بھی نامسخّر کھڑا تھا۔ صادق پُور کے مسکونہ مکانات، مسجد حتّیٰ کہ قبریں تک کھود کر پھینک دی گئی تھیں — انگریزی حکومت نے جب اسیرانِ بلا کی جائداد منقولہ و غیر منقولہ ضبط کی تو پٹنہ کے مسلمانوں نے گویا اپنے ہی طور پر فیصلہ کر لیا کہ کوئی شخص غیر منقولہ جائداد کے نیلام پر بولی نہیں دے گا۔ اس لیے راونشا نے سفارش کی تھی کہ یہ عمارات منہدم کر دی جائیں۔ اب ان کی جگہ ایک وسیع و عریض جدید طرز کی پٹنہ میونسپلٹی کی عمارت تعمیر ہو چکی تھی، تاہم تحریکیں سنگ و خشت کی محتاج نہیں ہوتیں۔ وہ دِلوں میں جڑ پکڑتی ہیں اور دِلوں ہی کے راستے پھیلتی چلی جاتی ہیں، جب تک دِل زندہ رہتے ہیں انھیں کوئی قوت اور طاقت نہیں مٹا سکتی اور جب دِل مر جاتے ہیں تو انھیں اینٹ اور پتھر کے عظیم الشان ڈھانچے کوئی سہارا نہیں دے سکتے اور حق نے تو ہمیشہ بے سروسامانی میں زندگی پائی ہے اور اس کو سربلند کرنے کا کام ہمیشہ بوریے پر بیٹھ کر انجام پایا ہے۔ صادق پُور کے مکین بوریا نشین تھے۔ یہ پُرشکوہ محل انھیں اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملا تھا۔ اس کی عمارت کے ایک حصّے کو انھوں نے تحریک کے کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ خود اُن کی اپنی زندگیاں اللہ کے عاجز و فرومایہ بندوں کی سی تھیں جنھیں وہ اُس کی راہ میں نچھاور کر چکے تھے۔ مرکز اور رہنماؤں سے محرومی اور پُورے مُلک میں خوف و دہشت طاری کر دیے جانے کے بعد نیا مرکز قائم کر کے کام جاری رکھنا بظاہر بڑا کٹھن بلکہ ناممکن نظر آتا تھا۔ تحریک کے ممتاز کارکن حکومت کی نظروں میں آ چکے تھے اور اُن پر نگاہ رکھی جا رہی تھی۔ بعض مختلف اوقات میں گرفتار بھی کیے جاتے رہے۔ ایسے حالات میں کسی شخص کا رہنمائی کے لیے آگے بڑھنا اور اُس کا ساتھ دینا کھیل نہ تھا، لیکن اربابِ

صدق وصفا کی ہمّت وعزیمت کے لیے حالات کی سنگینی نے ہمیشہ مہمیز کا کام دیا ہے اور راستے کے پتھر ان کے عزائم کی جولانیوں کا باعث ہُوئے ہیں۔ اکثر انھی لوگوں نے دنیا کو زیر وزبر کیا ہے جو دشمن کی شوکت وقوّت کو خاطر میں نہیں لائے اور اپنے مؤقف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔ بقولِ اقبال مرحوم۔

ہر کہ دانائے مقاماتِ خودی است
فضلِ حق داند اگر دشمن قوی است
کشتِ انساں را عدو باشد سحاب
ممکناتش را بر انگیزد ز خواب
سنگِ راہ آب است اگر ہمّت قوی است
سیل را پست وبلندِ جادہ چیست
سنگِ راہ گردد فسانِ تیغ عزم!
قطعِ منزل امتحانِ تیغ عزم!
خویش را چُوں از خودی محکم کُنی
تو اگر خواہی جہاں برہم کُنی![1]

قیامت کے اس سماں میں دِل ابھی تک زندہ تھے اور زندہ رہنے کی تڑپ رکھتے تھے، چنانچہ مولوی مُبارک علی آگے بڑھے اور انُھوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر تنظیمِ جماعت کا کام سنبھال لیا۔ وہ حاجی پُور ضلع مظفر پُور (بہار) کے رہنے والے تھے۔ مولانا ولایت علیؒ سے بَیعت تھی۔ تحریک میں شامل ہُوئے، تو صادق پُوری کے ہو رہے۔ مولانا ولایت علیؒ سرحد چلے گئے اور

---

[1] ہر وہ شخص جو مقاماتِ خودی سے آگاہ ہے قوی دشمن کو اللہ تعالیٰ کا فضل گردانتا ہے۔ دشمن، انسان کی کھیتی کے لیے بادل کا کام دیتا ہے جو اس کی قوتوں، صلاحیتوں اور جذبوں کو خواب سے جگا دیتا ہے۔ ہمّت اور حوصلہ قوی ہو تو راستے کا پتھر بھی پانی ہو جاتا ہے۔ سیلاب کے آگے پست و بلند راہیں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ راستے کا پتھر عزم کی تلوار کے لیے سان بن جاتا ہے اور قطعِ منزل کو وہ اپنے لیے آزمائش اور امتحان سمجھتا ہے۔ اگر تُو دنیا کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے تو اپنی خودی کو مستحکم اور مضبوط بنا۔

مولانا فرحت حسین[1] نے برِ صغیر میں تحریک کی زمام کار ہاتھوں میں لی، اُن کے بعد یہ ذمّہ داری مولانا یحییٰ علی اور پھر مولانا احمد اللہ پر آ پڑی، مولوی صاحب ان تینوں مردانِ حق کے دست و بازو اور معاون بنے رہے۔ مولانا یحییٰ علی اور دوسرے بلا کشانِ محبت پر انبالے میں مقدمہ چلا تو مولوی صاحب مقدمے کی پیروی میں مولانا ولایت علی کے سولہ سالہ صاحبزادے مولوی محمّد حسن ذبیح کے دوش بدوش رہے۔ ان کے ساتھ کئی بار انبالہ کا سفر کیا۔ مولانا احمد اللہ کے مقدمے کی پیروی میں بھی اسی سرگرمی اور لگن کے ساتھ مولوی محمّد حسن کا ہاتھ بٹایا۔ اس طرح وہ ۱۸۶۴ء ہی میں انگریزوں کی نظر میں آ چکے تھے۔ مولانا احمد اللہ گرفتار ہوئے تو ان کی کڑی نگرانی ہونے لگی۔ ان کے نام جو خطوط آتے اُن پر سنسر ہوتا جلد ہی حکومت کو پتہ چل گیا کہ جماعت کا نظم و نسق ان کے ہاتھوں میں ہے۔ ۱۸۶۸ء کے اواخر میں وہ بعض خطوط کی بنیاد پر گرفتار کر لیے گئے، مگر پھر چند ماہ بعد انھیں رہا کر دیا گیا۔ رہا ہوتے ہی مولوی صاحب پھر سرگرمِ عمل ہو گئے، لیکن قدم قدم پر جال بچھا ہُوا تھا، ان کی ایک ایک نقل و حرکت پر آنکھیں لگی ہُوئی تھیں۔ ۱۸۶۹ء میں انھیں پھر پکڑ لیا گیا اور جنوری ۱۸۷۰ء میں رہا ہُوئے۔ اسیری اور رہائی کے اس تماشے کا جماعت کے کئی اور کارکن بھی شکار ہوتے رہے۔ ان میں تبارک علی، امیر خان، حشمت داد خان، حاجی دین محمّد، امین الدّین وغیرہ شامل تھے۔ یہ تو معدودے چند نام ہیں جو بعد ازاں ۱۸۷۱ء کے مقدمۂ پٹنہ میں ماخوذ ہُوئے، تحریک کے عام کارکن ہزاروں کی تعداد میں ملک کے طُول و عرض میں بغیر مقدّمہ چلائے خلافِ قانون

---

[1] مولانا فرحت حسین جنھیں فرحت علی بھی کہا جاتا ہے، مولانا ولایت علیؒ کے سب سے چھوٹے بھائی تھے اور چھوٹے حضرت کہلاتے تھے۔ بڑے حضرت (مولانا ولایت علیؒ) جب کبھی مرکز صادق پور سے باہر جاتے انھیں اپنا قائم مقام بناتے۔ وہ سرحدِ آزاد چلے گئے تو جماعت کی قیادت مستقلاً ان کے سپرد کر دی گئی۔ بڑے زاہد و عابد اور خطیب تھے۔ فنونِ حرب میں بھی خوب مہارت رکھتے۔ اعلیٰ گھڑ سوار، عمدہ نشانچی، اُڑتی چڑیا کو بھی مار گراتے، زبردست پیراک، الغرض ظاہری اور باطنی اوصاف کا جلیل و جمیل پیکر تھے۔ نو برس تک جماعت کی قیادت کی۔ ۴۸ برس کی عمر میں انتقال ہُوا۔ مولانا عبدالرّحیم اسیرِ انڈمان انھیں کے صاحبزادے تھے۔

جیلوں میں ٹھونس دیے گئے تھے۔[1] انگریزی حکومت نے ایک الگ محکمہ قائم کر دیا تھا جس کا کام تحریک کی سرگرمیوں پر قابو پانا، کارکنوں کی نگرانی کرنے اور انھیں "اعتدال" پر رکھنا تھا۔ اس محکمے پر بے پناہ روپیہ اُٹھ رہا تھا۔ تحریک کے اثرات اس قدر دُور دُور تک اور گہرے پھیلے ہُوئے تھے کہ انگریز حُکّام سخت پریشان تھے۔ "اصلاح شروع کی جائے تو کہاں سے؟ ہر ضلع میں ایک مرکز قائم تھا جس کے ساتھ ہزاروں خاندان جی جان سے وابستہ تھے۔ ان مراکز اور ان کے رہنماؤں کے خلاف شہادت میسّر آسکتی تھی تو انہی لوگوں سے جو تحریک کا ساتھ دے رہے تھے، لیکن ہنٹر کے الفاظ میں "اُن کا یہ حال تھا کہ اپنے سردار سے غدّاری کے بجائے مَوت کو ترجیح دیتے تھے۔"

○

اربابِ دعوت و عزیمت حالات کے سنگین اندھیروں میں لافانی جذبوں کا چراغ جلائے راہِ وفا پر گامزن تھے اور اندر ہی اندر ایک اور مہیب طوفان جنم لے رہا تھا۔ برطانوی حکومت کے خُفیہ محکمے کے شکاری کُتّے نتھنے پھُلاتے سکیڑتے ہُوئے ہر طرف بُو سُونگھتے پھر رہے تھے۔ اچانک سرحدِ آزاد پر ایک زبردست دھماکا ہُوا۔ انگریز حکومت "فارورڈ پالیسی" پر عمل کرتے ہُوئے بتدریج آزاد علاقے پر اپنے چنگل دراز کرتی جا رہی تھی۔ نومبر ۱۸۶۷ء میں اُس نے وادیٔ اگرور میں اوگی کے مقام پر

---

[1] ہنٹر اپنی کتاب میں، جو اُس نے ۱۸۷۱ء میں لکھی تھی، ایک ایسے ہی کارکن کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتا ہے:

"اس وقت بنگال کی ایک جیل میں ایک سفید ریش مسلمان ہے جس کی زندگی ہر طرح سے پاک ہے، لیکن وہ انتہا پسند باغی ہے۔ تیس برس سے اُس کی بغاوت کا حال معلوم تھا اور وہ بھی جانتا تھا کہ اُس کا حال چھپا ہُوا نہیں۔ ۱۸۴۹ء میں اُسے باضابطہ تنبیہ کی گئی۔ ۱۸۵۳ء اور ۱۸۵۷ء میں دوبارہ متنبہ کیا گیا۔ ۱۸۶۴ء میں اُسے مجسٹریٹ کی عدالت میں آخری طور پر سرزنش کرنے کے لیے طلب کیا گیا، لیکن اُس نے یہ ساری تنبیہات بہرے کانوں سے سُنیں۔ آخر ۱۸۶۹ء میں اُسے ذاتی حراست میں لے لیا گیا۔ ایسے مقدمات کو نبٹانا بہت مشکل ہے۔ اپنے عقیدے کے مطابق متقی اور مخلص لوگوں کے خلاف کارروائی کرتے ہُوئے حکومت خود گھبراتی ہے، بس اتنا کیا جا سکتا ہے کہ اُن کا زہر دوسروں تک نہ پہنچنے پائے اور وہ بھی صرف معمولی پابندیوں کے ساتھ ....."

ایک فوجی چوکی قائم کر دی۔ پورے علاقے میں اضطراب کی چنگاریاں بکھر گئیں۔ ۳۰ جولائی ۱۸۶۸ء کو قبائلیوں کے ایک لشکر نے اس چوکی پر حملہ کر دیا۔ چوکی تو وہ نہ چھین سکے مگر خاصی خونریزی ہوئی۔ برطانوی حکومت نے ۳۱ جولائی کو جوابی کارروائی کی اور چنگاریاں آگ بن گئیں۔ چند ہفتوں کے اندر اندر برطانوی علاقے کے بائیس گاؤں اس آگ میں جل کر بھسم ہو چکے تھے۔ سرحدی فوج تقریباً دگنی کر دی گئی تھی، لیکن صورتِ حالات اس کے قابو سے باہر ہو چکی تھی۔

۸ ستمبر کو مرکزی حکومت نے لشکر کشی کی اجازت دی، تاہم اب پنجاب کے بجائے صوبجاتِ متحدہ کی چھاؤنیوں سے فوجیں طلب کی گئیں۔ اس فوجی مہم کی کمان بریگیڈیئر جنرل وائلڈ کو سونپی گئی۔ ۲۰ ستمبر کو کمانڈر انچیف نے افواج کی پیش قدمی کا حکم دیا اور ۳ اکتوبر کو دو شاخہ حملے کا آغاز ہو گیا۔ ایک جیش کی کمان کرنل برائٹ کر رہا تھا اور دوسرے کی کرنل واگھن۔ تقریباً نو ہزار فوج حرکت میں آ چکی تھی۔ یہ نقل و حرکت اس تیزی سے ہوئی کہ قبائلی سٹپٹا گئے۔ ویسے بھی وہ جم کر لڑنے کے عادی نہ تھے۔ وہ ہر محاذ پر پسپا ہونے لگے۔ مجاہدین واحد قوت تھے جنھوں نے ایک ایک قدم پر انگریزوں کا بڑی جانبازی سے مقابلہ کیا اور ایک بار پھر انگریزوں کو اس قوت کی سخت جانی اور خطرناکی کا بشدت احساس ہوا۔ ۲۰ اکتوبر تک انگریزی افواج فاتحانہ واپس آ رہی تھیں، لیکن وہ بقول ہنٹر "اب بھی خرابی کی تہ تک پہنچنے میں ناکام رہی تھیں" وہ نہ تو مجاہدین کو ان کی کچھار سے باہر نکال سکیں اور نہ انھیں ہندوستان واپس جانے پر آمادہ کر سکیں۔ مجاہدین پہلے کی طرح اب بھی سربلند اور کوہ ثبات تھے۔

اس دھماکے کی لہروں نے برطانوی ہند کی پوری حکومت کو ایک مرتبہ پھر جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ "خرابی" کا اصل "سرچشمہ" اس کی اپنی سرحدوں میں تھا، اندھے مقدمات اور جبر و تشدد کے ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال بھی اس سرچشمے کا منہ نہ بند کر سکا تھا۔ جذبے پہلے کی طرح جوان تھے، بلکہ مصائب و شدائد نے ذوقِ جنوں کو اور تابناکی بخش دی تھی۔ جذب و جنوں کی اس کیفیت سے برطانوی حکام سیخ پا ہو گئے۔

تحریک کے بعض افراد اُن کی نظر میں تھے، بعض کا ذکر انبالہ اور پٹنہ کے مقدمات میں آچکا تھا، ان کی سرگرمیوں کی نگرانی بھی ہو رہی تھی، ان کی ڈاک بھی سنسر کی جاتی۔ وہ چاہتے تھے کوئی ایسا اشارہ مل جائے جس کی مدد سے پوری تحریک پر ضربِ کاری لگا سکیں۔ اکتوبر ۱۸۶۸ء کے بعد شکاری کتّوں کی قوتِ شامّہ اور تیز ہو گئی۔

تحریک کے کارکن ساری خط کتابت اب بھی مرموز زبان میں کرتے تھے اور زیادہ تر قابلِ اعتماد قاصدوں کے ذریعے، تاہم کبھی کبھار وہ ڈاک کے ذریعے بھی آپس میں خطوط کا تبادلہ کرتے اور رقوم ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجتے۔ ۷ رمئی ۱۸۶۸ء کو امیرِ جماعت مولوی مبارک علی نے دہلی کے پتے پر تحریک کے ایک ذمّہ دار کارکن امّید علی کے نام رجسٹری خط میں بنک کے ہاف نوٹ بھیجے۔ ایک رجسٹری خط انھوں نے مولوی محمّد امین کے نام ۲۷ رمئی کو دہلی ارسال کیا، لیکن کسی خط کی رسید نہ آئی۔ مولوی صاحب نے کئی مہینے انتظار کے بعد ۲۷ رنومبر ۱۸۶۸ء کو پٹنہ کے پوسٹ ماسٹر کے نام درخواست دی کہ انھوں نے جو رجسٹری خط بھیجے تھے وہ مکتوب الیہم کو نہیں ملے، تحقیقات کی جائے کہ وہ خط کہاں گئے؟ پوسٹ ماسٹر نے یہ درخواست خصوصی خفیہ محکمے کے اعلیٰ حکّام کو بھیج دی۔ انسپکٹر پولیس بابو اشیری پرشاد جس نے انبالے اور پٹنے کے مقدمات کی چھان بین اور تیاری میں اہم کردار ادا کیا تھا، درخواست لے کر کلکتے پہنچا اور اسپیشل ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر ریلی سے ملا ــــــ یہ جانتے ہوئے سال کی سب سے بڑی خبر تھی۔ جو کھوج برطانوی ہند کی حکومت کو درکار تھا، وہ ہاتھ آگیا تھا۔ اب انگریز حکّام اپنی تفتیش کا دائرہ وسیع کر سکتے تھے اور تحریک کے بڑے بڑے ستونوں اور ممتاز کارکنوں کو گرفت میں لے سکتے تھے۔ مسٹر ریلی نے اُسے دہلی جانے اور امّید علی اور محمّد امین کے گھروں کی تلاشی لینے کی ہدایت کی۔

یہاں پہلے ہی بعض اُن سوداگروں کی نگرانی کی جا رہی تھی جن کے نام پٹنہ کے الٰہی بخش (مُلزم مقدمہ انبالہ) کی دُکان سے ملنے والے کھاتوں میں درج تھے، خورشید علی ان میں سے ایک تھے۔ انھی دنوں راج محل میں بھی تحریک کے کارکنوں کا سراغ لگا

تھا۔۔۔اتواری لبسواس کی شکایت پر نولو کرسٹو گھوش نے مخبری کی تھی کہ ابراہیم منڈل اس علاقے میں "وہابی تحریک" کے امیر ہیں، چنانچہ مسٹر ریلی نے تحقیقات کی اور وہاں سے پٹنہ گیا وہاں انکشاف ہوا کہ مشرقی علاقوں میں جہاد کے لیے جو چندہ جمع ہوتا ہے وہ مبارک علی وصول کرتا ہے۔ مبارک علی یہ رقوم دہلی کے خورشید علی نامی ایک شخص کے حوالے کرتا ہے اور وہ یہ روپیہ "ہندوستانیوں" کو سرحد بھیجتا ہے۔ بابو ایشری پرشاد کے پہنچتے ہی دہلی کے حکام حرکت میں آ گئے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس میجر آرچرڈ نے خورشید علی، امید علی اور محمد امین کے وارنٹ حاصل کر کے ان کے گھروں پر چھاپہ مارا۔ خورشید علی کی دکان سے جو بہی کھاتہ ملا اس سے حکومت بنگال کے سیکرٹری کے ایک خط کے مطابق جو اس نے ہوم ڈیپارٹمنٹ حکومت ہند کے سیکرٹری کے نام بھیجا تھا، اس اطلاع کی واضح اور مضبوط شہادت ملتی تھی۔ امید علی کے مکان سے جو مواد ملا وہ کہیں دھماکہ خیز تھا۔ اس کے ہاں سے بڑی تعداد میں ایسے خطوط ملے جن سے تحریک کے طریق کار اور امید علی کے مرتبہ و مقام کا پتہ چلتا تھا۔ وہ دارالحکومت میں مولوی مبارک علی کے سب سے اہم نمائندے تھے۔ مولوی محمد امین کو پولیس چھاپے کی خبر پہلے ہی مل گئی۔ وہ باقر گنج (بنگال) کے رہنے والے تھے، خبر ملتے ہی دہلی سے نکل گئے۔

برطانوی حکومت نے صحیح آدمیوں پر ہاتھ ڈالا تھا۔ امید علی کے گھر سے ۱۹ خط ملے۔ ان میں سے بعض بڑے اہم تھے۔ چند خطوط میں مختلف علاقوں میں کام کرنے والے تحریکی کارکنوں کے نام درج تھے۔ اس طرح شمالی اور مشرقی صوبوں میں دور دور تک پھیلی ہوئی تحریک کی اہم کڑیاں حکومت کے ہاتھ آ گئی تھیں۔ ایک خط مولانا یحییٰ علی کا تھا جو انھوں نے ۱۰ صفر ۱۲۷۶ھ کو لکھا تھا۔ اس زمانے میں امید علی رامپور میں ہوتا تھا۔ اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ مولوی محمد امین کا ہاتھ بٹانے کے لیے دہلی چلا جائے۔ ایک اور خط سے ظاہر ہوتا تھا کہ مولوی احمد علی اور صادق علی سہارنپور میں تحریک کے ذمہ دار کارکن ہیں۔ ایک اور خط بتاتا تھا کہ دانا پور میں جماعت کا نظم و نسق پیر محمد کے ہاتھ میں ہے (یہ بات قابل ذکر ہے کہ پیر محمد کی بیٹی مولوی مبارک علی صاحب کے

صاحبزادے تبارک علی کی بیوی تھی) ایک اور خط ناٹے خاں اور سید عبداللہ کی نشاندہی کرتا تھا جو رڑکی میں تحریک کا کام کر رہے تھے۔ بعض خطوں میں اشرفیوں کا حوالہ تھا کچھ میں اُنھیں جُوتوں کے پردے میں ظاہر کیا گیا تھا اور کچھ میں کتابوں کے لبادے میں۔ ایک خط میں بعض کتابوں کی قیمتیں ۱۹، ۱۵، ۱۶ اور ۱۶۴ روپے درج تھیں۔ بعد میں تحقیقات سے پتہ چلا کہ ان کی اصل قیمتیں صرف دو اور تین روپے ہیں۔

اُمّید علی کو اُسی وقت زیرِ حراست لے کر پوچھ گچھ کے لیے خصوصی خفیہ محکمے کی عقوبت گاہ میں پہنچا دیا گیا۔ اس پر کیا کچھ مظالم توڑے گئے، تاریخ میں اس کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ وہ خود ہی اپنی رُودادِ الم بیان کر سکتا تھا، مگر ایک شکستہ اعصاب شخص کے لیے جسے تحریک سے غدّاری اور بے وفائی کے احساس نے قتل کر ڈالا ہو، ایسی کسی رُوداد کو الفاظ کا پیراہن پہنانا ممکن نہ تھا خصوصاً ایسے دَور میں جبکہ برطانوی استبداد کے دہشت ناک سایوں نے چار سُو سکوتِ مرگ طاری کر دیا تھا! اُمّید علی کو دسمبر ۱۸۶۸ء کے اوائل میں زیرِ حراست لیا گیا لیکن قانونی طور پر اُس کے وارنٹ گرفتاری ۲۴ر فروری ۱۸۶۹ء کو جاری ہُوئے۔ اُمّید علی بڑا پرانا کارکن تھا۔ مولانا ولایت علی کے ہاتھ پر اُس نے بَیعت کی تھی۔ آسائش کا دَور تو تحریکوں پر اپنے نصبُ العین کی طرف پیش قدمی کرتے ہُوئے کبھی آتا ہی نہیں جب تک وہ منزلِ مقصود کو جا نہیں لیتیں، ٹھاٹھ باٹھ اور عیش و راحت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتیں۔ صعوبت ناک سفر کی تلخ کامیاں ان کا مقدر ہوتی ہیں — حالات کا اُتار چڑھاؤ ان سے قدم قدم پر جانکاہی اور ایثار و قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اُمّید علی اب تک پیش آنے والے سارے احوال و کیفیات سے دوچار ہو چکا تھا۔ وہ ان کارکنوں میں سے تھا جو ہنٹر کے بقول اپنے سردار سے غدّاری کے بجائے مَوت کو ترجیح دیتے تھے، لیکن مسلسل دو ماہ تک اُسے جن جسمانی اور نفسیاتی اذیتوں کی چکّی میں پیسا گیا، اُنھوں نے اُسے ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا اور برطانوی حُکّام اُس سے طُول طویل بیان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

○

بربریت کے ہتھکنڈوں سے حاصل کردہ اس بیان میں تحریک کے پھیلاؤ اور طریقِ کار کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی جاسکتی ہے[1]۔

"میں تراچور، پرگنہ مولدی ضلع باقرگنج کا رہنے والا ہوں۔ بارہ برس کی عمر میں پڑھنے کے لیے گھر چھوڑا۔ فرید پور کے گاؤں میں نجیب اللہ خلیفہ (ایک درزی) کے مکان پر گیا اور کپڑے سینے اور قرآن پڑھنا سیکھا۔ پھر کلکتے چلا گیا تاکہ بھائی امداد علی کے ہاتھ نہ آسکوں۔ وہاں مچھوا بازار کی مسجد میں ایک مولوی کے ساتھ پڑھتا رہا۔ یہاں تقریباً ایک برس رہا۔ پھر ایک طالب علم ساتھی عماد الدین سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے مجھے دہلی جانے کا مشورہ دیا؛ چنانچہ میں جھڑکنڈا اور گیا کے راستے دہلی آگیا۔

غدر سے کوئی دس بارہ برس پہلے پٹنہ کے مولوی ولایت علی دہلی آئے اور محلہ کشمیری دروازہ میں ٹھہرے۔ میں اُن کا وعظ سننے جایا کرتا۔ وہ جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دیتے اور کہتے جو لوگ جہاد میں شریک ہوتے ہیں اللہ اُن پر برکتیں نازل کرتا ہے اور جو شریک نہیں ہوسکتے، مگر یہیں گھروں میں بیٹھ کر مجاہدین کی مدد کرتے ہیں اللہ انھیں بھی برکت وسعادت سے نوازتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد مولوی ولایت علی پشاور چلے گئے۔ پھر ہزاروں مسلمان قافلہ در قافلہ یہاں پہنچنے لگے۔ وہ سراؤں اور مسجدوں میں قیام کرتے اور پشاور روانہ ہوجاتے۔ ایک روز مولوی ایمان علی مرحوم[2] نے جو قلعہ میں رہا کرتے تھے، مجھے ہدایت کی کہ میں مولوی ولایت علی کی تلقین کے مطابق مجاہدین کی مدد کروں۔ میں مجاہدین کے قافلوں کو ان کی جائے قیام تک لے جاتا اور پھر انھیں راہ دکھاتا۔ مولوی ایمان علی، عبدالعزیز جفت ساز، حسین بخش، وزیر بیگ، مہم خان اور دوسرے لوگ جہادیوں کے مصارف کے لیے روپیہ مہیا کرتے۔ میں یہ روپیہ ان میں تقسیم کرتا، بسا اوقات نقد دیتا اور بعض اوقات جوتے فراہم کرتا۔ وہ بیمار

---

[1] امید علی کا یہ بیان اور آئندہ صفحات میں درج کیے جانے والے تمام بیانات اور سرکاری چٹھیوں کے لیے دیکھیے ڈاکٹر معین الدین احمد خان کی مرتب کردہ کتاب:

SELECTIONS FROM BENGAL GOVERNMENT RECORDS ON WAHABI TRAILS OF 1863-1870,

ص ۵۲ تا ۹۱۔ بیانات پڑھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ پولیس کچھ باتیں خاص طور پر ان لوگوں سے کہلوانا چاہتی ہے جن سے مجاہدین کی تحریک پر کالک مل جاسکے۔

[2] یہ شاید نواب تربیت [illegible] حکیم کے استاد مولوی امام علی تھے انھوں نے مولانا ولایت علی کی بیعت کی تھی۔

ہو جاتے تو انھیں اپنے گھر لے جاتا، اُن کا علاج معالجہ کراتا اور پھر روپیہ دے کر مغرب کو جانے والے راستے پر لگا دیتا۔

مَیں نے یہ فرائض غدر تک انجام دیے۔ شمس الدّین بنگالی، محمّد شفیع بنگالی اور متعدّد دوسرے حضرات ان فرائض کی ادائیگی میں میری معاونت کرتے۔ ان میں سے بعض جہاد پر چلے گئے ہیں، بعض اپنے گھروں میں ہیں اور کچھ فوت ہو چکے ہیں۔ غدر کے دوران مَیں قلعہ میں رہا اور دہلی کی تباہی اور بربادی کے بعد نظام الدّین میں جا مقیم ہوا۔ پھر مولوی بشارت اللہ (ضلع جیسور) غازی خانساماں (ضلع بردوان)، نذیر، بارکو، رجی علی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ رام پور چلا گیا۔ وہاں مَیں ایک مسجد کے مکتب میں پڑھانے لگا۔ میرا قیام نظام الدّین پنجابی کے گھر میں تھا۔ اس اثنا میں مولوی یحییٰ علی عظیم آبادی نے سُنا کہ مَیں رام پور میں ہوں۔ مَیں نے اُنھیں خط لکھا جس کا جواب اُنھوں نے مجھے دیا۔ اُن کا یہ خط (الف نشان والا) میرے گھر سے پولیس کے ہاتھ آیا۔ مَیں نے خط ب مولوی یحییٰ علی کو بھیجا۔ اُنھوں نے مجھے اطلاع دی کہ مولوی فرحت حسین کا انتقال ہو گیا ہے اور اُن کا کام مَیں نے سنبھال لیا ہے۔ یحییٰ علی نے مجھ سے کہا کہ مَیں دہلی واپس چلا جاؤں۔ اسی زمانے میں مجھے ایک خط دہلی کے مولوی عبدالقادر کا مِلا۔ اُنھوں نے اپنے بیٹے کی شادی میں شرکت کی دعوت دی تھی اور اپنا ہاتھ بٹانے کو کہا تھا؛ چنانچہ مَیں دہلی چلا گیا اور وہاں سات آٹھ مہینے محلہ بنگلہ سیّد فیروز میں رہا۔ پھر کچھ واجب الادا رقم لینے آگرے گیا۔ تھوڑی سی رقم تو مل گئی، باقی نہیں۔ تین مہینے بعد مَیں دہلی آیا اور ایک سال تک پنجابی کٹڑہ میں رہا۔ پھر مسجد پہاڑ گنج میں منتقل ہو گیا۔ یہاں عبدالصمد، شیخ عائد علی اور دو ایک بنگالی یعنی عثمان، عبدالغنی سُورج گڑھی اور بعض دوسرے لوگ جن کے نام مجھے یاد نہیں، میرے پاس آنے جانے لگے۔ وہ مولوی مُبارک علی اور دوسرے اصحاب سے روپیہ لاتے، ایک دو دِن میرے پاس قیام کرتے اور پھر مغرب کی طرف ستھانہ کی راہ لیتے جہاں مولوی عبداللہ اور فیاض علی کے ساتھ جہادی رہا کرتے تھے۔

پہلے عظیم آباد سے لاہور اور پشاور کے لیے ہُنڈیاں آیا کرتیں، لیکن جب بعض

ہنڈیاں پکڑی گئیں اور ان لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ اشرفیاں کمر سے باندھ لیتے اور لیے جاتے۔ یہ اشرفیاں عظیم آباد سے آتیں۔ یہ لوگ مغرب سے (امیر) عبداللہ اور (مولانا) فیاض علی اور دوسرے جہادیوں کے خطوط بھی لاتے اور مبارک علی اور دیگر اصحاب کو پہنچاتے۔ کوئی ڈیڑھ مہینہ ہوا، عبدالوحید خاں نامی ایک قاصد، جو عظیم آباد کے قریب کہیں رہتا ہے، عبداللہ اور فیاض علی کے پاس سے ان کے خطوط اور کاغذات لے کر آیا۔ یہ خطوط وغیرہ مبارک علی اور دوسرے لوگوں کے نام تھے۔ اسی طرح اور لوگوں کی بھی آمد و رفت رہتی تھی۔

تقریباً آٹھ نو مہینے ہوئے مغل شہزادہ فیروز شاہ کے دو قاصد آئے۔ ان میں سے ایک کا نام صادق اللہ تھا۔ وہ راج محل یا بھاگل پور کا رہنے والا تھا۔ دوسرا بنگالی تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ وہ مختلف راجاؤں کے نام کئی خطوط لے کر آئے تھے۔ دونوں پرانی عیدگاہ کی سرائے میں ٹھہرے اور مجھے تلاش کرتے ہوئے پہاڑ گنج پہنچے۔ میں مولوی حفیظ اللہ کا وعظ سننے گیا ہوا تھا اس لیے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ میرے نام مسجد کے مولوی صاحب کو پیغام دے گئے کہ میں ان سے باقر گنج کے امین الدین (مولوی امین) کی دکان پر پچھلے پہر ملوں۔ یہ دکان دریبے میں ہے۔ میں وقت مقررہ پر امین الدین کی دکان پر گیا۔ فیروز شاہ کے دونوں قاصد وہاں بیٹھے امین الدین سے مغرب (سرحد آزاد) کی باتیں بیان کر رہے تھے۔ پہلے تو مجھے دیکھ کر وہ چپ ہو گئے، لیکن جب امین الدین نے کہا کہ یہی امیّد علی ہے تو وہ میرے ساتھ بھی گفتگو کرنے لگے۔ انھوں نے بتایا انھیں فیروز شاہ نے بھیجا ہے۔ میں نے پوچھا: "شہزادہ کہاں ہے؟" ان کا جواب تھا: "ستھانہ میں مولوی عبداللہ کے پاس، وہ بھی جہادیوں میں شامل ہو چکے ہیں اور ہم ان کے خطوط لے کر آئے ہیں"۔ میں نے کہا: "مجھے خط دکھاؤ"۔ کہنے لگے: "دکھائیں گے، لیکن پہلے فیروز شاہ کے بھائی ایزد بخش کو تلاش کر دو۔ اس کی موجودگی میں ہم تمھیں خط دکھا دیں گے۔"

میں اگلے روز ایزد بخش کی تلاش میں نظام الدین گیا، مگر وہ وہاں نہ تھا۔ لوگوں

سے پتہ چلا وہ شہر میں بنگالی کوچے کے پیچھے رہتا ہے۔ میں نے اُس کا مکان تلاش کر لیا، لیکن وہ گھر پر نہ تھا، چنانچہ میں اپنے گھر چلا گیا۔ قاصد میرے ہاں پوچھنے آتے کہ ایزد بخش کا کیا بنا؟ ملا یا نہیں؟ "میں نے اُسے تلاش کر لیا ہے" میرا جواب تھا۔ کہنے لگے "یا تو ہمیں اُس کے پاس لے چلو یا اُسے اپنے ساتھ لے آؤ"۔ میں ایزد بخش کے ہاں گیا۔ اُس نے کہا: "انھیں میرے گھر پر مت لانا، میں کل پھاٹک حبش خان جاؤں گا، وہاں مجھے مولوی نذیر حسین[1] سے کچھ مشورہ کرنا ہے، میں ان (قاصدوں) سے وہیں ملوں گا۔"

دونوں قاصد میرے گھر آ گئے۔ ہم تینوں باہر کھڑے انتظار کرتے رہے۔ کوئی گھنٹے بھر بعد ایزد بخش آ پہنچا۔ میں نے تعارف کرایا "یہی وہ قاصد ہیں جنھیں تمھارے بھائی نے بھیجا ہے۔" ایک خستہ حال سا مکان خالی پڑا تھا۔ ایزد بخش ہمیں وہاں لے گیا۔ قاصدوں نے پہلے اِدھر اُدھر کی گھریلو باتیں شروع کر دیں، جب میں نے انھیں اطمینان دلایا کہ یہی شخص شہزادے کا بھائی ہے تو انھوں نے کئی خط ایزد بخش کے حوالے کیے۔ میں نے خطوط کھولے اور انھیں پڑھا۔ خطوط راجاؤں کے نام تھے جن کے نام مجھے یاد نہیں رہے۔ شہزادہ فیروز شاہ نے انھیں لکھا تھا کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق اُس کی مدد کریں۔ میں آمو میں ہوں گا۔ ایک اور خط ایک راجا کے ایڈی کانگ کے نام تھا۔ اُس سے کہا گیا تھا کہ ڈھائی لاکھ روپے کے جو جواہرات تمھارے پاس ہیں اُنھیں بیچ دو اور کسی ذریعے سے فیروز شاہ کو بھیج دو۔ ایک خط خود ایزد بخش کے نام تھا۔

قاصدوں نے ایزد بخش سے کہا کہ وہ اُن کے ساتھ چلے، جواہرات وصول کر کے بیچ ڈالے اور رقم اپنے بھائی کو بھیج دے، لیکن ایزد بخش نے معذرت کی کہنے لگا: "میں کچھ نہیں کر سکتا، میں نے دُکان کھول لی ہے" (دُکان چھوڑ کر نہیں جا سکتا)۔

"اِس قسم کے خطوط بار بار نہیں آ سکتے"، قاصدوں نے کہا۔ "انھیں اپنے پاس رکھو، ہم فیروز شاہ کو جا کر اطلاع کر دیں گے کہ تمھارے بھائی میں اِس طرح کا کام کرنے کی

---

[1] مشہور اہلِ حدیث عالمِ دین جن کے شاگرد پورے برِ صغیر میں پھیلے ہوئے تھے۔ شیخ الکل کہلاتے تھے۔ مصنف کے جدِ امجد کو بھی اس عظیم شخصیت کا ممتاز شاگرد ہونے کا شرف حاصل تھا۔

جرأت نہیں ہے۔ پھر جو وہ ہدایت کرے اُس پر عمل کرنا۔ ہم دوبارہ آجائیں گے۔"

آدھے خط کھلے تھے اور آدھے بند کہ مولوی نذیر حسین وہاں آگئے۔ ان کے ساتھ دو تین آدمی اور تھے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ مولوی نذیر حسین نے ان خطوط پر نظر ڈالی، مگر ان کے بارے میں کوئی بات نہ پوچھی۔ ایزد بخش نے خط بند کیے اور گھر ے گیا۔ قاصد سرائے میں چلے گئے۔ مولوی نذیر حسین اور اُن کے ساتھی میرے ساتھ وہیں کھڑے رہے۔ مَیں نے مولوی صاحب کو بتایا کہ یہ فیروز شاہ کے قاصد تھے اور ایزد بخش کے نام کچھ خط لائے تھے۔ مولوی صاحب نے جیسے سُنی اَن سُنی کر دی۔ کوئی جواب نہ دیا اور اپنے دوستوں سے باتیں کرتے رہے۔ یہ کوئی آٹھ نو مہینے کی بات ہے۔ خطوط پر فیروز شاہ کی ایک بڑی سی مُہر تھی۔ ان کا مقصد انگریز سرکار کے خلاف جنگ میں امداد حاصل کرنا تھا۔ اس واقعے کے بعد کئی اور قاصد مغرب سے آئے عظیم آباد اور دُوسرے مقامات کی طرف چلے گئے۔ فیروز شاہ کی طرف سے پھر کوئی قاصد نہ آیا۔ تقریبًا تین ماہ پہلے عماد علی مشرق کی جانب سے آیا اور مغرب کی طرف چلا گیا۔ عماد علی عظیم آباد کے قرب وجوار کا رہنے والا ہے۔

مَیں یہاں دہلی میں بیٹھ کر ان لوگوں کی مدد کیا کرتا۔ ہزاروں روپے مشرق سے لائے جاتے اور مغرب بھیجے جاتے۔ مَیں نے قاصدوں سے پُوچھا: "یہ اتنی رقم کہاں جاتی ہے؟" اُنھوں نے جواب دیا: "جہادیوں کے لیے جو انگریزی سرکار سے لڑ رہے ہیں اور جو لوگ اس جنگ میں مددگار ہیں انھیں بھی حصہ ملتا ہے۔"

امین الدین کو مَیں بیس برس سے جانتا ہوں۔ پہلی بار ہم یہیں دہلی میں ملے تھے۔ دونوں مِل کر مولوی ولایت علیؒ کا وعظ سننے جایا کرتے۔ ہم بڑے گہرے دوست تھے۔ وہ کتابوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ دینوی کاموں میں مصروف رہتا اور ساتھ ہی ساتھ جہادیوں کی بھی روپے پیسے سے مدد کرتا۔ دو مہینے ہُوئے وہ عظیم آباد مبارک علی سے ملنے جاچکا ہے۔ اُس کا ارادہ وہاں سے ڈھاکہ اور پھر اپنے گھر جانے کا بھی تھا۔ مُبارک علی نے اُسے بُلا بھیجا تھا۔ اُس کے سُسر عظیم الدین کے خطوط بھی آئے تھے جن میں اُسے

آنے کو کہا تھا۔ امین الدین نے جاتے ہوئے مجھے ہدایت کی کہ مَیں جہاد کے کام میں ہر طریقے سے مدد کرتا رہوں۔ مبارک علی جہاد کے کام میں پیش پیش ہے۔ دہلی میں جہاد کے کام میں حصّہ لینے والا اور کوئی شخص میرے علم میں نہیں۔

سہارنپور میں مولوی سعادت علی اور مولوی احمد علی (بستی) روپیہ پیسہ بھجواتے ہیں، مَیں نہیں جانتا وہ خود مالی مدد کرتے ہیں یا نہیں۔

انبالہ میں محمد حسین نامی ایک شخص محمد شفیع کا گماشتہ یا دوست ہے وہ جہاد کے کاروبار میں مدد کرتا ہے۔

لاہور میں مولوی حاجی عبدالستار اس معاملے میں مددگار تھا، اُس کی وفات کے بعد ایک اور آدمی مقرر کر دیا گیا ہے جس کا نام مجھے یاد نہیں۔

راولپنڈی میں تین آدمی ہیں۔ ایک کا نام عبداللہ شاہ ہے جو مشرق کا رہنے والا ہے۔ دوسرا قاسم علی ہے، بنگال کا باشندہ ہے اور لال کُرتی میں رہتا ہے۔ تیسرے آدمی کا نام مجھے یاد نہیں۔ قاصد اِن لوگوں کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہ جہاد میں مدد کرتے ہیں۔

پشاور میں ہدایت اللہ ہے۔ بازار قصّہ خوانی کے قریب کسی مسجد میں رہتا ہے اور جہاد کے اس کام میں معاون ہے۔ ایک دو ولایتی بھی اُس کے پاس آیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اُس سے ہندوستان سے آیا ہوا روپیہ اور جہادی لے جاتے ہیں۔

مَیں نے فیروز شاہ کے قاصد صادق اللہ سے سُنا کہ جن دِنوں وہ (فیروز شاہ) ہندوستان میں انگریزوں کے ساتھ برسرِ جنگ تھا، ایک یا دو آدمی اُس کے ہم رکاب تھے۔ پھر جب اُسے جنگلوں میں چھپنا پڑا اور وہاں سے وہ فارس چلا گیا تو یہ آدمی بریلی یا لکھنؤ اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ فیروز شاہ نے قاصدوں سے کہا تھا کہ وہ ان لوگوں کا پتہ چلائیں آج کل کہاں ہیں۔ وہ توپ سازی اور گن کیس بنانے میں مہارت رکھتے ہیں، اگر مل جائیں تو انھیں اپنے ساتھ لیتے آئیں۔

تبارک علی عرف قادر بخش، مبارک علی عظیم آبادی کا بیٹا ہے اور جہاد کے تمام

کام انجام دیتا ہے۔ مُبارک علی اس سارے کام کی قیادت کرتا ہے۔ دو برس ہُوئے تبارک علی دہلی آیا اور مدرسہ حسین بخش میں ٹھہرا۔ اُس نے ظاہر یہ کیا کہ پڑھنے آیا ہے، لیکن درحقیقت وہ جہاد کے کام میں مصروف تھا اور قاصد اُس کے پاس آجا رہے تھے۔ مَیں نے خود اُنھیں اُس سے ملاقاتیں کرتے دیکھا۔ مشرق سے جو رقوم آتیں پہلے اُس کے پاس آتیں اور وہ اُنھیں مغرب بھیج دیتا۔ درحقیقت وہ اس کام میں ہمارا معاون تھا۔ ہم ایک دوسرے سے متواتر ملتے رہتے۔ ایک برس ہُوا وہ دیوبند کے راستے عظیم آباد چلا گیا۔ اب مَیں اور امین الدین سارا کام کرتے۔ مُبارک علی کے تین چار خطوط امین الدین کے نام آئے جن میں نوٹ تھے، مگر لفافے پر میرا پتہ لکھا ہُوا تھا۔ امین الدین مہاجنوں سے نوٹ بھُنواتا۔ بعض اوقات نیل کٹڑا سے، کبھی کبھار ان کی کتابیں خرید لیتا۔ ایک مرتبہ امین الدین نے مجھے بتایا کہ کچھ نوٹ اُسے نہیں ملے، وہ ڈاکخانے والوں سے اس کی شکایت کرے گا۔ مشرق سے آنے والے قاصدوں سے مَیں نے ایک بار دریافت کیا: "اِس کاروبار میں کون کون لوگ شریک ہیں؟" اُنھوں نے جواب دیا: "زور آور خان، بہادر خان، ولادر خان وغیرہ یہ سب جہادیوں کی مدد کرتے اور روپیہ پیسہ دیتے ہیں۔" ان میں سے بعض بھاگلپور کے رہنے والے ہیں، بعض دیناپور کے۔ قادر بخش (تبارک علی) کا کھاتہ سید محمد دکاندار دریبہ اور سید ماہ رزم کے ساتھ ہے جو ممتاز علی پرنٹنگ پریس چھتہ قبر میں رہتے ہیں۔ مجھے یہ علم نہیں کہ ان لوگوں کو اس کاروبار کی خبر ہے یا نہیں۔"

○

یہ وہ تحریری بیان تھا جو پولیس نے دہلی کے مجسٹریٹ کارسٹیفن کی عدالت میں ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو اُمید علی سے دلوایا۔ اُس کے زبانی بیان پر شمالی اور مشرقی صوبجات میں پولیس ہر جگہ سرگرمِ عمل ہوگئی تھی اور اُمیّد علی نے جن جن لوگوں کے نام لیے تھے اُنھیں گرفتار کیا جا رہا تھا۔ ایزد بخش ولد مرزا ناظم بھی گرفتار ہونے والوں میں تھا۔ اُس کا بیان بھی ۱۵ر فروری ہی کو لیا گیا۔ اُس نے تسلیم کیا کہ قاصد خطوط لاتے تھے، لیکن کہا: "مَیں نے اُنھیں مکتوب الیہم تک پہنچانے سے انکار کر دیا۔ مَیں نے کہا مَیں ایک غریب

دکاندار ہُوں، میرے دو بچے بیمار ہیں، میرے پاس نہ تو وقت ہے اور نہ میں کوئی خطرہ مول لے سکتا ہُوں۔ میرے بچوں پر اُفتاد پڑ سکتی ہے۔ خطوط کا وہ تھیلا میرے پاس دن بھر رہا۔ رات کے وقت مَیں نے واپس کر دیا۔ مَیں نہیں جانتا وہ لوگ کہاں گئے اور کب گئے؟ مولوی نذیر حسین نے تھیلا نہیں دیکھا۔"

۱۶ر فروری ۱۸۶۹ء کو جے ایچ ریلی اسپیشل ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس نے انسپکٹر جنرل پولیس صوبجات زیریں کو دہلی سے خط لکھا جس میں اُمید علی اور ایزد بخش کے بیانات کا ترجمہ پیش کیا اور لکھا:

"اُمید علی کے بیان کی لپیٹ میں مختلف مقامات کے مختلف افراد آتے ہیں۔ مَیں ان لوگوں تک پہنچنے سے پہلے ہر طرح کی تحقیقات کروں گا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اُمید علی بنگالی ہے، امین الدین بھی بنگالی ہے، اسی طرح مُلک کے اس حصّے میں اکثر بااثر وہابی مولوی بنگالی ہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے خلاف کی جانے والی سازش کو عملی جامہ پہنانے میں بنگالی بڑے ہی موزوں اور مفید سمجھے جاتے ہیں جبکہ روپیہ بھُنانے اور خطوط بھیجنے کی صعوبت ہندوستانیوں پر چھوڑ دی گئی ہے۔"

ایزد بخش کے خط کا تذکرہ کرتے ہُوئے مسٹر ریلی نے لکھا: "اُس نے میاں نذیر حسینؒ کے بارے میں جان بُوجھ کر اس بات کا انکار کیا کہ وہ قاصدوں کے ساتھ ان کی گفتگو کے دوران موجود نہ تھے۔ میجر آرچرڈ اور بابو الیشری پرشاد کے سامنے ایزد بخش نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ نذیر حسین بھی وہاں موجود تھے۔ یہ نذیر حسین بھی بنگال کے رہنے والے ہیں اور دہلی میں اصلی وہابی لیڈر یہی ہیں۔ اُمید علی اور امین الدین ان کے ماتحت ہیں۔ نذیر حسین اگرچہ دہلی میں بڑے بااثر آدمی ہیں اور ان کے خلاف گواہی مشکل ہی سے ملے گی لیکن مَیں صداقت کی گہرائیوں میں پہنچنے کی پُوری کوشش کروں گا۔

مَیں نے پٹنہ کے مجسٹریٹ سے سُنا ہے کہ تبارک علی کے پاس سے جو خطوط ملے ہیں اُن میں میرٹھ کے بھی چند آدمیوں کے نام ہیں۔ کاغذات بابو الیشری پرشاد کو دے دیئے جائیں گے۔"

۱۹ر فروری ۱۸۶۹ء کو مسٹر ریلی نے صوبجات زیریں کے انسپکٹر جنرل کو دہلی

سے خط میں اطلاع دی کہ بابو الشیری پرشاد کی رپورٹ پر مولوی نذیر حسین صاحب کے مکان کی تلاشی لی گئی تو دو بنگالی اُن کی مسجد میں دکھائی دیے۔ یہ لوگ تھوڑی ہی دیر پہلے دہلی پہنچے تھے۔ مَیں نے انھیں طلب کر لیا۔ اُن کے بیانات سے پتہ چلا کہ وہ ضلع میمن سنگھ کے رہنے والے ہیں اور قرآن پڑھنے دہلی آئے ہیں، اُن کے یہاں آنے کا یقیناً کوئی مقصد ہوگا ورنہ قرآن تو ڈھاکہ، کلکتہ یا ہگلی میں بھی آسانی سے پڑھ سکتے تھے۔ سختی سے پُوچھا گیا تو انھوں نے تسلیم کر لیا کہ وہ ستھانہ کے رنگروٹ ہیں اور اُنھیں یہ فریب دے کر لایا گیا ہے کہ سید احمدؒ ابھی زندہ ہیں اور پہاڑوں میں مقیم۔ اُن کی زیارت بھی ہوگی۔

(۲) اُمّید علی نے بیان کیا تھا کہ دو قاصدوں میں سے ایک کا بازو لڑائی میں زخمی ہو گیا ہے اور مولوی سعادت علی اور احمد علی سہارنپور والے مولوی امیر الدین کے ساتھ لین دین کرتے ہیں۔ الشیری پرشاد نے وارنٹ تلاشی حاصل کیا اور جائنٹ مجسٹریٹ نے سعادت علی کے گھر کی تلاشی لی اور کئی خطوط ہاتھ آئے جن کا معاینہ ہو رہا ہے۔ تلاشی کے وقت الیشری پرشاد کو دو بنگالی متصلہ مسجد میں نظر آئے۔ ان میں سے ایک کے بازو پر زخم کا نشان تھا۔ دوسرے کا نام عبد الصمد تھا جس کا ذکر اُمّید علی نے کیا تھا۔ وہ قاصد ہے۔ زخمی شخص رنگپور کا باشندہ ہے اور عطاء اللہ نام ہے۔ مشکوک سی باتیں کرتا ہے۔ کہتا ہے وہ چھ برس پہلے گھر سے نکلا تھا، اس علاقے میں آیا اور کابل روانہ ہو گیا۔ سُنا تھا وہاں پھل بکثرت ہوتے ہیں۔ خیبر میں اُسے ڈاکوؤں نے زخمی کر دیا اور لُوٹ لیا۔ خالی ہاتھ ہندوستان لَوٹا۔ کوئی چار مہینے مولوی عبد اللہ کے پاس رہا۔ وہ کچھ لوگوں کے نام بھی بتاتا ہے، پھر خیبر چلا آیا جہاں ڈھائی برس رہا۔ اُس وقت سے سہارنپور میں مقیم ہے اور خیرات پر گزر بسر کرتا ہے۔ ان دونوں کو الشیری پرشاد دہلی لے آیا۔ اُمّید علی نے فوراً پہچان لیا۔ وہ زخمی شخص قاصد ہی تھا، اُمّید علی اُسے سرحد لے جانے کے لیے روپیہ دیا کرتا تھا۔ وہ جنگ میں زخمی ہُوا تھا۔

۲۶ر فروری ۱۸۶۹ء کو اسپیشل ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس نے صوبجات زیریں کے انسپکٹر جنرل پولیس کو کلکتے سے لکھا:

۱۶ر فروری ۱۸۶۹ء کے حوالے سے یہ رپورٹ پیش کی جارہی ہے۔ مولوی نذیر حسین سورج گڑھ ضلع مونگیر کے باشندے ہیں۔ ان کے ہاں سے تلاشی کے وقت جو خطوط ہاتھ آئے اُن کا لفظی ترجمہ بھیجا جارہا ہے۔ ان کے الفاظ بڑے پُراسرار ہیں، ایسے اشارے کنائے عام ہیں جو آدمی کسی طاقت ور حکومت کے خلاف خطرناک باتیں لکھتے ہوئے ــــــ انھیں چھپانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ایسے اشارے کنائے ان خطوط اور کاغذات میں بھی پائے جاتے تھے جن کی بنیاد پر انبالہ اور پٹنہ کے مقدّمے چلائے گئے۔ ان مقدموں میں دی جانے والی سزاؤں کے پیشِ نظر یہ توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ مولوی خط کتابت میں حکومت کے خلاف بغاوت کا اظہار کھلے الفاظ میں کرے گا۔ اگرچہ دہلی میں مولوی کے خلاف کوئی شخص شہادت نہ دے گا، تاہم ان خطوط کا جو مقصد ہے اُس کی بنا پر میں یہ درخواست کرنے میں حق جانب ہوں کہ مولوی نذیر حسین کو گرفتار کرلیا جائے۔ اُمید علی نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ مولوی نذیر حسین نے فیروز شاہ کے بھیجے ہوئے خط دیکھے تھے اور جانتے تھے کہ قاصد کون ہیں، انھیں خطوط کے مقصد کا بھی پتہ تھا۔ ایزد بخش نے بھی پہلے زبانی بیان میں اس بات کو تسلیم کیا، مگر تحریری بیان میں انکار کردیا۔"

میاں نذیر حسینؒ صاحب کے گھر سے ۱۳ خطوط اور آخری مغل بادشاہ کے فرامین برآمد ہوئے۔ تین خطوط مولوی محمّد جعفر تھانیسری کے تھے، ایک خط امیر جماعت مُبارک علی کے صاحبزادے تبارک علی کا تھا۔ ایک خود مُبارک علی کا بھیجا ہُوا تھا جس میں انھوں نے کسی مرنے والے کی چھوڑی ہوئی بیوی کے حق مہر کی رقم کا ذکر کیا تھا اور کوئی مسئلہ پُوچھا تھا۔ میاں صاحب کا اس خط کے بارے میں مؤقف یہ تھا کہ یہ ایک ایسے آدمی کا معاملہ ہے جو مرگیا، ایک دو بیویاں چھوڑ گیا ایک سُورت میں اور دوسری بڑودا میں۔ لیکن مسٹر ریلی نے اپنی رپورٹ میں لکھا: "خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرنے والے آدمی نے اپنی بیوی ڈھاکہ میں چھوڑی۔ اس میں تین سو روپے جمع کرنے کا ذکر ہے۔ سوال یہ ہے کہ مُبارک علی پٹنہ میں بیٹھے ہوئے ایک ایسے شخص میں کیوں دلچسپی لیتا ہے جو ڈھاکہ میں مرا؟ مجھے یقین ہے کہ تین سو کی یہ رقم کسی عورت کے حق مہر کی نہیں تھی،

جہادیوں کے لیے تھی۔ خصوصاً جب کہ ہم جانتے ہیں کہ مبارک علی نے یحییٰ علی کا کام سنبھال رکھا ہے۔"

ایک اور خط میں شطرنج کے کھیل کے بارے میں فتویٰ دریافت کیا گیا تھا مسٹر ریلی نے خیال ظاہر کیا کہ یہ جنگ کی طرف اشارہ ہے۔ ایک ایسا خط بھی ہاتھ آیا جو میاں نذیر حسینؒ نے مولانا عبداللہ غزنویؒ کے نام لکھا تھا۔ مسٹر ریلی کی رائے تھی کہ مکتوب الیہ دراصل مولانا عبداللہ (امیر المجاہدین) ہیں۔ مسٹر ریلی نے لکھا تھا کہ پنجاب گورنمنٹ سے کہا جائے کہ وہ میاں نذیر حسینؒ کو ۱۸۱۸ء کے قانون III کے تحت گرفتار کرلے۔"ایشری پرشاد (جو یہ ساری تحقیقات کر رہا تھا) کا کہنا ہے کہ جب تک مولوی آزاد ہے سرحد کے ہندوستانیوں اور برطانوی رعایا کے درمیان رابطے اور میل جول کو روکنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ وہ اُمید علی اور امین الدین کی جگہ دُوسرے اشخاص کو آسانی سے متعین کر سکتا ہے۔"

رپورٹ کے آخر میں مسٹر ریلی نے لکھا: "مَیں نے ایشری پرشاد کو ہدایات دی ہیں کہ وہ انبالہ جائے اور جو سُراغ ہمیں ملے ہیں اُن پر کام کرے اور ضروری سمجھے تو آگے سرحد جائے اور مجھے اپنی کارکردگی سے مطلع کرتا رہے۔ ضرورت پڑی تو مَیں بھی پنجاب اُس کے ساتھ جا ملوں گا۔"

۸ ر مارچ ۱۸۶۹ء کو حکومتِ بنگال کے قائم مقام جونیئر سیکرٹری نے اس رپورٹ اور مسٹر ریلی کی سفارشات کے بارے میں صوبجاتِ زیریں کے انسپکٹر جنرل پولیس کو لکھا:

"جہاں تک حکومت کی اطلاعات کا تعلق ہے، لیفٹیننٹ گورنر کو مولوی نذیر حسین کے خطوط وہابی تحریک سے منسلک کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ہز آنر کے خیال میں، ایک استثنیٰ کے سوا، ان خطوں میں ذرا بھی مشتبہ بات نہیں ہے؛ تاہم حکومتِ پنجاب سے درخواست کر دی گئی ہے کہ وہ ۱۸۱۸ء کے ریگولیشن III کے تحت اس شخص کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دے بشرطیکہ ایشری پرشاد اس حکومت کو یہ اطمینان دلادے کہ

مولوی کی گرفتاری کے کافی وجوہ موجود ہیں۔ نیز میں درخواست کروں گا کہ مسٹر ریلی تمام ڈویژنوں کے کمشنروں کو ان ساری باتوں سے خفیہ طور پر آگاہ کرتے رہیں جو تحقیقات کے دوران میں سامنے آتی رہی ہیں اور جن سے متعلقہ ڈویژن متأثر ہوتے ہیں"

○

اُمید علی کے بیان کی روشنی میں تفتیش کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کا دائرہ بڑھتا چلا گیا۔ ۱۹ مارچ ۱۸۶۹ء کو مجسٹریٹ نے ڈپٹی کمشنر دہلی کو لکھا کہ اس وقت چار آدمی قید ہیں: اُمید علی، ایزد بخش، عطاء اللہ اور مولانا نذیر حسینؒ ——— لیکن یہ تو آغاز تھا۔ سنہ ۱۸۶۹ء تک چھوٹے بڑے سینکڑوں کارکن زنجیر و سلاسل میں جکڑے جا چکے تھے اور پشاور سے بنگال تک پولیس کے بوچڑ خانوں میں اُن کے جسم و رُوح کو بُری طرح ذبح کیا جا رہا تھا۔ ان میں راجشاہی کے منیر الدین، خدا بخش، صُوفی حاجی اور سہارنپور کے سعادت علی اور احمد علی تھے پٹنہ میں خورشید علی، مولوی مُبارک علی اور امیر خان نظر بند کیے جا چکے تھے۔ پٹنہ کے حشمت داد خان، امیر خان اور حاجی دین محمد، راج محل کے ابراہیم منڈل اور نذیر سردار اور مالدہ کے مولوی امیر الدین (جن کی مخبری نولو کرسٹو گھوش نے کی تھی) دہلی پولیس نے اُمید علی کے مکان پر چھاپہ مارا تو ابن الدین دہلی چھوڑ کر چلے گئے تھے مجسٹریٹ نے فوراً پٹنہ کے حُکام کو تار بھیجا، چنانچہ بہار اور بنگال کی سرکاری مشینری حرکت میں آگئی اور انھیں ضلع میمن سنگھ میں گرفتار کر لیا گیا۔ مولوی مُبارک علی کے صاحبزادے تبارک علی اور اُن کے خُسر پیر محمد بھی زنداں کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیے گئے تھے۔ نذیر محمد معظم مراد عبداللہ قواعدی (جو مجاہدین کو پریڈ کروایا کرتا تھا) قاری امداد علی، عبدالغنی سُورج گڑھی اور سینکڑوں دوسرے افراد گواہی کے لیے پلپیے اور کچلے جا رہے تھے۔ بمبئی اور مدراس میں گہری چھان بین الگ جاری تھی اور دہاں "وہابی تحریک" کے اثرات اور عظیم آباد کے ساتھ اس کے تعلقات کا سُراغ لگایا جا رہا تھا۔

۱۸۷۰ء کے اوائل تک انگریز حُکام تحریک کے بڑے بڑے سرگرم اور ممتاز رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف مقدمات چلانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ یہ مقدمات تین مختلف

اَوقات میں چلائے گئے۔ مارچ ۱۸۷۰ء میں مالدہ کے مولوی امیرالدین پر مقدمہ دائر کر دیا گیا سیشن جج نے انھیں حبسِ دوام بعبور دریائے شور اور ضبطیٔ املاک کی سزا سنائی جسے ہائی کورٹ نے بحال رکھا اور مارچ ۱۸۷۲ء میں اُنھیں انڈمان پہنچا دیا گیا۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء میں اسلام پور کے ابراہیم منڈل اور نذیر سردار پر سازش کا چوتھا مقدمہ (راج محل) شروع ہُوا اور اُنھیں بھی حبسِ دوام بعبور دریائے شور اور ضبطیٔ جائداد کی سزا دے دی گئی۔ انھیں انڈمان نہیں بھیجا گیا اور وہ ہندوستان ہی کی مختلف جیلوں میں آٹھ برس تک اذیتوں کا شکار ہوتے رہے اور ۱۸۷۸ء میں رہا ہُوئے۔

پانچویں اور آخری مقدمے کے لیے سال بھر تیاری ہوتی رہی۔ مشقِ ستم بنانے کے لیے سات اربابِ جنوں منتخب کیے گئے۔

(۱) مولانا مُبارک علی۔ امیرِ جماعت تھے اور تحریک کی سرگرمیوں کا فعّال مرکز۔ مرکزی شخصیت ہونے کی وجہ سے اس مقدمے کے سب سے بڑے ملزم یہی تھے، اگرچہ اہمیت بوجوہ امیر خان کو مل گئی۔

(۲) مولوی تبارک علی۔ مولوی مبارک علی کے صاحبزادے پُرجوش کارکُن تھے۔ اپنے والد کے دستِ راست۔ اِن پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ انھوں نے امبیلا کی جنگ (۱۸۶۳ء) میں مجاہدین کے ایک دستے کی کمان کی تھی۔

(۳) حاجی دین محمّد۔ صُوبہ بہار کے رہنے والے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے اِن کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں کیں، تاہم جماعت میں ان کے مقام کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ اُن کا نام چوٹی کے "مجرموں" میں شامل کیا گیا تھا۔ ایک حاجی دین محمّد راولپنڈی میں متعیّن تھے اور تحریکِ مجاہدین کے ساتھ "رابطہ افسر" کا کام کرتے تھے۔ ممکن ہے وہ یہی دین محمّد ہوں۔

(۴) حشمت داد خان۔ پٹنہ کی مشہور امیر خان فرم کے حصّے دار تھے۔ محلہ عالم گنج پٹنہ کے رہنے والے اور لکھ پتی تاجر تھے۔ ۱۸۴۷ء میں مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی ہندوستان واپس آنے پر مجبُور کر دیے گئے

تو اُنھوں نے اور ان کے شریکِ کار دلاور خان نے ان کی ذاتی ضمانت دی تھی۔ دلاور خان تو فوت ہو چکے تھے اس لیے دار و گیر سے محفوظ ہو گئے، انھیں تحریک کے ساتھ اپنے اس تعلق کی قیمت چکانی پڑی۔

(۵) پیر محمد۔ دانا پور کے رہنے والے تھے اور مولوی تبارک علی کے خسر۔ دانا پور میں جماعت کے ممتاز کارکن تھے، تاہم گرفتاری غالباً مولوی تبارک علی کے ساتھ رشتہ داری کے جرم میں ہوئی۔ حکومت ان کے خلاف ایک بھی معقول شہادت نہ پیش کر سکی۔

(۶) حاجی امین الدین۔ باقر گنج کے باشندے تھے: ان کے دو عرفی نام تھے مولوی امین اور عبید اللہ۔ بہت بڑے تاجر تھے اور تحریک کے کاموں میں گرم جوش۔

(۷) امیر خان۔ محلہ عالم گنج پٹنہ کے باسی تھے۔ گرفتاری کے وقت ۷۵ برس کے تھے۔ بنگال اور بہار میں پھیلا ہوا چمڑے کا کاروبار اتنا وسیع تھا کہ انگریز تاجر بھی ان کے آگے خم کھاتے اور حسد کی آگ میں جلتے تھے۔ کروڑپتی تھے۔ سیّد بادشاہ یا مولانا ولایت علیؒ کی بیعت تھے۔ تحریک کے کاموں میں دِل کھول کر مالی اعانت کرتے۔ اگرچہ اس اعانت کا ثبوت انگریز حکّام سر توڑ کوشش کے باوجود فراہم نہ کر سکے۔ بنگال کے مشرقی اضلاع سے موصول ہونے والا روپیہ انھیں کی کولوٹولہ کلکتّہ والی فرم کی وساطت سے پٹنہ اور پنجاب بھیجا جاتا۔ اس سلسلے میں یہ خاصی احتیاط برتتے۔ صرف ایک ہنڈی کا سراغ حکومت کے ہاتھ لگ سکا اور اس کی بنا پر ۱۸۶۴ء میں پہلی مرتبہ گرفتارِ ابتلا ہوئے۔ کپتان پارسنز کلکتے گیا، ان کے کولوٹولہ والی دکان کی تلاشی لی اور انھیں گرفتار کر لیا۔ ان کے کارندے منشی مصاحب علی اور شریکِ کار زور آور خاں بھی گرفتار کیے گئے تھے اور دونوں سرکاری گواہ بن گئے۔

مولوی مبارک علی اور اُن کے دوسرے چار ساتھی تو پہلے ہی گرفتار کیے جا چکے تھے۔ ۱۰ جولائی ۱۸۶۹ء کو کلکتہ میں امیر خان کی گرفتاری عمل میں آئی اور ۱۲ جولائی

کو حشمت داد خان کی۔ انھیں مختلف جیلوں کی یاترا کرانے کے بعد علی پور اور ویلگا کی جیلوں میں پہنچا دیا گیا۔ انگریز حکام کا رویہ روزِ اول ہی سے عناد و نفرت کا آئینہ دار تھا۔ ان سب لوگوں کو ریگولیشن نمبر ۳ ۱۸۱۸ء کے تحت گرفتار کیا گیا تھا کہنے کو یہ شاہی قیدی (STATE PRISONERS) تھے، لیکن ان کے ساتھ سلوک عام حوالاتیوں کا سا کیا جا رہا تھا۔ گرفتار کرتے وقت انھیں وارنٹ تک نہ دکھائے گئے۔ جب انھوں نے پوچھا کہ انھیں کس جرم کی پاداش میں پکڑا گیا ہے تو پہلے تو جواب دینے کی زحمت ہی گوارا نہ کی گئی پھر اواخر جولائی میں صرف اتنا بتایا گیا کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کے حکم سے گرفتاری عمل میں آئی ہے اور وارنٹ دکھانے کی اجازت نہیں۔ تقریباً ایک برس بعد حشمت داد خان اور امیر خان نے الگ الگ درخواستیں اعلیٰ حکام کو دیں۔ ۱۱ مئی ۱۸۷۰ء کو بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر ولیم گرے کی خدمت میں حشمت داد خان نے ایک عرضداشت پیش کی کہ اُسے یا تو رہا کیا جائے یا جلد از جلد اُس پر مقدمہ چلایا جائے۔ لیفٹیننٹ گورنر نے جواب دیا کہ وہ نہ تو رہا کیا جا سکتا ہے اور نہ اُس پر مقدمہ ہی چلایا جا سکتا ہے اور چونکہ اس کی گرفتاری ریگولیشن ۳ ۱۸۱۸ء کے تحت عمل میں آئی ہے اس لیے نہ تو یہ معمول ہے اور نہ حکومت ضروری ہی سمجھتی ہے کہ اُسے وارنٹ کی نقل فراہم کی جائے۔ امیر خان نے انگریز انتظامیہ سے رجوع کرنے کے بجائے کلکتہ ہائی کورٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ حشمت داد خان نے بھی الگ ایک درخواست عدالتِ عالیہ میں دائر کی۔ دونوں درخواستوں کی سماعت چیف جسٹس نارمن نے خود کی۔ اسیروں کی طرف سے تین وکیل مسٹر انیسٹے، مسٹر انگرام اور مسٹر ایوانز پیش ہوئے۔ اُنھوں نے مقدمہ بڑی محنت سے لڑا اور اپنے مؤکلوں کی گرفتاری کو غیر قانونی ثابت کیا۔ مسٹر انگرام کی تقریر پر ایڈووکیٹ جنرل چیخ اٹھا۔ اُس نے قانونی نظائر پیش کرتے ہوئے اٹلی کے محبّ وطن شاعر اور ادیب کا ذکر کیا جو آسٹریا کے خلاف آزادی کی جنگ کرتے ہوئے گرفتار ہوا تھا اور کئی برس تک آسٹریا والوں کے ظلم و ستم کا نشانہ رہا۔ گلیڈسٹون سیاحت کے لیے آسٹریا گیا تو اُسے اس مظلوم قیدی کے شب و روز کا پتہ چلا۔ اُس نے ان مظالم کے خلاف آواز بلند کی

اور انگلستان میں ان کی خوب اشاعت کی۔ انگلستان سے اُٹھنے والی یہ آواز پُورے یورپ میں پھیل گئی، یہاں تک کہ آسٹریا والے ادا یرو کو رہا کرنے پر مجبُور ہو گئے۔ مسٹر انگرام نے ایسے ہی عزم کا اظہار کیا اور عدالت سے کہا: "مَیں امیر خاں کے مقدمے اور حکومتِ ہند کی حماقت کو انگلستان کے چپے چپے میں نشر کروں گا۔ جو آنکھیں ادا یرو کے مصائب پر آنسو بہا چکی ہیں، وہ امیر خاں کے مصائب پر بھی روئیں گی ...... جنابِ والا! انگریز قوم سے مطالبہ کیا جائے گا کہ وہ امیر خاں کے مقدمے کے متعلق اپنا فتویٰ صادر کرے۔ کیا اس باب میں کوئی شبہ ہے کہ وہ فتویٰ کیا ہوگا؟ یہ اُنھیں حرف اور اُنھیں آتشیں الفاظ میں لکھا جائے گا جنھوں نے آشوری بادشاہ کی رُوح پر پژمردگی طاری کردی تھی۔ فتویٰ یہ ہوگا: ولیم گرے اور لارڈ میئو[1]! تم نے برطانوی رعایا پر ظلم کیا، تم نے انگریزی قانون کی حُرمت زائل کی، تم ترازو میں تولے گئے اور پُورے نہ اُترے[2]"

جسٹس نارمن نے ۱۹ راگست ۱۸۷۰ء کو ہیبس کارپس کی دونوں درخواستیں مسترد کردیں۔ اُس نے لمبے چوڑے فیصلے میں شواہد اور اقتباسات کا طُومار باندھ دیا اور آخر میں لکھا کہ حکومت نے جو کارروائی بھی کی ہے قانون کا منشا پُورا کرنے کے لیے جائز اور درست طور پر کی ہے۔ اسی روز مسٹر اینسٹے نے دونوں کے لیے ضمانت کی درخواستیں دیں۔ ۸ ستمبر کو عدالت نے درخواستوں کی سماعت کی اور فیصلہ حسبِ توقّع نظر بندوں کے خلاف ہُوا۔ اب پٹنہ سے کلکتّہ انتقالِ مقدمہ کی درخواست کی گئی۔ اس کا حشر بھی وہی ہُوا جو پہلی درخواستوں کا ہو چکا تھا۔ بعد ازاں مسٹر رہٹسک نے اس درخواست کے استرداد پر لکھا: "یہ مقدمہ ذاتی نوعیّت اختیار کر گیا تھا۔ سرکاری حلقوں کا خیال تھا کہ ان مجرموں کو کسی نہ کسی طرح سزا ہو جانی چاہیے اور یہ کلکتّے میں ناممکن تھا۔" اس اثنا میں مقدمہ چلانے کی تیّاری پُوری تیز رفتاری سے مکمل ہو رہی تھی۔ ۱۸۷۱ء کے آغاز میں مولوی مُبارک علی اور ان کے بعض ساتھی رہا کر دیے گئے، لیکن ابھی وہ اُڑنے نہ پائے تھے کہ دوبارہ گرفتار ہو گئے کہ اب انگریز حکومت اپنا کیس مکمل کر چکی تھی۔

---

[1] گورنر جنرل ہند [2] سرگزشتِ مجاہدین۔ ص ۴۲۱-۴۲۲

اصل مقدمے کی ابتدائی سماعت یکم مارچ ۱۸۷۱ء کو پٹنہ کے قائم مقام مجسٹریٹ مسٹر باربور کی عدالت میں شروع ہوئی۔ مجسٹریٹ نے ۲۷ مارچ کو فردِ جرم عائد کرکے سیشن سپرد کر دیا۔ سیشن جج مسٹر پرنسپ نے سماعت کا آغاز یکم مئی سے کیا۔ حکومت نے ۱۳۶ گواہوں کی فہرست پیش کی تھی، لیکن صرف ۱۱۳ پیش ہوئے۔ ۴۶ گواہوں نے ملزمین کی طرف سے شہادت دی۔ امیر خان اور حشمت داد خان کی طرف سے مقدمے کی پیروی مسٹر انیسٹے اور مسٹر انگرام نے کی، بعض دوسرے ملزموں کی وکالت مسٹر لگنم اور مسٹر منڈرسن نے کی، بعض ملزموں نے سرے سے کوئی وکیل کرنے کا تکلف ہی نہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ مسٹر انیسٹے چند پیشیاں بھگتا کر وکالت سے دستبردار ہو گئے۔ اِس پر اُس دَور کے مشہور نیم سرکاری اخبار انگلش مین نے الزام لگایا کہ وہ فیس کم ہونے کے باعث بمبئی چلے گئے ہیں۔ اُنھوں نے اِس کی پُرزور تردید کی اور پُورے مقدمے کو "شرمناک" قرار دیا۔

مقدمہ تین مہینے جاری رہا۔ گواہوں میں وہ لوگ بھی تھے جنھوں نے انبالہ اور پٹنہ کے پہلے مقدمے میں شہادت دی تھی۔ بس رٹی رٹائی کہانی تھی جو ہر گواہ سُناتا چلا جاتا۔ ملزموں کے بارے میں گواہوں نے بہت کم کہا۔ زیادہ تر تحریک کے نظام اور طریقِ کار، واعظین اور مبلغین کی تقریروں، تحریک کی خفیہ اصطلاحی زبان اور قاصدوں کی آمد و رفت ہی کا ذکر ان کی زبان پر تھا۔ بعدازاں رہٹسک نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا اور امیر خان کے متعلق تو اُس نے حکومت کی طرف سے پیش کردہ شہادتوں کی روشنی میں لکھا: "روپے کے معاملے وہ بہت فیاض معلوم ہوتا ہے لیکن اُس کا تعلق جہاد سے ثابت کرنا بڑا دشوار معلوم ہوتا ہے۔" ملزموں کو سزا دینے کے لیے انگریز حکام نے جو بے ضابطگیاں اور غیر قانونی کارروائیاں کیں وہ اس قدر عیاں اور بھونڈے انداز کی تھیں کہ سیشن جج اپنے فیصلے میں ان کا ذکر کرنے اور یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا کہ "اگرچہ ان غیر قانونی حرکتوں کا موجودہ مقدمے پر کوئی فوری اثر نہیں پڑتا، تاہم انھیں نظر انداز کرنا مناسب نہ ہو گا۔ اس لیے اگر ہندوستان میں سراغرسانی

کی پولیس رکھنا مطلوب ہے تو چاہیے کہ اس کے افسر اپنے آپ کو پولیس افسروں کے عام قانون سے بالاتر نہ سمجھیں ورنہ بہت ممکن ہے کہ ان معاملات میں بے لگام آزادی اختیارات کے غلط اور ناروا استعمال پر منتج ہو۔"

جولائی ۱۸۷۱ء کے شروع میں حشمت داد خان کو سیشن جج نے رہا کر دیا، اس لیے کہ اُن کے خلاف مقدمہ بادی النظر میں ثابت نہ ہو سکا تھا۔ باقی چھ ملزموں کو معمول کے مطابق حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور اور ضبطی جائداد کی سزا دی گئی۔ ملزموں کے وکیلوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ عدالتِ عالیہ نے پیر محمد کو الزام ثابت نہ ہونے کی بنا پر رہا کر دیا اور باقی پانچ کی سزا بحال رکھی۔

ان پانچ ملزموں میں سے صرف مولوی مبارک علی کو کالے پانی (انڈمان) بھیجا گیا۔ امیر خان آٹھ نو برس قید رہنے کے بعد رہا ہوئے۔ مولوی مبارک علی پر اتنا جبر و تشدد کیا گیا کہ وہ جیل ہی میں اپنے اللہ سے جا ملے۔ حاجی دین محمد اور امین الدین کے بارے میں تاریخ خاموش ہے کہ اُن کا کیا انجام ہوا، قید خانے ہی میں ظلم و ستم کا شکار ہو گئے یا سزا کاٹنے کے بعد رہا ہوئے۔ انبالے کے مقدمے میں محمد شفیع کی پچاس لاکھ کی جائداد ضبط کر کے مقدمے کے مصارف حکومت نے پورے کیے تھے، اب امیر خان کی کروڑوں روپے کی جائداد ہتھیا لی گئی، حالانکہ انگریز حکام انھیں مجرم قرار دینے والی ایک بھی شہادت نہ پیش کر سکے تھے۔

یہ آخری مقدمہ تھا جو تحریک کو کچلنے اور اس کے کارکنوں پر دہشت طاری کرنے اور اہلِ حق کو اپنے آگے جھکانے کے لیے ان پر چلایا گیا۔ سینکڑوں افراد بغیر مقدمہ چلائے قید و بند کے مصائب بھگتتے رہے، لیکن ظلم و جور کی ہر آندھی میں اس تحریک کے علمبردار ثابت قدم رہے۔ دشمن کا ہر وار ان کے عزائم کو زندگی بخشتا رہا اور آخر کار دشمن کو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ان آشفتہ سروں سے حق کا سودا نکالنے میں ناکام رہے ہیں۔

ڈبلیو، ڈبلیو ہنٹر نے ۱۸۷۱ء کے وسط میں لکھا:

"بنگال جیسے دُور دراز صوبے نے اپنے خرچ پر سرحدی کیمپ کے لیے

رنگروٹوں کے گروہ کے گروہ تیار کیے۔ اس کے ہر گاؤں بلکہ ہر خاندان نے اُن کی مثال کی پیروی کی اور مصارفِ جنگ میں حصّہ لیا۔ ان بدنصیب بھٹکاتے ہوئے غداروں کے گروہ کے گروہ ہم نے قید خانوں میں ڈال دیے اور عدالتوں نے یکے بعد دیگرے ان کے سرغنوں کو سمندر پار کے بے آب و گیاہ جزیروں میں بھیج دیا، لیکن اس کے باوجود سارے ملک نے ہماری سرحد پر اسلام کی بے کسانہ اُمیدوں کی آبیاری روپے اور آدمیوں سے کی، بلکہ وہ اب تک عیسائی حکومت کے خلاف خُونی احتجاج پر مُصر ہے۔"

○

حُکمِ خُداوندی

ٹھیک اُس زمانے میں جب برِصغیر میں اہلِ حق کے خلاف نیا طُوفان جنم لے رہا تھا، انڈمان میں ایک دھماکے کا سامان ہو رہا تھا۔ اور یہ دھماکا عین اُس وقت ہُوا جب چند روز بعد مولوی تبارک علی اور مولوی امیرالدین پابہ زنجیر انڈمان پہنچنے والے تھے۔ یہ ایک ایسا دھماکا تھا جس سے برطانوی ہند کے قصر و ایوان لرز کر رہ گئے۔ یہ دھماکا اُس نفرت کی ایک اور علامت تھا جو برطانوی حکُومت کے خلاف دِلوں میں کھول رہی تھی۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۷۱ء کو عبداللہ نامی ایک پنجابی نوجوان نے کلکتہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نارمن پر قاتلانہ حملہ کیا۔ نارمن سخت زخمی ہُوا اور مر گیا۔ تحقیقات پر پتہ چلا کہ عبداللہ دماغی خرابی کے عارضے میں مبتلا ہے، تاہم اُسے پھانسی کی سزا دے دی گئی۔ یہ گویا اُس عدالتی نظام کے خلاف احتجاج تھا جو گزشتہ سات برس سے سوانگ رچا کر پہلے سے طے کردہ فیصلے کر رہا تھا اور جس کے پاس ان سینکڑوں ہزاروں مظلوموں کی بے چارگی اور مظلومیت کا کوئی مداوا نہ تھا جن کے جسم و ضمیر کو انگریز حکُومت کی سفّاک مشینری بے دردی سے ذبح کر رہی تھی۔ ساڑھے چار مہینے بعد ایک اور "صاحب جنوں" نے اس مشینری کے سب سے بڑے کارپرداز پر ضربِ کاری لگائی۔

یہ "صاحب جنوں" تیراہ کا آفریدی نوجوان شیر علی تھا۔ وہ اکتوبر ۱۸۶۸ء میں انڈمان پہنچا تھا۔ میانہ قامت، دُبلا پتلا اور بدرُو۔ سرحد کے بے شمار افراد کی طرح وہ دو گھرانوں کی نفرتوں اور عداوتوں کے گھناؤنے سایے میں پروان چڑھا۔ دشمن گھرانا، اُس کے اپنے خاندان ہی کی ایک شاخ تھا۔

○

دونوں شاخوں میں کئی بار تصادم ہو چکا تھا اور فریقین کے بہت سے آدمی مارے گئے تھے۔ ہر جھگڑے اور قتل سے انتقام در انتقام کا چکر اور تیز ہو جاتا۔ شیر علی جوان ہُوا، تو کمشنر پشاور کے سوار اردلیوں میں بھرتی ہو گیا۔ گاؤں میں جھڑپیں بدستور جاری تھیں۔ شیر علی کو بھی بار بار بُلاوے آتے کہ آؤ اور دشمنوں سے بدلہ لو——— وہ امن پسند تھا اور پُرسکون زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا۔ اُس نے ان بُلاوؤں پر کان نہ دھرے تو طعن بھرے پیغامات آنے لگے۔ آخر ان کچوکوں کا ردِعمل ہُوا۔ اُس کے اندر کا منتقم مزاج پٹھان بے قابو ہو گیا۔ ایک روز خبر ملی دشمنوں کا ایک آدمی پشاور آیا ہُوا ہے۔ وہ اس کے تعاقب میں لگ گیا، اُسے پشاور کے ایک باغ میں جا لیا اور دن دہاڑے سب کے سامنے قتل کر دیا۔ دشمن کا قصہ چُکانے کے بعد بھاگا، مگر پکڑا گیا۔ مقدمہ چلا اور ۲؍اپریل ۱۸۶۷ء کو پھانسی کا حُکم سُنا دیا گیا، لیکن چُونکہ اُس کا چال چلن اچھا تھا، امبیلا کی جنگ میں بھی حصہ لے چُکا تھا اور انگریزوں کی خدمات انجام دی تھیں، اس لیے اُس کی سزائے موت، حبسِ دوام بعبور دریائے شور میں بدل گئی۔

گرفتاری کے بعد انڈمان بھیجے جانے تک وہ کئی جیلوں میں رہا۔ تقریباً ہر جگہ اُس نے ایسے بہت سے قیدی دیکھے جن کی سیرت و کردار سے وہ بے حد متاثر ہُوا۔ نماز روزے کے پابند، تہجد گزار، متقی، پرہیزگار، خوش اخلاق، ساتھی قیدیوں کے غم خوار و خدمت گار اور صابر و شاکر۔ کھوج لگایا تو پتہ چلا یہ ان مجاہدین کے ساتھی ہیں

جن سے وہ ابتلا کی جنگ میں لڑتا رہا تھا۔ مجاہدین کی اعانت کرنیکے الزام میں پورے ملک میں ان کی پکڑ دھکڑ ہو رہی ہے۔ پھر ان لوگوں پر توڑے جانے والے مظالم کی لرزہ خیز داستانیں بھی اُس نے اپنے زنداں کے رفیقوں سے سُنیں۔ وہ اس گروہ کے کئی ایسے لوگوں سے بھی ملا جو کسی عدالت کے سزا یافتہ نہ تھے، مگر سالہا سال سے قید و بند کی مشقتیں جھیل رہے تھے۔ وہ انگریزوں سے سخت متنفر ہو گیا۔

شیر علی انڈمان پہنچا تو یہاں کے مناظر سے اس کی نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ مولانا یحییٰ علیؒ کو فوت ہوتے آٹھ مہینے ہو چکے تھے، لیکن ان کی سیرت و شخصیت کا چرچا ہر زبان پر تھا۔ اُسے اپنی بدنصیبی پر افسوس ہوا کہ وہ ایسے ولی اللہ کے دیدار سے محروم رہا، تاہم جب پتہ چلا کہ حضرت صاحب کے چند ساتھی بھی یہاں ہیں تو اُس نے اُن سے ملنے کی ٹھان لی۔ لیکن وہ جن جزیروں میں تھے وہاں اُسے جانے کا کبھی موقع نہ ملا، البتہ اُن کے صحبت یافتہ افراد سے وہ اکثر ملتا رہتا جو دوسرے ٹاپوؤں کی طرح ماؤنٹ ہیریٹ میں بھی تھے۔ یہ زیادہ تر وہ قیدی تھے جو یا تو قتل کی پاداش میں یہاں آئے تھے یا ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شریک ہونے کے جرم میں۔ قتل کے مجرموں کے بعد سب سے زیادہ تعداد مؤخر الذکر قیدیوں کی تھی۔ یہ سب لوگ اُونچے گھرانے کے تھے اور گرفتاری سے پہلے اعلیٰ مناصب پر فائز۔ ان کے ساتھ انگریزوں کا سلوک نہایت توہین آمیز تھا۔ اکثر سے نہایت سخت مشقت لی جاتی اور دوسرے چوہڑے چماروں کی طرح موٹا جھوٹا کھانے کو ملتا۔ ذرا ذرا سی بات پر بید کی سزائیں ملتیں۔ ان کے برعکس گوری چمڑی والے یورپین مجرموں اور کالے کلوٹے دوغلے عیسائیوں کے ساتھ شاہانہ برتاؤ کیا جاتا۔ شیر علی یہ سب کچھ دیکھتا اور اُس کا خون کھول اُٹھتا۔ آخر اُس نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی بڑے انگریز کو قتل کر کے ان سب مظلوموں کا انتقام لے گا۔

شیر علی کی زندگی تو ہندوستان کی جیلوں ہی میں بدل گئی تھی۔ یہاں حضرت صاحب کی دعوت و تبلیغ سے متاثر افراد کی مجلسوں میں اُٹھنے بیٹھنے سے اس کا مذہبی رنگ اور گہرا ہو گیا۔ نماز باجماعت پڑھتا، اکثر روزے رکھتا اور مزدوری اور تنخواہ سے جو کچھ

بچ رہتا۔ مہینے دو مہینے کے بعد اس کا کھانا پکا کر غریب قیدیوں میں تقسیم کر دیتا۔ نیک کرداری کے باعث نگران بھی اس کی زیادہ دیکھ بھال نہ کرتے۔ مشقتی قیدیوں کے لیے اُسے حجام بنا دیا گیا۔

جنوری ۱۸۷۲ء کے اواخر میں شیر علی نے سُنا ہندوستان کا بڑا لاٹ (لارڈ میو) آرہا ہے۔ وہ فوراً اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کی تیاریوں میں لگ گیا۔

○

لارڈ میو ۸ر فروری ۱۸۷۲ء کو صبح کے وقت انڈمان پہنچا۔ لیڈی میو اور دوسرے بہت سے اعلیٰ سرکاری حُکام بھی اُس کے ساتھ تھے۔ انڈمان کے چیف کمشنر نے وائسرائے کی حفاظت کے زبردست انتظامات کر لیے تھے۔

بندرگاہ پر وائسرائے کا شاندار استقبال ہُوا۔ اکیس ضرب توپ کی سلامی دی گئی۔ دوپہر کا کھانا وائسرائے نے چیف کمشنر کے ساتھ کھایا اور پھر دَورہ شروع ہو گیا۔ پولیس پُوری طرح چاق چوبند تھی اور اس نے وائسرائے کے آگے پیچھے دائیں بائیں چلتی دیواریں سی بنالی تھیں۔

ادھر شیر علی، ماؤنٹ ہیریٹ میں نہایت بے قرار تھا۔ وہ چُھری اپنے کپڑوں میں چُھپائے جزیرۂ رَوس جانا چاہتا تھا، مگر پولیس نے قیدیوں کی نقل و حرکت پر پابندی لگا دی تھی۔ وقت گزرتا جا رہا تھا اور شام ہونے والی تھی۔ شیر علی بے تابی کے عالم میں کبھی ٹہلنے لگتا اور کبھی چُپ چاپ کھڑا سوچ میں ڈُوب جاتا۔ وہ محسُوس کر رہا تھا سُنہری موقع ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ لارڈ میو چاٹم جزیرے کے دَورے سے فارغ ہُوا، تو گھڑی بھر دِن باقی رہ گیا تھا۔ اُس نے ماؤنٹ ہیریٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ پرائیویٹ سیکرٹری نے ہر چند کہا باقی دورہ اگلے روز پر ملتوی کر کے جہاز پر تشریف لے چلیے، لیکن وائسرائے نے جواب دیا ابھی دن باقی ہے، ٹھنڈا اور سُہانا وقت ہے، ماؤنٹ ہیریٹ دیکھ لینا چاہیے۔ یہ تقریباً بارہ سو فٹ بلند پہاڑی تھی، جگہ نہایت خُوبصورت اور آب و ہَوا نہایت خوشگوار۔ وائسرائے یہاں ایک سینی ٹوریم بنانا چاہتا تھا۔ آخر اُس کے اصرار پر

یا بو حاضر کیا گیا۔ نصف چڑھائی پر جا کر لارڈ میو پالکی سے اُتر پڑا کہ پیدل چلوں گا۔ چوٹی پر پہنچے، تو آفتاب مغربی اُفق سے ہم آغوش تھا۔ وائسرائے دیر تک غروبِ آفتاب کا منظر دیکھتا رہا۔ پھر پرائیویٹ سیکرٹری سے کہنے لگا: "ایسا خوبصورت نظارہ مَیں نے عمر بھر کبھی نہیں دیکھا"۔ اُسے کیا خبر تھی کہ اُس کی زندگی کا آفتاب بھی بہت جلد غروب ہونے والا ہے۔

پہاڑ سے اُترتے اُترتے اندھیرا ہو گیا، تاہم وہ اندھیرے ہی میں واپس روانہ ہو گئے۔ تین چوتھائی راستہ طے کیا تھا کہ مشعل بردار پہنچ گئے۔ اس وقت سات بج رہے تھے۔ لارڈ میو اور ان کی جماعت پُل ہوپ ٹاؤن پر پہنچی۔ پولیس نہایت چوکنا تھی اور اس کے دوش بدوش آگے پیچھے چل رہی تھی ...... وائسرائے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کے ساتھ آہستہ آہستہ چل کر گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا اور پھر کشتی میں سوار ہونا چاہا۔ یکایک پیچھے کھٹکا ہوا۔ ایک شخص نے شیر کی طرح جست کی اور لارڈ میو پر لوٹ پڑا اور یکے بعد دیگرے چھُری کے دو وار کیے۔ ضرب کھاتے ہی وائسرائے پانی میں گر پڑا۔ افراتفری میں مشعلیں گُل ہو گئیں۔ اِدھر لوگ قاتل پر جھپٹے۔ ایک قیدی نے اس کے ہاتھ سے چھُری چھین لی۔ کچھ قاتل پر پل پڑے، لیکن پرائیویٹ سیکرٹری نے اُسے مار پیٹ سے چھُڑایا۔ وہ شیر علی تھا۔ وائسرائے نے فوراً دم توڑ دیا۔

شیر علی گرفتار کر لیا گیا۔ جب اُس سے پُوچھا گیا کہ حملہ کس کے ایما پر کیا، تو اُس نے جواب دیا: "اللہ کے حکم سے"۔

○

وائسرائے کے قتل کی خبر ہندوستان پہنچتے ہی کھلبلی مچ گئی۔ انگریز حُکام کو یقین تھا شیر علی کے اس فعل کے پیچھے گہری سازش کارفرما ہے۔ بنگال گورنمنٹ نے پولیس کا لاؤ لشکر فوراً انڈمان بھیج دیا۔ ڈپٹی کمشنر پولیس کلکتہ کے علاوہ لالہ ایشوری پرشاد بھی تفتیش کے لیے پہنچ گیا جو انبالہ اور عظیم آباد کے مقدموں میں اپنی کارکردگی کی بدولت اب ڈپٹی کلکٹر بن چُکا تھا۔ ان لوگوں نے مولانا احمد اللہ، اُن کے ساتھیوں اور دوسرے ممتاز قیدیوں کو اُلجھانے کی بڑی کوشش کی، مگر ناکام رہے۔ شیر علی کا ایک ہی جواب تھا:

اُس نے اللہ کے حُکم سے قتل کیا ہے۔ جن لوگوں کو یہ ملوث کرنا چاہتے تھے شیر علی سے اُن کی نہ تو کبھی کوئی ملاقات ہُوئی اور نہ وہ اُس کے نام سے واقف تھے۔ انڈمان کے حکام نے بھی ان قیدیوں کے حسنِ کردار کی گواہی دی۔ اس طرح وہ جرمِ ناکردہ کا شکار ہونے سے بچ گئے، البتہ اِس کے بدلے انھیں مزید دس سال قید میں بسر کرنے پڑے کہ انڈمان کے قواعد وضوابط بالکل ہی بدل ڈالے گئے۔

شیر علی پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا ہُوئی۔ پھانسی کھلے عام دی گئی۔ وہ تختۂ دار کی طرف بڑی دلیری سے بڑھا۔ پھندا گردن میں ڈالا گیا، تو بلند آواز سے پکارا: "مَیں نے جب اس کام کا ارادہ کیا تھا، تو اپنے تئیں مُردہ سمجھ لیا تھا۔ مُسلمان بھائیو! مَیں نے تمھارے دشمن کو مار ڈالا۔ گواہ رہو کہ مَیں مُسلمان ہُوں۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ"

دو بار اس نے کلمہ بُلند آواز سے بالکل ٹھیک ٹھیک پڑھا۔ تیسری بار پھانسی کے رَسّے سے گلا گھُٹ گیا اور صرف مُحمّد رَّسُولؐ تک پڑھ سکا اور جان دے دی۔

○

ایک چراغ اور بُجھا

انڈمان میں زندگی کی آبجو کٹھن راہوں سے گزرنے کے باوجود سکون کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ مولوی محمّد جعفر کُچھ مُدت ملازمت کرتے رہے پھر انھوں نے کاروبار شروع کر دیا۔ ملازمت ہی کے دوران میں انگریزی سیکھی اور اُس میں اتنی دسترس حاصل کر لی کہ انگریز حُکّام سے بلا تکلّف بات چیت کرتے۔ درخواستیں اور اپیلیں بھی انگریزی زبان میں لکھنے لگے۔ جزیرے میں اچھّی خاصی لائبریری تھی جس میں ہر موضوع پر کتابیں تھیں، وہ ساری لائبریری انھوں نے کھنگال ڈالی۔ یُوں اُن کا مطالعہ بڑا وسیع ہو گیا۔

اُنھوں نے پہلے ایک کشمیری قیدی عورت سے شادی کی، وہ فوت ہو گئی، تو المورٹہ کی ایک نومُسلم برہمن دوشیزہ سے نکاح کر لیا جس سے اللہ تعالیٰ نے اُنھیں ننھے بچّے عطا کیے۔ اس طرح اللہ نے اپنے بندے کو مصائب و شدائد پر صبر کرنے کا خوشگوار صلہ عنایت

فرما دیا۔

تحریک کے دوسرے ساتھی بھی مطمئن زندگی بسر کر رہے تھے۔ میاں عبدالغفار کو وطن سے بیوی بچے بلانے کی اجازت مل گئی تھی۔ یہاں ایک نئے ساتھی سے بھی تعارف ہوا۔ یہ بوگرا کے مسعود خان تھے، انھیں جرمِ حق پرستی کی پاداش میں ۱۸۶۰ء ہی میں عمر قید کی سزا دے کر تعذیب و اذیت کے اس جہنم میں جھونک دیا گیا تھا۔ مولانا عبدالرحیم سرکاری فرائض انجام دینے کے بعد اپنا زیادہ وقت مولانا احمداللہ کی خدمت میں گزارتے۔ ہر شخص طمانیتِ قلب کی دولت سے مالامال تھا۔ گاہے گاہے وہ سب مل بیٹھتے، ذکر و فکر کی مجلسیں جمتیں، ایک دوسرے کو حق پر جمے رہنے اور پُرمحن حالات کا صبر کے ساتھ سامنا کرنے کی تلقین کرتے ——— مئی ۱۸۷۱ء میں مولانا ولایت علی کے صاحبزادے مولوی محمد حسن اپنے ماموں مولانا احمداللہ اور عم زاد بھائی مولانا عبدالرحیم سے ملنے آئے اور تقریباً ایک مہینہ پورٹ بلیئر میں رہ کر واپس وطن تشریف لے گئے۔ لیکن پھر یہ بساط بھی اُلٹ گئی۔ لارڈ میو کے قتل کے بعد جور و جبر کے شب و روز لوٹ آئے۔ خون کے چھینٹے اُن کے اُجلے شفاف دامنوں پر تلاش کیے جانے لگے۔ اگرچہ ایک داغ بھی انھیں نہ مل سکا، تاہم قید و بند کے سارے قواعد و ضوابط بدل ڈالے گئے۔ جو مراعات قیدیوں کو پچھلے چھ سات برس میں دی گئی تھیں، وہ سب چھین لی گئیں۔ مسلمان قیدی، خصوصاً تحریک سے وابستہ افراد مختلف ٹاپوؤں میں منتشر کر دیے گئے۔

یہی شب و روز تھے کہ مولوی تبارک علی اور مولوی امیرالدین اپنے جذب و جنوں کی سزا بھگتنے کے لیے انڈمان پہنچے۔ ابتدائی دو تین برس اُن کے سخت مشقتوں اور صعوبتوں کے بھنور میں گزرے۔ پھر آہستہ آہستہ برطانوی حکام کا اعصابی تناؤ کم ہوا تو اُن کا رویہ بدلتا گیا اور بلاکشانِ عشق کے مصائب میں بھی کمی آ گئی۔ مولوی تبارک علی اسٹیشن محرر اور مولوی امیرالدین مدرسے میں معلم لگ گئے۔ سبھی اصحاب ایک دوسرے کے پڑوسی ٹاپوؤں میں متعین کر دیے گئے۔ بس ایک

مردِ خدا تھا جسے آخر وقت تک سب سے الگ تھلگ دُور ایک ٹاپو، وائپر آئی لینڈ میں زندگی گزارنی پڑی۔ ماہ و سال گزرتے چلے گئے، لیکن مولانا احمد اللہ کے بارے میں انگریز حکام کا جذبہ انتقام پہلے دِن کی طرح جوان رہا۔ اُنھیں ذہنی اور جسمانی طور پر ہمیشہ بے آرام رکھا گیا۔ وہ تقریباً ستاون اٹھاون برس کے تھے جب انڈمان پہنچے۔ مولانا یحییٰ علی کی وفات کے بعد ان کی صحت تیزی سے بگڑنے لگی اور وہ روز بروز کمزور اور نحیف ہوتے چلے گئے۔ ستر برس تک پہنچتے پہنچتے انھیں سخت نقاہت نے آلیا۔ مصائب اور صعوبتوں نے اُن کی رہی سہی توانائی بھی چھین لی۔ انڈمان کے قواعد کی رُو سے جب کوئی قیدی بارہ برس سرکاری نقطۂ نظر سے بحُسن وخوبی گزار دیتا اور کوئی داغ دھبہ اُس کے ریکارڈ پر نہ ہوتا تو اُسے مختلف مراعات سے نواز دیا جاتا، لیکن مولانا احمد اللہ کو ان سے محرُوم رکھا گیا۔

مولانا عبدالرحیم نے ابرا ڈین کے قصبے میں دکان کر لی تھی اور سو پچاس روپے ماہوار بچت ہونے لگی تھی۔ آپ نے ڈسٹرکٹ افسر سے درخواست کی کہ مولانا احمد اللہ بہت بُوڑھے اور ضعیف ہو گئے ہیں اور سرکاری کام کرنے کی اب اُن میں طاقت نہیں رہی، مَیں ان کا بھانجا ہوں، اُنھیں میرے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن ڈسٹرکٹ افسر نے درخواست مسترد کر دی۔ کچھ مدت کے بعد یہ شخص تبدیل ہو گیا۔ اُس کی جگہ جو دوسرا افسر آیا اُس سے مولانا عبدالرحیم نے پھر التماس کی۔ سفارش بھی کروائی۔ افسر نے درخواست منظور کر لی اور اپنے دستخط کر کے کاغذات ناردرن ڈسٹرکٹ کے افسر کے پاس بھیج دِیے جس کے علاقے میں مولانا احمد اللہ رہا کرتے تھے، مگر اُس نے درخواست منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ کچھ مدت کے بعد انھوں نے تیسری بار پھر ایک درخواست انڈمان کے چیف کمشنر کے سامنے پیش کی۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات تھا۔ چیف کمشنر نے درخواست مسترد کرتے ہُوئے لکھا کہ یہ دونوں وہابی ہیں اور انھیں ایک جگہ نہیں رکھا جا سکتا۔ اس تگ و دو میں ڈھائی تین برس گزر گئے۔

مولانا عبدالرحیم مجبُوراً خاموش ہو گئے۔ جب تک مولانا مُلازم رہے اپنے افسرِ بالا سے اجازت لے کر مہینے میں ایک بار مولانا احمد اللہ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے

اور چند گھنٹے ان کی صحبت میں خدمت کرتے ہوئے گزارتے۔ دکان کھولی تو مہینے میں دو تین بار حاضر ہونے لگے۔ سارا دن وہیں رہتے، چونکہ وہاں شب بسری کی اجازت نہ تھی اس لیے غروبِ آفتاب سے پہلے واپس آجاتے۔

رفتہ رفتہ مولانا احمد اللہ کی طاقت جواب دے گئی اور پھر مرض الموت نے آلیا۔ مولانا عبدالرحیم نے دوبارہ اپنے ڈسٹرکٹ افسر کو درخواست دی کہ میرے ماموں وائپر آئی لینڈ میں سخت بیمار ہیں، اُن پر بیہوشی طاری ہے، وہ تنِ تنہا ہیں، کوئی اُن کی خبر گیری کرنے والا نہیں، چند روز کے مہمان ہیں، مجھے رات اُن کے پاس گزارنے کی اجازت دی جائے۔ بڑی بھاگ دوڑ اور کوشش سخت کے بعد چودھویں دِن درخواست منظور ہوئی۔ اس دوران میں اُن کا معمول یہ رہا کہ دُکان پر اپنے بیٹے عبدالفتاح کو جو کچھ عرصہ پہلے ہندوستان سے انھیں ملنے آئے تھے، بٹھاتے اور خود وائپر آئی لینڈ روانہ ہو جاتے۔ ایک کوس کا فاصلہ طے کر کے نیو بیبے کے گھاٹ پر پہنچتے۔ وہاں سے تقریباً ایک ہی کوس کا بحری سفر کھاڑی میں طے کر کے وائپر آئی لینڈ کے گھاٹ پر اُترتے۔ عصر تک وہاں رہتے اور اپنے عظیم ماموں کی خدمت بجا لاتے، پھر روتی ہوئی آنکھوں اور تڑپتے ہوئے دِل کے ساتھ رخصت ہوتے اور رات آٹھ نو بجے ابرڈین پہنچتے۔

چودھویں روز عصر کے وقت مولانا عبدالرحیم نے حسبِ معمول واپسی کی اجازت چاہی تو مولانا احمد اللہ کی حالت اچھی خاصی سنبھل چکی تھی اور وہ پورے ہوش و حواس میں تھے۔ اُس روز آپ نے دیر تک باتیں کیں۔ تقویٰ اختیار کرنے، اللہ کی رضا چاہنے اور مصائب و شدائد کا صبر و استقلال سے سامنا کرنے کی وصیت فرمائی۔ مولانا عبدالرحیم اطمینان بھرے دِل کے ساتھ خوش خوش رخصت ہوئے۔ ابرڈین پہنچے تو مولوی محمد جعفر میاں عبدالغفار اور بہت سے دوسرے احباب منتظر بیٹھے تھے۔ مولانا کی حالت سنبھلنے کا مژدہ سُن کر دِلوں میں مسرت جاگ اُٹھی۔ ابھی ان حضرات کی محفل گرم تھی کہ چپڑاسی شب باشی کا اجازت نامہ لے کر آ گیا۔ گویا خوشی دو آتشہ ہو گئی۔ رات مولانا عبدالرحیم نے آنکھوں میں کروٹیں بدلتے کاٹی۔ طلوعِ سحر سے پہلے اُٹھے، نمازِ فجر

پڑھی، دُکان عبدالفتّاح کے سپُرد کی اور روانہ ہو گئے۔ نیو بیبے کے گھاٹ پر پہنچے تو وہاں کوئی کشتی نہ تھی۔ لاچار انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وائپر آئی لینڈ کی طرف سے ایک کشتی آتی دکھائی دی۔ کشتی گھاٹ پر پہنچی تو ملّاحوں نے ایک رقعہ اُنھیں دیا۔ رقعہ مولانا احمداللہ کے خادم عبدالواحد نے لکھا تھا۔ اُس نے اطلاع دی تھی کہ حضرت آٹھ بجے شب سجن دنیا سے رہا ہو کر خلدِ بریں میں داخل ہو گئے۔ مولانا عبدالرّحیم نے ایک لمحے کے لیے تو یُوں محسوس کیا جیسے زمین و آسمان گھوم رہے ہوں، لیکن جلد ہی انھوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ کشتی رانوں سے مِنّت سماجت کی کہ ذرا ٹھہریں، ہم ابھی واپس آتے ہیں۔ اُنھوں نے ہامی بھر لی۔ مولانا عبدالرّحیم دوڑتے ہُوئے دکان پر پہنچے اور احباب کو غم انگیز سانحے سے آگاہ کیا۔ پھر تجہیز و تکفین کے لیے روپیہ اور کپڑا لیا، دُکان مقفّل کی اور بیٹے کو ساتھ لے کر بھاگم بھاگ گھاٹ پر پہنچے۔ کشتی مسافروں سے بھر چکی تھی اور اب ملّاح صرف اُنھیں کے منتظر تھے۔ باپ بیٹے کے سوار ہوتے ہی اُنھوں نے پتوار سنبھالے اور کشتی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ وائپر آئی لینڈ کے گھاٹ پر اُترے اور مکان پر پہنچے۔ مولانا احمداللہ چادر اوڑھے ابدی نیند سو رہے تھے۔ عبدالواحد غم و حُزن کی تصویر بنے بیٹھا تھا۔ مولانا عبدالرّحیم نے چہرے پر سے چادر اُٹھائی۔ چودھویں رات کا چاند مُسکرا رہا تھا۔ فرطِ محبت سے، لَو دیتی ہُوئی پیشانی چُوم لی۔

غسل اور تکفین کا مسئلہ خاصا پریشان کُن تھا۔ وائپر آئی لینڈ میں زیادہ تر بُوڑھے، اندھے، معذور اور ناکارہ قیدی سرکاری کاموں پر بھیج دیے جاتے تھے۔ کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو ان باپ بیٹے کا ہاتھ بٹاتا۔ تحریک کے ساتھی اور دوست احباب، حُکّام کی اجازت ہی سے آسکتے تھے اور یہ ایک صبر آزما عمل تھا۔ مولانا عبدالرّحیم سخت فکر و تردّد کے عالم میں تھے کہ یارانِ صدق و وفا آنا شروع ہو گئے۔ سب سے پہلے مولوی محمد جعفر اور میاں عبدالغفّار پہنچے۔ پھر چیف کمشنر انڈمان کے منشی اکبر خان تین چار آدمیوں کے ہمراہ آگئے۔ پھر اِکّا دُکّا دوسرے اصحاب آنے لگے اور پندرہ سولہ

آدمی جمع ہو گئے۔

طے پایا کہ مولانا کو یہاں سے لے جا کر ابرڈین کے قریب ساؤتھ پائنٹ کے قبرستان میں مولانا یحییٰ علی قدس سرہ کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ منشی اکبر زماں اور مولوی محمد جعفر جزیرہ کے انچارج حاکم سے اجازت لینے گئے۔ اُس نے نادرن ڈسٹرکٹ کے افسر سے دریافت کیا، لیکن اُس متعصب شخص نے اجازت نہ دی اور حکم دیا کہ ڈنڈاس پائنٹ کے قبرستان میں دفن کرو۔ دل کے زخم اور گہرے ہو گئے۔ غم والم میں ڈوبے دل و دماغ کے ساتھ اُنھوں نے مولانا کے جسدِ خاکی کو غسل دے کر کفنایا، نمازِ جنازہ پڑھی اور پھر ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر ڈنڈاس پائنٹ گئے۔ وہاں سمندر کے کنارے ایک ٹیلے پر جہاں غریب الدیار لوگوں کی چند اور قبریں زندگی کی ناپائداری، انسان کی غربت و بے چارگی اور تقدیر کی بالادستی کا نقشہ پیش کر رہی تھیں، مولانا کی آخری آرام گاہ تیار کی گئی اور پھر لرزتے ہاتھوں اور زخمی دل کے ساتھ اُنھیں دفن کر دیا۔ ایک عجیب وحشت ناک سماں تھا۔ ایک طرف جنگلی درخت آسمان سے باتیں کر رہے تھے، دوسری طرف سمندر کی پہاڑ ایسی موجیں اُمڈ اُمڈ کر ساحل سے سر پٹک رہی تھیں، فراٹے بھرتی ہوئی ہوا جنگل میں درختوں کے درمیان چکر کاٹتی —— سائیں سائیں کر رہی تھی اور اس خوفناک شور میں سمندر کی شوریدہ سر موجوں نے اضافہ کر دیا تھا۔ مولانا عبدالرحیم کے الفاظ میں "شورِ محشر برپا تھا" اور اِس شورِ محشر میں غم واندوہ کے مارے ہوئے پندرہ سولہ آدمی، چُپ چاپ، وقت کے ایک ولی کی آخری آرام گاہ کو مٹی سے ڈھانپ رہے تھے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى۔ (ہم نے تمھیں اسی مٹی سے پیدا کیا، پھر اسی میں تمھیں لوٹا دیں گے اور پھر دوسری بار اسی مٹی ہی میں سے اُٹھا کھڑا کریں گے۔)

تدفین کر چکے تو دیر تک دُعا کرتے رہے اور پھر اشکوں میں ڈوبی آنکھوں اور مضطرب جذبوں کے ساتھ کشتی کی طرف بڑھے۔ کشتی میں بیٹھ کر اُنھوں نے آخری نظر اُس ٹیلے پر ڈالی جہاں وہ اپنے غریب الوطن بزرگ کو خاک کے سپرد کر آئے تھے۔ مولانا احمد اللہ

بلا شبہ اپنے عہد کے گوہر شب چراغ تھے۔ اُنھوں نے اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح تموّل اور ناز و نعم کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھے۔ انھیں زندگی کی ہر آسائش میسّر تھی۔ اپنے شہر کے رئیس تھے، سرکار دربار میں عزت کا مقام حاصل تھا، لیکن یہ ساری دنیاوی راحتیں اور اعزازات اُن کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہ رکھتے تھے۔ سید بادشاہ کے ہاتھ پر بیعت کی تو اُنھوں نے نام احمد بخش سے احمد اللہ رکھ دیا۔ یہ تبدیلی نام تک ہی محدود نہ رہی پوری زندگی پر پھیل گئی۔ اپنی دنیاوی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے ساتھ ساتھ تحریک کے خاموش کارکن تھے۔ خاندان کی کفالت اور معاش کے انتظام کی ذمہ داری اٹھا کر اُنھوں نے تمام مردوں کو فکرِ معاش سے بے نیاز کر دیا تھا تاکہ وہ تحریک کا کام یکسُو ہو کر کر سکیں اور جب مولانا یحییٰ علی گرفتار ہُوئے تو تحریک کی قیادت بھی سنبھال لی۔ پھر اس راہ میں ابتلا اور سختیوں نے آگے بڑھ کر خوش آمدید کہا تو بڑے صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنے رب کے انتہائی صابر اور شاکر بندے تھے۔ حالات کی کٹھنائیوں میں تپتے ہُوئے بھی راضی برضائے الٰہی رہتے۔ ہشّاش بشّاش ہنستا ہُوا چہرہ دیکھ کر لوگ حیران رہ جاتے۔ زمانے کی چیرہ دستیوں کی ذرا سی پرچھائیں بھی اس پر نہ ہوتی۔ کِتاب و سُنّت کے متبحر عالم تھے۔ بڑے ہی زاہد و عابد۔ سرکاری فرائض انجام دینے کے بعد جو وقت بچ جاتا نماز روزے اور تلاوتِ قرآن مجید میں صرف کرتے۔ نمازِ تہجّد کبھی قضا نہ ہُوئی۔ جہاں بھی رہے تلقین و ارشاد سے ذہنوں اور دلوں میں حق کو اپنانے اور اس پر چلنے کی تڑپ پیدا کیے رکھی۔ جو قیدی یا آزاد شخص آپ کے پاس آتا اُسے پند و نصیحت کرتے۔ پولیس اور پلٹن (فوج) والے بھی فیضیاب ہوتے انکی صحبت کیمیا صفت تھی۔ اٹھارہ برسوں میں صدہا قیدی جنھوں نے کبھی اپنے رب کے سامنے سر نہ جھکایا تھا، ناشائستہ افعال اور غفلت کی زندگی سے تائب ہو کر پکّے مسلمان، موحّد، صوم و صلوٰۃ کے پابند اور تہجّد گزار بن گئے۔ ہندو بھی آپ کے ارشادات کو کان دھر کر سُنتے۔ لوگ بے پناہ محبّت کرتے اور انھیں اپنا مشفق و مہربان باپ سمجھتے۔ ان کے سانحۂ ارتحال کی خبر نے ان سے فیض پانے والوں

میں ہر طرف رنج وغم کی لہر دوڑا دی۔ ان سب کو اس احساس نے بے چین کر دیا کہ وہ اپنے محسن کے آخری سفر میں اُن کو کندھا بھی نہ دے سکے اور ابدی آرام گاہ پر مٹی ڈالنے کی سعادت سے بھی محروم رہے۔

مولوی محمد ایوب خاں مقیم جزیرہ نے اس سانحے پر یہ تاریخ کہی:

چوں ازیں دارِ فنا جانب باغِ رضواں
احمد اللہ رواں گشت بصد دِل شاداں
عاقبت مصرِ بقا گشت عزیز از قدمش
یوسفے بود گرفتارِ بلائے زنداں
عالمِ باعمل و فاضلِ افضل زہمہ
یدِ بیضا است بہ کشّافِ رموزِ قرآں
ہمہ زہد و ہمہ تقویٰ و ہمہ صوم وصلوٰۃ
ہمہ مصروفِ عبادت ہمہ صرفِ عرفاں
اصلِ بدعت شدہ از قوّتِ او مستاصل
نخلِ توحید نشاندہ ہمہ در باغِ جہاں
سالِ تاریخ وفاتش ز تفکّر جستم
دخل الخلد بفرمود ہماں دم رضواں
مہِ قرباں بہ تمامی و محرّم اَقرب ۱۲۹۹
سِن تسعہ ز احادش بگرفتم پئے آں

○

واپسی

۲۱ر نومبر ۱۸۸۱ء (۲۸ر ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ) کو مولانا احمد اللہ کا وصال ہُوا۔

اسی سال کے اواخر میں اپنے والد گرامی (مولانا عبدالرّحیم) کے ساتھ ایک برس رہنے

کے بعد مولوی عبدالفتاح واپس وطن گئے تو اُن کے ہاتھ مولوی محمد جعفر نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے مشورے سے ایک عرض داشت لکھ کر دی جس میں لارڈ رپن سے انھیں رہا کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اس درخواست پر کوئی دس مہینے غور و خوض ہوتا رہا۔ لارڈ رپن کے حکمِ خاص سے ان پر چلائے گئے مقدمات کی چھان بین ہوتی رہی اور پھر گورنر جنرل نے جنوری ۱۸۸۳ء میں حکم صادر کیا:

"مقدمے کے تمام پہلوؤں پر کامل غور و خوض اور حکومتِ پنجاب سے مشورے کے بعد گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل نے فیصلہ صادر فرمایا ہے کہ جن لوگوں کو سلطنت کے خلاف جنگ میں شرکت و اعانت کے جرم کی بنا پر حبسِ دوام بہ عبورِ دریائے شور کی سزا ہوئی تھی اور وہ ہنوز یہ سزا بھگت رہے ہیں، انھیں اب رہا کر کے گھروں میں آنے کی اجازت دے دی جائے، البتہ انھیں پولیس کی نگرانی قبول کرنا ہوگی، نیز مقامی حکومتیں ان کی بُود و ماند پر جو پابندیاں عائد کرنا مناسب سمجھیں، وہ لازماً منظور کرنا پڑیں گی۔"

اس فیصلے کے مطابق چھ اصحاب مولوی محمد جعفر، مولانا عبدالرحیم، میاں عبدالغفار، مولوی امیرالدین، مولوی تبارک علی اور مسعود خان کو رہا کر دیے گئے۔ چار اصحاب ۳ مارچ ۱۸۸۳ء کو اور مسعود خان ماہ اپریل میں انڈمان سے روانہ ہوئے۔ مولوی محمد جعفر کو مزید کچھ مدت ٹھہرنا پڑا کہ اُن کی اہلیہ کی سزائے قید ابھی باقی تھی۔ مئی میں ان کی رہائی کے احکام بھی جاری ہو گئے اور نومبر ۱۸۸۳ء (محرم ۱۳۰۱ھ) میں وہ بھی ہندوستان پہنچ گئے۔

مولانا عبدالرحیم رہا ہو کر عظیم آباد پہنچے تو اپنے خاندانی مکانات اور مقابر کا دلدوز منظر دیکھ کر ان کے دِل پر جو قیامت گزری اُس کا ذکر دُکھ بھرے لہجے میں جس میں کہیں کہیں تلخی اور طنز کا نشتر بھی کارفرما تھا، کئی برس بعد اپنی کتاب "الدر المنثور فی تراجم اہل صادقپور" میں ان الفاظ میں کیا:

"میں سپرنٹنڈنٹ صاحب کے بنگلے سے رخصت ہو کر محلہ نمو ہیہ میں پہنچا

جہاں کہ میرے اہل و عیال مقیم تھے۔ اُس کی صبح ہو کے صادق پور گیا تو وہاں دیکھا کہ ہم لوگوں کے مکانات کل منہدم کر کے کفِ دست میدان بنا دیے گئے ہیں۔ مَیں نے چاہا کہ اپنے خاندانی مقبرے کو جہاں چودہ پُشت سے ہمارے آباؤ اجداد دفن ہوتے چلے آئے تھے، جاکر دیکھوں خصوصًا اپنے والدین ماجدین غفر اللہ لہما کے مزار کی زیارت کروں اور اس پر دُعائے مغفرت اور فاتحہ پڑھوں۔ مگر ہر چند کہ کوشش کی، پتہ نہ ملا۔ بعد تجسس تفحص بسیار غور و فکر کے قرینے سے معلوم ہُوا کہ حضرت والدین ماجدین کی قبریں کھود کر اس پر بنائے عمارت میونسپلٹی بنا دی گئی ہے۔

يَا مَنْزِلًا لَعِبَ الزَّمَانُ بِأَهْلِهِ
فَأَبَادَهُمْ بِتَفَرُّقٍ لَا يُجْمَعُ
إِنَّ الَّذِيْنَ عَهِدْتَهُمْ بِكَ مَرَّةً
كَانَ الزَّمَانُ بِهِمْ يَضُرُّ وَيَنْفَعُ
أَصْبَحْتَ تَفْزَعُ مَنْ يَرَاكَ وَطَالَمَا
كُنَّا إِلَيْكَ مِنَ الْمَهَاوِلِ نَفْزَعُ
ذَهَبَ الَّذِيْنَ يُعَاشُ فِيْ أَكْنَافِهِمْ
بَقِيَ الَّذِيْنَ حَيَاتُهُمْ لَا تَنْفَعُ[1]

اے حضرات ناظرین، اس وقت اس حرکت کا جو ہمارے اموات کے ساتھ کی گئی، جو صدمہ دل پر گزرا وہ بیرون از حیطۂ تقریر و تحریر ہے۔ اس وقت تک اس کی یاد سے بدن کے رونگٹے تک کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارا جرم میں ہمارے اموات اور آباؤ اجداد کی قبریں کیوں کر کھود دی گئیں اور وہ مقبرہ

---

[1] مولانا مسعود عالم ندوی نے ان اشعار کا حسب ذیل ترجمہ کیا ہے:
ترجمہ: اے وہ منزل، جس کے رہنے والے زمانے کی دستبُرد کا شکار ہوئے اور انھیں زمانے نے ایسا منتشر کیا کہ پھر جمع ہونے کی توقع نہیں۔
وہ جنھیں مَیں نے کبھی تیری آغوش میں آسودہ حال دیکھا تھا، زمانہ اُن کے سہارے نفع و نقصان پہنچاتا تھا۔
جو تجھے اب دیکھتا ہے گھبرا اُٹھتا ہے، اور ایک وقت وہ تھا کہ ہم مشکلات سے گھبرا کر تیری آغوش میں پناہ ڈھونڈا کرتے تھے۔
وہ لوگ تو گزر گئے، جن کے سایے میں زندگی، زندگی تھی۔ اب وہ لوگ رہ گئے جن کی زندگیاں کسی کام کی نہیں۔

کیوں معرضِ ضبطی میں آیا؟ ہماری عادل گورنمنٹ نے کیوں یہ کام کیا؟"

ہندوستان میں ان حضرات کے شب و روز کی ہر آن نگرانی ہوتی رہی۔ مدتوں تھانوں میں حاضری دینا پڑی۔ یہ پابندی ختم ہوئی تو مقامِ رہائش سے باہر جانے کے لیے اجازت ضروری قرار پائی۔ ایسے حالات میں تحریک کے ساتھ وابستگی ممکن نہ تھی۔ پھر اُنّیس بیس برسوں میں یہاں بڑا کچھ انقلاب آچکا تھا۔ پُرانی نسل ختم ہو کر نئی نسل اُٹھ چکی تھی جس کا اندازِ فکر و عمل پُرانی نسل سے کوئی مطابقت نہ رکھتا تھا۔ مولانا عبدالرحیم اس انقلاب کا ذکر بھی بڑے دُکھی انداز میں کرتے ہیں:

"یہ ساڑھے تین مہینے کم پُورے بیس برس میں اپنے گھر آیا تو دیکھا کہ رنگ ڈھنگ، چال چلن، لباس پوشاک و کل طرزِ معاشرت تمام شہر کا بدلا ہوا ہے۔ جو لوگ اس وقت میں عمر رسیدہ تھے وہ تو پیوندِ زمیں ہو گئے اور جو لڑکے تھے وہ بُوڑھے ہو گئے اور جو ملکِ عدم میں تھے وہ لباسِ ہستی پہن کر جوان ہو گئے اور ایک نئی روشنی اور نئے اعتقادات اور نئے خیالات کے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ اس وقت بے اختیار حضرت عزیر علیہ السلام کا قول جو بیت المقدس کو ویران دیکھ کر آپ نے فرمایا تھا اور اللہ رب العزت نے اپنے کلام پاک میں اس کو حکایتاً نقل کیا ہے، یاد آگیا۔ وہ یہ ہے قَالَ اَنّٰی یُحْیِیْ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ خصوصاً اہلِ صادق پُور کے مرد و عورت ہر ایک میں تغیّرِ عظیم پایا کہ جس کا سخت رنج و گزند قلب پر گزرا۔ اس وقت مجھ کو اپنی رہائی پر از بس کہ افسوس ہوا کہ کاش میں بھی اُسی جزیرے کا پیوندِ زمیں ہو جاتا تو بروزِ حشر اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ محشور ہوتا اور نیز مکروہات کے معاینہ سے محفوظ رہتا۔ یٰلَیْتَنِیْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا"

مولوی مُبارک علی کی گرفتاری کے بعد تحریک کا کام مولانا ولایت علی کے صاحبزادے مولوی محمد حسن نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اور وہ بڑے حُسنِ تدبّر کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ مولانا عبدالرحیم رہا ہو کر آتے تو لوگوں نے بھی عرض کی اور سرحدِ آزاد میں مجاہدین کے امیر مولوی عبداللہ نے بھی خواہش ظاہر کی کہ ہندوستان

میں زمامِ کار وہ خود سنبھال لیں، مگر آپ نے فرمایا: "برادر محمد حسن جس صورت سے کام کر رہے ہیں وہ کرتے رہیں، ہم ان کے کاموں میں مدد دیتے رہیں گے۔" لیکن جب مولوی محمد حسن نے ۱۳۰۷ھ میں انتقال فرمایا تو انھوں نے ساری ذمہ داری اپنے بوڑھے کندھوں پر اٹھا لی۔

حکومت کی کڑی نگرانی اور تغیرِ احوال کے باوجود نئے نئے کارکن تحریک کو میسر آنے لگے۔ مولانا محمد ابراہیم آروی، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا عبدالحکیم صادق پوری ان میں نمایاں ترین تھے۔ مولانا عبدالرحیم کا طریقِ کار اب پہلے سے بالکل مختلف تھا۔ عملی سرگرمیوں سے کسی قسم کا واسطہ نہ رکھتے۔ اجنبی لوگوں سے گفتگو اور میل جول میں ہمیشہ احتیاط برتتے۔ حکومت کے خفیہ کارندے صبح و شام ٹوہ میں رہتے۔ ایک بار خفیہ پولیس کا ایک انسپکٹر ملنے آیا اور کہنے لگا آپ کی طرف سے مجاہدین کے لیے چندہ جمع ہوتا ہے۔ مولانا عبدالرحیم فوراً سمجھ گئے کہ یہ لوگ اب کیا کھیل کھیلنے کی فکر میں ہیں۔ فرمایا: "میرے نام پر اگر کوئی چندہ جمع کرتا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ حکومت اگر چاہتی ہے کہ دوبارہ مجھے جزیرہ انڈمان بھیج دے تو وہ ایسا کر سکتی ہے، میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

ایک اور موقع پر ایک شخص حاضرِ خدمت ہوا۔ اُس کی ظاہری شکل صورت اور اعمال و افعال سے مولانا محمد ابراہیم آروی ایسے اصحاب بھی دھوکے میں آگئے۔ وہ انھی کی جانب سے خط لے کر آیا تھا، لکھا تھا "یہ قابلِ اعتماد آدمی ہیں، میں آپ کے پاس بھیجتا ہوں، اُمید ہے کہ کام چلے گا۔" اس شخص نے مولانا ابراہیم آروی کے خط کے ساتھ کچھ رقم بھی پیش کی۔ انھوں نے دینداری اور اخلاص کے قالب میں چھپی ہوئی ناپاک روح کو دیکھ لیا۔ فرمایا: "یہ رقم مدرسہ اصلاح المسلمین محلہ پتھر کی مسجد پٹنہ کے سید کفایت حسین صاحب کو جا کر دے دو اور ان سے مدرسے کی رسید لے لو۔" وہ شخص ان کے ہاں سے تو چلا گیا، مگر مدرسے نہ پہنچا۔ پہنچتا بھی تو کیوں؟ اُس کا تو مقصد ہی اور تھا۔ کچھ عرصے بعد مولانا ابراہیم صاحب کا خط آیا: "فلاں شخص

مَیں نے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا اُمید ہے کام چلا ہو گا۔" آپ نے جواب بھجوایا: "آپ کے بھیجے ہُوئے آدمی میرے پاس آئے تھے، لیکن مَیں نے ان سے کہا اَنۡتُمۡ بِهَدِیَّتِكُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ[1]۔" مولانا ابراہیم بڑے متعجب ہُوئے کہ مولانا، ایسے متدین اور عابد و زاہد لوگوں پر بھی اعتماد نہیں کرتے، لیکن کچھ عرصے بعد وہ مولانا عبدالرحیم کی خدمت میں حاضر ہُوئے تو انھوں نے تسلیم کیا کہ آپ کا اندازہ درست تھا۔ وہ شخص واقعی خفیہ پولیس کا کارندہ تھا۔

مولانا عبدالرحیم بہت بُوڑھے ہو گئے اور ضعف و نقاہت نے آلیا تو اُنھوں نے اپنی ذمہ داریاں اپنے نواسے اور مولانا احمد اللہ کے پوتے مولوی عبدالخبیر کو سونپ دیں، اس لیے کہ اُن کے تمام نمایاں اور ممتاز معاونین انتقال کر چکے تھے۔ اُدھر سرحدِ آزاد میں امیر عبداللہ بھی واصل بحق ہو چکے تھے۔ یُوں ملک کے اندر اور باہر دونوں جگہ دس بارہ برس کے عرصے میں تحریک کی قیادتیں تبدیل ہو گئیں۔ امیر عبداللہ نے امیر المجاہدین مقصود علی کے انتقال پر جماعت کی متفقہ رائے اور اصرار پیہم پر امارت سنبھالی تھی۔ اپنے عظیم و جلیل والد مولانا ولایت علی کی براہِ راست نگرانی میں پروان چڑھے اور بڑے بڑے معرکوں میں حصّہ لیا اور جب تک زندہ رہے انگریزوں کے لیے آفت بنے رہے۔ اتباعِ سُنّت کے ساتھ ساتھ سلوک و طریقت کی راہ کے بھی شہسوار تھے۔ سپہ گری کے فنون میں طاق۔ زبردست گھڑسوار تھے اور جنگ کا سازوسامان، گولہ بارُود، توپ، بندُوق تیار کرنے کے بھی ماہر تھے۔ بڑے ہی مدبر تھے۔ اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کے حامل اور سیاسی اُمور پر بھاری دسترس رکھتے۔ انگریزوں نے ملکا پر بے خبری میں حملہ کر کے اور آزاد قبائل کو ساتھ ملا کر مجاہدین کا قلع قمع کرنے کا جو عظیم منصوبہ بنایا تھا اُسے انھی کے تدبر اور فوجی بصیرت نے ایک ایسی کٹھن مہم میں بدل ڈالا جسے سَر کرنے کے لیے انگریزوں کو اپنی پُوری جنگی قوت

---

[1] سورہ نمل کی آیت ۳۶ کا ایک ٹکڑا ہے۔ ملکہ سبا کا سفیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں ہدیے لے کر پہنچا تو آپ نے فرمایا: اَتُمِدُّوۡنَنِ بِمَالٍ فَمَاۤ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيۡرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰىكُمۡ‌ۚ بَلۡ اَنۡتُمۡ بِهَدِيَّتِكُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ۔ کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمھیں دیا ہے۔ تمھارا ہدیہ تمھیں کو مبارک رہے۔

جھونک دینی پڑی اور اپنی جس کارروائی کو وہ بچوں کا کھیل سمجھتے تھے، اُس سے سیم وزر کی ہوس بھڑکا کر بمشکل چھٹکارا پاسکے۔

مولانا عبدالرّحیم کا انتقال جولائی ۱۹۲۳ء کے اواخر میں بقرعید کے روز ہُوا اور ۱۱ ذی الحجہ کو دفن کیے گئے۔ بعض اصحاب کا خیال تھا کہ مولانا کو سپردِ خاک کرنے سے پہلے ان کے جانشین (مولوی عبدالخبیر) کے ہاتھ پر بیعت کر لینی چاہیے، لیکن دوسرے دوستوں کی رائے تھی کہ کسی اور موقع پر بیعت لینی چاہیے۔ جنازے کے وقت خُفیہ پولیس کے آدمی بھی بڑی تعداد میں ہوں گے اور ایک ایک لمحے پر اُن کی نظر ہوگی۔ ایسے موقع پر بیعت لینا درست نہیں؛ یہ رائے صائب تھی، چنانچہ بیعت ملتوی کر دی گئی۔ اندیشہ صحیح ثابت ہُوا۔ خُفیہ پولیس کے ایجنٹ کئی روز تک بڑی سرگرمی سے کھوج لگاتے رہے کہ مولانا کا جانشین کون مقرر ہُوا ہے جنازے کی نماز مولانا یحییٰ علی کے صاحبزادے مولانا عبدالقیوم صادق پُوری نے پڑھائی اور بڑی لمبی دعائے جنازہ کے بعض جملے وہ بار بار نہایت تضرّع اور زاری سے دُہراتے رہے۔ دفن کے بعد دعائے تثبیت بھی بڑی طویل کی۔ دُعا بہت پُر کیف تھی۔ قبر کے آرام کی استدعا، جنّت کے دروازں کے کُھلنے، جنّت کا لباس پہنانے، قبر میں جنّت کا فرش بچھوانے کی التجا تو دعا میں تھی ہی، ایک جُملہ آخر میں یہ بھی کہا کہ آپ ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں سے اب آپ کو کوئی شخص انڈمان نہیں بھیج سکتا۔ اللہ دنیا کے مصائب و آلام کا اچھا اجر نصیب فرمائے۔

مولانا عبدالرّحیم اپنے خاندان اور سید بادشاہ کے قافلے کے دوسرے ارکان کی طرح متبعِ سُنّت اور زاہد و متورّع تھے۔ نہایت بہادر، عالی ہمّت اور جری تھے اور فنِ حرب میں طاق۔ اگرچہ محاذِ جنگ پر جانے اور جہاد میں عملاً حصّہ لینے کا کبھی موقع نہ ملا اور زندگی کے دو عشرے قید و بند میں گزارے، اس کے باوجود جنگی اسٹرٹیجی مرتب کرنے اور فوجوں کو لڑانے کی اعلیٰ صلاحیت سے بہرہ ور تھے اور اس باب میں ناقدانہ مہارت رکھتے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم شروع ہُوئی تو

اس کی خبروں پر برابر تبصرہ فرماتے اور یہ تبصرہ عموماً درست ثابت ہوتا۔ مصائب و شدائد کا ہمیشہ مردانہ وار مقابلہ کیا اور کٹھن سے کٹھن اور انتہائی پریشان کن حالات میں بھی کبھی ہراساں نہ ہوتے۔ نہایت متواضع، عجز و انکسار کا مجسمہ اور خوش اخلاق تھے، لیکن حق کے معاملے میں بڑے غیرت مند اور شیر ببر کی طرح غضب ناک۔ بے حد مردم شناس تھے، دوست دشمن کو خوب پہچانتے۔ تقریر نہایت پُر مغز اور وعظ پُر اثر ہوتا۔ انڈمان سے واپسی کے بعد گوشۂ تنہائی اختیار کیے رکھتے، لیکن پھر بھی ہر وقت دین و ملت کی فکر دامن گیر رہتی۔ اُن کی صحبت میں فکر و نظر اور ظاہر و باطن کو جِلا اور اصلاح کا سرمایہ ملتا۔ مولانا عبدالرحیم صادق پور کے آخری فرد تھے جنھوں نے برصغیر میں تحریک کی قیادت کی۔ انھوں نے مولوی عبدالخبیر کو اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا، مگر تحریک کا وہ ڈسپلن ختم ہو گیا جو مولانا ولایت علی کے سے چلا آرہا تھا اُن کا تقرر متنازع فیہ مسئلہ بن گیا۔ پھر ملک کے سیاسی حالات نیا رُخ اختیار کر چکے تھے۔ صادق پور تقریباً اُنسٹھ برس سے انگریز کی سختیوں اور مظالم کا ہدف بنا ہوا تھا۔ اُس کی انٹیلی جنس نے اُس کے ایک ایک فرد کو گھیر رکھا تھا۔ اس گھیرے میں کام کرنا آسان نہ رہا تھا۔ مزید برآں صادق پور کی نئی نسل نئے خیالات اور نئے ماحول میں اُٹھ رہی تھی جسے اُس مقصد سے کوئی لگاؤ نہ تھا جس کے لیے اُس کے بزرگوں نے قربانی اور ایثار کی تابندہ روایات قائم کی تھیں۔ ان حالات میں نئی قیادت کی ضرورت تھی۔ پہلے بھی تحریک کو کارکنوں ہی سے قیادت ملتی رہی تھی اور اب بھی کارکن ہی اس خلا کو پُر کر سکتے تھے۔

اور تاریخ کے مسافر نے دیکھا کہ اُنھوں نے اس خلا کو پُر کر دیا۔

چوتھی منزل

چمرکنڈ

خوفناک دھماکا

جون ۱۹۲۰ء کی ۲۰ تاریخ تھی۔ فیروز پور رات بھر کی نیند کے بعد جاگ چلا تھا۔ کانسٹیبل علی محمد نے گھڑی پر نظر ڈالی، ساڑھے چار بج رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی فیروز پور کے دروازے کھولنے چل کھڑا ہوا۔ ملتانی دروازہ کھول کر امرتسری دروازے کی طرف بڑھا۔ قصوری دروازے کے قریب پہنچ کر ٹھٹکا، کوئی شخص کھیت میں بیٹھا تھا۔ آواز دی: "کون ہے؟" صبح کے سناٹے میں صرف صدائے بازگشت سنائی دی۔ علی محمد پھر پکارا: "کون ہے؟" اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی طرف ہولیا۔ آدمی جلدی سے اُٹھا، ڈب سے پستول نکالا اور فائر کر دیا۔ گولی سنسناتی ہوئی علی محمد کے پاس سے گزر گئی۔ آدمی نے دوسرا فائر کرنا چاہا، مگر پستول نہ چل سکا۔ اتنے میں کسی شخص نے پیچھے سے آکر اس کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔ آدمی بھاگ کھڑا ہوا، مگر علی محمد اور پستول چھیننے والے شخص نے تعاقب کر کے اُسے پکڑ لیا۔ وہ آدمی دیکھنے میں سیدھا سادا دیہاتی تھا۔ کھدر کی تہمد اور دیسی کرتا زیب تن تھا، سر پر کھدر ہی کی پگڑی۔ سانولا رنگ، لمبا قد، مضبوط ہاتھ پاؤں، چھوٹی سی کالی داڑھی، عمر کوئی بیس پچیس سال ہو گی۔ صورت شکل سے شریف اور دیندار معلوم ہوتا تھا۔ اس اچانک اُفتاد سے وہ سخت بدحواس اور پریشان تھا، منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ تھانے پہنچ کر تلاشی لی گئی، ریوالور کی گولیاں اور پانچ سو روپے ملے۔

اب صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی، دیہاتی اپنے آپ پر قابو پا چکا تھا۔ پوچھ گچھ شروع ہوئی، اُس نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ تھانیدار غصے میں لال پیلا ہو گیا۔ "ذرا اس بدمعاش کے کس بل نکال دو۔" وہ گرجا اور تین چار سپاہی درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ اوندھے منہ لٹا کر وہ مار ماری کہ کھال اُدھیڑ دی۔ تھانیدار باؤلے بیل کی طرح ڈکراتا، گالیاں بکتا اور پھنکارتا رہا: "اور مارو....

اِس ..... کو اَور مارو۔" لیکن دیہاتی بھی ایک سخت جان تھا۔ ایک مرتبہ چُپ جو سادھی، تو پولیس کی کوئی سختی اس کی چُپ نہ توڑ سکی۔ ایسے سخت جان آدمی سے پہلی بار پالا پڑا تھا۔ تھانیدار سوچنے لگا بڑا ڈھیٹ ہے۔ ہو نہ ہو کوئی چھٹا ہُوا بدمعاش ہے۔ اُس نے پُرانے کاغذات نکالے اور لگا اُنھیں اُلٹنے پلٹنے۔۔۔ اور پھر اُس کی باچھیں کھل گئیں "بدمعاش! آخر تم ہمارے ہتھے چڑھ ہی گئے....." وہ چنگھاڑا۔ پھر گویا اپنے آپ کو داد دیتے ہُوئے بولا: "ہمارے چُنگل سے کون بچ سکتا ہے؟ ہم تو مُجرم کو پاتال سے بھی کھینچ لاتے ہیں" دیہاتی پر اس کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ بس اس شکار کی طرح تھانیدار کا مُنہ دیکھتا رہا جسے جال کے نہ ٹُوٹنے والے حلقوں نے بے دَم کر دیا ہو۔

"تم اشتہاری مجرم ہو، تمھاری گرفتاری کے لیے انعام کا اعلان ہو چکا ہے۔ تم نے تین ڈاکے ڈالے ہیں" تھانیدار نے کہا اور ایک بڑے سے رجسٹر کی ورق گردانی کرتے ہُوئے ایک فوٹو نکالی۔ تصویر کے خدوخال اس دیہاتی سے مِلتے جُلتے تھے، بس ڈاڑھی مُونچھوں کا فرق تھا۔ تصویر والے شخص کی ڈاڑھی بھاری اور چڑھی ہُوئی اور مُونچھیں بڑی بڑی تھیں۔ یہ شخص پولیس کو ڈکیتی کی تین وارداتوں میں مطلوب تھا اور کئی سال سے مفرور۔

"تمھیں نا جا ڈاکو ہو..... آخر ہم نے تمھیں پکڑ ہی لیا"۔ کِسی خوش کُن خیال سے تھانیدار کا چہرہ چمک اُٹھا تھا۔ "صاف صاف اقرار کر لو، اب چھُپانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا" اُس نے کہا اور دیہاتی کو گھُورا۔ دیہاتی کے چہرے پر اضطراب کی پرچھائیں نمودار ہُوئیں۔ پھر یُوں محسُوس ہُوا اُس کے دِل میں زبردست کشمکش برپا ہے۔ ہیڈ مُحرّر نے اشتہاری مجرم پکڑے جانے کی فرد بھرنی شروع کی۔ دیہاتی جس نے تھانے کا وحشت ناک عذاب بڑے صبر سے جھیل لیا تھا، بڑی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا ـــــ آخر اُس نے اپنی چُپ توڑ دی: "نہ میں ڈکیت ہُوں اور نہ کِسی ڈکیتی سے میرا کوئی واسطہ ہے"

اس نے کہا۔

"تو پھر کون ہو؟" تھانیدار نے اپنی نظریں دیہاتی کے چہرے پر اور گہری گاڑ دیں۔ اس کے لہجے میں بھالے کی کُند نوک کی سی درشتی تھی۔

"میرا نام احمد ہے، لوگ مجھے خان بہادر کہتے ہیں۔ موضع مہنتہ، تھانہ جلال آباد، ضلع فیروز پور کا رہنے والا ہوں، والد کا نام ماناں ہے، ذات کا بھٹی ہوں اور مجاہدین کی جماعت میں شامل۔"

"مجاہدین......!" تھانیدار اچھل پڑا۔ یہ انکشاف اس کے لیے پہلے انکشاف سے بھی زیادہ مسرت انگیز تھا۔ مجاہدین کے نام سے وہ بخوبی واقف تھا، لیکن وہ انھیں صرف انگریزی سرکار کا باغی سمجھتا تھا۔ اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ یہ اُس آگ کی چنگاری ہے جو رائے بریلی کے ایک سیّدؒ نے اپنے خون سے روشن کی تھی۔ چنگاری جو نوّے سال گزرنے کے باوجود سرحدِ آزاد میں ابھی تک سُلگ رہی ہے، جسے کبھی تازہ و گرم لہو میسّر آجاتا ہے تو بھڑک اُٹھتی ہے، جس سے برِصغیر میں انگریزی اقتدار کئی بار بھسم ہوتے ہوتے رہ گیا۔

"ہاں، میرا تعلق مجاہدین سے ہے...... ابھی چند روز ہوئے ہیں اور میرے چار ساتھی مجاہدین کے مرکز سے اسلحہ لے کر آئے اور وہ اسلحہ ہم نے قاضی کوٹ میں قاضی عبدالرّؤف کے گھر میں دفن کر دیا۔"

"چار ساتھی...... اسلحہ...... قاضی کوٹ......!" تھانیدار نے دل ہی دل میں کہا ایک زبردست کیس ہاتھ لگا ہے...... ایک دھماکا جس سے اُونگھتی بھیلتی ہوئی تاریخ چونک پڑے گی۔

"تمھارے چار ساتھی اور تھے؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"جی ہاں، چار ساتھی۔ یعقوب عرف درویش، محمد حسین عرف محمد عمر، سلیمان عرف ایوّب، غلام محمد عرف محمد......" احمد عرف خان بہادر نے جواب دیا۔

"تم سب لوگوں کے دو دو نام ہیں؟"

"جی ہاں، ہم تحریک کا کام عرفی ناموں سے کرتے ہیں"

"اسلحہ کس قسم کا تھا؟"

"بم، ریوالور، بندوقیں اور کارتوس..... یہ مجاہدین کے مرکز اسمست سے مولوی محمد بشیر نے بھیجا ہے۔ انھوں نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ مولوی فضل الٰہی کو دے دیں..... مولوی صاحب نے انھیں عبدالرؤف کے گھر دفن کروادیا"

"تم جا کہاں رہے تھے؟"

"اپنے گاؤں، میری والدہ بیمار ہیں، انھیں ملنے جا رہا تھا"

"یہ روپے تم نے کہاں سے لیے؟"

"مولوی فضل الٰہی نے دیے تھے"

یہ وہ زمانہ تھا جب ملک بھر میں سیاسی ہل چل بپا تھی۔ مارشل لا اگرچہ ختم ہو چکا تھا، مگر جلیانوالہ باغ میں بہنے والے خون نے چاروں طرف جذبات کی آگ بکھیر رکھی تھی۔ جلسے جلوس اور ہڑتالیں زوروں پر تھیں۔ خلافت کی تحریک بھی جاری تھی جس نے پشاور سے مالابار تک مسلمانوں میں جوش و جذبہ بھر دیا تھا۔ دوسری طرف افغانستان میں انقلاب آچکا تھا، حبیب اللہ قتل ہو چکا تھا اور امان اللہ خاں تخت نشین۔ وہ انگریزوں کا جانی دشمن تھا۔ اُس نے تخت پر بیٹھتے ہی اُن سے جنگ چھیڑ دی اور ٹھل کا علاقہ فتح کر لیا۔ بعد ازاں جنگ بندی ہوگئی، لیکن ان سب واقعات کے نتیجے میں ہندوستان میں لوگوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ افغانستان کے ساتھ اس کش مکش میں اسمست کے مجاہدین کا نام اکثر سننے میں آتا رہا تھا۔ ایسے عالم میں اسلحے کا انکشاف ایک خوفناک دھماکا تھا۔

گوجرانوالہ سے دس میل دُور شمال مغرب میں کھیتوں اور شیشم کے درختوں میں گھِرا ہُوا گاؤں قاضی کوٹ رات کی پُرسکون چادر میں لپٹا محوِ خواب تھا۔ کہیں کہیں کوئی چراغ، زاہدِ شب زندہ دار کی طرح جاگ رہا تھا۔ باقی پُورے گاؤں میں اندھیرا تھا۔ پھر مشرقی اُفق سے آخری راتوں کا چاند اُبھرا اور اس کی ناتواں کرنیں اندھیرے سے کش مکش کرنے لگیں۔ عین اُس وقت پولیس کی ایک زبردست بھاری گارد چُپ چاپ گاؤں میں داخل ہُوئی اور اس نے قاضی عبدالرّؤف کا گھر اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ گھیر لیا۔ صبح کی اذان گونجی، تو گاؤں بیدار ہو گیا۔ لوگ مسجد کی طرف بڑھے۔ قاضی عبدالرّؤف بھی حسبِ معمُول گھر سے نکلے۔ قریب ہی مسجد تھی۔ پولیس کے سپاہی جگہ جگہ کھڑے دیکھ کر اُن کا ماتھا ٹھنکا، مگر چہرے سے کسی قسم کا تأثر ظاہر نہ ہونے دیا۔ نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے، تو دروازے ہی پر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے روک لیا۔ اُس نے بڑے نرم لہجے میں کہا: "قاضی صاحب! ہم نے سُنا ہے آپ کے ہاں ہتھیار ہیں۔ مجاہدین کے مرکز اسمست سے آئے ہیں۔" قاضی صاحب نے صاف انکار کر دیا۔

"ہُوں۔" سپرنٹنڈنٹ نے بھاری بھرکم گردن ہلائی۔ "ہمیں ایک نہایت معتبر ذریعے نے خبر دی ہے۔"

قاضی صاحب ابھی کچھ کہہ نہ پائے تھے کہ ایس پی نے انسپکٹر پولیس کی طرف دیکھا اور کہا: "خان بہادر کہاں ہے؟ پھر دیکھیں قاضی صاحب کیا فرماتے ہیں؟" اس کے لہجے میں بلا کا طنز تھا۔ خان بہادر کا نام سُن کر قاضی عبدالرّؤف کا دِل زور سے دھڑکا، چہرے پر بھی اضطراب کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ ایس پی کی توجّہ دوسری طرف تھی، اس لیے وہ فکر و تشویش کی لہر نہ پڑھ سکا۔

چند منٹ بعد خان بہادر پولیس کے پہرے میں آ پہنچا۔

"ہلو قاضی صاحب! آپ اب بھی کسی اسلحے سے انکاری ہیں؟"

"مجھے کسی اسلحے کی خبر نہیں ہے"

"خُوب۔ (خان بہادر سے مخاطب ہو کر) تُم کہو، کیا خیال ہے؟"

"جناب، ہم چار آدمی اسلحہ اسمست سے لائے تھے۔ مولوی فضل الٰہی نے ہمیں قاضی صاحب کے پاس یہاں بھیج دیا۔ وہ اسلحہ انھوں نے قاضی عبیداللہ کے ساتھ مِل کر ایک صندوق میں رکھا اور دفن کر دیا"

"تو قاضی عبیداللہ بھی تمھارے شریکِ کار تھے؟"

"جی ہاں"

قاضی عبیداللہ، قاضی عبدالرؤف کے برادرِ نسبتی تھے اور نماز پڑھ کر گھر جا چکے تھے۔ اُنھیں ایک بار خیال بھی آیا کہ گاؤں سے نکل جائیں، مگر پولیس نے ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ اُس کی نگاہ سے بچ کر نکلنا ممکن نہ تھا۔ ایس پی نے انھیں بھی طلب کر لیا۔ خان بہادر کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ راز فاش ہو چکا ہے۔ انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ فوراً اقرار کر لیا کہ خان بہادر اور اس کے ساتھی اسلحہ لائے تھے اور ہم نے زمین میں دفن کر دیا۔ قاضی عبدالرؤف کے لیے بھی اب ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اندرونی کمرے کا فرش کھودا گیا۔ ایک بڑا سا صندوق جرمن ساخت کے اسلحہ، بم، پستول اور کارتوسوں سے بھرا ہُوا نکلا۔ خان بہادر، قاضی عبدالرؤف اور قاضی عبیداللہ گرفتار کر لیے گئے۔

اگلے روز اخبارات کی چیختی ہُوئی سُرخیاں خبر دے رہی تھیں: "ضلع گوجرانوالہ کے گاؤں قاضی کوٹ سے بم پکڑے گئے۔ تین مُلزم گرفتار، باقی مُلزموں کی تلاش جاری ہے۔"

○

گوہرِ شاہوار

زمانے کی گردش چار سال پیچھے پہنچ گئی ہے۔ جالندھر جیل میں وزیر آباد کا ایک نوجوان قید ہے۔ عمر تیس بتّیس کے لگ بھگ، متوسط قد، بلند پیشانی

عقابی ناک، دِل میں کھُب جانے والی نگاہیں، گورا چِٹّا رنگ، لمبی سیاہ ڈاڑھی، چہرے بُشرے سے جبل کی مصیبتیں صاف جھلک رہی ہیں، لیکن اپنی دُھن کا پکّا اور عزم و ہمت کا پہاڑ ہے۔

نوجوان کا جُرم یہ ہے کہ مجاہدین کی تحریک کو روپے اور آدمی فراہم کرتا ہے۔ اٹھارہ سال کا تھا جب اس تحریک سے وابستہ ہُوا۔ بیس سال کی عُمر میں تحریک کے مرکز اسمست گیا اور امیر المجاہدین کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی۔ اُن دِنوں ریلوے میں ملازم تھا۔ نچلے متوسط طبقے کے کسی مسلمان نوجوان کے لیے نوکری حاصل کرنا پہاڑ کاٹ کر جُوئے شیر لانے سے کم مشکل نہ تھا، مگر اِس نے اس ملازمت کو لات ماری اور اپنی ساری زندگی حق کی راہ میں وقف کر دی۔ نوکری چھوڑی، تو باپ تین چار سال ناراض رہا۔ آخر اپنے وقت کے شیخ اور استاذ حافظ عبدالمنانؒ کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ اُس نے قرآن کریم کی تعلیم شیخ ہی سے حاصل کی تھی۔ نوجوان بھی جماعتِ مجاہدین کے نام اور کام سے انہی کی صحبت میں متعارف ہُوا تھا۔ حافظ صاحب کا مجاہدین سے خصوصی تعلق تھا۔ نابینا تھے، لیکن بے شمار آنکھوں والوں سے کہیں بینا —— مجاہدین کو روپیہ پہنچانے کی منزل ان کا مدرسہ بھی تھا۔ رضاکار بھی آتے جاتے یہیں ٹھہرتے، یہاں انھیں کھانا بھی ملتا اور ٹھکانا بھی۔ باپ نے شیخ سے عرض کی:

"حضرت آپ کا شاگرد نہ تو نوکری کرتا ہے اور نہ کوئی کاروبار۔ میرے کہے سے باہر ہے، آئے دِن اس کے مہمان آتے رہتے ہیں، حیران ہُوں اس کا کیا کروں؟"

"میراں بخش!" شیخ نے جواب دیا "میرے چار لڑکے ہیں، چاروں لے لو اور وہ جسے تم نکمّا سمجھتے ہو، مجھے دے دو۔ تم اس نوجوان کی قدر کیا جانو؟ تمھیں کیا خبر وہ کیا چیز ہے؟" شیخ، جلال میں آ گئے تھے۔ میراں بخش معذرت کرتے رہے: "حضرت! مجھ کور بیں کو خبر نہ تھی جسے میں خزف سمجھتا ہُوں وہ

گوہر شاہوار ہے۔ آئندہ میں اُس کی کبھی شکایت نہ کروں گا۔"

اور واقعی یہ نوجوان گوہر شاہوار نکلا۔ سرحد میں مولانا عبداللہ بچاليس برس امارت کے منصب پر فائز رہنے کے بعد فوت ہو چکے تھے اور ان کی جگہ ان کے بھائی مولانا عبدالکریم امیر چن لیے گئے تھے۔ امیر عبداللہ نے اپنے آخری دور میں ٹیلوائی کو مرکز بنایا تھا اور وہیں دفن بھی ہوئے۔ امیر عبدالکریم نے ٹیلوائی چھوڑ کر اسمست کو مرکز بنا لیا تھا۔ زمامِ امارت ہاتھ میں لیتے ہی انھوں نے نئے خطوط پر تحریک کو منظم کیا۔ ہندوستان میں تحریک کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے قابل اور محنتی کارکن مقرر کیے۔ اس نوجوان کو ہندوستان میں تحریک کے لیے روپے اور مجاہد فراہم کرنے کا کام سونپا جسے اُس نے اِس خوبی اور ذوق و شوق سے انجام دیا کہ چند سال کے اندر اندر پشاور سے مدراس تک سرگرم کارکنوں کا ایک جال بچھ گیا۔ اس نے اپنے عہد کے بڑے بڑے رہنماؤں سے رابطہ استوار کیا۔ ۷ر نومبر ۱۹۱۵ء کو پولیس اسے گرفتار کرنے وزیر آباد پہنچی، تو یوں لگتا تھا جیسے اس کا سامنا کسی بڑی ہی انقلابی شخصیت سے ہو۔ پولیس کی کمان انگریز سپرنٹنڈنٹ کر رہا تھا۔ نوجوان نے تھوڑی ہی دیر پہلے مُلک کے مختلف ممتاز افراد کو خط لکھے تھے۔ پولیس نے ان پر فوراً قبضہ کر لیا۔ دو خط اس کی نظر سے چُوک گئے۔ نوجوان نے اشارہ کیا اور اس کے والد نے پولیس کی نظر بچا کر انھیں اُٹھا لیا اور گول کر کے کھا گئے۔ ان میں سے ایک خط مولانا محمد علی جوہر کے نام تھا اور دُوسرا مولانا ابوالکلام کے نام۔

جیل میں بھی نوجوان کے شب و روز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تحریک کا کام وہ اب بھی کر رہا ہے۔ قیدی ساتھی اور جیل کے کارندے اس کے کردار سے متاثر ہیں۔ یہ انھیں قرآن و سُنّت کی پیروی کی تلقین کرتا رہتا ہے۔

دارڈر ولی محمدؐ تو اس کا بہت زیادہ عقیدت مند ہے اور اس کے ہاتھ پر بیعت کر کے تحریک کا رکن بن چکا ہے۔ نوجوان اس کی وساطت سے جیل کی چار دیواری سے باہر ہر علاقے کے ممتاز افراد کو ہدایت دیتا رہتا ہے وہ جو چٹھیاں لکھتا ہے، ولی محمد انھیں ڈاک میں ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح باہر سے آنے والی ڈاک اُس کے ذریعے نوجوان تک پہنچ جاتی ہے۔

لیکن ایسا کام کب تک چھپا رہ سکتا ہے؟ جیل کے ایک بھنگی کی نگاہیں ہر وقت ولی محمدؐ کے تعاقب میں ہیں۔ وہ اِس نوجوان کی کنسوئیاں بھی لے رہا ہے۔ وَلی محمدؐ نگرانی سے بے خبر اپنے کام میں مصروف ہے اور ایک روز وہ "رنگے ہاتھوں" پکڑا جاتا ہے۔ وہ ڈیوڑھی میں پہنچ چکا ہے۔ جیل کا سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ اُسے روکتے ہیں۔ نائب داروغہ اور جیل کے سپاہی بھی پہنچ گئے ہیں۔ ولی محمدؐ کی تلاشی لیتے ہیں، تو نوجوان کا لکھا ہوا خط برآمد ہوتا ہے۔ خط بظاہر سیدھا سادا ہے۔ سرسری طور پر پڑھنے سے کوئی بھی اندازہ نہیں کر پاتا کہ خط کے الفاظ اپنے اندر کوئی خُفیہ پیغام رکھتے ہیں۔ ولی محمدؐ فوراً معطل کر دیا جاتا ہے۔ پولیس اپنے حربے استعمال کرتی ہے تو اقرار کر لیتا ہے کہ وہ نوجوان کی ڈاک لانے اور لے جانے کا کام ایک سال سے کر رہا ہے۔ وہ اِن لوگوں کے اَتے پَتے بھی بتا دیتا ہے جن کے ساتھ نوجوان کی خط کتابت ہوتی رہی ہے۔ انگریز حکومت کے شکاری کُتّے ان کا پیچھا کرتے ہیں اور وہ ایک ایک کر کے جیل پہنچ جاتے ہیں۔

نوجوان پر بغاوت کا مقدّمہ چلتا ہے جس کی سزا موت ہے جیل میں اُس پر بے تحاشا ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ چلچلاتی دھوپ میں دِن بھر کھڑا رکھتے ہیں۔ اس کا جسم جُھلس گیا ہے، رنگ سیاہ اور آنکھیں خراب ہو گئی ہیں! برطانوی حکومت اُس کو پھانسی دلوانے کا پُورا انتظام کرتی ہے، مگر زندگی اور مَوت کے فیصلے زمین پر نہیں آسمان پر ہوتے ہیں۔ مقدمے کی سماعت، فوجی

عدالت جیل ہی میں کرتی ہے۔ ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود جرم ثابت نہیں ہوتا۔

اسی مقدمے کے دوران نوجوان کے والد بیمار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے کی ملاقات کو جالندھر جاتے ہیں، کتنے ہی دن انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ مگر ملاقات نہیں ہوتی۔ آخر ڈپٹی کلکٹر سے پوچھتے ہیں کہ ملاقات کی اجازت کیوں نہیں ملتی؟ وہ کہتا ہے تمہارے بیٹے پر بغاوت کا مقدمہ بن گیا ہے، چند دنوں تک یا تو اسے گولی ماردی جائے گی یا وہ بری ہو جائے گا۔ بوڑھا باپ، غمزدہ دل لیے واپس آجاتا ہے۔ بار بار کہہ رہا ہے "میرے لختِ جگر! تجھے گولی لگتی ہے یا نہیں مجھے تو لگ گئی ہے" اسی وقت بیماری آلیتی ہے۔ بستر پر گرتے ہیں، تو پھر نہیں اٹھتے۔ نوجوان کے گھر کا نظام تلپٹ ہوگیا ہے۔ وہ ۱۹۱۸ء میں مجبوراً تین ہزار روپے کی ضمانت پر رہائی حاصل کرتا ہے۔ حکومت کا حکم ہے کہ اجازت کے بغیر شہر سے باہر نہیں جاسکتا۔ وہ صبح و شام کوتوالی میں حاضری دیتا ہے۔ اس کے پاس آنے جانے والوں پر حکومت کڑی نظر رکھتی ہے، لیکن اس کے باوجود تحریک کا کام جاری رکھتا ہے۔

وہ انتھک اور سراپا عمل انسان ہے۔ ضمانت کی میعاد ختم ہوتی ہے، تو اپنے مقصدِ زندگی کے عشق میں ڈوبا پھر دوروں پر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ صبح کہیں ہوتی ہے شام کہیں۔ قدم قدم پر خطرہ ہے۔ دشمن اس کے نقش قدم کی بو سونگھتا پھرتا ہے، مگر وہ ہر خطرے کو انگیز کرتے ہوئے تحریکی دورے جاری رکھتا ہے۔ اب کے اس نے نیا روپ دھارا ہے۔ تین ساتھیوں کے ساتھ مل کر چاقو چھریاں بنانے والی فرم بنالی ہے اور سپلائی کا کام اپنے ذمے لیا ہے۔ وہ فرم کی مصنوعات کا ایک سیمپل بکس ساتھ رکھتا ہے۔ جس شہر میں جاتا ہے دکانداروں کی فرمائشیں بھی بک کرتا ہے اور جماعت کا کام بھی ——— فضل الٰہی اسی نوجوان کا نام تھا۔

ایک درویش، ایک مسافر

گوجرانوالہ کا انگریز ایس پی اپنا لاؤ لشکر لے کر وزیر آباد پہنچ گیا۔ قاضی عبدالرؤف نے گرفتاری سے پہلے موقع پا کر ایک آدمی مولوی فضل الٰہی کو خبر دینے کے لیے بھیج دیا تھا۔ پولیس گارد چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی شخص گاؤں سے نہ نکل سکتا تھا، لیکن یہ شخص کسی نہ کسی طرح نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ وزیر آباد پہنچا، تو پتہ چلا مولوی صاحب دو تین روز ہوئے کاروباری دورے پر جا چکے ہیں۔ اتنے میں پولیس بھی پہنچ گئی۔ اُس نے آتے ہی پورا محلّہ گھیر لیا۔ گھر پر کوئی مرد نہ تھا۔ پولیس نے پوچھ گچھ شروع کی۔ گھر والوں سے پوچھا، کارخانے کے حصہ داروں سے دریافت کیا۔ سب نے کہا کاروبار کے لیے کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ کہاں؟ کسی کو معلوم نہ تھا —— اور واقعی ان لوگوں کو کچھ خبر نہ تھی۔ جماعت کے صرف ایک نوجوان صوفی عبداللہ کو پتہ تھا۔ اگر وہ مولوی صاحب کے پیچھے جاتے، تو خود بھی پکڑے جاتے اور مولوی صاحب کا سراغ بھی مل جاتا۔ کارخانے کے ایک حصہ دار مولوی عبدالماجد سے ملے اور کہا آپ رات بمبئی ایکسپریس سے رتلام چلے جائیں اور مولوی صاحب کو ساری صورتِ حال سے مطلع کر دیں۔ وہ حافظ عبدالغفور کے ہاں مقیم ہیں۔ مولوی عبدالماجد رات کی تاریکی میں چھپتے چھپاتے اسٹیشن پر پہنچے، گاڑی میں سوار ہوئے، تو جان میں جان آئی۔ رتلام پہنچے، تو وہاں میٹنگ ہو رہی تھی۔ مولوی فضل الٰہی اُنھیں دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ عبدالماجد نے بتایا آپ کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔

مولوی صاحب نے فرمایا: "ماجد بھائی! تم آ تو گئے، لیکن اب کسی سے ذکر نہ کرنا، ورنہ اُلٹی آنتیں گلے پڑ جائیں گی۔ مجھے بچاتے بچاتے خود پھنس جاؤ گے ——" پھر کچھ ہدایات دیں۔ مولوی عبدالماجد اُسی روز واپس چلے آئے۔

یہاں پولیس کو پتہ چل چکا تھا کہ مولوی صاحب کی فرم کا ایک

تھے دار تین چار روز سے غائب ہے۔ سی آئی ڈی کے آدمی اس کا کھوج لگاتے رہے۔ کئی لوگوں سے پوچھ گچھ بھی کی پانچویں دن مولوی عبدالماجد وزیرآباد پہنچے، تو تھانے میں طلب کر لیے گئے۔ تھانیدار دیر تک تفتیش کرتا رہا۔ ان کا جواب تھا میں اپنے سسرال جلال پور جٹاں گیا تھا۔ آخر کار مولوی عبدالماجد کی گلو خلاصی ہو گئی ـــــ مولوی فضل الٰہی کے گھر کے سامنے قصابوں کا گھر تھا، وہاں سی آئی ڈی کا ایک آدمی متعین کر دیا گیا کہ مولوی صاحب آئیں، تو فوراً اطلاع کرے۔ وہ دو مہینے تک وہاں رہا اور مولوی صاحب کے ہاں آنے جانے والے ہر شخص پر نظر رکھی۔

○

مولوی فضل الٰہی نے اطلاع ملتے ہی ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ حافظ عبدالغفور احاطہ بمبئی میں جماعت کے امیر تھے، انھوں نے دو ہزار روپے مجاہدین کے لیے دیے اور ایک ملازم ضلع ہزارہ کا اُن کے ساتھ کر دیا۔ مولوی صاحب نے نازک حالات کے پیش نظر بڑی احتیاط سے سفر کیا۔ دو ہزار روپے ہزاروی ملازم کے سپرد کر دیے۔ وہ انسان کی نفسیات سے واقف تھے۔ جانتے تھے اثنائے سفر میں اُس کا دل بے ایمان ہو جائے، تو روپیہ لے کر رفوچکر ہو جائے گا، بصورتِ دیگر کچھ عجب نہیں پولیس کو رپورٹ کر کے پکڑوا دے۔

رتلام سے احمد آباد، جودھپور، حیدر آباد، سکھر ہوتے ہوئے کوئٹہ پہنچے۔ جیسے جیسے بلوچستان کے قریب پہنچتے گئے اُنھوں نے دیکھا پولیس کی نگرانی بڑھتی جا رہی ہے۔ جنکشنوں پر خفیہ پولیس کے آدمی خاصی تعداد میں متعین تھے۔ ایک جنکشن پر وہ گاڑی میں داخل ہو کر ایک ایک آدمی سے پوچھنے لگے۔ کون ہو؟ کہاں سے آ رہے ہو، کہاں کا قصد ہے؟ وہ ہر مسافر کو غور سے دیکھتے اور اگلے ڈبے میں چلے جاتے۔ مولوی صاحب نے عین وقت پر خطرہ محسوس کر لیا۔ فوراً گاڑی سے اُترے اور سامنے کی ٹوکری...

جماعت حلقہ باندھے حُقّہ پی رہی تھی ---- ان میں جا بیٹھے اور اگرچہ حُقّے کو کبھی ہاتھ نہ لگایا تھا، حُقّہ پینے لگے۔ ساری گاڑی کی پڑتال ہوگئی، مولوی صاحب کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا۔ گاڑی چلی، تو سوار ہو گئے۔

کوئٹہ پہنچنے کے بعد مولوی فضل الٰہی سرحد پار کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں لگ گئے۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا مرحلہ تھا۔ سرحدی محافظ خبردار کیے جا چکے تھے۔ کوئٹے میں چپے چپے پر خُفیہ پولیس آنے جانے والوں کی نگرانی کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ فرودگاہ سے باہر قدم رکھنا بھی خطرے سے خالی نہ رہا۔ ایک دن مولوی صاحب غسل کرنے شہر کے مضافات میں کسی مقام پر گئے۔ نل ذرا نشیب میں تھا۔ اُترنے کے لیے نیچے دیکھا، تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔ سی آئی ڈی کا جو انسپکٹر جالندھر میں ان پر متعین تھا، نل کے نیچے بیٹھا نہا رہا تھا۔ مولوی صاحب اُلٹے پاؤں واپس آ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا حکومت نے چاروں طرف مکمل جال بچھا دیا ہے جس سے بچ کر نکلنا آساں نہ تھا۔ فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب کی ڈاڑھی بڑی لمبی تھی، اپنے ہم سفر سے کہا: "میری ڈاڑھی تراش کر چھوٹی کر دو"۔ ---- "توبہ، توبہ" اس نے جواب دیا "حضرت! مجھ سے تو یہ گستاخی نہیں ہو سکتی"۔ ---- مولوی صاحب نے قینچی اور شیشہ گٹھڑی سے نکالا، خود ڈاڑھی چھوٹی کی، کٹے ہوئے بال ہاتھ میں لے کر آسمان کی طرف مُنہ کیا اور کہا: "میرے مولا! یہ بال تیرے نبیؐ کی سُنّت سمجھ کر تیری رضا کے لیے رکھے تھے، اب تیری رضا ہی کے لیے کاٹ رہا ہوں"۔ پھر بال اسی درخت کے نیچے دفن کر دیے۔ پہاڑوں اور جنگل سے گزرتے پاپیادہ کوئٹے سے پچھلے اسٹیشن پر آئے، گاڑی میں سوار ہوئے اور سکھر کے راستے ملتان روانہ ہو گئے ---- ملتان چھاؤنی اسٹیشن سے ایک اسٹیشن ادھر، شیر شاہ جنکشن پر اُتر گئے۔ ملتان اس لیے نہ گئے کہ بڑے شہروں میں خُفیہ پولیس کے تعاقب کا زیادہ خطرہ تھا

یہاں گاڑی بدلی اور ریاست گُنڈیاں، کیمبل پور پہنچے۔ اس اثنا میں ہزاروی ہم سفر نے دغا دی۔ چپکے سے کِھسک گیا۔ دو ہزار روپیہ اور ٹکٹ اُسی کے پاس تھے۔ توکّل برخُدا، پلیٹ فارم کے دُوسری طرف گاڑی سے اُترے اور باہر نکل گئے۔ کسی نے ان کی طرف نہ دیکھا۔

مولوی صاحب بالکل خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔ روٹی تک کھانے کو پاس نہ تھی۔ اللہ کا نام لے کر پیدل ہی ہری پور ہزارہ کی طرف چل کھڑے ہُوئے۔ ہری پور سے کوئی دو میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا گاؤں ڈھیری ہے۔ یہاں ایک مجاہد بھائی مولوی اسمٰعیل رہتے تھے۔ اُن کا گھر گویا ایک طرح کا سفری کیمپ تھا۔ آنے جانے والے مجاہدین انہی کے ہاں ٹھہرتے ــــــ مولوی صاحب کی منزلِ مقصود بھی یہی پڑاؤ تھا۔ پہاڑی راستہ سخت دشوار گزار تھا۔ اس پر بھوک اور پیاس نے نڈھال کر دیا۔ دو دِن سفر کرتے ہوئے چلے تھے۔ دوپہر کے وقت ایک بُوڑھا کسان اپنے کھیتوں میں درخت کے نیچے بیٹھا نظر آیا۔ مولوی صاحب نے پاس جا کر پانی مانگا۔ اُس نے پُوچھا: "کون ہو؟"

فرمایا: "درویش، مسافر۔"

"کہاں جا رہے ہو؟"

"ہری پور۔"

نقاہت کی وجہ سے مولوی صاحب کی آواز بمشکل نکل رہی تھی۔ زمیندار نے پُوچھا: "آپ بھُوکے تو نہیں ہیں؟"

مولوی صاحب نے کہا: "دو دن سے بھُوکا ہُوں۔"

بُوڑھے نے انھیں پانی بھی پلایا اور روٹی بھی کھلائی۔ کھا پی کر پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ چوتھے دِن ڈھیری پہنچے، تو پاؤں سُوج کر پھٹ چُکے تھے۔ کچھ دن مولوی اسمٰعیل کے پاس رہے۔ اُنھوں نے مرہم پٹّی کی۔ زخم مندمل ہُوئے، تو سرحد پار کرنے کی فکر دامن گیر ہُوئی۔ مولوی اسمٰعیل ــــ دِن رات

موقع کی تلاش میں رہتے، لیکن کوئی صورت نظر نہ آتی۔ سرحد پر پہرے وغیرہ کے انتظامات بہت سخت کر دیے گئے تھے۔ آخر مولوی فضل الٰہی صاحب پاپیادہ لارنس پور آئے اور وہاں سے گاڑی میں سوار ہو کر پشاور۔

رات کا وقت تھا۔ گاڑی سے اُتر کر سیدھے خواجہ عبدالعزیز کے ہاں پہنچے۔ خواجہ صاحب، اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ پہلے پہل ان کے والد خواجہ اللہ دتا، مجاہدین کی تحریک سے وابستہ ہوئے۔ پھر اعانتِ مجاہدین کی یہ سعادت، بیٹے کو باپ سے ورثے میں ملی۔ اس راہ میں پیش آنے والے کسی خطرے کو خاطر میں نہ لاتے۔ مولوی صاحب نے خواجہ صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا ——— تو وہ سوئے پڑے تھے۔ اُٹھے، دروازہ کھولا، دیکھا ایک چھوٹی سی ڈاڑھی والا شخص سامنے کھڑا ہے۔ پہچان نہ سکے۔ آخر خود مولوی صاحب نے اپنا تعارف کرایا۔ خواجہ صاحب گرمجوشی سے لپٹ گئے۔ قاضی کوٹ میں اسلحہ کی برآمدگی، قاضی برادران کی گرفتاری اور مولوی صاحب کو گرفتار کرنے کی تگ و دَو کی خبریں وہ پڑھ چکے تھے۔ اُن کا خیال تھا مولوی صاحب اب تک جو حکومت کے ہاتھ نہیں آئے، تو ضرور سرحد پہنچ چکے ہیں۔ اب اپنے سامنے کھڑا پایا، تو حیرت زدہ رہ گئے۔ پوچھا: "حضرت! آپ کہاں؟" مولوی صاحب نے اشارے سے چُپ رہنے کو کہا۔ اندر گئے، تو دشت نوردی کی ساری داستان کہہ سُنائی۔ مولوی صاحب، خواجہ عبدالعزیز کے گھر کئی روز رہے۔ خواجہ صاحب تنہا رہتے تھے۔ صبح ڈیوٹی پر جاتے، تو مکان کو تالا لگا جاتے تاکہ کسی کے دِل میں شبہہ کا کانٹا نہ چُبھے۔ رات کے وقت لَوٹتے، تو دن بھر کی خبریں گوش گزار کرتے۔ اس دوران میں خواجہ صاحب نے مولوی صاحب کی، جنھیں ہندوستان میں مجاہدین کے امیر کا مقام حاصل تھا، جس طرح خدمت کی اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نصب العین میں کتنے مخلص تھے۔ خواجہ صاحب، مولوی صاحب کی تمام ضروریات پوری

کرتے ـــــــ حتیٰ کہ ان کی اجابت تک اُٹھاتے اور اندھیرے میں باہر پہنچا آتے۔

خواجہ صاحب کی بھاگ دَوڑ سے آخر کار سرحد پار کرنے کا بندوبست ہو ہی گیا۔ پشاور سے آپ چارسدہ پہنچے۔ وہاں خواجہ صاحب کے ایک دوست نے تانگے کا انتظام کر رکھا تھا۔ مولوی صاحب نے کوچبان کے کپڑے خود پہن لیے اور کوچبان کو اپنے کپڑے دے دیے۔ خُود کوچبان بن گئے اور تانگے والا ان کی جگہ مسافر۔ راستے میں ایک دو جگہ پُوچھ گچھ بھی کُچھ لوگوں نے کی۔ انھیں تانگے والا اِدھر اُدھر کی باتیں ہانک کر ٹال دیتا۔ خود مولوی صاحب کوچبان کے بھیس میں چُپ چاپ بیٹھے رہتے۔ ان کی طرف کسی کا دھیان نہ گیا۔ اس طرح ۷ اراگست کو آزاد علاقے میں پہنچ گئے۔

○

عَدالت کے کٹہرے میں

قاضی کوٹ، اخبارات کی شہ سُرخیوں کا عنوان بنا ہُوا تھا۔ قاضی عبیداللہ کو حکومت نے وعدہ معاف گواہ بنا لیا تھا۔ خان بہادر اور قاضی عبیداللہ کے بیانات سے تحریک کے بیسیوں افراد کے نام سامنے آئے۔ اِن سب کو گرفتار کر کے پھانسنے کی کوشش کی گئی۔ خواجہ عبدالعزیز (لاہور) مولوی الٰہی بخش (بھبانوالہ) محمّد رمضان، مستری ابراہیم اور مولوی عنایت اللہ اثری (وزیر آباد) حاجی بشیرالدین جُوتے بنانے والے اور خلیفہ اسحاق (دہلی) پکڑے گئے۔ ان پر حوالات میں بڑے ظُلم توڑے گئے، بھُوکا پیاسا رکھا گیا، دھوپ میں کھڑا کیا گیا، جسمانی تشدد سے بھی محفوظ نہ رہے؛ تاہم انھوں نے کوئی بات مان کر نہ دی۔ شرکتِ جُرم کا کوئی ثبوت نہ مِلا، تو انھیں چھوڑ دیا گیا۔ مقدمے میں جو لوگ براہِ راست ملوّث تھے ان میں سے اکثر غائب تھے۔ مولوی فضل الٰہی

تحریک کے آزاد مرکز میں پہنچ چکے تھے۔ وہاں سے انھوں نے اخبارات کے نام باقاعدہ خبر بھجوادی تھی کہ میں آزاد علاقے میں پہنچ گیا ہوں، میرے گھر والے مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کریں۔ محمد حسین عرف محمد عمر، سلیمان عرف ایوب، غلام محمد عرف محمد کا کچھ پتہ نہ تھا۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی، لیکن محمد عمر کے سوا باقی ملزم آخر وقت تک ہاتھ نہ آئے۔

مقدمے کی ابتدائی سماعت خان غلام حسن خان مجسٹریٹ درجۂ اوّل گوجرانوالہ نے کی۔ سماعت کے روز کچہری لوگوں سے بھر جاتی۔ دُور دُور سے لوگ رُوداد سُننے کے لیے آتے۔ استغاثے کی شہادتیں کئی دن جاری رہیں۔ جماعتی کارکنوں کے لیے خان بہادر اور قاضی عبیداللہ کی گواہی بہت حیرتناک تھی۔ خان بہادر خاصا پُرانا اور مخلص کارکُن تھا۔ اس نے بڑی بڑی خطرناک مہموں میں حصّہ لیا تھا۔ یہی حال قاضی عبیداللہ کا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی مولوی فضل الٰہی کے زمانۂ اسیری میں ان سے خط کتابت کرتے ہُوئے گرفتار ہو چُکے تھے۔ سولہ سال سے جماعت کا کام کر رہے تھے۔ ان کے اخلاص اور عہد کی سچّائی کا سب کو اعتراف تھا، لیکن اب وہ گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ایسی گواہی دے رہے تھے جس سے جماعت پر شدید ضرب پڑتی تھی۔ ایک اور بات جس نے سنسنی پھیلادی، مولوی ولی محمّد فتوحی والے اور اُن کے بعض مُریدوں کی گواہیاں تھیں۔ مولوی ولی محمّد تحریکِ مجاہدین کے سرگرم کارکن رہے تھے اور اُن کی دعوت و تبلیغ سے سینکڑوں نوجوان رضا کار بن کر اسمست گئے ـــــ مگر کچھ مدت پہلے وہ جماعت سے الگ ہو چُکے تھے اور اب اُن کی گواہی ایک معاند کی گواہی تھی۔ خالص سرکاری گواہوں میں سی آئی ڈی کے انسپکٹر میر فضل امام کی شہادت شاہکار تھی۔ اس نے مقدمے کو ایک وسیع سازش کا جزو بتایا جس میں امیر امان اللہ خان (فرمانروائے افغانستان)، جنرل نادر خاں (جو بعد ازاں بادشاہ بنے)، مولوی عبدالرحیم عرف محمد بشیر، مولانا عبیداللہ سندھی اور

امیر نعمت اللہ (امیر مجاہدین) شامل تھے۔ ایک اور سرکاری افسر کی گواہی، مجاہدین کے حلقے میں دھماکے سے کم نہ تھی۔ اس نے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ بم اور اسلحہ اسمست سے آیا ہے اسی ساخت کا ایک بم عدالت میں پیش کیا اور دعویٰ کیا کہ مجاہدین کے امیر نعمت اللہ کی انگریزوں سے خفیہ مصالحت ہو چکی ہے۔ یہ بم انھوں نے انگریزی حکومت کو بھیجا تھا اور اطلاع دی تھی کہ اس قسم کے بم ہندوستان بھیجے جا رہے ہیں۔ عدالت میں پیش ہونے والی گواہیاں ملزموں اور مجاہدین کے حوصلے پست کر دینے والی تھیں، لیکن انھوں نے انگریزی حکومت کا یہ وار بڑے صبر و استقامت سے برداشت کیا اور اپنے نصب العین کی صداقت پر ان کا یقین ہزار کوشش کے باوجود متزلزل نہ ہوا۔

○

مقدمہ ابھی چل ہی رہا تھا کہ محمّد حسین عرف محمد عمر پشاور سے پکڑا ہوا آیا۔ اٹھائیس اُنتیس سال کا یہ جوان جب عدالت میں پیش ہوا، تو کھچا کھچ بھرے ہوئے کمرے میں ہلکی سی ہلچل مچ گئی۔ ہر شخص اُسے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ جس وقت پنجاب میں گرفتاریاں ہو رہی تھیں، محمّد حسین چمرکنڈ میں تھا۔ انھی دنوں ایک لمبے اور مضبوط قد کاٹھ کا نوجوان چمرکنڈ پہنچا جہاں وہ جلد ہی مجاہدین میں گھل مل گیا۔ کسی کو خیال نہ آیا کہ چھان بین کی جائے یہ کون شخص ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ دراصل مجاہدین نے انٹیلی جنس کے شعبے کی طرف توجہ ہی نہ دی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں بھی اسی کمزوری کے طفیل تحریک پر مصائب کے طوفان اُمڈے اور اب پھر وہی تاریخ دُہرائی جا رہی تھی۔ اس شخص کو انگریزوں نے مجاہد کے بھیس میں بھیجا تھا۔ وہ کئی مہینے چمرکنڈ میں رہا اور بھید معلوم کرتا رہا۔ مجاہدین ضرورت کا سامان خریدنے اکثر پشاور اور دوسرے سرحدی شہروں میں آتے رہتے تھے۔ اس مرتبہ محمّد حسین کی ڈیوٹی لگی۔ اُس کے ساتھ وہ انگریزی جاسوس بھی رُکنِ جماعت کی حیثیت سے پشاور آیا۔ سامان خرید چکے اور واپسی

کا وقت ہُوا، تو جاسُوس کو جیسے کوئی بات یاد آ گئی۔ کہنے لگا: "عمر بھائی! ذرا ٹھہرو، مَیں ایک آدمی سے مل آؤں۔"

"ہاں، مگر جلد آنا۔" محمد حسین نے کہا۔

"بس یہی پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔" وہ بولا اور لمبے لمبے قدم اُٹھاتا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

محمد حسین، سازش سے بے خبر اطمینان کے ساتھ سامان کے پاس بیٹھا رہا۔ بیس منٹ گزُرے، پھر آدھا گھنٹہ..... وہ اپنے خیالات میں گم ساتھی کا انتظار کر رہا تھا کہ اچانک اُس نے دیکھا پولیس نے اُسے گھیر لیا ہے۔ نہ تو بھاگنا ممکن تھا اور نہ اس کا موقع۔ پولیس نے گرفتار کر لیا۔

انھی دِنوں ہندوستان میں جگہ جگہ بموں کے دھماکے ہو رہے تھے۔ ایک بم ڈِین ہوٹل پشاور میں گرا تھا، ایک رسال پُور چھاؤنی میں۔ ایک بم راولپنڈی میں پولیس کے ایک بڑے افسر کی کوٹھی پر گرا۔ ان واقعات کا ذمہ دار، مجاہدین کو گردانا گیا اور محمد حسین کو سات سال قید بامشقت کی سزا دے دی گئی۔

محمد حسین بے یار و مددگار تھا۔ اُس کے پاس روپیہ تھا نہ کوئی شخص اُس کا واقف اور شناسا کہ دفاع کا خرچ برداشت کرتا۔ مجاہدین کے سوا کسی نے اس کی گرفتاری اور سزا کو اہمیت نہ دی۔ اسے محض ایک عام سا واقعہ سمجھا۔ مجاہدین کے لیے اس کا مقدمہ لڑنا اور اپیل کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ آخر خیراتی فنڈ سے اپیل کا فیصلہ ہُوا۔ قاعدے کی رُو سے محمد حسین کی نیک چلنی کا تصدیق نامہ گوجرانوالہ پولیس سے حاصل کرنا ضروری تھا۔ کاغذات گوجرانوالہ پہنچے، تو پولیس کو وہ شکار ہاتھ آ گیا جس کی اُسے تلاش تھی اور جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی۔ پہلی سزا کے خلاف اپیل تو وہیں دھری رہ گئی، انگریزی حکومت کے شکاری کُتے فوراً پشاور پہنچے اور محمد حسین کو پابجولاں دُوسرے ساتھیوں کے دوش بدوش عدالت کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا۔

۲۳ر دسمبر ۱۹۲۰ء کو خان غلام حسن خان نے ملزم سیشن سپرد کر دیے۔ ۱۴ر جنوری سے رائے بہادر گنگا رام سیشن جج کی عدالت میں سماعت شروع ہوئی۔ ملزموں کی طرف سے شیخ دین محمد نے وکالت کی۔

۲۱ر اپریل کو سیشن جج نے فیصلہ سنایا۔ عدالت کا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سیشن جج کی آواز بلند ہوئی تو عدالت میں سناٹا چھا گیا "خان بہادر اور محمد حسین کو زیرِ دفعہ ۱۲۰ اے بی - ۳۰۲ تعزیراتِ ہند سات سال قید، ایک ہزار روپیہ جرمانہ اور زیرِ دفعہ قانونِ اسلحہ سات سال قید با مشقت دی جاتی ہے۔"

قاضی عبدالرؤف کو بھی انہی دفعات کے تحت چار چار سال قید با مشقت دی گئی۔

خان بہادر، محمد حسین اور قاضی صاحب تینوں نے سزا کا اعلان بڑے حوصلے سے سنا۔ انبالہ اور عظیم آباد کے مقدموں کے پیشِ نظر خیال یہی تھا حبسِ دوام بعبورِ دریائے شور سے کم سزا نہیں ملے گی۔

سزاؤں کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ ۱۰ر اگست کو جسٹس مارٹینو نے فیصلہ سنایا۔ اُس نے سزائیں بحال رکھیں، البتہ حکم دیا کہ خان بہادر اور قاضی عبدالرؤف کی سزائیں ایک ساتھ شروع ہوں گی۔

○

یہ پُر اسرار بندے

قاضی کوٹ کا مقدمہ محدود سا مقدمہ تھا، مگر مجاہدین کی تحریک پورے ہندوستان میں سرگرمِ عمل تھی۔ ہر علاقے کا نظام الگ تھا تاکہ اگر کسی علاقے میں تحریک کے کسی لیڈر اور [illegible] پر اُفتاد پڑے، تو دوسرے علاقے کے لوگ متاثر نہ ہوں، تاہم تمام علاقوں کے رہنما ایک دوسرے سے رابطہ رکھتے تھے۔ وہ تبلیغی کانفرنسوں، جلسوں اور معاشرتی اور دینی مدرسوں

کی سالانہ تقریبات میں شریک ہوتے۔ جلسوں میں شرکت کرنے والے نوجوانوں پر نظر رکھتے اور جو "کام" کا دکھائی دیتا اُس کو منتخب کر لیتے، اس کی فکری و عملی تربیت کرتے، بنوٹ اور سپاہیانہ فنون سکھاتے۔ ان تربیت یافتہ نوجوانوں میں سے اکثر اسمست چلے جاتے اور جنگ وجہاد میں حصّہ لیتے۔ بہت سے ہندوستان ہی میں مختلف مقامات پر متعین کر دیے جاتے۔ ہر ایک کو اُس کی صلاحیتوں کے مطابق کام سونپا جاتا۔ ہر شخص احکام شریعت کا پابند اور اللہ کی راہ میں مر مٹنے کے جذبے سے سرشار ہوتا۔ انگریز کے سائے میں زندگی بسر کرنے کو معصیت اور اس کی حکومت ختم کر کے اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدّوجہد کو فرض عین سمجھتا۔

یہ لوگ دیانت و امانت میں اپنی مثال آپ تھے۔ خود بہت تنگی تُرشی سے گزر بسر کرتے، مصیبتیں اُٹھاتے، لیکن ہزاروں روپے پاس ہونے کے باوجود ایک دمڑی بھی اپنے اُوپر صرف نہ کرتے۔ اکثر محنت مزدوری کر کے اپنا سفر خرچ پُورا کرتے۔ حافظ عنایت اللہ اثری کو ایک رقم اسمست پہنچانے کا کام سونپا گیا۔ رقم اشرفیوں کی صُورت میں تھی۔ کوئی دو اڑھائی سیر سونا بنتا تھا۔ حافظ صاحب نے آمد و رفت کا تمام خرچ اپنی جیب سے کیا۔ واپس آئے تو اُن کے پاس صرف اتنے پیسے تھے کہ ہری پُور سے جہلم تک کا ریلوے ٹکٹ خرید سکیں۔ جہلم پہنچ کر ایک درزی کی دُکان پر دو چار روز کام کیا۔ ٹکٹ کی رقم فراہم ہو گئی تو وزیر آباد آئے۔

رقوم اور خطوط وغیرہ پہنچانے کا کام بڑا کٹھن تھا۔ قدم قدم پر جال بچھے تھے۔ خُفیہ پولیس کے سپاہی تعاقب میں رہتے اور ان سے بچ نکلنا بڑی جرأت، دلیری، ہوشیاری اور ذہانت کا کام تھا۔ مجاہدین، عام درویشوں، طالب علموں اور فقیروں کے بھیس میں سفر کرتے، بسا اوقات سادھوؤں کا بھروپ بھی بھر لیتے۔ جو علاقے راستے میں پڑتے وہاں کا لباس، زبان اور

طرزِ معاشرت اختیار کر لیتے۔ زبان نہ آتی، تو گونگے بن جاتے۔ کبھی یورپین لباس پہن لیتے، کبھی کالج کے طالب علم بن جاتے، کبھی سرحد کے رئیس زادوں کا لباس زیب تن کر لیتے۔ عموماً رات کے وقت سفر کرتے اور دن میں محفوظ مقامات پر ٹھہر جاتے۔ ان لوگوں کی جرأت و ہمت کے عجیب و غریب واقعات سننے میں آتے۔ ایک مرتبہ ایک قاصد ریل گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ ایک اسٹیشن پر اچانک اُس نے محسوس کیا اُس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ ایک سفید پوش تو اُس کے پہلو میں آ کر بیٹھ گیا۔ قاصد نے جیب میں سے چاقو نکالا اور نظر بچا کے اپنی دائیں آنکھ نکالی اور باہر پھینک دی۔ پھر رومال سے خون پونچھ کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ خفیہ پولیس کے سپاہی نے نشست پر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد اُس کا حلیہ دل ہی دل میں اپنے کاغذات میں درج حُلیے سے ملانا چاہا، لیکن جو شخص اُس کے پاس بیٹھا تھا اُس کی ایک آنکھ ہی نہ تھی۔ اپنا سا مُنہ لے کر رہ گیا۔

سرحدی مرکز یا ہندوستان سے جب بھی کوئی روانہ ہوتا، تو جب تک وہ منزلِ مقصود پر نہ پہنچ جاتا، گرفتاری کا دھڑکا لگا رہتا۔ بعض قاصدوں کے متعلق تو حیرت ناک واقعات مشہور تھے۔ انھی میں ایک قاصد عبدالقادر تھا۔ وہ کئی مرتبہ گرفتار ہوتے ہوتے بچا اور ایک بار تو پکڑا بھی گیا۔ وہ پورے ہندوستان کا چکر کاٹ کر آ رہا تھا۔ اس کے پاس ہندوستان کے بعض بڑے بڑے لیڈروں کے خطوط بھی تھے اور نوٹوں کی صورت میں ہزاروں روپے کی رقم بھی۔ خطوط اور نوٹ اس نے کوٹ کے استر میں سلوا رکھے تھے۔ ہری پور میں وہ کئی روز ٹھہرا رہا۔ مولوی فضل الٰہی کے بڑے بھائی محمد الٰہی، ہری پور کے اسٹیشن ماسٹر تھے۔ انھوں نے مجاہدین کے لیے ایک الگ تھلگ مکان لے رکھا تھا۔ آنے جانے والے مجاہدین وہاں قیام کرتے۔ محمد الٰہی صاحب ان کی خاطر تواضع کرتے اور پھر سرحدِ آزاد کی طرف جانے والوں کی

سواری اور رہبر کا انتظام کر دیتے۔

عبدالقادر ہری پور میں چند روز ٹھہر کر آگے روانہ ہوا۔ رات کے اندھیرے میں آخری انگریزی چوکی کے پاس سے گزرا اور دربند پہنچا۔ دربند دریائے اٹک کے کنارے ریاست امب کا مرکز تھا۔ نواب امب کا وزیر مجاہدین کا خفیہ حامی تھا، اس لیے یہاں ان سے کوئی پوچھ گچھ ہوتی نہ کسی قسم کی نگرانی لو روک ٹوک۔ مجاہدین کسی خرخشے کے بغیر ریاست میں سے گزرتے۔ صبح کا وقت تھا۔ عبدالقادر کشتی کے انتظار میں گھاٹ پر بیٹھا تھا کہ گورا فوج کے چند سپاہی گشت کرتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ ولایتیوں کے درمیان ایک اجنبی کو بیٹھا دیکھ کر چونکے اور پکڑ کر حوالات میں ڈال دیا۔ کوٹ وہ اس سے پہلے ہی اتروا کر لے چکے تھے۔ عبدالقادر کی گرفتاری کی خبر عصر کے وقت اسمست پہنچی۔ فکر و تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ عبدالقادر بڑے اہم خطوط لے کر آرہا تھا۔ رمضان کے دن تھے۔ افطار کے وقت مجاہدین نے بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑا کر اُس کی رہائی کی دُعا مانگی۔

ادھر گوروں نے کوٹ تو عبدالقادر سے لے لیا، مگر اس کی تلاشی نہ لی۔ عبدالقادر کو بھوکا پیاسا حوالات میں بند ہوئے اکیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ رات کا پچھلا پہر تھا ——— گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا کہ کھٹکے سے اُس کی آنکھ کھل گئی۔ کیا دیکھتا ہے حوالات کا دروازہ کھلا اور کوئی شخص اندر داخل ہوا۔ قریب آیا، تو وہ ایک بزرگ تھے۔ لمبی سفید ڈاڑھی، چمکتا ہوا نورانی چہرہ۔ اُسے جاگتے دیکھ کر بولے: "اٹھو، یہ اپنا کوٹ لو۔ یہاں سے نکال دینا میرا کام تھا، اب بھاگ کر بچ نکلنا تمھارا کام ہے۔" عبدالقادر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹ لیا اور دریا کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھا۔ ایک جگہ سے دریا پایاب تھا اور رفتار اتنی سست کہ معلوم ہوتا پانی کی رَو یہاں پہنچتے پہنچتے سو گئی ہے۔ پاٹ بھی کم چوڑا تھا۔ عبدالقادر نے یہیں سے

دریا عبور کیا۔ مغربی کنارے پر پہنچا، تو مشرقی اُفق پر سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ شام کے وقت وہ اسمست پہنچ گیا۔ ساری بستی میں حیرت بھری مسرت کی لہر دوڑ گئی اور جب عبدالقادر نے اپنی رہائی کی داستان سُنائی، تو حیرت کی جگہ دُعا کی قبولیت اور نصرتِ خداوندی پر یقین نے لے لی۔ اَللہ اپنے بندوں کی مدد ایسے عجیب و غریب طریقوں سے کرتا ہے کہ بظاہر مادّی پیمانے اس کی توجیہہ سے قاصر نظر آتے ہیں۔ مولانا عبدالقادر قصوری کے صاحبزادے مولوی محمد علی ان دنوں وہیں اسمست میں تھے انھوں نے بتایا کہ رات مَیں نے خواب میں دیکھا کہ بھائی عبدالقادر رہا ہو کر آ گئے ہیں۔

اسی قسم کے ایک تجربے سے مولوی فضل الٰہی صاحب کے دستِ راست صُوفی عبداللہ گزرے۔ صُوفی صاحب ان کے انتقال کے بعد مجاہدین کے امیر منتخب ہوئے۔ یہ جماعت ابھی تک علامتی طَور پر زندہ ہے۔

خود کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ صُوبہ بہار کے ایک چھوٹے سے قصبے ڈھاکہ سے پیر زین العابدین سے پانچ ہزار روپے لے کر آ رہا تھا۔ انھوں نے روپے اپنے ایک ملازم کے سامنے دیے تھے۔ ڈھاکہ سے ریلوے اسٹیشن پانچ چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ اپنے خیالات میں مستغرق چلے جا رہے تھے کہ دو آدمی بھاری بھر کم لاٹھیاں ہاتھوں میں لیے آتے دِکھائی دیے۔ اُن کی وضع قطع اور تیور دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ پھر اچانک یُوں معلوم ہُوا کہ مولوی فضل الٰہی صاحب تشریف لے آئے ہیں، ان کے ہاتھ میں بھی لاٹھی ہے، آتے ہی ان پر پل پڑے اور صُوفی صاحب سے فرمایا کہ بھاگ کر اسٹیشن پر پہنچ جاؤ۔

تحریک سے وابستہ حضرات، خطرات کے علی الرّغم جماعت کو روپیہ فراہم کرتے۔ تقریباً ہر شخص نے اپنی تنخواہ اور آمدنی کا ایک حصّہ اس مقصد کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ قادر والا ضلع فیروز پُور کے مولوی کرم الٰہی

گورنمنٹ ہائی اسکول لدھیانہ میں عربی کے ٹیچر تھے۔ وہ اپنی تنخواہ میں سے تھوڑی سی رقم اپنی گزر بسر کے لیے رکھ لیتے باقی سب مجاہدین کو بھجوا دیتے۔ ان کے بعض ساتھی بھی اپنا حصہ ان کے حوالے کرتے۔ ایک بار پولیس نے تھانے میں بلا کر پوچھ گچھ بھی کی، لیکن اس کے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ خاصی مدت نگرانی ہوتی رہی اس کے باوجود مولوی کرم الٰہی نے اپنا معمول جاری رکھا۔

فیروز پور میں حاجی نور محمد کی صرافے کی دکان تھی۔ وہ مجاہدین کے لیے بڑی بڑی رقمیں جمع کر کے بھیجا کرتے تھے۔ دکان کا ایک کمرہ جماعت نے قاصدوں اور اسمست اور چمرکنڈ آنے جانے والے رفقا کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ وہ جرنیلی سڑک پر سفر کرتے ہوئے یہاں رکتے، چند روز آرام کرتے، اعانت لیتے اور آگے چل کھڑے ہوتے۔ ان مہمانوں کے کھانے اور دوسری ضروریات کا انتظام بھی حاجی صاحب خود کرتے۔ ایک مرتبہ گرفتار بھی کر لیے گئے، لیکن پولیس کوئی واضح ثبوت مہیا نہ کر سکی، چنانچہ چھوڑنا پڑا۔

یہ لوگ جب تحریک کے امیر یا کسی کارکن کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کرتے تو پھر زندگی کی ہر پیاری متاع سے دستکش ہو جاتے۔ گھر بار، کاروبار، زمینداره، بال بچے غرض دنیا کی ہر شے چھوڑ دیتے۔ مولانا عبدالرحیم جنھیں ہجرت کے بعد ملا محمد بشیر کے نام سے شہرتِ دوام ملی، جب اسمست کے لیے روانہ ہوئے تو کتابوں کا بہت بڑا کاروبار کر رہے تھے۔ بعض اوقات ایک ایک دن میں چار چار پانچ پانچ سو کی آمدن ہو جاتی تھی، لیکن اس سب کو تحریک سے وابستہ ہو کر خطرے میں ڈال دیا اور جب ہجرت کا مرحلہ درپیش ہوا تو اس طرح دامن جھاڑ کر اٹھے کہ پھر کبھی خیال تک دل میں نہ لائے۔ چودھری اللہ داد سنبھلہ ضلع سیالکوٹ کے باشندے تھے۔ جوانی کے دن تھے کہ ہجرت کا ارادہ کیا۔ صرف چھ سات برس کا ایک بچہ تھا۔

بیوی سے ارادے کا ذکر کیا تو وہ رفاقت پر آمادہ نہ ہوئی۔ انھوں نے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا۔ عزیز و اقارب اور خود اہلیہ نے کہا کہ طلاق نہ دو، ویسے چلے جاؤ، لیکن وہ بیوی کے حقوق گردن پر لے کر ہجرت اور جہاد کی راہ پر گامزن ہونا نہیں چاہتے تھے! چنانچہ طلاق دے دی۔ بچے کو ساتھ لیا کہ اُسے بھی اللہ کی راہ کا سپاہی بنائیں گے اور یاغستان چلے گئے۔

اور دلیر ایسے کہ انگریز حکّام کے مُنہ پر ان کی مذمت کرتے اور ان کی حکومت کے مٹنے کی دُعائیں مانگتے۔ سوات بونیر کے ایک مولوی عبداللہ تھے جو پشاوری کہلاتے تھے۔ بڑے اچھے مقرر تھے۔ ۱۹۱۵ء میں انجمن حمایتِ اسلام کا سالانہ اجلاس ہوا۔ یہ بھی مدعو تھے۔ تقریر زور شور سے جاری تھی کہ پنجاب کا گورنر مائیکل اوڈوائر آ گیا۔ جنگِ عظیم کا زمانہ تھا۔ ترک، جرمنی کے دوش بدوش انگریزوں سے نبرد آزما تھے۔ اوڈوائر کی خوُن آشامی اگرچہ ابھی آشکارا نہیں ہوُئی تھی، لیکن مشہور تھا کہ سخت حاکم ہے۔ وہ اُردو اچھی طرح سمجھتا اور بولتا تھا، اس کے آتے ہی اسٹیج سیکرٹری نے مولوی صاحب سے تقریر ختم کرنے کی درخواست کی کہ آپ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا: بہتر، اب صرف دعا باقی ہے؛ چنانچہ ہاتھ اُٹھا کر دُعا شروع کر دی: "اے اللہ مسلمانوں کو قوتِ ایمانی دے، انھیں اسلام پر ثابت قدم رکھ، نیک عمل کرنے کی توفیق بخش...... انھیں یہ دے...... وہ دے۔" مجمع آمین آمین کہہ رہا تھا۔ پھر مولوی صاحب یکدم بولے: "اے اللہ، مسلمانوں کو حکومت کا مزا بھی چکھا دے، انگریزوں کی حکومت نہیں دینا نہ دے، رُوس ہی کی حکومت دے دے۔" مجمع نے زور سے آمین کہی اور مولوی صاحب غائب ہو گئے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ گئی اور وہ بڑی مشکل سے اُن کے چنگل سے بچ کر سرحدِ آزاد پہنچ گئے۔

رخشِ وقت رواں دواں تھا۔ قاضی کوٹ کیس کے سزا یافتگان میں سب سے پہلے قاضی عبدالرؤف چار سال کی سزا کاٹ کر رہا ہوئے۔ تین سال بعد احمد عرف خان بہادر بھی سات سال کی سزا کاٹ کر چھوٹ گیا۔ اب صرف ایک مجرمِ عشق پابجولاں، زندگی کے دِن کاٹ رہا تھا اور وہ تھا محمّد حسین عرف محمّد عمر۔

محمّد حسین ان ہزاروں کارکنوں میں سے ایک تھا جن کی مقصد سے لگن، اخلاص، سرفروشی اور استقامت نے اس تحریک کو ایک سو سال سے زائد عرصے تک سرگرمِ عمل رکھا۔ وہ کوٹ بھوانی داس، ضلع گوجرانوالہ کا رہنے والا تھا۔ باپ کا نام پیر محمّد تھا جو اپنے گاؤں کا نمبردار تھا۔ تھوڑی بہت زمین تھی جس پر خوشحالی سے گزر بسر ہو جاتی۔ پیر محمّد کتاب و سُنّت کا پابند، زاہد اور تنہائی پسند تھا۔ دارالحرب ہندوستان میں غلامی کی زندگی پر کُڑھتا رہتا۔ آخر ۱۸۹۵ء میں ہجرت کر کے مجاہدین کے مرکز چلا گیا۔ چھوٹا سا ہنستا کھیلتا پُرسکون گھرانا، کھیت، گھر بار، نمبرداری کوئی چیز بھی زنجیرِ پا نہ بن سکی۔ ایک بار وطن جو چھوڑا تو پھر واپس نہ آیا۔ اس وقت محمّد حسین صرف تین سال کا بچّہ تھا۔ دو بھائی اس سے بڑے اور ایک بہن چھوٹی تھی۔ آٹھ نو سال کا ہوا تو وہ مبلّغین کے وعظ و تذکیر سے متاثر ہوا۔ عمر کے ساتھ ساتھ تحریک سے وابستگی بڑھتی چلی گئی۔ ۱۲-۱۹۱۱ء میں اُس نے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ بڑے بھائیوں کو اُس نے بے خبر رکھا کہ کہیں وہ اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائیں، البتّہ چھوٹی بہن کو اپنا رازدار بنایا۔ اُس نے اپنا زیور زادِ راہ کے طور پر اُسے دیا۔

مرکز پہنچنے کے بعد اس کا جماعتی نام محمّد عمر رکھا گیا اور اُسے ڈاک لانے لے جانے اور ہندوستان سے روپے اور آدمی مرکز میں پہنچانے کا کام سونپ دیا گیا۔ محمّد حسین آٹھ نو سال تک یہ جانکاہ فرض بڑی خوش اسلوبی کے

ساتھ انجام دیتا رہا۔ بارہا گرفتاری کے خطرے سے دوچار ہُوا، مگر اپنی ذہانت سے چکمہ دے کر نکل گیا۔ ذہانت اور طاقت کا یہ مقابلہ آخر کب تک جاری رہ سکتا تھا؟ انگریزوں نے خُفیہ پولیس کا جو جال بچھا رکھا تھا، ایک روز محمّد عمر اُس کے حلقوں میں اُلجھ کر گرفتار ہو گیا۔ قاضی کوٹ کے مقدمے میں محمّد حسین کو دو مختلف الزامات کے تحت سات سات سال کی سزا ہُوئی۔ ادھر پشاور کی عدالت نے بھی اُسے بم گرانے کے الزام میں سات سال قیدِ بامشقّت کی سزا سُنا دی۔ گویا اکّیس سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ شیخ دین محمّد نے ہائی کورٹ میں محمّد حسین کا مقدمہ لڑا، تو قاضی کوٹ کے کیس میں دی جانے والی دونوں سزائیں بیک وقت شروع کرنے کا حکم ہُوا۔ اس طرح مجموعی سزا چودہ سال رہ گئی اور جرمانہ معاف ہو گیا۔

آخری فیصلہ ۱۹۲۳ء میں ہُوا اور محمّد حسین کو دُور دراز کے جیل خانوں میں بھیج دیا گیا۔ اس طرح رشتہ داروں سے مُلاقات کی صُورت بھی جاتی رہی۔ پُورے زمانۂ قید میں اُس کے صرف تین خط بہن بھائیوں کو ملے۔ ۱۹۳۱ء میں اس کی بائیں ران میں درد شروع ہُوا جو ہڈّی کا ناسُور بن گیا۔ ڈاکٹر کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہُوا اور اُس کے لیے چلنا پھرنا مشکل ہو گیا۔ جیل کے ضوابط کے مطابق دس سال میں اُسے دو سال کی رعایت مِل چُکی تھی اور اب صرف دو سال کی قید باقی تھی۔ حکومت نے جب دیکھا کہ مرض لاعلاج ہو چُکا ہے اور قیدی کا بچنا مشکل ہے تو اُسے گوجرانوالہ جیل منتقل کر دیا اور وہاں سے کوٹ بھوانی داس پہنچا دیا۔ اب وہ چلنے پھرنے سے تقریباً معذور ہو چُکا تھا، لیکن اس کے باوجود اس پر یہ پابندی لگا دی گئی کہ سُپرنٹنڈنٹ پولیس کی تحریری اجازت کے بغیر گاؤں سے باہر نہ جائے اور ہر ہفتے قلعہ دیدار سنگھ میں حاضری کی رپورٹ دے۔ ہر حال میں صابر و شاکر محمّد حسین نے ان احکام کی تعمیل کی۔ یہاں تک کہ ناسُور پھٹ گیا اور وہ ہلنے جُلنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اب حکم ہُوا کہ گاؤں کے چوکیدار اور نمبردار اس کی موجودگی کی خبر دیتے رہیں۔ آخر ستمبر ۱۹۳۲ء میں صدق و اخلاص اور صبر و استقامت کا یہ پیکر جاں بحق ہو گیا۔

اِنسپکٹر پولیس نے موقع پر جا کر مرنے کی تصدیق کی، تب کہیں جا کر تدفین عمل میں آئی۔

○

جن کارکنوں کو برِصغیر کے اندر رہ کر کام کرنا ہوتا تھا ان کے شب و روز کتنے کٹھن تھے اور وہ کس طرح تلوار کی دھار پر کام کرتے تھے اُس کی ایک ہلکی سی جھلک عبدالکریم چمرکنڈی کی داستانِ زندگی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اصلی نام حبیب اللہ ہے اوران سطور کے قلمبند کرتے وقت اِن مجاہد کی زندگی کا قافلہ تقریباً اَسّی منزلیں طے کر چکا ہے۔ ۱۹۱۲ء میں شعورِ حیاتِ ملّی سے بہرہ مند ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برِصغیر کے اخبارات شہ سرخیوں میں جنگِ طرابلس کی خبر دے رہے تھے۔ اٹلی نے طرابلس (لیبیا) پر حملہ کر دیا تھا اور سنّوسی تحریک کے بے سروسامان مجاہد اُس کے آگے پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے تھے۔ انھوں نے وقت کے جدید ترین اسلحہ سے لیس اور نئے خطوط پر تربیت یافتہ اطالوی فوجوں کے چھکّے چھڑا دیے تھے، لیکن وہ تہی دستی کے عالم میں کب تک مقابلہ کر سکتے تھے؟ آہستہ آہستہ ان کی قوّتِ مزاحمت جواب دیتی چلی گئی اور اطالوی غالب آنے لگے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب علّامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان کی شاعری مسلمانانِ ہند کی رگوں میں آگ بھر رہی تھی۔ خصوصاً علّامہ کی نظم فاطمہ بنت عبداللہ نے دِلوں کی دنیا تہ و بالا کر دی تھی۔ بچّے بچّے کی زبان پر گیارہ برس کی اس عرب بچّی کی داستانِ سرفروشی تھی اور ان اشعار سے تو ہر قلب میں رجائیت کی لہر دوڑ گئی تھی۔

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہُوں گرچہ اُن کی وسعتِ مقصد سے مَیں
آفرینش دیکھتا ہُوں اُن کی اِس مرقد سے مَیں
تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نُور
جو ابھی اُبھرے ہیں ظُلمت خانۂ ایّام سے
جن کی ضَو ناآشنا ہے قیدِ صُبح و شام سے
جن کی تابانی میں اندازِ کہن بھی نَو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پَرتو بھی ہے

عبدالکریم چمرکنڈ ہی بھی ان ہزاروں نوجوانوں میں سے تھے جو سوز و درد سے معمُور اس فضا سے متاثر ہُوئے اور پھر ان کی زندگیوں کا رنگ ڈھنگ بدل گیا۔ اُس زمانے میں چونکہ سیاست اور مذہب میں آج کی طرح بُعد نہ تھا اور سیاسی جنگ اسلامی زندگی کے احیا ہی کے لیے لڑی جا رہی تھی، اس لیے سیاست اور مذہب دونوں ان کی دِلچسپیوں کا مرکز بن گئے۔ دو سال تک یہ دِلچسپی اخبارات پڑھنے اور سیاسی و دینی زندگی کے شب و روز پر بحثِ مباحثے تک محدود رہی۔ دسمبر ۱۹۱۴ء میں گورنمنٹ سنٹر ڈیوری لائن سبحان خان لاہور میں بحیثیت مکینک ملازم ہو گئے۔ یہاں مولانا احمد علی مرحوم کے درسِ قرآن میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ بس پھر کیا تھا، دُنیائے دِل کی کایا پلٹ گئی۔

پہلی جنگِ عظیم کا پُورا زمانہ برِصغیر کے مسلمانوں کے لیے بہت تشویش انگیز تھا۔ ترکوں کی شکست کی خبریں پے بہ پے آ رہی تھیں، لیکن بے بس مُسلمان کچھ بھی نہ کر سکتے تھے۔ انھی ایّام میں ہجرت کا سلسلہ شروع ہُوا۔ کالجوں کے طلبہ ہندوستان چھوڑ کر افغانستان جانے لگے۔ مُلک کے اندر حکومت نے دار و گیر کا سلسلہ تیز کر دیا۔ جس پر بھی ذرا شک گزرتا، دھر لیا جاتا۔ نتیجہ یہ کہ بہت سے سیاسی کارکُن بھی سرحدِ آزاد اور وہاں سے کابل پہنچنے لگے۔ بے شمار لوگ جیلوں میں ٹھونس دیے گئے۔ آخر جنگ ختم ہو گئی جرمنی اور اُس کے ساتھی تُرک ہار گئے۔ اتحادی طاقتیں خلافتِ عثمانیہ کے حصّے بخرے کرنے

میں منصرف ہوگئیں۔ عثمانیوں پر یہ کوہِ غم ٹوٹا، تو اس سے برِصغیر کے مسلمان شدید متاثر ہوئے۔ تحریکِ خلافت و ہجرت اُن کے اسی ردِ عمل کا نتیجہ تھی۔ ہجرت کرنے والوں میں کالج کے طلبہ کے علاوہ علما کی ایک جماعت بھی تھی۔ ۲۰ء میں جن علماء نے افغانستان کی طرف ہجرت کی ان میں مولانا احمد علی مرحوم بھی تھے اور عبدالکریم چمرکنڈی ان کے جلو میں۔

کابل پہنچے تو وہاں مولوی محمد بشیر مرحوم سے ملاقات ہوئی جو مجاہدینِ سرحد کے نمائندے کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے۔ انھیں پہلی بار پتہ چلا کہ سرفروشوں اور حق پرستوں کی ایک جماعت گزشتہ نوّے برس سے ہندوستان میں اسلام کا پرچم سربلند کرنے کی جدوجہد کر رہی ہے۔ اور سید بادشاہ کی اُس تحریک سے تعلق رکھتی ہے جس کا صُور انھوں نے ایک صدی پہلے برِصغیر میں پھونکا تھا۔ مولوی محمد بشیر کا اصلی نام عبدالرحیم تھا۔ مسجد چینیاں والی کے امام مولانا رحیم بخش صاحب کے صاحبزادے تھے۔ سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے پورے خاندان کو پہلے ہی سے وابستگی تھی۔ مولوی صاحب کے تایا نے اس تحریک کے ایک فرد مولوی حیدر علی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس طرح مجاہدین کے کاموں سے دلچسپی انھیں گویا خاندان سے ورثے میں ملی جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ اس تحریک کے کارکنوں اور متوسلین کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ غلامی کی زندگی اور غیر اسلامی حکومت کے غلبے سے سخت متنفر تھے۔ اس کے سایے میں سانس لینا بھی حرام سمجھتے۔ ہر وقت اس آرزو میں تڑپتے رہتے کہ موقع ملے اور وہ دارالحرب سے ہجرت کر جائیں۔ مولوی محمد بشیر کی بھی یہی کیفیت تھی۔ دل میں پختہ ارادہ کر چکے تھے کہ کاروبار سمیٹ کر ہندوستان سے نکل جائیں گے اور کسی آزاد اسلامی ملک میں جا بسیں گے۔ ابھی یہ ارادہ عملی جامہ پہن نہ پایا تھا کہ جنگ چھڑ گئی جو تحریکِ آزادی کے لیے مہمیز ثابت ہوئی۔ ہندوستان میں دارو گیر کا بازار گرم ہو گیا۔ حکومت نے ان لوگوں کی سرگرمیوں کی کڑی نگرانی شروع کر دی جنھیں وہ مجاہدین کی تحریک سے وابستہ سمجھتی تھی۔ مولوی صاحب انھی میں سے ایک تھے۔ ایک روز خبر ملی حکومت نے ان کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے ہیں۔ فوراً وہ فیصلہ کر لیا جس نے اُن کی زندگی کا رُخ ہی بدل ڈالا۔ بھائی بہنوں اور بال بچوں سے ملے اور چل کھڑے ہوئے۔ کتابوں کا کاروبار تھا، بھائی سے کہہ گئے ایک جگہ

سے تم لینی ہے وہاں جا رہا ہوں، شاید کچھ دِن لگ جائیں۔

گھر والے اُن کی واپسی کے منتظر رہے۔ آخر ایک روز اُن کے خط نے یہ راز فاش کیا کہ وہ مجاہدین کے مرکز اسمست پہنچ گئے ہیں۔ کچھ مدت وہاں رہے اور پھر چمر کنڈ کو اپنا مستقر بنا لیا۔ ان کی متحرک اور فعال شخصیت نے تھوڑی ہی مدت میں جماعتِ مجاہدین کے شب و روز بدل ڈالے۔ کچھ امتدادِ زمانہ کچھ داخلی اور خارجی حالات کی وجہ سے مجاہدین کی سرگرمیوں میں جمود پیدا ہو چلا تھا، انھوں نے اس جمود کو توڑا۔ جگہ جگہ چوکیاں قائم کیں۔ برِصغیر سے تازہ دم مجاہد بڑی تعداد میں آنے لگے اور انگریزوں کے خلاف کارروائیاں از سرِ نو شروع ہو گئیں۔ اُنھوں نے حکومتِ افغانستان کے ساتھ مجاہدین کے تعلقات گہری بنیادوں پر اُستوار کرنے کی کوشش کی اور انھیں پہلی بار کابل کا تعاون حاصل ہُوا۔ امیر حبیب اللہ خان کو دین و ملّت کے کاموں میں دلچسپی لینے پر اُکسایا۔ امیر کی حکومت میں اُنھیں بڑا اثر و رسوخ حاصل تھا۔ اُس نے اِنھیں یاغستان میں تنظیم پر مامور کیا اور بارہ ہزار روپے سالانہ اخراجات کے لیے دیے۔ افغان حکومت خود اُنھیں ایک ہزار روپے ماہانہ دیتی تھی، مگر اخلاص، للہیت، قناعت پسندی اور ایثار پیشگی کا یہ عالم تھا کہ صرف پانچ روپے اپنے لیے رکھتے باقی ساری رقم جماعت کو دے دیتے۔ ہجرت سے پہلے ہزاروں روپے کے کاروبار کے مالک تھے۔ جو چوپٹ ہو کر رہ گیا اور بال بچوں کی گزر اوقات تک مشکل ہو گئی۔ اس کی پریشان کُن خبریں ان تک پہنچیں، مگر نہ تو ان کے پائے استقامت میں کوئی لغزش آئی اور نہ اُنھوں نے بچوں کے لیے ایک حبّہ تک یاغستان سے بھیجا، حالاں کہ وقتاً فوقتاً بڑی بڑی رقوم ملتی رہتی تھیں، انھیں وہ جماعت کی امانت سمجھتے۔ ہجرت کرتے وقت عہد کیا کہ جب تک ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت رہے گی، واپس نہیں آئیں گے اور اس سرزمین میں سانس لینا اپنے اُوپر حرام سمجھیں گے۔ اس عہد کو آخر دم تک نباہا۔ بڑے دِل و دماغ کے اور صاحبِ تدبیر و بصیرت اِنسان تھے۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ہجرت کے بعد کابل میں آزاد ہندوستان کی جو عبوری حکومت قائم کی اُس میں اُنھیں وزیرِ دفاع بنایا گیا تھا۔

مولوی محمد بشیر صاحب کی شخصیت سے عبدالکریم چمرکنڈی بڑے متاثر ہوئے

اور انہیں کی رفاقت اختیار کر لی۔ وہ چمر کنڈ میں مولوی صاحب کے پاس تقریباً چھ برس تک رہے اور مختلف خدمات انجام دیا کیے۔ ۱۹۲۶ء کے وسط میں انھیں ہندوستان میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ یہ بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ قدم قدم پر خطرات تھے۔ برطانوی حکومت کی خفیہ پولیس نماز روزے کے پابند ہر شخص پر نظر رکھتی اور جس پر ذرا بھی شک گزرتا، سائے کی طرح اُس کے ساتھ لگ جاتی۔ عبدالکریم چمر کنڈی کا کام مختلف علاقوں کا دورہ کر کے سرحدی مرکز کے لیے زکوٰۃ اور صدقات وصول کرنا، اُسے جماعت کے قاصدوں کے ذریعے جماعت تک پہنچانا، نئے رضا کار بھرتی کرنا اور انھیں راہِ حق میں جہاد کرنے کے لیے بھجوانا تھا۔

کُفر زارِ ہند میں پہنچ کر عبدالکریم چمر کنڈی کچھ دن بڑے مضطرب رہے، لیکن پھر رفتہ رفتہ اپنے فرائض میں کھو گئے۔ جماعت کے کام سرانجام دینے کے ساتھ ساتھ اُنھیں اپنی گزر بسر کے لیے کاروبار بھی کرنا پڑتا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اُن کی مُخبری ہوگئی۔ اُس روز چار مجاہد بھائی اُن کے ہاں مقیم تھے۔ صُوفی عبداللہ مرحوم جو ماموں کانجن کے قریب اوڈانوالہ کے دینی مدرسے کے سربراہ تھے اور اُن دِنوں چمر کنڈ میں امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی کے انتہائی معتمد ساتھی تھے۔ مولوی رحمت اللہ، امیر جماعت اسمست کے نمائندے نومُسلم شیخ عبدالرحمٰن، حافظ عبدالاحد ناگپوری اور گجرات (پنجاب) کے نواحی گاؤں اُدووال کلاں کے فضل الرحمٰن پرلیس میں۔ عبدالکریم صاحب کے بڑے بھائی کا دواخانہ تھا۔ سی آئی ڈی کا آدمی شاہ دین دُکان پر آیا۔ اُس وقت ان کے چچا زاد بھائی شیر محمد دکان پر تھے۔ وہ مُسمسی صُورت بنا کر بولا: "میرا بھائی ہجرت کر کے کابل چلا گیا تھا اُس کا کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ کہاں ہے بہت سے لوگ واپس آچکے ہیں، مگر اس کے بارے میں نہ تو کوئی خبر ہے اور نہ اُس نے کسی کے ہاتھ کوئی خط پتر ہی بھیجا ہے۔ شیر محمد سیدھا سادہ آدمی تھا، داؤ گھات سے ناواقف۔ کہنے لگا: "ہمارا بھائی بھی کابل گیا تھا، وہ تو یہاں آتا جاتا رہتا ہے اور آج کل بھی آیا ہوا ہے، اُس سے آپ کو پتہ چل جائے گا۔"

"آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ مجھے اپنے بھائی سے ملا دیجئے، مَیں ابھی تھوڑی دیر

میں واپس آتا ہوں"۔ شاہ دین نے لجاجت سے کہا اور چلا گیا۔

برابر والے دُکان دار کو عبدالکریم چمرکنڈی کے بارے میں تھوڑی بہت خبر تھی اُس نے شیر محمّد سے کہا "یہ تم نے کیا غضب ڈھایا۔ یہ تو سی آئی ڈی کا حوالدار شاہ دین تھا۔ اب بھاگ کر جاؤ اور اپنے بھائی کو خبردار کر دو"۔ وہ ہانپتا کانپتا گھر پہنچا اور سارا واقعہ کہہ سُنایا۔ اس وقت پانچوں مجاہد بیٹھے جماعتی کاموں کے سلسلے میں صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ یہ خبر سُنتے ہی انھوں نے اجلاس برخاست کر دیا اور سب مختلف شہروں کو روانہ ہو گئے۔ فضل الرحمٰن کو مولوی محمّد بشیر نے مرکز میں طلب کیا تھا۔ عبدالکریم صاحب نے انھیں رستے کا خرچ دیا اور کہا: "تم اپنے گاؤں سے ہوتے اور گھر والوں سے ملتے ہوئے لشکر چلے جاؤ۔" انھیں رخصت کر کے دُکان پر پہنچے، تو چند منٹ بعد شاہ دین آ گیا۔

کہنے لگا: "لشکر سے آپ تین آدمی چلے تھے۔ ایک تو فضل الرحمٰن تھا۔ دوسرا کون تھا اور کہاں ہے؟" اس بات میں کوئی صداقت نہ تھی پہلے روز دو مجاہد بھائی میاں عبدالرحیم (ایمن آباد) اور فضل الرحمٰن روانہ ہوئے تھے اور اگلے دن شیخ عبدالرحمٰن اور عبدالکریم چمرکنڈی۔ شیخ نے انھیں مردان تک پہنچایا اور وہاں سے وہ اکیلے امرتسر پہنچے۔ نوشہرہ میں گرفتار ہونے سے بال بال بچے، تاہم عبدالکریم نے یہی بہتر سمجھا کہ شاہ دین اپنے مغالطے میں اُلجھا رہے۔

"فضل الرحمٰن کہاں کا رہنے والا ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"وہ گجرات کے اسٹیشن پر اُتر گیا تھا۔ مجاہد بھائی میری طرح سادہ لوح نہیں ہوتے کہ پولیس والوں کو اپنا صحیح نام اور اتہ پتہ بتا دیں"۔

"اور وہ دوسرا آدمی کون تھا؟" اُس نے پھر سوال کیا۔

"وہ ایک بنگالی تھے۔ رات میرے ہاں مہمان رہے۔ میری اپنے بھائی سے مُلاقات ہُوئی، تو اُنھوں نے مجھ سے کہا اب تمھیں یہیں رہنا ہو گا۔ مَیں نے انکار کر دیا۔ بھائی نے دھمکی دی کہ مَیں صُبح پولیس کو تمھارے آنے کی خبر کر دوں گا، وہ خود تمھیں روک لے گی۔ مہمان نے ہماری بات چیت سُن لی؛ چنانچہ صُبح جب ہم نماز کے لیے مسجد گئے، تو وہ بنگالی بھائی اس دوران میں غائب ہو گئے کہ کہیں پکڑے نہ جائیں"۔

"اُس بنگالی کا نام اور پتہ تو تم جانتے ہو گے؟" اُس نے پھر سوال کیا۔

"نہیں" عبدالکریم نے جواب دیا۔ "مجاہد بھائی ایک دُوسرے کو اپنا نام نہیں بتلاتے، وہ حافظِ قرآن تھے اور ہم انہیں حافظ صاحب ہی کہا کرتے تھے۔"

"تمہیں فضل الرحمٰن کا اتہ پتہ معلوم ہے، مگر بتلانے سے گریز کر رہے ہو۔" حوالدار نے کہا۔ عبدالکریم نے معذرت کی تو بولا! "ہمیں اُس کی ضرورت ہے، وہ ہمارے چنگل سے نہیں بچ سکتا، جہاں بھی ہوگا ہم اُسے پکڑ لائیں گے، بہتر ہے تم ہی بتا دو۔" حوالدار کا لہجہ درشت اور بھاری ہو گیا تھا۔

عبدالکریم نے اپنی لاعلمی پر اصرار کیا اور وہ چلا گیا۔

تین ہفتے گزر چکے تھے کہ فضل الرحمٰن صاحب آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ عبدالکریم چمرکنڈی نے اُنھیں مسجد کوتوال، مدرسہ تجوید القرآن میں ٹھہرایا۔ فضل الرحمٰن نے تنہائی میں خود ہی اپنی رُوداد سُنائی: "مَیں چمرکنڈ کے بجائے مدرسہ رحمانیہ دہلی چلا گیا تھا۔ یہ نوجوان بھی اس مدرسے میں شکستہ حال، پھٹے پُرانے کپڑے پہنے وارد ہُوا۔ میرے پاس جو روپے تھے اُن سے مَیں نے اِس کو کپڑے بنوا دیے اور جہاد کی تلقین و تبلیغ کی، اب یہ لشکر میں جانے کے لیے بے قرار ہے، میرے پاس پُوری رقم نہ تھی، چنانچہ آپ کے پاس لے آیا ہُوں۔ مدرسہ تجوید القرآن کا ایک طالب علم حافظ خلیل بھی مجاہدین کی صف میں شامل ہونا چاہتا ہے، ہم تینوں کے لیے کرایے اور زادِ راہ کا بندوبست کر دیجیے۔"

عبدالکریم کسی تأثر کا اظہار کیے بغیر فضل الرحمٰن کی رُودادِ تبلیغ سُنتے رہے، اُنھوں نے اپنی بات ختم کی تو مُسکراتے ہُوئے بولے: "یہ شخص جِسے آپ اپنی تبلیغ و تلقین کے نتیجے میں نشۂ جہاد میں سرشار پاتے ہیں، سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ آپ کو پھانسنے کے لیے جال بچھایا گیا ہے۔ وہ لوگ مجھے چیلنج دے چکے ہیں کہ ہم اُسے (فضل الرحمٰن کو) ہر صُورت میں پکڑ کر رہیں گے۔"

فضل الرحمٰن کے چہرے پر ناگواری کی پرچھائیاں پھیل گئیں۔ جس نوجوان کو وہ

اللہ کی راہ کا سپاہی بنا کر لائے تھے، اُسے عبدالکریم سی آئی ڈی کا آدمی قرار دے رہا تھا یہ اُس نوجوان کی نہیں خود ان کی اپنی توہین تھی۔ کہنے لگے: "مَیں آپ سے زیادہ اس شخص کو جانتا ہُوں، ہمیں زادِ راہ فراہم کر دیجیے، ہم یہاں زیادہ عرصہ ٹھہرنا نہیں چاہتے۔"

عبدالکریم چمرکنڈی کے پاس جماعت کا کوئی روپیہ نہ تھا۔ انھوں نے اپنی والدہ سے طلائی بالیاں عاریتاً لیں اور ایک دوست کے پاس گروی رکھ کر بِلا سُود پچاس روپے قرض لیے اور فضل الرحمٰن کو دے دیے۔ پھر اس نوجوان کو علیحدگی میں سفر سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لشکر کی صعوبت ناک زندگی کا ذکر کیا اور جھوٹ مُوٹ کہا کہ میں انھی مصائب اور صعوبتوں کی تاب نہ لا کر بھاگ آیا ہُوں، مگر وہ بالکل متاثر نہ ہُوا۔ کہنے لگا: "راہِ حق میں مصیبتیں اور سختیاں آتی ہی رہتی ہیں، مَیں انھیں خندہ پیشانی سے برداشت کروں گا۔"

تحریک کے رہنماؤں کا ہمیشہ یہی دستور رہا تھا کہ وہ لوگوں کو تحریک میں شامل کرتے وقت اُن سے حلف لیتے اور کوئی شخص مشتبہ بھی ہوتا تو اُس کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دیتے۔ اس طریق کار نے انھیں کئی بار نقصان بھی پہنچایا، لیکن شاید اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس کا توڑ جوابی انٹیلی جنس کا جال بچھانا تھا جس کی طرف تحریک نے کبھی توجہ نہ کی۔ نوجوان نے بہت اصرار کیا تو عبدالکریم چمرکنڈی نے اس سے حلف لے لیا۔ فضل الرحمٰن دونوں ساتھیوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔

کئی ہفتے گزر گئے اور پھر ایک روز خبر ملی کہ فضل الرحمٰن اور حافظ خلیل سرحد پار کرتے ہُوئے پکڑے گئے ہیں۔ حافظ خلیل کے والد بھاگم بھاگ پشاور پہنچے اور بیٹے کو ضمانت پر چھڑوا لائے، مگر فضل الرحمٰن کی ضمانت نہ ہو سکی۔ حافظ خلیل نے امرتسر پہنچ کر عبدالکریم چمرکنڈی کو داستانِ اسیری و رہائی سُنائی۔ اُس نے کہا:

"ہم ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو وہ نوجوان کہنے لگا آپ لوگ لاہور چلیے، مَیں کل فلاں وقت لاہور اسٹیشن پر پہنچ جاؤں گا۔ اگلے روز ہم لاہور ریلوے اسٹیشن پر اُس کا انتظار کرتے رہے، مگر وہ نہ آیا۔ آخر ہم نے اس کے بغیر ہی سفر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حسن ابدال کے ٹکٹ خریدے۔ مَیں نے دیکھا بکنگ کلرک کسی آدمی سے گہرے انداز میں کھسر پھسر کر

رہا ہے کھُسر پھُسر سے فارغ ہو کر اُس نے ہمارے ٹکٹوں کے نمبر نوٹ کر لیے مجھے پہ شک سا ہُوا، فضل الرحمٰن سے ذکر کیا، مگر اُس نے حسبِ عادت لاپروائی سے بات ٹال دی "ہونہہ کچھ بھی نہیں ہے، تم ضرورت سے زیادہ حسّاس ہو چلے ہو" اُس کا جواب تھا۔

حسن ابدال ریلوے اسٹیشن پر ہم نے گاڑی سے اتر کر مُسافر خانے کا رُخ کیا۔ ٹکٹ کلکٹر نے ہمارے ٹکٹ لیے۔ انھیں غور سے دیکھا اور پھر ہمیں پولیس کے حوالے کر دیا۔ اچانک ایک مُسافر نے جو چہرے مُہرے اور وضع قطع سے خاصا معتبر اور معزز نظر آتا تھا، مداخلت کی۔ پولیس والوں کو ڈانٹا کہ شریف لوگوں کو تنگ کرتے ہو، شرم نہیں آتی؟ پُلسیوں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر ہمیں چھوڑ دیا۔ رات ہم نے حسن ابدال میں گزاری۔ صُبح ٹانگے میں بیٹھ کر ہری پُور پہنچے اور وہاں سے دوڑ۔ آگے پیدل سفر تھا۔ دربند سے چند میل اِدھر پولیس کی آخری چوکی کر پلیاں ہے۔ وہاں پہنچتے ہی دھر لیے گئے۔ پولیس ہمیں چوکی میں لے گئی۔ کیا دیکھتے ہیں وہی صاحب جنھوں نے ہمیں حسن ابدال اسٹیشن پر پولیس کے چُنگل سے چُھڑوایا تھا، پولیس افسر کی وردی پہنے بڑی تمکنت سے بیٹھے ہمارے منتظر ہیں۔ مُسکراتے ہُوئے ملے۔ مَیں نے اُن سے کہا: "پکڑنا ہی تھا تو ہمیں رہائی کیوں دلوائی تھی؟" قہقہہ لگاتے ہُوئے بولے "وہاں پکڑ لیتے تو تم سو طرح کے بہانے تراش کر چھُوٹ سکتے تھے۔ اب قصّہ زمیں برسرِ زمین چُکایا ہے۔" اُس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ہم لاہور ہی سے تمہارا تعاقب کر رہے تھے۔"

فضل الرحمٰن دو سال کے لیے پسِ دیوارِ زنداں پہنچ گیا۔ اُس پر بڑا دباؤ ڈالا گیا کہ وہ عبدالکریم چمرکنڈی کے بارے میں بیان دے کہ وہ اب تک کام کر رہے ہیں، ڈرایا دھمکایا بلکہ تشدد تک کیا اور قید معاف کرنے اور دنیاوی مفادات سے جھولی بھرنے کا لالچ بھی دیا، مگر آدمی بڑا ہی صاحبِ عزم اور نہ ٹُوٹنے والا تھا، نہ تو اُس نے کسی دھمکی اور تشدد کی پروا کی اور نہ ترغیب و تحریص کے دام ہی میں آیا۔ عبدالکریم کے ساتھ کسی قسم کے تعلق سے صاف انکار کر دیا۔

عبدالکریم چمرکنڈی کی نگرانی اب اور کڑی ہو گئی، تاہم وہ کام کرتے رہے۔ سی آئی ڈی

والے انھیں "رنگے ہاتھوں" گرفتار کرنا چاہتے تھے، اس کا انھوں نے کبھی موقع نہ دیا۔ اکثر غچّا دے کر نکل جاتے۔ دہلی جانا ہوتا تو مشہور کر دیتے کہ لاہور گئے ہیں۔ نگرانی پر متعین خفیہ پولیس کے آدمی ان کی تلاش میں لاہور چھانتے پھرتے۔ لاہور جانے کا پروگرام ہوتا تو پڑوسیوں سے کہہ جاتے کوئی پوچھے تو کہہ دینا دہلی گیا ہے، وہ دہلی میں کھوج لگاتے رہتے اور یہ لاہور میں گھومتے پھرتے۔

یہ صورتِ حالات ان لوگوں کے لیے سخت پریشان کُن تھی۔ وہ ہر ناکامی پر بھِنّا اُٹھتے اور آتشِ انتقام اور بھڑکنے لگتی۔ شروع شروع میں عبدالکریم چمرکنڈی کی مخبری ہوئی تو کوشش کے باوجود انھیں پتہ نہ چل سکا کہ مخبر کون ہے۔ ایک روز خبر ملی عبدالقدیر لشکر میں گیا تھا اور وہاں سے ایک سرگرم مجاہد محمّد دین کو دھوکا دے کر لے آیا اور سرحد پولیس کے حوالے کر دیا۔ معمہ حل ہو گیا تھا۔ عبدالکریم کی مخبری بھی عبدالقدیر ہی نے اپنی چمڑی بچانے کے لیے کی تھی۔ اُسے مجاہدین میں بڑا اچھا مقام حاصل تھا۔ وہ مولانا فضل الٰہی کا میر منشی ہوا کرتا تھا۔ پھر وہ انگریز حکومت کے شکاری کُتوں کے گھیرے میں آ گیا اور انھوں نے نفسیاتی ہتھکنڈے اختیار کر کے اُسے اپنے حلقوں میں کس لیا۔ ایک روز وہ عبدالکریم کے پاس آیا اور کہنے لگا: پولیس مجھ سے پوچھ کچھ کر رہی ہے، مَیں اپنی جان چھڑانے کے لیے تمھاری مخبری کر دوں گا۔ انھوں نے اُسے ایک قیمتی جیبی گھڑی اور کچھ روپیہ نقد دیا اور کہا: اِس گندگی میں کیوں ملوّث ہوتے ہو؛ یہ زادِ راہ لو اور لشکر میں واپس بھاگ جاؤ۔ اُس نے گھڑی اور روپیہ لے لیا، مگر بھاگ جانے کے بجائے پولیس سے معاملہ کر لیا۔ نہ صرف عبدالکریم کی مخبری کی، بلکہ جماعت کے دُوسرے افراد کی بھی مخبری کرنے لگا۔ جماعت کو کچھ خبر نہ تھی۔ یہ شخص لشکر پہنچا۔ وہاں سے تازہ ترین معلومات حاصل کیں، محمّد دین کو ساتھ لیا اور اُسے پولیس کے ہاتھوں گرفتار کرا دیا۔

ادھر خُفیہ پولیس عبدالکریم کو پھانسنے کے لیے دام کے حلقے تنگ کرتی جاتی تھی۔ اب شاہ دین نے اُن کے ایک دوست عبدالغنی سائیکل ساز کو آلۂ کار بنایا۔ مستری عبدالغنی نے انھیں اپنی دُکان پر بُلایا اور اپنے کسی گاہک کے نام اُن سے خط لکھوایا۔ انھوں نے خط

خُوب بنا سنوار کر لکھا۔ مستری نے تعریف کے پُل باندھ دیے۔ اتنے میں شاہ دین پہنچ گیا اور اُس نے خط مستری کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ پھر عبدالکریم سے مخاطب ہُوا: "فکر کی بات نہیں، بس ایک ضرورت سے ہمیں تمھاری تحریر کا نمونہ درکار تھا۔" وہ چلا گیا تو مستری نے بتایا کہ مجھ سے یہ کام سخت دباؤ ڈال کر کروایا گیا ہے۔

عبدالکریم کی تحریر حکومت کے ہاتھ لگ چکی تھی، اس لیے انھیں بے حد محتاط ہو جانا پڑا۔ پہلے تو وہ ہندوستان کے تحریکی کارکنوں سے خط کتابت کے ذریعے اشاروں کنایوں میں رابطہ قائم کر لیتے تھے۔ اب ایسا کرنا نہ صرف اُن کے لیے بلکہ مکتوب الیہ کے لیے بھی سخت خطرناک تھا۔ اِس صُورتِ حال سے اُن کی سرگرمیاں سخت متاثر ہُوئیں۔

اسی زمانے میں عبدالکریم کی ملاقات ڈاکٹر عبدالرشید سے ہُوئی۔ وہ امرتسر کے رہنے والے تھے اور افغانستان میں امیر امان اللہ خان کے بہنوئی علی احمد جان کے سیکرٹری تھے۔ اُن سے عبدالکریم کا تعارف اُس وقت ہُوا جب حکومتِ افغانستان کی طرف سے انھیں انعامات اور تمغۂ خدمت سے نوازا گیا۔ دراصل امیر امان اللہ کے خلاف پہلی بغاوت ہُوئی تو اُسے فرو کرنے کے لیے بطورِ امداد چمرکنڈ سے ۴۶ مجاہدین کا ایک دستہ عبدالکریم کی کمان میں افغانستان بھیجا گیا۔ وہاں وہ تقریباً نو مہینے رہے۔ اُن کی کارگزاری سے افغان فوج کے کمانڈر انچیف علی احمد جان بہت مسرور ہوئے؛ چنانچہ اُنھیں انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اپریل ۲۵ء میں تقریب منعقد ہُوئی۔ کمانڈر انچیف کی طرف سے یہ انعامات ڈاکٹر عبدالرشید نے اُنھیں دِیے۔ ڈاکٹر صاحب کے بھائی عبدالکریم کے شناسا تھے۔ انھی نے ڈاکٹر صاحب کو خبر دی کہ عبدالکریم آج کل یہیں ہے۔ اُنھوں نے اِنھیں اپنے ہاں بُلایا۔ یہ حاضر ہُوئے تو کہنے لگے ایک رقعہ تمھارے نام مولانا محمد بشیر نے دیا تھا۔ مجھے راستے میں مصلحتاً ضائع کر دینا پڑا۔ مولانا نے جو کام آپ کے سپُرد کیے تھے اُن کے بارے میں جواب لکھ دیجیے مَیں اُنھیں پہنچا دُوں گا۔ عبدالکریم نے زبانی پیغام دے دیا۔

کچھ عرصہ ہی گزرا تھا کہ مجاہدینِ اسمست کے امیر کا داماد حبیب الرحمٰن بنگالی اِن کے پاس آیا۔ وہ جماعت کے کسی کام سے بنگال جا رہا تھا۔ اُس نے بتایا مولانا محمد بشیر

نے تمھارے نام ایک خط مجھے دیا تھا۔ ایک جگہ پولیس نے مجھے روک لیا۔ مَیں رفعِ حاجت کے بہانے ریل گاڑی کے بیت الخلا میں داخل ہو گیا اور خط مُنہ میں ڈال کر نگل لیا، مولانا کے نام کوئی خط دے دیجیے تاکہ انھیں میری اور آپ کی مُلاقات کا علم ہو جائے۔ انھوں نے اسے بھی یہی کہہ کر ٹال دیا کہ مَیں آپ کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔ بس زبانی ہی میرا پیام اور سلام پہنچا دیں۔

پولیس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چلا تھا۔ آخر اکتوبر ۱۹۲۸ء میں انھیں عبدالکریم پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مِل گیا۔ دسہرہ کے تہوار پر قلعہ اور مسجد کے درمیان درشنی دروازے کے قریب کسی شخص نے ہجوم پر بم پھینک دیا۔ بہت سے آدمی مارے گئے۔ بم کا تجزیہ کیا گیا، تو وہ جمر کنڈ کے ان بموں میں سے تھا جو جرمنی سے منگوائے گئے تھے۔ ایسے ہی بم ۱۹۲۰ء میں قاضی کوٹ کے گاؤں میں قاضی عبدالرؤف کے مکان سے دُوسرے اسلحہ کے ساتھ برآمد ہُوئے تھے۔ قلعہ پولیس کے مُسلمان انچارج کا قرعۂ فال انھی دیوانے کے نام پڑا۔ شام ہو رہی تھی کہ پولیس کی بھاری جمعیت نے انھیں دُکان پر آن گھیرا۔ پولیس کی کمان خواجہ تاج الدین انسپکٹر کر رہا تھا۔ اُس نے ان سے پُوچھا: "عبدالکریم تمھیں ہو؟"

"جی ہاں"۔ اُنھوں نے جواب دیا۔

"کرم الٰہی کون ہے؟"

"مَیں ہُوں"۔

"اور چراغ دین؟"

"مَیں"۔

اب پولیس نے اپنی کارروائی شروع کی۔ مکان اور دکان کی تلاشی لی، مگر کوئی چیز برآمد نہ ہُوئی۔ اللہ تعالیٰ کی کارسازی دیکھیے، اگر چاہے تو اپنے بندوں کی کس انداز میں مدد کرتا ہے! حکومتِ افغانستان نے انھیں جو تمغۂ خدمت عطا کیا تھا اور وہ مُہر جو انھوں نے افغان حکومت کی طرف سے جماعتِ مجاہدین کو دیا جانے والا دو سال کا وظیفہ (۴۲ ہزار روپے) وصول کرتے وقت استعمال کی تھی، وہ دونوں چیزیں اُسی دکان ہی میں رکھی تھیں، مگر تلاشی

لینے والوں کی نظر ان پر نہ پڑی، ورنہ افغانستان اور مجاہدین کے ساتھ ان کے رابطے کی داستان سنانے کے لیے یہی کافی تھیں۔

ناکامی کے ایک اور داغ کے سوا یہاں کچھ ہاتھ نہ آیا تو عبدالکریم کو لاہور لے گئے۔ اپنے آپ کو پولیس کے نرغے میں پا کر انھوں نے اُس ذات کا سہارا پکڑا جس کی بادشاہت سب بادشاہتوں پر بھاری ہے اور جو بندۂ مومن کا اوّل و آخر سہارا ہے۔ اُس کی بارگاہ میں دِل کی گہرائیوں سے دعا کی: "اے اللہ! مَیں تیرا عاجز و کمزور بندہ ہُوں۔ یہ لوگ جس طاقت کے نمائندے ہیں اُس کی سلطنت پر سُورج غروب نہیں ہوتا، لیکن تیری طاقت کے آگے وہ پرِ کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتی، تُو ہی میرا والی و کارساز ہے۔ مجھے ان کے شر سے بچا۔" خود کہتے ہیں "دُعا مانگنے کے بعد میرا دِل سکینت کے گہوارے میں جھولنے لگا اور پھر مجھ پر پولیس کا رُعب کبھی طاری نہ ہُوا۔"

وہ لوگ سات دِن تک شاہی قلعے میں اعصاب شکن نفسیاتی حربے آزماتے اور پُوچھ گچھ کرتے رہے۔ پہلے زندگی کے احوال کی چھان بین کی اور پھر مجاہدین سے تعلق کی کڑیاں ڈھونڈیں اور جوڑیں۔ عبدالکریم نے اپنے حالات تو بے کم و کاست بڑے مؤثر انداز میں بیان کر دیے، البتہ مجاہدین کے بارے میں کہا اب میرا اُن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہاں اُن سے جھگڑا ہو گیا تھا اور مَیں بھاگ کر واپس آ گیا۔ بم کیس کا ذکر چلا تو انھوں نے کہا: "اُس روز مَیں امرتسر میں تھا اور رات گئے تک دکان میں کام کرتا رہا تھا۔" نہ صرف بازار کے متعدد افراد نے اُن کے اِس بیان کی تصدیق کی تھی بلکہ خود سی آئی ڈی کی اپنی رپورٹ بھی یہی کہتی تھی، چنانچہ اُنھیں بے گناہ قرار دے کر چھوڑ دیا گیا۔

بظاہر معاملہ ختم ہو گیا، لیکن مہینہ سوا مہینہ ہی گزرا تھا کہ دسمبر ۱۹۲۸ء کے اواخر میں پولیس دوبارہ آدھمکی۔ پھر وہی تلاشیوں کا چکر چلا اور ایک بار وہ پھر لاہور کے شاہی قلعے میں مشقِ ستم بنے ہُوئے تھے۔ اب خواجہ تاج الدین کے بجائے چودھری شہاب الدین تفتیش کر رہے تھے۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ تمھیں خود بم پھینکنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ تمھارے پاس بہت سے آدمی ہیں اور ان میں سے کسی بھی شخص سے یہ کام لے سکتے ہو۔ یہ کام تمھارا

ہی ہے، کرنے والے ہاتھ چاہے کوئی بھی ہوں۔

چودھری صاحب منجھے ہوئے پولیس افسر تھے، اپنے آپ کو مذہبی تصور کرتے اور دہلی کے ایک بہت بڑے پیر کو اپنا مرشد کہتے۔ عبدالکریم نے کسی بھی سازش میں ملوث ہونے سے پھر انکار کیا تو چودھری صاحب جلالی آواز میں بنکارے: "تمھارے لیے سزائے موت تجویز ہو چکی ہے۔ میرا طریقِ تفتیش عام پولیس والوں سے بالکل مختلف ہے۔ تم اپنا مجرم چہرہ مجھ سے نہیں چھپا سکتے۔ مَیں فلاں پیر صاحب سے توسّل رکھتا ہوں، مراقبہ کرتا ہوں اور ملزم کے سارے کرتوت عیاں ہو جاتے ہیں۔" دیکھتے ہی دیکھتے وہ مراقبے میں چلے گئے۔ عبدالکریم نے اپنے اللہ کا آستانہ تھاما اور دامنِ دل دُعا کے لیے پھیلا دیا: "خدایا! تو قادر و توانا، علیم و بصیر ہے۔ دلوں کے بھید اور غیب کی باتیں تیرے سوا کوئی نہیں جانتا تیری اس قدرت میں یہ شخص نقب لگانے چلا ہے، تُو ہی اسے ناکام اور خاسر کر۔" مراقبے سے نکلے تو چودھری صاحب خاصے نرم پڑ چکے تھے۔ پھر اپنے کارنامے سُنانے لگے کس طرح مراقبے کے ذریعے مجرموں کا کھوج لگایا۔ آخر میں بولے: "مَیں تشدد کا قائل نہیں، بلکہ اس سے توبہ کر چکا ہوں۔ ملتان میں متعین تھا کہ ایک ملزم آیا۔ بڑا ضدی اور اَڑیل۔ کسی طرح اقبالِ جرم پر آمادہ نہ ہوا۔ آخر مَیں نے اپنے پولیس والے ہتھکنڈے آزمائے، مگر وہ بہت مہنگے پڑے۔ میرا جوان اور خوبرو بیٹا چنگا بھلا اچانک دم توڑ گیا اور مَیں نے عہد کیا کہ آئندہ کسی پر ظلم و تشدد نہ کروں گا۔"

ایک دن چودھری صاحب کہنے لگے: "تم اپنے آپ کو چھپاتے ہو اور ہمارے پاس ایسے آدمی ہیں جو تمھاری شخصیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہم انھیں یہاں بلائیں گے اور وہ تمھارا سب پول کھول کر رکھ دیں گے۔" عبدالکریم نے کہا: "ہاں ضرور بلوائیے، مگر وہ میرا سامنا نہیں کر سکیں گے۔ آئیں گے تو گونگ ہو کر رہ جائیں گے۔" پھر پتہ چلا چودھری نے ایک سب انسپکٹر آدمی لانے کے لیے بھیج دیا ہے۔ ایک دو روز بعد انھوں نے بتایا آدمی آ گئے ہیں، لیکن پھر نہ جانے انھیں اُن کے سامنے لانے کی کیوں ہمت نہ ہوئی۔

قلعے میں عبدالکریم کو دس دن ہو چکے تھے۔ چودھری شہاب الدین اُن سے

خاصے متاثر نظر آتے تھے۔ اِس عرصے میں انھوں نے کتنی بار مراقبہ کیا، مگر عبدالکریم کی قوتِ ایمانی اور اپنے رب پر اعتماد و توکل ہر بار ان مراقبوں پر غالب آجاتا۔ شعبان کا مہینہ تھا۔ گھر سے چلے تھے تو روزوں کی نیت کر کے چلے تھے، چنانچہ مسلسل روزے رکھ رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ذکرِ خفی بھی جاری تھا۔ ایک روز نمازِ عصر کے بعد جانماز پر بیٹھے ذکر اذکار میں مصروف تھے کہ چودھری صاحب، ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نیاز احمد، انسپکٹر پولیس سید احمد شاہ اور خواجہ تاج الدین ان کے پاس آئے۔ سپرنٹنڈنٹ کہنے لگا: دیکھو بھائی، بات یہ ہے تمھیں سزائے موت تو ہونی ہی ہے اور یہ واقعی شہادت کی موت ہو گی، کیا یہ بہتر نہیں تم اقرار کر لو، ہمیں دس ہزار روپے کا انعام مل جائے گا۔ اس میں تمھارا تو کوئی نقصان نہیں۔"

"نہیں، یہ سودا یوں نہیں ہو گا۔" انھوں نے کہا۔ "ہونا یہ چاہیے آپ مجھے پانچ ہزار روپے دیجیے، میں اپنے بچوں کو دے آتا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ تختۂ دار تک اس راز کو فاش نہیں کروں گا۔ آپ کو اعلیٰ کارکردگی کا سرٹیفکیٹ بھی تو ملے گا۔" وہ ہنستے ہوئے چلے گئے۔

اگلے دن چاروں پھر آئے۔ عبدالکریم نے کہا: "جس جرم میں آپ مجھے پھانسی دِلوانا چاہتے ہیں، ہم اُسے انتہائی کمینگی سمجھتے ہیں۔ کسی مسلمان سے، بے گناہ لوگوں کے ہجوم پر بم پھینکنے کا گھناؤنا فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔ اگر سزائے موت دِلوانی ہی ہے، تو مجھے مسٹر سانڈرس کے قتل میں ملوث کر لیجیے، اگرچہ میرے ہاتھ اس خون سے بھی پاک ہیں، تاہم یہ تو اطمینان ہو گا کہ میں ایک انگریز کو قتل کرنے کے الزام میں مارا جا رہا ہوں۔"

اُن کی یہ بات ان چاروں کے دِل میں اتر گئی اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ایسا دین دار مسلمان کسی کام کو حرام جانتے ہوئے اُس کام میں کیسے ملوث ہو سکتا ہے؟ آخر انھیں یقین ہو گیا کہ اس مظلوم شخص کو وہ بے گناہ رگید رہے ہیں۔

قلعہ میں پندرھواں دن تھا کہ چاروں افسر پھر ان کے پاس آئے اور بولے: "کیا ہی اچھا ہو آپ ہمارے ساتھ مِل کر کام کریں۔"

"کسی کو گرفتار کرانے اور جھوٹی سچی شہادتیں دِلوانے کے سوا آپ مجھ سے کیا

کام لے سکتے ہیں ؟" اُنھوں نے کہا: "کوئی کام لینا ہے، تو مجھے باہر بھیجیے، پھر دیکھیے میں کیا کر دکھاتا ہُوں "

"لیکن آپ پھر مجاہدین کے ساتھ جا ملے تو ؟" اُنھوں نے پُوچھا۔

"ہاں، ایسا بھی ہو سکتا ہے " اُنھوں نے جواب دیا " مگر ذرا سوچیے جس شخص کے متعلق آپ کو یہ خوف ہے کہ وہ باہر جاتے ہی ہمارا مخالف ہو جائے گا اُس سے آپ کام کیوں کر لے سکیں گے ؟"

وہ ہنس پڑے۔ اللہ نے اپنے بندے کی یاوری کی اور وہ ایمان و ضمیر کا سودا کیے بغیر رہا کر دیے گئے۔

یہ تحریک کے صرف ایک کارکن کی رُودادِ جنوں کے چند اوراق ہیں[1] ان کے آئینے میں ان ہزاروں گمنام مردانِ حق کی فردِ عمل دیکھی جا سکتی ہے جنھوں نے انتہائی نامساعد اور خطرات میں چاروں طرف گھری ہُوئی فضا میں ایفائے عہد کی ایمان افروز داستانیں مرتب کیں، لیکن انھیں ان داستانوں کے نقوش تاریخ کے صفحات میں ثبت کرنے والا کوئی قلم میسر نہ آسکا۔

○

دَورِ آخر

امیر عبدالکریم ۱۱ رفروری ۱۹۱۵ء کو فوت ہُوئے۔ وہ مولانا ولایت علی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ بڑے باہمت، قوی اور مضبوط تھے سیف اور تفنگ کے ایسے دھنی کہ آٹھ دس آدمی بھی ان پر ٹوٹ پڑتے تو انھیں زیر کر لیتے۔ ساری عُمر انگریزوں کے ساتھ جہاد و قتال میں گزری۔ پہلے اپنے چچا مولانا عنایت علیؒ کے پرچم تلے، پھر اپنے بھائی امیر عبداللہ کی قیادت میں۔ زندگی کے آخری بارہ برس اُنھوں نے مجاہدین کی خود قیادت کی۔ وہ ایک اچھے سپہ سالار ہی نہ تھے اعلیٰ مدبر اور

---

[1] عبدالکریم چمرکنڈی نے اپنی زندگی کا یہ باب اُردو ڈائجسٹ کے آزادی نمبر کے لیے بھیجا تھا جسے راقم نے اپنے الفاظ میں از سرِ نو مرتب کیا اور یہ ستمبر ۱۹۷۳ء کے شمارے میں شائع ہُوا۔

سیاست کار بھی تھے۔ ان کے دن حق کی راہ میں تگ و دَو میں گزرتے اور راتیں اپنے رب کے حضور رکوع و سجود میں۔ حافظِ قرآن تھے۔ اکثر تلاوت میں مصروف رہتے۔ قرأت کا انداز بڑا سادہ تھا، لیکن لہجہ اتنا پیارا اور رُوح کے سوز و درد میں ڈوبا ہوتا کہ از دِل خیزد بر دِل ریزد کا سماں بندھ جاتا۔ صبح اور عشا کی نمازیں لمبی لمبی سُورتیں پڑھتے، لیکن مقتدی لاہُوتی فضا میں اس طرح گم ہو جاتے کہ انھیں تھکن کا ذرا بھی احساس نہ ہو پاتا۔ اُن کی وفات کے ساتھ ہی قیادت کا وہ عظیم سلسلہ ختم ہو گیا جس کی تربیت یا تو خود سید بادشاہ نے کی تھی یا اُن کے خلفا نے۔ اب جو لوگ اس عظیم تحریک کے سربراہ بنے وہ دین و اخلاق، جوش و جذبہ، صلاحیّت اور عزیمت و استقامت ہر لحاظ سے فروتر تھے۔ سخت کوشی کی جگہ راحت طلبی نے لے لی تھی۔ تلواروں کی جھنکار اور بندوقوں سے نکلنے والے مَوت کے شعلوں کے بجائے عورتیں اور راحت و عیش کے سامان ان کی دلچسپیوں کا مرکز بن گئے تھے۔ یہی وہ فضا تھی جس نے صُوفی ولی محمّد فتوحی والے کو پُوری تحریک ہی سے برگشتہ کر ڈالا۔ وہ تحریک کے ان شیدائیوں میں سے تھے جنھوں نے پنجاب کے گاؤں گاؤں میں کِتاب وسُنّت کا پیغام اور حق و جہاد کی دعوت پہنچائی تھی۔ امیر عبد اللہ کے آخری دَور اور امیر عبد الکریم کے پُورے زمانۂ امارت میں سرحدِ آزاد پہنچنے والے مجاہدین کی ایک بڑی تعداد ان نوجوانوں پر مشتمل تھی جو صُوفی صاحب کے وعظ و ارشاد سے متاثّر ہو کر تحریک میں شریک ہُوئے تھے۔ وہ جب خود مجاہدین کے مرکز اسمست میں پہنچے تو امیر عبد اللہ کے پوتے، امیر نعمت اللہ کا دَور تھا۔ جس دَور کے تصوّر نے خود انھیں تحریک سے وابستہ کیا تھا اور جسے جوان و گرم خُون مہیّا کرنے کے لیے انھوں نے قریہ قریہ، شہر شہر کی خاک والہانہ جوش اور جذبے کے ساتھ چھانی تھی، وہ مثالی دَور، ماضی کی تاریخ کا حصّہ بن چُکا تھا۔ اب نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ صحیح طرزِ عمل تو یہ تھا کہ صُوفی صاحب اصلاحِ احوال کی جدّ و جہد کرتے۔ مجاہدین کی بڑی تعداد شب و روز کے اس نئے رنگ سے نالاں تھی، وہ اُن کی اس جدّ و جہد میں اُن کا ساتھ دیتے، لیکن صُوفی صاحب بالکل ہی باغی ہو گئے۔ واپس پنجاب پہنچے اور تحریک کے خلاف مورچہ جما کر اپنے "گناہ" کا کفّارہ ادا کرنے لگے۔ یہی نہیں تحریک کے کارکنوں پر قاضی کو

کا اسلحہ کیس چلا تو اُنھوں نے اور اُن کے بعض ارادت مندوں نے انگریزی سرکار کی طرف سے گواہی دی۔

یہ صورتِ حال بلاشبہ بڑی اذیت ناک تھی۔ اس عیش پرستی اور راحت کوشی نے اسمست کو انگریزوں کے ساتھ مفاہمت پر آمادہ کیا۔ اگرچہ اسمست کے امیر علانیہ اس کا اظہار نہ کر سکے، لیکن مجاہدین میں یہ بات عام تھی کہ اسمست انگریزوں سے مِل گیا ہے۔ اس طرح اسمست اور تحریک کے اُن مخلص کارکنوں کے درمیان کش مکش شروع ہو گئی جو تحریک کے نصب العین اور مقصد کی صحت پر اب بھی یقینِ کامل رکھتے تھے اور جن کا ایمان تھا کہ کرنے کا کام ہے تو یہی، خرابی اگر کہیں پیدا ہو گئی ہے تو اُسے دُور کرنا چاہیے نہ کہ پُوری تحریک کے خلاف محاذ آرائی۔ اس کش مکش میں امیر نعمت اللہ ایک مخلص کارکُن عبدالرشید عرف یوسف کے ہاتھوں مارے گئے۔ (یہ نوجوان ان جوشیلے طالب علموں میں سے تھا جو تحریکِ ہجرت میں انگریز کی غلامی میں جکڑے ہُوئے وطنِ عزیز کو چھوڑ کر افغانستان چلے گئے تھے اور پھر وہاں سے اسمست آ گئے تھے) اب سرحد اور برِصغیر میں کام کرنے والے تحریکی کارکنوں کا مرکز اسمست نہیں چمرکنڈ تھا (اسمست بزرگوں کی یاد کے طور پر محض ایک علامتی مرکز رہ گیا جس کی زمامِ امارت امیر عبداللہ کے پوتے اور امیر نعمت اللہ کے عمّ زاد بھائی رحمت اللہ کے ہاتھ میں تھی) اس ذیلی مرکز کے قائد مولوی عبدالکریم قنوجّی نے تو برِصغیر کے کارکنوں اور جماعتوں کو ہدایات جاری کر دی تھیں کہ اعانت کی رقوم اور رضا کار اسمست نہ بھیجے جائیں بلکہ مجاہدین کا مرکز اب چمرکنڈ ہے اور اسی کے ساتھ رابطہ رکھنا چاہیے۔

"چمرکنڈ، مہمند اور باجوڑ کے علاقوں اور افغانستان کی سرحد کے مقامِ اتّصال پر ایک ایسے پہاڑ کے دامن میں واقع ہے جس کی پتھریلی تختی پر نقّاشِ ازل نے اپنے خامۂ قدرت سے اس قدر حسین و جمیل اور دلفریب نقش کندہ کیے ہیں کہ زبانِ قلم اُنھیں بیان کرنے سے عاجز ہے۔ اس کی سرسبزی و شادابی پر باغِ بہشت بھی رشک کھا کر مُنہ چھپا لیتا ہے۔ اس کا کوثر نما پانی اور نسیمِ عنبر شمیم زندگی سے مایُوس بیماروں کو

مژدۂ زندگی بخشتے ہیں۔[1]" اور فی الحقیقت چمرکنڈ مجاہدین کی تحریک کے لیے بھی تازہ زندگی کا سرچشمہ بن گیا۔

مولوی عبدالکریم قنوجی نے مولوی فضل الٰہی کو اپنا نائب بنا رکھا تھا۔ مولوی عبدالکریم قنوجی کا انتقال وسط ۱۹۲۱ء میں ہُوا اور مولوی فضل الٰہی صاحب ۱۹۲۶ء تک چمرکنڈ کے امیر رہے۔ اپنے زمانۂ امارت میں انھوں نے ایک وسیع منصوبہ بنایا جس کا مقصد یہ تھا کہ مجاہدین دوسروں کے دستِ نگر بنے رہنے کے بجائے اپنے قدموں پر کھڑے ہوں، علاقۂ آزاد کے باشندوں میں کارفرما غیر اسلامی عصبیتوں کا خاتمہ ہو، ان کے اندر ملّی شعور اور اسلامی رُوح جنم لے اور وہ وقت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اپنے آپ کو ڈھالیں۔ اس منصُوبے کے اہم خدوخال یہ تھے:

(۱) دیوبند اور انجمن حمایتِ اسلام کے ملتے جُلتے طرز پر ایک درس گاہ کا قیام جس میں مُجاہدین اور مقامی باشندوں کے بچّوں کو دینی اور جدید تعلیم دی جائے اور ایک بہت بڑا کتب خانہ بنایا جائے۔ اس طرح ایسی نوجوان نسل تیّار کی جائے جو دنیا کے حالات مدِّ نظر رکھ سکے اور ان حالات میں علاقے اور مجاہدین کی قیادت کر سکے۔

(۲) ایک ہسپتال کی تعمیر جس میں مریضوں کو مُفت علاج فراہم کیا جائے۔ اس طرح نہ صرف پُورے علاقے کی ایک اہم ضرورت پُوری کی جائے بلکہ خدمتِ خلق کے ذریعے مجاہدین کے اثرات پھیلائے جائیں۔

(۳) اسلحہ ساز فیکٹری بنائی جائے جس میں وقت کے جدید ترین ہتھیار تیار ہوں۔

(۴) کپڑے وغیرہ کے کارخانے قائم کیے جائیں تاکہ مجاہدین ہندوستان کے چندوں پر انحصار کرنے کے بجائے اقتصادی طور پر خود کفیل ہو سکیں۔

(۵) پراپیگنڈے کے لیے ایک پندرہ روزہ اخبار "المجاہد" کا اجرا اور پریس کا قیام۔

---

[1] چمرکنڈ کے محلِّ وقوع اور ماحول کے بارے میں یہ الفاظ ہم نے "جرگہ اقوام سرحد" کی رپورٹ سے الفاظ مستعار لیے ہیں۔ یہ جرگہ مولوی محمد بشیر کی شہادت کے بعد یہ تحقیق کرنے بیٹھا تھا کہ اس میں مولوی فضل الٰہی کا ہاتھ تھا یا نہیں، حقیقی قاتل کون تھے اور انھوں نے کیوں شہید کیا تھا؟

اس منصوبے کا آغاز چمر کنڈ سے ہونا تھا، پھر اسے آہستہ آہستہ اسمست تک اور اُس کے بعد وزیرستان تک پھیلا دینے کا ارادہ تھا۔

منصوبے پر کام شروع ہوگیا۔ چمر کنڈ پہاڑوں میں گھرا ہُوا ہے۔ میدان ناپید ہے۔ مجاہدین اور مقامی باشندوں نے مل کر پتھریلے پہاڑ توڑے اور زمین فراہم کی۔ مدرسے، کُتب خانے، شفا خانے، اسلحہ، کپڑے اور چمڑے کے کارخانوں کے لیے فراخ، ہَوادار اور روشن عمارتیں تعمیر کیں۔ درس گاہ میں تعلیم شروع ہوگئی، خود مولوی صاحب درس دیتے۔ ۳۲۰۰۰ ہزار روپے سے ضروری مشینیں خریدنے کے آرڈر دے دیے۔ اخبار بھی چھپنے لگا۔ کارخانوں کی مشینیں مجاہدینِ پشاور کی طرف سے اُونٹوں پر لا رہے تھے کہ مُخبری ہُوئی اور وہ گرفتار کر لیے گئے۔ یہ عظیم منصوبہ تھا اور اگر عملی جامہ پہن سکتا تو اس کے اثرات بڑے دُور رَس ہوتے، لیکن اس مُخبری سے نامکمّل رہ گیا، تاہم درس گاہ اور پریس اپنا کام کرتے رہے۔

مولوی محمّد بشیر اس عرصے میں وزیرستان اور کابل میں ضروری کام انجام دے رہے تھے، وہاں سے لَوٹے تو چمر کنڈ کی امارت کے بارے میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ مولوی فضل الٰہی اختلاف کو ختم کرنے کے لیے امارت سے الگ ہوگئے اور مولوی محمّد بشیر نے قیادت کی باگ ڈور تھام لی۔ وہ شہید ہُوئے تو ذمّہ داری پھر مولوی فضل الٰہی کے کندھوں پر آپڑی۔ یہ دونوں حضرات بڑے دُور اندیش، مدبّر اور فعّال تھے اور ان کی تگ و دَو سے چمر کنڈ انگریزوں کے لیے سخت دردِ سر بن گیا۔ ایک طرف سرحدِ آزاد میں مجاہدین کی سرگرمیاں پھر سے جاری ہوگئیں، دوسری طرف برِّصغیر میں دعوت و تبلیغ اور رضا کاروں کی فراہمی کا کام تیز ہوگیا۔

مولوی محمّد بشیر کی پا[ل]یسی سے مولوی فضل الٰہی کو اس وقت سے اختلاف تھا جب وہ ابھی ہندوستان ہی میں تھے۔ اوّل الذکر تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے ہر وہ ذریعہ اور وسیلہ اختیار کرنے کے حامی تھے جس سے مقصد کی طرف تیزی سے پیش قدمی کی جا سکتی۔ اُنھوں نے سب سے پہلے افغانستان کے حکمرانوں کے ساتھ تعلّقات اُستوار کیے۔ یہ بات اُس عہد کے سیاسی منظر و پس منظر میں قابلِ اعتراض نہ تھی، لیکن جب رُوس میں

کمیونسٹ انقلاب برپا ہُوا تو انھوں نے اُن کے ساتھ روابط بڑھانے شروع کر دیے۔ اُن کے خیال میں مجاہدین، رُوسیوں کی مدد سے انگریزوں کے لیے زبردست خطرہ بن سکتے تھے۔ دوسری طرف مولوی فضل الٰہی کمیونسٹوں کے سخت مخالف تھے اور اُن سے مدد حاصل کر کے انگریزوں پر فتح پانے کو مجاہدین کی نہیں، کمیونسٹوں کی فتح سمجھتے تھے۔ کامیابی کے بعد حقیقی حکمران کمیونسٹ ہوتے جن کے شکنجے میں گرفتار ہو جانے کے بعد چھٹکارا ناممکن تھا اور پھر یہ پالیسی تحریک کے نصب العین سے بھی انحراف کے مترادف تھی۔ تحریک، برِصغیر میں اسلامی حکومت قائم کرنے اُٹھی تھی اور کمیونسٹ لادین ہی نہیں خدا اور مذہب کے کٹّر دشمن تھے۔

اس اختلاف نے خاموش کش مکش کی صُورت اختیار کر لی تھی۔ انگریز تو ایسے ہی زرّیں مواقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ ایک شام چمرکنڈ کی مسجد میں ایک نوجوان آیا۔ سترہ اٹھارہ سال کے پیٹے میں ہوگا۔ ابھی ڈاڑھی نکل رہی تھی۔ دُبلا پتلا، نحیف اور کمزور۔ اپنا نام عبدالحلیم بتایا اور کہا ضلع گورداس پور کا رہنے والا ہُوں۔ اُن دِنوں مولوی محمد بشیر کابل گئے ہُوئے تھے۔ واپس آئے تو عبدالحلیم اُن کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ مولوی صاحب نے حالات دریافت کیے۔ اُس نے بتایا: ”ماں باپ مر چکے ہیں، کچھ انگریزی پڑھ لی تھی، تلاشِ معاش کے سلسلے میں نکلا ہُوں، افغانستان جانا چاہتا تھا، پروانۂ راہداری نہ مل سکا، لہٰذا چمرکنڈ چلا آیا۔“

مولوی صاحب نے کہا: ”برخوردار افغانستان جا کر کیا کرو گے؟ یہیں رہو، دین کا کام کرو، اللہ معاش کا انتظام بھی کر دے گا۔“

عبدالحلیم نے قدرے تامّل کے بعد پیش کش قبول کر لی۔ مولوی صاحب نے قرآن مجید پر ہاتھ رکھ کر عہد لیا کہ وہ نہ تو احکامِ جماعت کی خلاف ورزی کرے گا نہ بدعہدی اور غدّاری کا ارتکاب۔ عبدالحلیم کے بارے میں مجاہدین مطمئن نہ تھے۔ وہ جب سے آیا تھا، عجیب سی حرکتیں کر رہا تھا۔ یا تو بالکل خاموش کسی سوچ میں ڈُوبا رہتا یا مرکزِ جماعت کا اس طرح چکر کاٹنے لگتا جیسے دیکھ رہا ہو کہ مختلف کمروں کا آپس میں کیا تعلق ہے، باہر آنے جانے

کے کون سے راستے ہیں، پہرہ کہاں کہاں لگتا ہے اور کب۔ کئی بار پہرے داروں نے اُسے بے مقصد اِدھر اُدھر گشت کرنے سے روکا۔ مولوی بشیر نے اُسے جماعت میں شامل کیا، تو ان لوگوں نے اپنے شکوک بیان کر دیے، لیکن مولوی صاحب نے کہا اِس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر میری تسلّی کر دی ہے، اب شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ مولوی صاحب اس پر بہت مہربان تھے۔ کھانے پینے اور دوسری ضروریات کا خصوصی خیال رکھتے۔ چائے اپنے ساتھ پلاتے۔ اس کی تعلیم کے لیے پشاور سے کتابیں منگوا کر دیں۔ چند روز کے اندر اندر عبدالحلیم، مولوی صاحب کا معتمد علیہ بن گیا۔ مولوی صاحب نے ایک کُتا بھی پال رکھا تھا جو رات کے وقت کسی کو مجاہدین کی بستی کے پاس نہ پھٹکنے دیتا۔ دن کے وقت بندھا رہتا تھا۔ پھر بھی کوئی اس کے قریب جانے کی ہمّت نہ کرتا، لیکن عبدالحلیم نے اُسے مانوس کر لیا۔ اکثر وہی کُتّے کو کھولتا اور باندھتا اور راتب اُس کے آگے ڈالتا۔

۱۳۵۲ھ کے رمضان المبارک کا چاند طلوع ہوا، تو مجاہدین کی اس ننھّی سی بستی میں نیکی کی بادِ بہاراں اور تیزی سے چلنے لگی۔ رات گئے تک تراویح پڑھی جاتی رہیں، پھر مجاہدین اپنی اقامت گاہوں میں جا سوئے۔ چمرکنڈ میں رات کو تین پہرے ہوتے تھے۔ پہرے کی ڈیوٹی عشا کی نماز کے بعد لگائی جاتی۔ اس وقت نہ اندر کا آدمی باہر جا سکتا نہ باہر کا اندر۔ مولوی محمد بشیر اپنے کمرے میں تنہا سوتے تھے۔ صرف کواڑ بند کر دیتے اور کُنڈی نہ لگاتے۔ سحری کے وقت ایک آدمی جگانے گیا۔ دروازہ کھولا، تو دیکھا مولوی صاحب دروازے کے سامنے لیٹے ہوئے ہیں۔ اُس نے دوسرے مجاہدین کو بُلایا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ لالٹین جلائی گئی۔ مولوی صاحب چارپائی کی پائنتی کی طرف زمین پر چت پڑے تھے۔ کسی نے انھیں بکرے کی طرح ذبح کر ڈالا تھا۔ عبدالحلیم غائب تھا۔ مزید دیکھ بھال کی، تو مولوی صاحب کا کُتّا چھت پر بندھا تھا اور اُن کے کمرے سے چار بندوقیں، ایک ریوالور اور ایک کابلی دُھسا غائب تھا۔ یقیناً اس قتل میں کچھ اور لوگ بھی شریک تھے۔ کچھ لوگوں نے شبہ کا رُخ مولوی فضل الٰہی کی طرف کر دیا، مگر وہ تین روز پہلے قرآن سُنانے چارمنگی چلے گئے تھے۔ پھر جرگہ بیٹھا اور تحقیقات کے بعد اُس نے فیصلہ دیا کہ مولوی فضل الٰہی کا اس سانحے میں کوئی ہاتھ نہیں۔

گکھڑ کے مولوی محمد یوسف نے ایک مرتبہ تنہائی میں اُن سے دریافت کیا کہ اس الزام میں کہاں تک صداقت ہے تو انھوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا: "یوسف! انشاء اللہ میں تجھ سے سچ کہتا ہوں اور اُس حاکموں کے حاکم اور جزا و سزا کے دن کے مالک کو جس کے سامنے ہم سب پیش کیے جانے والے ہیں گواہ کر کے کہتا ہوں میرا اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں اور میرا دامن اُن کے خون سے بالکل صاف ہے۔ اُن کے نزدیک یہ سازش انگریز کے ایجنٹوں نے تیار کی تھی جو چمرکنڈ کے اندر بھی موجود تھے۔ جرگے نے تو بعض افراد کے نام تک بیان کر دیے۔ اس طرح انگریزوں نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی۔ مولوی فضل الٰہی اور مولوی بشیر کے اختلافات سے کون واقف نہ تھا۔ انگریزوں کا خیال تھا قتل کی ذمہ داری مولوی فضل الٰہی پر ڈال دی جائے گی اور انھیں قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ یوں وہ اپنے دو بڑے دشمنوں سے نجات پالیں گے۔ عبدالحلیم پھر کہیں نظر نہ آیا۔ ایک روایت کے مطابق جن ہاتھوں میں وہ کھیل رہا تھا انھی نے اُسے پہاڑوں ہی میں ٹکڑے ٹکڑے کروا ڈالا اور یہ ٹکڑے یاغستان کے غاروں میں پھنکوا دیے۔

○

مولوی محمد بشیر نومبر ۱۹۳۴ء میں شہید ہوئے۔ اسمست اپنے "نئے رنگ" میں رنگ چکا تھا اور اُس نے چمرکنڈ کے خلاف بظاہر دکھائی نہ دینے والا محاذ قائم کر لیا تھا۔ ایک کش مکش تھی جو اندر ہی اندر جاری تھی۔ کبھی کبھی خون کے چھینٹے دامن کو رنگین کر جاتے مچھلی ہمیشہ سر کی طرف سے سڑنا شروع ہوتی ہے۔ تحریکیں زوال پذیر ہوتی ہیں تو سب سے پہلے ان کے رہنماؤں میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ پہلے نصب العین دھندلاتا اور پھر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ناسازگار اور معاندانہ ماحول میں منزل کی طرف بڑھنے کی لگن دم توڑ دیتی ہے۔ مصلحتیں جنم لینے لگتی ہیں۔ تگ و دو اور جدوجہد کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور اُس کی جگہ راحت کوشی اور تن آسانی لے لیتی ہے۔ رہنماؤں کی بے عملی یا مقصد سے انحراف رفتہ رفتہ پوری تحریک کو جمود اور مایوسی کی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اگر کچھ لوگوں میں نصب العین سے محبت ہوتی ہے اور وہ تحریک کے سفینے کو مصلحتوں اور سازشوں کی چٹان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے

ہیں، تو یہ رہنما ان کے خلاف جوڑ توڑ اور اکھاڑ پچھاڑ میں لگ جاتے ہیں۔ یہی کیفیت یہاں پیدا ہو چکی تھی۔ اس صورتِ حال سے کتنے ہی مخلص کارکن شکستہ دل ہو کر جمود کی موت شکار ہو گئے، کتنے ہی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا لقمہ بن کر انگریزی پولیس کے چنگل میں جکڑے گئے اور کتنے ہی حالات کے الجھاؤ سنوارنے کی اندھی تدبیریں کرتے ہوئے گولیوں کا ہدف بن گئے۔

اسمست اور چمرکنڈ دونوں ایک دوسرے کو شک اور بے اعتمادی کی نظروں سے دیکھتے۔ قیادت جب تک فعال اور اپنے نصب العین سے والہانہ وابستہ رہی برصغیر کے اندر اور سرحدِ آزاد میں تحریک کی سرگرمیاں انگریزی حکومت کے لیے جانکاہ آفت بنی رہیں۔ جنگِ امبیلا (۱۸۶۳ء) کے بعد ۱۹۱۵ء (امیر عبدالکریم کی وفات) تک مجاہدین نے انگریزوں سے پانچ جنگیں لڑیں۔ ان جنگوں میں انگریزوں کو اپنی ساری قوت جھونکنی پڑی۔ وہ مجاہدین کو ہر بار شکست دینے میں کامیاب رہے، تاہم ان کی قوت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکے۔ ایک چنگاری مسلسل سلگتی رہی جو موقع پاتے ہی بھڑک اٹھتی۔ امیر نعمت اللہ کے ابتدائی عہد میں صرف ایک دو جھڑپوں میں مجاہدین نے حصہ لیا۔ اس کے بعد اسمست کی آگ تو بالکل سرد ہو گئی، البتہ چمرکنڈ کی رگوں میں نصب العین سے لگن کی حرارت دوڑتی رہی۔ مولوی محمد بشیر اور مولوی فضل الٰہی کی اسٹریٹیجی اور سیاسی پالیسی میں اگرچہ بڑا فرق تھا، تاہم مقصد دونوں کی نگاہ میں رہا اور ان کی سرگرمیاں اسی محور پر گھومتی رہیں۔

مولوی محمد بشیر کی شہادت کے بعد مولوی فضل الٰہی نے چمرکنڈ کی امارت ہاتھ میں لی تو یاغستان اور برصغیر کے سیاسی حالات میں تغیر رونما ہو چکا تھا۔ امیر المجاہدین نے اپنے پہلے عہدِ امارت میں جس منصوبے پر عمل شروع کیا تھا، مولوی محمد بشیر چونکہ اس سے ہم آہنگ نہ تھے اس لیے اُن کے امیر بنتے ہی تقریباً وہ منصوبہ ختم ہو کر رہ گیا۔ بس ایک درس گاہ، وہ بھی محدود پیمانے پر، اب تک جاری تھی یا گاہے گاہے "المجاہد" کا ایک آدھ شمارہ چھپ جاتا۔ بدلتے ہوئے حالات نئے خطوط کار مرتب کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ برصغیر میں سیاسی زندگی نئی کروٹ لے چکی تھی۔ خفیہ تحریکوں کے بجائے اب علانیہ جدوجہد ہونے لگی تھی۔ اُدھر ہندو مسلم کش مکش ایک نیا موڑ مڑ گئی تھی۔ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ نافذ ہو گیا تھا اور مستقبل کے نقشے بننے لگے تھے۔ برصغیر کی

دونوں بڑی قومیں ـــــ ہندو اور مسلمان ـــــ اپنی تہذیبی روایات، مذہبی عقائد، اخلاقی اقدار، سیاسی افکار و تصورات، تاریخ، مزاج غرض ہر لحاظ سے ایک دُوسرے سے مختلف تھیں اور زندگی کے دو ایسے دھاروں پر رواں جو کسی سنگم پر آپس میں گلے نہیں ملتے۔ ایک مختصر اور مصنوعی یگانگت اور اتحاد کا دَور اِن پر طلوع بھی ہُوا، لیکن یہ مصنوعی خول بہت جلد ٹوٹ پھوٹ کر وقت کے صحرا میں گم ہو گیا۔ اب وہ ایک دُوسرے کے سامنے آ کھڑی ہُوئی تھیں۔ مُسلمان اقلیت ہونے کے ناطے اپنے تہذیبی و سیاسی مستقبل پر اکثریت کی تنگ دِلی، تعصب اور کینہ جوئی کے سایے منڈلاتے دیکھ رہے تھے۔ انڈیا ایکٹ کے تحت عام انتخابات ہُوئے اور برِصغیر کے اکثر صوبوں میں کانگرسی وزارتیں وجود میں آئیں تو اُن کے طرزِ عمل سے خطرات کے یہ سائے بھیانک حقیقت کی ادنیٰ جھلک میں تبدیل ہو گئے۔ ہندو اکثریت کے ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنے شب و روز کو صاف پڑھ لیا تھا اور پھر انھوں نے اپنے لیے وہ فیصلہ کیا جس نے آگے چل کر برِصغیر میں اسلام کی بنیادوں پر نظریاتی مملکت قائم کرنے کی تحریک کا رُوپ دھار لیا۔

مولوی فضل الٰہی نے بدلے ہُوئے حالات کے تقاضے محسوس کیے اور ان کی روشنی میں اپنی پالیسی بنائی۔ ابتدائی دو ایک سال تو انھیں سخت معاند شب و روز سے دوچار ہونا پڑا۔ انھیں مولوی محمّد بشیر کے قتل کے شبہ میں چمرکنڈ سے نکال دیا گیا تھا اور وہ ہجرت در ہجرت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیے گئے تھے لیکن رفتہ رفتہ مطلع صاف ہوتا چلا گیا، شبہات کے تاریک بادل چھٹتے گئے۔ جرگے نے اُنھیں بے گناہ قرار دے دیا۔ جرگے کی تحقیقات ہی کے دوران پتہ چلا کہ اس سانحے کے وقت اسمست کے حامی اور انگریزوں کے بعض جاسوس چمرکنڈ میں موجود تھے۔ بہرحال اسمست کو جو مقام ۱۹۲۶ء میں مولوی محمّد بشیر نے مصالحت کر کے پھر سے دے دیا تھا وہ اب بالکل چھن گیا۔ مجاہدین مولوی فضل الٰہی کے گرد جمع ہونے لگے۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک کا عرصہ یاغستان میں دَورے کرتے ہُوئے گزارا۔ اسی زمانے میں اُنھوں نے جمعیتِ احرار سرحدِ آزاد قائم کی اور اُس کے مختلف اجلاس منعقد ہُوئے۔ اسی دوران میں انگریزوں کے ساتھ کئی جھڑپیں ہُوئیں اور ایک جھڑپ

میں لارڈ بشٹ ایسا نمایاں شخص مارا گیا۔ ۱۹۳۸ء میں مولوی فضل الٰہی وزیرستان گئے اور فقیر ایپی کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہے۔

اسی اثنا میں انھوں نے برِصغیر کے خفیہ دورے کرنے کا انقلابی فیصلہ کیا۔ اُن کے دوروں کے دو مقصد تھے۔ اندرونِ مُلک تحریکِ مجاہدین کے مختلف مراکز اور کارکنوں سے رابطے کی تجدید (جو امارت سے الگ ہونے کے بعد پہلا سا نہیں رہا تھا) اور اُن میں رُوح تازہ پھونکنے اور دعوتِ جہاد کا دائرہ وسیع کرنے کے ساتھ ساتھ اُن کی اس انداز میں تنظیم کہ رضا کاروں کی بھرتی اور روپے کی فراہمی کا سلسلہ از سرِ نو پُوری قوت سے شروع ہو سکے۔ ہندو قوم سے کش مکش جو رنگ اختیار کر چلی تھی اُس کے پیشِ نظر مسلح جدّوجہد کی ضرورت کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا تھا اور امیر المجاہدین اُس لمحے سے نبٹنے کے لیے مُجاہدین کو تیار رکھنا چاہتے تھے۔ دُوسرا کام انھوں نے ان دوروں میں یہ کیا کہ تحریکِ پاکستان کے حق میں ذہنوں کو ہموار کرنے کی سعی و جہد کی۔ اس طرح تحریک کو کٹھن مرحلوں میں پُرجوش اور سرگرم کارکن فراہم کیے جنھوں نے مُسلمانوں کے اندر کانگرس کے حامی عناصر کی قوت توڑنے اور سلہٹ اور سرحد کے ریفرنڈم جیتنے میں اہم کردار ادا کیا۔

○

مارچ ۱۹۴۰ء کی ۲۳ تاریخ تھی۔ آغازِ بہاراں کے دن تھے۔ زندگی حُسنِ مجسّم بنی ہُوئی تھی۔ خزاں زدہ درخت سرسبز و شاداب زندگی کا پیرہن اوڑھ چلے تھے۔ کونپلیں پھُوٹ رہی تھیں۔ اس بہار میں خُونِ شہیداں کی سُرخی نے مزید رنگ بھر دیا تھا۔ چار روز پہلے برطانوی سامراج اور اُس کے کارندوں نے خاکساروں کو نہایت بہیمانہ انداز میں خاک و خوں میں لوٹا دیا تھا۔ لاہور کا چہرہ خُون آلود تھا اور فضا غمناک۔ ایسے عالم میں برِصغیر کے مُسلمان اپنی تاریخ کا ایک اہم فیصلہ کرنے چلے تھے، فیصلہ جو پُورے برِصغیر کی تاریخ کا دھارا بدل دینے والا تھا۔ شاہی مسجد کے سایے تلے منٹو پارک کی وسعتوں میں ہیجبر سے راس کماری تک پھیلی ہُوئی اُمتِ مسلمہ کی امنگوں کا شعور خیمہ زن تھا۔ ایک لاکھ کے اس تاریخی اجتماع میں وہ تاریخی قرارداد منظور کی گئی جو مُسلمانوں کا نصب العین بنی اور جو

قرار دادِ پاکستان کے نام سے مشہور ہے۔ مُسلمانوں کے دِل ۱۹ مارچ کے خُونیں حادثے سے مجرُوح اور غمزدہ تھے، مگر جب قرار داد منظور ہُوئی تو ان میں جوش وخروش کی ایک نئی رُوح پوری رَو دَوڑ گئی۔ یُوں محسوس ہُوا کہ وہ جس منزل کی تلاش میں تھے، وہ بالکل سامنے کھڑی اُنھیں دعوت دے رہی ہے کہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے کام لو اور تپتے ہُوئے صحرا سے نکل کر زندگی بخش چھاؤں تلے پہنچ جاؤ۔ پنڈال دیر تک جذب وجنوں کے نعروں سے گونجتا رہا....

پنڈال کے ایک گوشے میں ایک ملنگ بھی بیٹھا تھا، لمبی ڈاڑھی، بڑی بڑی مُونچھیں، کندھوں پر لٹکتی ہُوئی زُلفیں، نصف پنڈلیوں کو چھُوتا ہُوا کُرتا، سر پر درویشی کلاہ، ہاتھ میں موٹے دانوں کی مالا، پاؤں میں دیسی جُوتے۔ دیکھنے میں بالکل اَن پڑھ لگتا تھا جیسا کہ ملنگ ہُوا کرتے ہیں، لیکن ان تاریخی لمحات کا فسوں اس کے چہرے پر اتنا گہرا نقش تھا کہ صاف پڑھا جاتا تھا۔ اس کی نگاہیں دُور اسٹیج پر جمی ہُوئی تھیں جہاں ایک دُبلا پتلا شخص کرسئ صدارت پر جلوہ افروز تھا۔ پنڈال میں مَوجزن ذوق وشوق کے زیروبم کے ساتھ ساتھ ملنگ کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ، دِل میں اُمڈنے والے جذبات کی غمازی کر رہا تھا ——— اور جب یہ تاریخی اجلاس برخاست ہُوا تو وہ ملنگ لاکھوں کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔

دس گیارہ ماہ بعد کولوٹولہ (کلکتہ) کی مسجد میں یہی ملنگ وارد ہُوا۔ اُس نے مسجد کے امام اور خطیب علامہ محمد یُوسف سے تنہائی میں مُلاقات کی اور اُن کے کان میں کچھ ایسا منتر پھُونکا کہ وہ اسی کا دم بھرنے لگے۔ اُنھوں نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھایا اور عرض کی: "حضرت، غائبانہ ارادت مندی تو پہلے سے تھی اب براہِ راست بَیعت کی سَعادت نصیب ہو جائے۔" ملنگ نے بَیعت لی اور پھر جس حجرے میں وہ مقیم تھا وُہ پُراسرار سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ لوگ آتے تنہائی میں باتیں ہوتیں اور رُخصت ہوتے تو سوز وسرور کی عجب کیفیات سے سرشار۔ ان میں ہر طبقے کے افراد شامل تھے۔ تاجر، پیشہ ور، صنعت کار، ملازم، سیاسی اور سماجی کارکن، طالب علم اور علمائے دین۔ حیران کُن بات یہ کہ یہ سب مَسلک کے لحاظ سے اہلِ حدیث تھے بلکہ انگریز کی وضع کردہ کرخت اصطلاح میں "وہابی"، جو پیری فقیری کے قائل نہیں ہوتے۔ ملنگوں اور مذہب کا لبادہ اوڑھے ہُوئے

اس قسم کے دُوسرے افراد اور ان کے کاروبار کو تو اُن کا ذہن قبول ہی نہیں کرتا۔ ملنگ کے ہاتھ پر بیعت کرنے والوں میں راغب احسن بھی تھے۔ تیس بتّیس برس کے نوجوان تھے، قدیم و جدید علوم کے فاضل۔ بنگال مُسلم لیگ کے سیکرٹری تھے۔ لاہور کے تاریخی اجلاس میں بنگالی مندوبین کے ساتھ شریک ہُوئے تھے اور اب پُوری سرگرمی کے ساتھ تحریکِ پاکستان کا کام کر رہے تھے۔ ملنگ جب تک کلکتے میں رہا راغب احسن اُس کے حلقوں میں رہے۔

علاّمہ محمّد یُوسف ہر اتوار کو درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ پچھلے کئی ہفتوں سے ایک نوجوان بڑی پابندی کے ساتھ اُن کے درس میں حاضری دے رہا تھا۔ وجیہ و شکیل، سُرخ و سپید رنگ، میانہ قامت، چوڑا چکلا سینہ، چھوٹی سی کالی سیاہ ڈاڑھی، مضبوط ہاڈ کاٹھ۔ نوجوان کا ذوق و شوق دیکھ کر علاّمہ نے اُس کے احوال کریدے۔ پتہ چلا عبدالغنی نام ہے اور قصور کا رہنے والا۔ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتا ہے جس کو غیرتِ دیں اور شوقِ جہاد و غزا ورثے میں ملا ہے۔ خاندان کے بزرگ اپنے وقت کے شیخ حافظ محمّد لکھویؒ کے ارادت مند ہیں اور جماعتِ مجاہدین سے وابستہ۔ روزگار کی تلاش میں آیا ہے اور پنجابیوں کے ایک کارخانے میں ملازم ہے۔ علاّمہ ان احوال سے بڑے متاثر ہُوئے اور نوجوان کی طرف خصوصی توجہ مبذول فرمانے لگے۔ ایک روز اُنھوں نے عبدالغنی سے فرمایا "آج ہم تمھیں ایک بزرگ سے ملواتے ہیں۔" وہ اُسے حُجرے میں لے گئے اور ملنگ سے ملوایا۔ ملنگ دیر تک اُس سے گھر بار کے حالات پُوچھتا رہا۔ نوجوان جیسے جیسے اپنے کوائف بیان کرتا گیا ملنگ کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ جب اُس نے بتایا کہ اُس کا خاندان حافظ محمّد لکھویؒ کے دامنِ فیض سے وابستہ تھا اور صُوفی ولی محمّد فتوحی والے اُن کے ہاں آیا جایا کرتے تھے تو ملنگ کے چہرے پر مسرّت کا نور پھیل گیا۔ عبدالغنی شاید چہرے کے تاثرات نہ پڑھ سکا، بڑے ادب سے عرض کی!

"حضرت، مَیں اسمِ مُبارک دریافت کر سکتا ہُوں؟"

"میرا نام محمّد ابراہیم ہے اور اجمیر شریف کا ملنگ ہُوں۔"

علاّمہ یُوسف نے عبدالغنی سے کہا "اِن بزرگ کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کر لو۔ غیرت کے حق سے وہ تقریباً بچھڑ گیا ہے ... ملنگوں وغیرہ کو اپنا

مرشد تسلیم نہیں کرتے، حیرت ہے آپ پر، اہلِ حدیث ہوتے ہُوئے مجھے ایسا مشورہ دے رہے ہیں!" عبدالغنی کا چہرہ فرطِ جذبات سے سُرخ ہوگیا۔ علّامہ محمّد یُوسف کچھ مزید کہے بغیر اُٹھے اور حجرے سے نکل آئے۔ عبدالغنی بھی ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ کئی ہفتے گزر گئے۔ عبدالغنی بلاناغہ درسِ قرآن میں حاضر ہو رہا تھا۔ اس دوران میں علّامہ نے اُسے کئی بار بیعت کی ترغیب دی اور جہاد سے مزیّن زندگی کی فضیلت بیان کی اور ملنگ کی مجلس میں لے گئے، لیکن عبدالغنی اپنے موقف پر قائم تھا۔ ایک روز اُس نے صاف صاف کہہ دیا: "مَیں تو مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی کے ہاتھ پر بیعت کروں گا۔ مَیں نے آزاد ریڈیو سے سُنا ہے وہ یاغستان سے رُوس کے راستے یُورپ چلے گئے ہیں، مِل گئے تو انھیں کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دوں گا۔" ملنگ اور علّامہ محمّد یُوسف کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسّم نمودار ہُوا جس کا احساس عبدالغنی کو نہ ہو سکا ——— آخر ایک روز اُس نے ملنگ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، اس شرط پر کہ جب بھی امیر المجاہدین سے ملاقات کا شرف حاصل ہُوا اِس بیعت کو فسخ کر دُوں گا اور اُن کا دامنِ ارادت تھام لُوں گا۔ بیعت کرتے وقت ملنگ نے نوجوان سے جو عہد لیا اُس نے اُسے پہلی مرتبہ چونکا دیا۔ عہد کے الفاظ ایک ملنگ کے مُنہ سے بہت عجیب سے لگ رہے تھے..... وہ نماز کی پابندی کرے گا..... اَللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے گا، اپنی زندگی میں ایک انگریز کو ضرور قتل کرے گا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، ہندوستان میں منہاجِ نبوت پر اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کرے گا اور جہاد کا وقت آئے گا تو اپنا گھربار، جان اور اولاد ہر شے حق کی راہ میں قربان کر دے گا.....

نوجوان عبدالغنی عجیب وغریب تجربے سے دوچار ہُوا تھا۔ وہ کئی روز تک سوچتا رہا ایسی باتوں سے کسی ملنگ کو کیا سروکار ہو سکتا ہے؟ کلکتے سے قصور واپس آیا تو مولانا عبدالقادر قصُوری کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ مولانا اپنے عہد میں پنجاب کے مشہور ممتاز وکیل اور تحریکِ خلافت کے رُوحِ رواں تھے، تحریکِ مجاہدین سے تعلّق باپ سے میراث میں ملا تھا جو بیٹوں (مولوی محی الدین احمد اور مولانا محمّد علی کینٹب) تک پہنچا۔ بڑے

حق پسند اور مخلص انسان تھے۔ ملک و ملت کی بے لوث خدمت کرتے۔ بے غرضی کا یہ عالم کہ پنجاب کی مجلس خلافت کے صدر کی حیثیت سے جو دورے کرنے پڑتے اُن کے مصارف خود اُٹھاتے۔ اپنے مصارف ہی نہیں اپنے ساتھیوں کا کرایہ بھی ادا کرتے۔ مجلس کے فنڈ سے کھانا تک کبھی نہ کھایا۔ ترکِ موالات کی تحریک چلی تو وکالت چھوڑ دی اور ہزاروں روپے کی آمدنی سے دست کش ہو گئے۔ حج پر گئے تو سلطان عبد العزیز آلِ سعود نے حجاز میں وزارت کا منصب پیش کیا، لیکن معذرت کر دی۔ صاحبزادے کو پتہ چلا تو کہا: "ایک اسلامی مملکت کی خدمت تھی، پیش کش قبول کر لیتے۔" فرمایا: "محمد علی، میرے لیے تین ہزار روپے ماہوار کا مستقل انتظام کر دو، میں واپس جا کر بارِ خدمت اُٹھا لیتا ہوں، لیکن سلطان سے تنخواہ لے کر میرے لیے خدمت کرنا ممکن نہیں۔ اسلام اور مسلمانوں کی بہتری اور ملکی مصالح کے پیشِ نظر جو کچھ ضروری ہو گا سلطان سے اسی صورت میں صاف صاف کہہ سکوں گا جب اُس کی حکومت کا کوئی احسان میرے سر پر نہ ہو گا۔" عبد الغنی نے کلکتے کے واقعات اور اجمیری ملنگ سے ملاقاتوں کی رُوداد بیان کی تو مولانا عبد القادر نے فرمایا: "بیٹا، وہ اجمیری ملنگ نہ تھا، امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی تھے۔" اِس انکشاف نے عبد الغنی کو بے چین کر دیا۔ چند روز بعد امیر المجاہدین کی خدمت میں حاضر ہونے کا شوق اُسے کشاں کشاں پھر کلکتے لیے جا رہا تھا۔

○

یہ ملنگ مولوی فضل الٰہی ہی تھے۔ ۱۹۴۱ء کا پُورا سال اُنھوں نے اسی بھیس میں بنگال اور بہار کا دورہ کرتے ہُوئے گزارا۔ جماعتِ مجاہدین کو از سرِ نو منظم کیا۔ جگہ جگہ جماعت کی شاخیں قائم کیں۔ صوبہ بنگال کی امارت علامہ راغب احسن کو سونپی۔ اسی زمانے میں راغب صاحب نے مولوی صاحب کی مُلاقات قائدِ اعظم اور مُسلم لیگ کے بعض دوسرے اکابر سے کروائی۔ امیر المجاہدین اور اُن کے پیشرو ایک سو بیس برس سے جس مقصد کی خاطر جدّوجہد کرتے رہے تھے اُنھیں اس کی تکمیل پاکستان کی صُورت میں ہوتی نظر آئی۔ اُنھوں نے پاکستان کی حمایت اور اس کے حصول کی جدّوجہد میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا ـــ جنگ کا الاؤ پوری شدت سے بھڑک اٹھا تھا۔ اس کی لپٹیں یورپ اور ایشیا کے وسیع خطّوں میں پھیل گئی تھیں۔ جرمن افواج مشرقی اور مغربی یورپ کو پامال کر کے رُوس کے قلب میں بڑھتی چلی جاتی تھیں۔ رُوسی ہر محاذ پر بُری طرح شکست کھا رہے تھے۔ اِدھر ہندوستان جاپانی حملے کی براہِ راست زد میں تھا۔ ملایا شکست کھا چکا تھا، برما لہولہان جاپانی فوجوں کے قدموں میں پڑا تھا، جزائر انڈمان پر بھی اُن کا پرچم لہرا رہا تھا، وزیگاپٹم اور کلکتہ جاپانی طیّاروں کی جولانیوں کا ہدف بن چکے تھے اور برِّصغیر کے مشرقی ساحل پر خوف اور افراتفری کا سماں تھا۔ سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج، جاپانیوں کی مدد سے وجود میں آچکی تھی۔ ہندوستان میں زمانۂ جنگ سے بہت پہلے سے سیاسی بیداری کی لہریں جوش زن تھیں۔ ہندو اور مُسلمان دونوں قومیں اب واضح نصب العین اور عزائم کے ساتھ اپنے اپنے انداز میں سرگرمِ عمل تھیں، برطانوی وزیرِ اعظم سر ونسٹن چرچل نے ہندوستانیوں کو مطمئن کرنے کے لیے اعلان کر دیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے گا۔ اِس اعلان میں برطانوی حکومت نے مُسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا؛ تاہم ہندو لیڈر جانتے تھے کہ انگریزوں نے جنگ جیت بھی لی تو جنگ کی خاکستر سے جو جہانِ نَو پیدا ہوگا اُس میں مُسلمان ایک ایسی قوّت بن کر اُبھریں گے کہ برطانوی حکومت کو ان کے مطالبے پر توجّہ دینی ہی پڑے گی؛ چنانچہ اُنھوں نے جاپانیوں کے ہاتھوں گھائل برطانوی قوّت پر آخری ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع کر دی ـــ اس تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے وہ ہندوستان بھر میں توڑ پھوڑ کر رہے تھے اور نیم بغاوت کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔

مولوی فضل الٰہی کی بصیرت نے اس تحریک میں مضمر خطرات کو بھانپ لیا۔ اُنھوں نے آنے والے دنوں کے لیے یورپ کی محوری طاقتوں سے مذاکرات کر کے معاہدہ طے کرنا ضروری سمجھا؛ تاکہ جاپانیوں کی مدد سے سبھاش چندر بوس اپنی آزاد ہند فوج کے ساتھ ہندوستان میں قدم جمانے کی کوشش کریں تو شمال مغربی سرحدوں سے

مجاہدین اور ان کے حلیف قبائل بھی حرکت میں آجائیں اس طرح نئے حالات میں مسلمان قوم اپنا وزن محسوس کروا سکے۔ مولوی صاحب بیرونِ ملک حج کے موسم ہی میں جا سکتے تھے۔ اس سے پہلے وہ عبدالرزاق کابلی کے نام سے ۱۹۳۹ء میں بھی حج کر کے آئے تھے اور اب بھی یہی ایک راستہ تھا، چنانچہ وہ حج پر روانہ ہو گئے۔ غالباً ان کا ارادہ حج بیت اللہ سے فارغ ہو کر اٹلی اور جرمنی جانے کا تھا، لیکن دورانِ سفر انھیں اپنا پروگرام بدلنا پڑا۔

برطانوی انٹیلی جنس عام دنوں میں بھی چوکس رہا کرتی تھی، اب تو جنگ کے ایام تھے۔ برطانیہ کی زیرِ نگیں خشکی اور سمندر میں ہر جگہ اس کا جال بچھا ہوا تھا۔ خفیہ پولیس کے چاق چوبند آدمی مسافروں پر کڑی نظر رکھتے۔ زائرینِ بیت اللہ کے جہاز پر بھی وہ حاجیوں کے بھیس میں نگرانی کر رہے تھے۔ بمبئی سے جہاز کو روانہ ہوئے دو دن ہو چکے تھے کہ ایک بوڑھا مولوی فضل الٰہی کے پاس آیا۔ علیک سلیک کے بعد بڑی نیازمندی سے جذب و شوق کی باتیں کرتا رہا اور پھر احوال کریدنے کی کوشش کی۔ نام کیا ہے؟ کہاں سے آرہے ہیں؟ کس جہاز سے واپس جائیں گے؟ مولوی صاحب کی ساری عمر اسی خارزار کی آبلہ پائی میں گزری تھی، انھیں شکار کرنے کے لیے قدم قدم پر دام بچھائے گئے تھے۔ اپنے اللہ کی نصرت و کرم سے کتنی ہی بار وہ ان کے عیار حلقوں میں گرفتار ہوتے ہوتے بچے تھے۔ شاعر نے شاید انھی کے احوال کی عکاسی کی تھی جب کہا تھا۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

اُن کی نورِ فراست سے جلا پائی ہوئی نگاہیں انسان کے ظاہری پیکر کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر اندر چھپے ہوئے وجود کو بھانپ لیتی تھیں۔ انھیں اس ذاتِ شریف کو پہچاننے میں ذرا دقت نہ ہوئی، تاہم بڑے سکون و طمانیت اور بے نیازی سے جواب دیا: "میرا نام حمید الدین ہے، اجمیر شریف کا ملنگ ہوں، حج پر جا رہا ہوں، واپسی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" بوڑھے نے بڑی گہری نظر سے گھورتے ہوئے انھیں دیکھا اور بولا: "میں نے پہچان لیا ہے، کیا آپ فضل الٰہی نہیں ہیں؟ ۱۹۱۴ء میں میں نے ہی آپ کو گرفتار کیا تھا اور آپ تین سال

جالندھر جیل میں رہے تھے۔"

"وہ کوئی اور ہوگا۔" امیر المجاہدین نے کہا۔ "تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ملنگ آدمی ہوں، مجھے تمہاری باتیں بڑی عجیب لگتی ہیں، ملنگ کو اِن سے کیا سروکار؟" انٹیلی جنس کے افسر نے پھر ایک گہری نظر آپ پر ڈالی اور چلا گیا۔

امیر المجاہدین، عبدالغنی سے ملے اور آہستہ سے فرمایا: "بیٹا! گرفتاری کا خطرہ ہے! آپ لوگ ہوشیار رہیں۔" پھر اسی وقت وضو کیا، دو رکعتیں پڑھیں اور اپنے اللہ کے آگے دستِ استمداد پھیلا دیا: "اے پروردگار، تیرے گھر کی زیارت کے لیے نکلا ہوں، ہندوستان کے دارالکفر کو دارالاسلام بنانے کی کوشش کر رہا ہوں، اس میں کامیابی عطا کر اور دشمن کے شر سے محفوظ رکھ ....." پھر سجدے میں گر گئے، دیر تک روتے رہے یہاں تک کہ بے ہوشی طاری ہو گئی۔ ہوش میں آئے تو فرمایا: "اللہ نے ایک تدبیر سجھائی ہے ...... ہم اپنے تئیں اُسی ذاتِ رحیم و کریم کے حوالے کرتے ہیں۔"

جدہ کی بندرگاہ پر اُترے تو مولوی فضل الٰہی بھیس بدل کر حاجیوں کے ہجوم میں چھپتے چھپاتے بندرگاہ سے نکلے اور پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر سیدھے اٹلی کے سفارتخانے پہنچ گئے۔ وہاں اپنا تعارف کرایا اور کہا وہ ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں مسولینی اور ہٹلر سے ملنا چاہتے ہیں۔ اطالوی سفیر اُن کے نام اور کام سے پہلے سے واقف تھا۔ آزاد ریڈیو پر اقبال شیدائی اکثر ان کی اس جدوجہد کا ذکر کرتے رہتے تھے جو وہ انگریزوں کے خلاف وطن کی آزادی اور اسلام کی سربلندی کے لیے گزشتہ چالیس برس سے کر رہے تھے۔ اُس نے اُنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور تینوں افراد کے ہوائی سفر کا انتظام کر دیا۔

اٹلی پہنچ کر امیر المجاہدین، افغانستان کے معزول حکمران امان اللہ خان کے مہمان ہوئے۔ انھی کی وساطت سے مسولینی کے ساتھ ملاقات ہوئی۔ مجاہد یعقوب بڑے لمبے تڑنگے تھے۔ مسولینی اُن کا قد و قامت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ یورپ کے کسی بھی قد آور شخص سے تاڑ کے درخت کی طرح بہت بلند تھے۔ بے ساختہ پکار اُٹھا: CAMEL OF MUJAHIDIN!

(مجاہدین کا اُونٹ[1])

روسنۃ الکبریٰ سے امیرالمجاہدین برلن پہنچے وہاں ہٹلر سے ملاقات ہوئی اور مجاہدینِ چمرکنڈ کے امیر کی حیثیت سے انھوں نے جرمنی کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ معاہدے کے مندرجات ابھی تک سامنے نہیں آسکے۔ اس عظیم تحریک کے دورِ آخر سے تعلق رکھنے والی بہت سی دوسری دستاویزات کی طرح یہ اہم دستاویز بھی تحریک کے پسماندگان کی بے توجہی یا شاید کم مائیگی کے "آرکیوز" میں مدفون ہے، تاہم اُس وقت کے سیاسی ماحول، بین الاقوامی سالات، جرمن افواج کی فتوحات کے سیلِ رواں اور اتحادیوں کی ہر محاذ پر شکست اور پسپائی کے پس منظر میں اس کا ایک ہلکا سا تصور کیا جاسکتا ہے۔ یقیناً یہ ایک انقلاب انگیز معاہدہ ہوگا۔ غازی عبدالغنی اپنی قلمی یادداشت میں صرف اتنا بتاتے ہیں کہ امیرالمجاہدین نے ہندوستان کو آزاد کرانے کا ایک ہمہ پہلو منصوبہ ہٹلر کے سامنے پیش کیا تھا جسے دیکھ کر وہ خود اور اُس کے فوجی مشیر اس مردِ درویش کی فوجی معاملات پر ماہرانہ نگاہ کے قائل ہوگئے۔ یہ معاہدہ اسی منصوبے کی روشنی میں ہوا تھا۔[2]

ملاقات کے بعد امیرالمجاہدین اور ان کے ساتھی، طیارے کے ذریعے اٹلی پہنچے اور وہاں سے جدہ۔ اور پھر احرام کا کفن بدن پر لپیٹے لَبَّیْكَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْكَ (حاضر ہوں اے اللہ میں حاضر ہوں) کی والہانہ پکار بلند کرتے ہوئے اپنے رب کی چوکھٹ پر سرنگوں ہوتے۔ وہ اس مقامِ عظیم پر کھڑے تھے جو مہبطِ وحیِ الٰہی تھا، جہاں سے اسلام کا آفتاب اُبھرا تھا جس کی شعاعیں تاریکیوں کا سینہ چیرتی ہوئی دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئی تھیں۔ اب جاہلیت اور ظلم و ستم کے اندھیارے پھر چھائے جاتے تھے۔ طرابلس (لیبیا)، سوڈان، الجزائر، عرب اور ہندوستان ہر جگہ پچھلی صدی ڈیڑھ صدی سے اہلِ حق و صدق ان کرتوں

---

[1] مصنف کو بھی امیرالمجاہدین کی صحبت میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہ روایت اُس نے اُن کی زبان سے خود سنی۔

[2] ہٹلر سے ملاقات کا تذکرہ امیرالمجاہدین نے مصنف سے بھی کیا تھا۔ غازی عبدالغنی جو اس سفر میں ان کے ہمرکاب تھے، ان کی روایت ہے کہ اس موقع پر جو معاہدہ ہوا وہ بھی مجاہدین کے پاس ہے۔

کی حرارت دِلوں میں سمیٹے، اپنے لہو کے چراغ جلائے اِن بڑھتے اُمڈتے اندھیروں سے جنگ لڑ رہے تھے۔ امیر المجاہدین سراپا سوز و درد تھے۔ اپنے رب کی حضوری میں پہنچ کر تو اُن کا عالم ہی اور تھا۔ ان کی راتیں کعبۃ اللہ میں رکوع و سجود اور اُمّت کے لیے دُعا و التجا میں گزرتیں اور دِن طواف و سعی اور عالمِ اسلام کے گوشے گوشے سے آئے ہُوئے افرادِ اُمّت سے ملاقاتوں اور مذاکرات میں۔ انھوں نے والیٔ نجد و حجاز سُلطان عبدالعزیز آلِ سعود سے بھی ملاقات کی۔ سُلطان آپ کی شخصیّت سے بے حد متاثر ہُوئے اور کئی روز تک سرکاری مہمان رکھا۔

حج سے فارغ ہو کر امیر المجاہدین نے مدینہ منورہ میں حاضری دی۔

اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اس دو عالم سے خوشتر سرزمین میں پہنچ کر ان کی والہیت اور گرمیٔ جذب و شوق کو ایک نیا رنگ مل گیا۔ یہ وہ آستانِ فیض ہے جہاں آنے والے اپنے اپنے شوق و وجدان اور آگہیِ قلب و نظر کے مطابق زندگی سے بہرہ یاب ہو کر جاتے ہیں۔ زہد و ورع کے پیکر اس آستانے پر اُس حقیقی زہد و ورع سے آشنا ہوتے ہیں جو گنبدِ خضرا کے مکیں صلّی اللہ علیہ وسلّم کے لائے ہُوئے پیغام کا مقصود و مطلوب اور خود حضور سرورِ عالمؐ کی اپنی حیاتِ مطہّرہ کا رنگِ جمال تھا، تصوّف و طریقت کے سالکوں پر احسان و شریعت کی راہیں آشکارا ہوتی ہیں، محبّت کے متوالوں پر عشق و جنوں کے حقیقی معانی کھلتے ہیں، زیست کی زلفیں سنوارنے والوں کو مشاطگی کا وہ سامان عطا ہوتا ہے جو کہیں اور سے دستیاب نہ پہلے کبھی ہُوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا اور حق و صداقت کا پرچم بلند کرنے اس راہ میں جدّ و جہد کرنے اور اپنے لہو کا نذرانہ پیش کرنے کی تمنّا رکھنے والے اصحابِ صبر و عزیمت کی اُن امثال سے بہرہ ور ہوتے ہیں جو اس سرزمین کے چپّے چپّے پر نقش ہیں۔

امیر المجاہدین کی زندگی میں یہ سارے رنگ مل کر ایک رنگ —— صبغۃ اللہ میں ڈھل گئے تھے اور اب وہ اس رنگ کو مزید گہرا کرنے کے لیے اس مقدّس آستانے اور اُس کی پاکیزہ فضا کے ایک ایک ذرّے کو اپنے اندر جذب کر رہے تھے۔ اُن کا تعلق اس آستانے

قافلے سے تھا جو برِصغیر میں اسلام کو سربلند کرنے اور اُس کی حکومت قائم کرنے اُٹھا تھا۔ یہ قافلہ اسی قافلۂ عشق کی گرد تھا جو اِس مقدس شہر سے پونے چودہ سَو برس پہلے روانہ ہُوا تھا۔ وہ تصور ہی تصور میں ان مجاہدینِ حق کو قطار اندر قطار اِس مقدس شہر سے نکلتے دیکھ رہے تھے جن سے زیادہ امن پسند، حق پرست، مظلوموں کے حامی اور پاک دل و پاکباز انقلابی چشمِ فلک، نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ وہ حق و صداقت کی تلوار لہرائے مشرق و مغرب میں پھیلتے جا رہے تھے۔ ان کی یلغار کے آگے نہ دشوار گزار پہاڑ مزاحم ہو سکے نہ طوفانی دریا اور سمندر۔ نہ رنگ و نسل اور زبان کی دیواریں حائل ہو سکیں اور نہ جغرافیائی حدیں اور نہ صدیوں کی جمی ہُوئی تہذیبی و تمدّنی قدریں اور روایات۔ یہ تلوار جہاں چمک گئی کفر و باطل کی دُنیا خاکستر ہو کر رہ گئی، ظلم و ستم کا دَور ختم ہو گیا، اِنسانوں پر اِنسانوں کی خُدائی جاتی رہی اور ایمان و اخلاق کی بنیادوں پر تہذیب و تمدّن کے ایک نئے دَور کا آغاز ہو گیا۔ امیر المجاہدین اپنے پیشرووں کی طرح اسی دَور کو از سرِ نَو ایک اجتماعی قوت کا رنگ دینے کی تگ و دَو کر رہے تھے۔ اُن کی ساری عُمر اسی جدّوجہد میں گزری تھی۔ وہ دیارِ حبیبؐ میں اپنے اندر ایک نئی زندگی پا رہے تھے اور جب مدینہ منوّرہ سے پھر ملنگ حمید الدّین کے بھیس میں زنجیرِ غلامی میں جکڑے ہُوئے وطن کی طرف روانہ ہُوئے تو اُن کا بُوڑھا دِل تازہ اُمنگوں سے سرشار تھا۔

○

۱۹۴۳ء کے اوائل میں امیر المجاہدین ارضِ حرمین شریفین سے واپس آئے۔ اگلے چار برس انھوں نے سرگرم مگر خاموش جدّوجہد میں گزارے۔ ان کی یہ تگ و دَو تحریکِ پاکستان کے لیے دینی حلقوں کی تائید حاصل کرنے اور مُسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں منظم کرنے پر مرکوز رہی۔ اِس مقصد کے لیے انھوں نے دُور دراز علاقوں کا سفر کیا۔ انگریزی حکومت کو خبر مل چکی تھی کہ وہ چمرکنڈ سے ہندوستان منتقل ہو چکے ہیں۔ قدم قدم پر اجنبی متجسّس آنکھیں اُنھیں گھُورتی ہُوئی ملتیں، لیکن سارے خطرات کو انگیز کرتے ہُوئے اُنھوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ راجپوتانہ، بنگال، بہار، سی پی، یوپی اور حیدر آباد دکن تک کا دَورہ کیا اور ان علاقوں میں جگہ جگہ جماعت مجاہدین کی شاخیں قائم کیں۔ راغب احسن، بنگال کے امیر تھے، حیدر آباد

دکن میں نواب بہادر یار جنگ نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور امیر المجاہدین نے انھیں دکن کا امیرِ جماعت بنایا۔ اسی زمانے میں قائدِ اعظم اور دوسرے مسلم لیگی رہنماؤں سے کئی ملاقاتیں کیں جن میں پاکستان کے مستقبل اور اُس میں قائم ہونے والے نظامِ حکومت پر گفتگو ہوئی۔ امیر المجاہدین نے اس سلسلے میں نظامِ کار بھی پیش کیا جس کی غرض و غایت پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا اور سید بادشاہ اور ان کے ساتھیوں نے جس مقصد کے لیے خون کے نذرانے دیے تھے اُسے پورا کرنا تھی۔ اِس مسودے پر سُہروردی صاحب سے کلکتے میں اُن کی کوٹھی پر رات ایک بجے سے صبح چار بجے تک بحث ہوتی رہی۔ پھر اِس پر دہلی میں قائدِ اعظم کی کوٹھی پر غور و خوض ہوا اور آخرکار جماعتِ مجاہدین اور قائدِ اعظم کے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔

معاہدے کے بعد جماعت کے کارکن مختلف علاقوں میں پھیل گئے اور تحریکِ پاکستان کا پیغام گاؤں گاؤں شہر شہر پہنچایا۔ ہندو جنگجو تنظیموں کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمان نوجوانوں کی جسمانی تربیت کے لیے اکھاڑے قائم کیے جہاں اُنھیں گتکہ، لاٹھی، تلوار اور دوسرے اسلحے کا استعمال سکھایا جاتا۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں جمعیتہ العلمائے اسلام کا قیام بھی امیر المجاہدین ہی کی پس پردہ کوششوں کا ثمرہ تھا۔ لکھمنیا ضلع مونگیر میں جمعیت کی جو کل ہند کانفرنس ہوئی اُس میں امیر المجاہدین بھیس بدل کر شریک ہوتے تھے۔ مونگیر سے لکھمنیا جاتے ہوئے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر سی آئی ڈی کے ایک افسر نے انھیں پکڑ لیا اور اُلٹے سیدھے سوالات کی بوچھاڑ کر دی، مگر اضطراب کی ذرا سی پرچھائیں بھی ان کے چہرے پر نمودار نہ ہوئی۔ بڑے سکون و اطمینان کے ساتھ جواب دیتے رہے۔ پھر جُل دے کر گاڑی سے اُتر گئے۔

۱۹۴۶ء کے تاریخ ساز انتخابات میں تحریک کے کارکنوں نے مسلم لیگی نمائندوں کے حق میں انتھک کام کیا۔ امیر المجاہدین نے ملک کو مختلف منطقوں میں تقسیم کر دیا تھا اور ان منطقوں میں اپنے کارکن نامزد کر دیے تھے جو قیامِ پاکستان کی راہ ہموار کرنے کی مسلمان عوام اور علما میں جدّوجہد کر رہے تھے۔ بعض کارکن سُہروردی، سردار عبدالرب نشتر اور نواب ممدوٹ کے ہم عناں تھے۔ قائدِ اعظم پر قاتلانہ حملہ ہوا تو غازی عبدالغنی قصوری کی

روایت کے مطابق ایک مجاہد غازی عبدالکریم نے اس حملے کو ناکام بنایا۔ امیر المجاہدین ہر اہم سیاسی موڑ پر خود موجود ہوتے۔ تقسیمِ ہند کے مسئلے پر دہلی میں بات چیت ہوئی تو وہ دہلی ہی میں تھے اور جب شملے میں مذاکرات ہوئے تو انھیں وہاں دیکھا گیا۔ انہی کی خفیہ تگ و دو سے اہلِ حدیث کی غالب ترین اکثریت نے اپنا وزن پاکستان کے پلڑے میں ڈالا اور مجاہدین نے ووٹوں کی یہ جنگ جیتنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ سرحد اور سلہٹ کے ریفرنڈم میں بھی انہی کی زبردست جدوجہد نے صورتِ حال کا پانسا پلٹا اور مسلم لیگ نے سلہٹ کا ریفرنڈم ڈیڑھ لاکھ ووٹوں کی اکثریت سے جیتا۔ غازی عبدالغنی قصوری اسی محاذ پر تھے۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بنا تو امیر المجاہدین لاہور میں تھے۔ تاریخ کا دھارا عظیم موڑ مڑ چکا تھا۔ انگریز برِصغیر سے رخصت ہو گیا تھا اور آزاد اسلامی مملکت وجود میں آ چکی تھی۔ دو لاکھ سے زائد مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کی تیغِ ستم کا چارہ بن گئے تھے۔ ہزاروں عصمت مآب خواتین انسان نما درندوں کے چنگل میں گرفتار ہو چکی تھیں۔ بچے کھچے مسلمانوں کے لٹے پٹے قافلے زخموں سے چور جسموں اور خوں چکاں روحوں کے ساتھ آگ اور لہو کے دریا میں سے گزر کر پاکستان کے ساحلِ مراد پر پہنچ رہے تھے۔ ابھی ان قافلوں کی آمد جاری تھی اور روح و بدن کے گھاؤ رِس رہے تھے کہ بھارت کی حکومت نے کشمیر کے مہاراجہ کے ساتھ سازباز کر کے پاکستان کی اس شہ رگ پر ہاتھ ڈال دیا اور اس سازش کا تار و پود بکھیرنے کے لیے کشمیری سردار عبدالقیوم کی قیادت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ (سردار عبدالقیوم نے امیر المجاہدین کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی ہوئی تھی) ادھر پاکستان کی مسلح افواج بھی حرکت میں آ گئی تھیں سرحدِ آزاد کے ہزاروں قبائلی بھی میدان میں اتر آئے۔ سری نگر کی طرف بڑھنے والوں میں سید بادشاہ کے مجاہدین بھی تھے۔

○

مجاہد کے آستانے پر

اگست ۱۹۴۹ء کی ۲۷ تاریخ تھی اور برسات کا موسم۔ گھنگھور گھٹائیں اٹھیں تو ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی۔ گھٹا برس کر نکل جاتی تو فضا میں حدت سی تیر جاتی، البتہ راتیں کسی قدر خنک تھیں۔

ایک ایسی ہی ہلکی ہلکی خنک رات تھی کہ چھبیس ستائیس برس کا ایک دُبلا پتلا نوجوان ہلکی سی چادر اوڑھے اور ایک پوٹلی ہاتھ میں لیے کوئی دس گیارہ بجے کے قریب وزیرآباد کے اسٹیشن پر ریل گاڑی سے اُترا۔ رات اُس نے شہر کے ایک اُجاڑ اور پرانے سے سہ منزلہ ہوٹل میں جاگتے اور کروٹیں بدلتے گزاری۔ کچھ تو ہوٹل کی پُراسرار فضا تھی جس کا شاید وہ نوجوان اُس رات واحد مہمان تھا اور کچھ اس کے دل میں اُمڈنے والے جذبات کا تلاطم تھا جس نے اُسے بے چین کر رکھا تھا۔ وُہ سید بادشاہ کے قافلے کے آخری مردِ جلیل کی زیارت کرنے آیا تھا۔ اُس کے پردۂ تصور پر سات آٹھ برس پہلے کے واقعات تصویریں بن کر اُبھر اور مٹ رہے تھے۔ اُن دِنوں یہ نوجوان ریاست جودھپور میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم تھا اور ایک پرائمری اسکول میں ٹیچر۔ ایک روز صبح کے وقت میرتی سلاوٹوں کی مسجد میں دو درویش وارد ہوئے۔ ایک لمبے تڑنگے تھے اور دوسرے میانہ قامت لمبی ڈاڑھی، عقابی ناک، بلند پیشانی، خوبصورت چہرہ جس پر زمانے کی سختیاں اور مصائب گہرا نقش چھوڑ گئے تھے۔ مؤخّر الذکر نے اپنا نام ابراہیم بتایا اور اپنے ساتھی کا یعقوب۔ وہ حج کر کے واپس آرہے تھے اور بظاہر چند روز سستانے اور دوست احباب سے ملنے یہاں رُک گئے تھے۔ نوجوان کے والد ظہر کی نماز پڑھنے گئے تو ایک صاحب نے جو شاید مولوی ابراہیم سے واقف تھے، اُن کا تعارف کرایا: "یہ مولانا محمّد فقیراللہ مدراسی[1] کے بڑے صاحبزادے حافظ عبداللہ ہیں اور ہمارے ہاں مدرسے میں اُستاذ۔" یہ سنتے ہی مولوی صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑی گرم جوشی سے حافظ صاحب کو سینے سے لگا لیا۔ مسرت کا نور اُن کے چہرے سے چھلکا پڑتا تھا۔ دیر تک ماضی کی خاکستر کریدتے اور اپنے مرحوم دوست اور تحریک کے سرگرم ساتھی کی ایمان افروز یادوں کی چنگاریوں سے دِلوں کو حرارت بخشتے رہے۔

مولوی صاحب نے اگرچہ اپنے آپ کو پوشیدہ رکھا، لیکن حافظ صاحب نے

---

[1] مصنف کے جدِ امجد دراصل کوہستانِ نمک کے ایک دامن میں آباد، تحصیل خوشاب ضلع شاہ پور (حال سرگودھا) ایک چھوٹے سے گاؤں کٹھہ مصرال کے رہنے والے تھے۔ عمر کا بڑا حصہ مدراس کے علاقے میں گزرا اس لیے مدراسی مشہور ہو گئے۔ اگرچہ خود اپنی تصنیفات میں وہ اپنے آپ کو شاہپوری ہی لکھا کرتے۔ مدراس میں جماعتِ مجاہدین

انھیں پہچان لیا۔ تنہائی میں دریافت کیا "آپ مولانا فضل الٰہی تو نہیں ؟" مردِ جلیل مُسکرائے، اُن کی مردم شناس نگاہوں کی داد دی اور فرمایا "مگر اس راز کو اپنے تک محدود رکھیے"۔ حافظ صاحب نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اُن کی درخواست پر اپنے ساتھی کے ہمراہ اُن کے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا۔ وہیں نوجوان اور اُس کے بہن بھائی پہلی مرتبہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ بڑی بزرگانہ شفقت و محبّت کا اظہار فرمایا اور دُعائیں دیں۔ ایک رات اپنی مہمانی کے شرف سے بھی نوازا۔ مولوی یعقوب صاحب قدرے لنگڑاتے تھے۔ امیر المجاہدین نے بتایا کہ ان کے کُولھے میں گولی لگی تھی۔ مولوی یعقوب تو چند روز رہ کر رُخصت ہو گئے، لیکن امیر المجاہدین جودھپور میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ مقیم رہے۔ وہ شہر سے باہر جماعت کے ایک کارکُن ٹھیکیدار عبدالحکیم (حال ساکن کراچی) کے مکان میں منتقل ہو گئے؛ تاہم تقریباً روزانہ شہر تشریف لاتے۔ نوجوان شام کے وقت واپسی میں اکثر ان کی قیام گاہ تک اُن کے ہمراہ جاتا اور رات گئے واپس آتا۔

امیر المجاہدین اس وقت ساٹھ باسٹھ برس کے ہوں گے، مگر عمر کے مقابلے میں خاصے تنومند اور ایک مجاہد کی طرح چاق چوبند تھے۔ نوجوان مُٹّھی بھر ہڈیوں کا ڈھانچا تھا۔ اُسے سیر و تفریح اور ورزش کی تلقین فرمایا کرتے۔ خدا جانے اُنھیں اس میں کیا خُوبی نظر آگئی تھی، اکثر فرماتے: "بیٹا! اسکول ماسٹری چھوڑ دو اور مجھ فقیر کے ساتھ ہو لو" ایک دو مرتبہ نوجوان کے والد سے بھی فرمایا، خورشید کو میرے ساتھ کر دو..... لیکن اُن دنوں خورشید بڑا آزاد خیال تھا اور اس آزاد خیالی نے اُسے کُفر و الحاد کے دشتِ تپاں میں سرگرداں کر رکھا تھا۔ فکری و نظریاتی بنیادیں سلامت نہ ہوں، تو انسان زندگی کے اہم ترین لمحات سے بھی آنکھیں بند کر کے گزر جاتا ہے۔ اُن کے اس ارشاد میں خورشید کے لیے کوئی دلچسپی اور کشش نہ تھی۔ وہ بس خاندان کے ایک بزرگ دوست کی حیثیّت سے اُن کی خدمت میں حاضری دیتا، ایسی حاضری جو ذوق و شوق اور جوش و جذبے کی گرمی سے تہی داماں تھی۔ نوجوانوں کی نفسیات میں جھانکنے والی نگاہیں شاید دِل کی بیماری بھانپ گئیں۔ اُنھوں نے اُسے اپنے عہد کے عظیم اسلامی مفکر سیّد ابوالاعلیٰ مودُودیؒ کا ترجمان القرآن اور دُوسرا لٹریچر

پڑھنے کی تلقین کی ـــــ اور یہی تلقین اُس کی زندگی کا دھارا بدلنے کا باعث ہوگئی۔

یہ منظر مدھم ہوتے ہوتے نگاہِ تصور سے غائب ہوگیا اور ایک اور تصویر اُبھر آئی۔ نوجوان نے دیکھا دین وملت کے غم و درد سے معمور دل امیر المجاہدین کو بے چین اور مضطرب کیے دیتا ہے۔ یہ دلِ دردمند ہی تھا جس نے اُنھیں ایک مطمئن اور پُر مسرت زندگی چھوڑ کر ہجرت وغربت کی پُر آفات وادیوں میں لا ڈالا تھا۔ وہ لمبی نمازیں پڑھتے، خشوع و خضوع میں ڈُوبی ہُوئی نمازیں۔ خشیتِ الٰہی سے بید کی طرح لرزاں رہتے۔ نماز کے بعد سجدے میں گر جاتے اور دیر تک اُمّت کی بھلائی، اسلام کی سر بلندی اور محکوم مسلمانوں کی آزادی کی دُعائیں مانگتے۔ اُن دنوں جنگ فیصلہ کن مرحلوں میں پہنچ گئی تھی۔ اِن دُعاؤں میں اتحادی طاقتوں کی تباہی اور شکست کی دُعا بھی ہوتی۔ وہ کہا کرتے: جب تک یہ طاقتیں کرۂ ارض پر موجود رہیں گی خدا کی زمین ظلم وستم اور فتنہ وفساد سے بھری رہے گی، قومیں غلامی کی زنجیروں میں جکڑی رہیں گی اور آزادی اور انصاف کے الفاظ کبھی شرمندۂ معانی نہ ہو پائیں گے۔

پھر ایک منظر اور نمودار ہُوا۔

اُس زمانے میں ملک کے طُول و عرض میں جنگی پروپیگنڈا زور شور سے جاری تھا۔ گوناگوں طریقوں سے لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے اور انگریزی حکومت سے تعاون کرنے پر اکسایا جاتا۔ جودھپور میں بھی اس مقصد کے لیے ایک تقریب منعقد کی گئی جس میں فوجی مظاہرے کا اہتمام بھی کیا گیا۔ اُس روز تقریباً سارا شہر اس تماشے کو دیکھنے کے لیے نکل پڑا تھا۔ پروگرام کے مطابق جنگی مظاہرہ شروع ہُوا۔ طیاروں نے پرواز کی اور فضائی جنگ کا نقشہ پیش کیا۔ پھر توپوں سے گولہ باری کی، لیکن ایک توپچی کی غلطی سے گولہ تماشائیوں کی عین سامنے والی صف پر جا گرا۔ بس پھر کیا تھا، ایک قیامت کا سا منظر تھا۔ بیسیوں تماشائیوں کے پرخچے اڑ گئے اور بیسیوں زخمی ہوگئے۔ مجمع میں زبردست بھگدڑ اور افراتفری مچ گئی۔ دہشت زدوں کے شور اور زخمیوں کی چیخوں نے منظر کو اور بھیانک بنا دیا تھا۔ حادثے کی خبر شہر میں پہنچی تو ہر طرف کہرام برپا ہوگیا۔ لوگ ہسپتال کی

طرف دوڑے جہاں زخمی اور مرنے والوں کی لاشیں پہنچادی گئی تھیں۔ ہر شخص اپنے بچوں اور عزیزوں کی فکر میں پریشان تھا۔

نوجوان حسبِ معمول ان مردِ جلیل وعظیم کے ہمراہ اُن کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہُوا تو اُنھوں نے اِس حادثے کا ذکر چھیڑ دیا۔ فرمایا: غلام قوموں کے افراد موت اور زندگی کو اسی طرح اہمیت دیتے ہیں۔ کوئی حادثہ رُونما ہوتا ہے تو نوحہ و ماتم سے آسمان سر پر اُٹھا لیتے ہیں۔ ہم لوگوں کی نظر میں تو اس قسم کے واقعات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں رہی۔ موت کا تماشا شب و روز ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتا رہتا ہے۔ دشمن کی بمباری سے اپنے عزیز ساتھیوں کو بچھڑتا دیکھتے ہیں، لیکن اس سے زیادہ اس تماشے کو کچھ وقعت نہیں دیتے کہ مرنے والے اپنا فرض ادا کر چکے ہیں اور ہمیں جو مہلتِ زندگی ملی ہے تو اس لیے کہ ہم اپنا فرض ادا کریں۔ اس بات کو قرآنِ کریم نے اِس طرح بیان فرمایا ہے: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔

اُس وقت تو مردِ خدا کی ان باتوں میں چھپے ہُوئے یقین و ایمان کا کچھ ایسا احساس نہ ہُوا، لیکن آج جب وہ منظر اس کے سامنے تھا نوجوان ایک عجیب سی لذت اپنی رگ و ریشے میں سرسراتی محسوس کر رہا تھا۔ زندگی اور موت کے اِس نقطۂ نظر کو اگر اہلِ ایمان حرزِ جاں بنالیں تو زندگی کو پیش دینے والے کتنے ہی بوجھ ہلکے ہو سکتے ہیں اور فرد اور معاشرے میں کارفرما ساری خرابیاں دُور ہو سکتی ہیں۔

اور پھر آخری منظر اُبھرا ——— شہر میں آتے جاتے کچھ نگاہیں امیر المجاہدین کا تعاقب کرنے لگتیں، چنانچہ ایک روز وہ نہایت خاموشی کے ساتھ جودھپور سے رُخصت ہو گئے۔

وہ چلے تو گئے، لیکن اُن کے شفقت بھرے نامے نوجوان کے والد کے نام آتے رہتے جن میں اس کے لیے دین و دُنیا کی بھلائی کی دُعاؤں اور تمنّاؤں کی سوغاتیں ہوتیں۔ وہ لکھتے: "خورشید اپنے دادا بزرگوار اور دادا مرحوم کے

بھائیوں[1] کا صحیح جانشین اور آپ کی بہترین یادگار ثابت ہو۔" ایک اور مکتوب میں اُنھوں نے مکہ معظمہ سے لکھا: "برخوردار خورشید میرے ہمراہ آتا تو آج اس مقدس سرزمین میں ہوتا۔"

اور ایک خط تو امیر المجاہدین نے خاص اُس کے نام (والد کی معرفت) بھیجا تھا۔ اُن دِنوں اس کی زندگی میں انقلاب آچکا تھا اور وہ اُس اِسلامی تحریک سے وابستہ ہو چکا تھا جس کی دعوت کا آغاز سید بادشاہ کی شہادت کے ٹھیک ایک سو برس بعد[2] ایک اور سیدؒ نے کیا تھا۔ وہی تجدید و اقامتِ دین کی تحریک.... اسلام کو سربلند اور اجتماعی زندگی میں نافذ کرنے کی تحریک ..... اور اس تحریک کے دامن سے وابستگی کے ساتھ ہی وہ صحافت کے کُوچے میں نکل آیا تھا۔ اس مکتوب کے الفاظ نے اُسے نیا حوصلہ اور جذبہ دیا تھا..... اُنھوں نے نوجوان کو فرزندِ ارجمند کے الفاظ سے مخاطب کیا تھا اور لکھا تھا: "از لطافتِ کلام تاں کہ برایم گاہ بگاہ بواسطہ جرایدِ ہند میسر آید تلخیٔ ایامِ غربت و مہاجرتِ مَن شیریں مے آرد۔ جزاک اللہ تعالےٰ۔ اندازہ کردم اگر شمارا ئے نوجواں شاہ سواری میدانِ صحافت را برائے خود مشغلۂ حیات گردانند، انشاء اللہ، نامِ اسلاف رحمہم اللہ زندہ جاوید خواہد گرداند۔ الحمدللہ تمنائے مذکور برآید..... " پھر مطالعے کے بعض موضوعات تجویز کرنے کے بعد لکھا تھا۔ خاص وقتوں میں میری دعائیں ہمیشہ تمھارے شاملِ حال رہیں گی۔ (دعواتِ مخصوصۂ ایں فقیر را مدام بحالِ خود شامل کردہ شدید)۔ آخر میں پنج وقتہ نمازِ با جماعت ادا کرنے، تلاوتِ قرآن مجید اور ذکرِ الٰہی کو معمول بنانے اور مسنونہ دُعاؤں کا وِرد کرنے کی نصیحت کی۔

---

[1] نوجوان کے دادا بزرگوار کے دو بھائی تھے مولانا محمد (غلام رسول) اور مولانا عبدالرحمٰن (غلام محمد) دونوں اپنے منجھلے بھائی (مولانا فقیراللہ) کی طرح متبحر اور جیّد عالم تھے۔ اول الذکر نوجوان کے نانا تھے۔ مؤخر الذکر کو حدیث تو گویا ازبر تھی اور کتاب دیکھے بغیر طلبہ کو درس دیتے۔ نحو کے ماہر تھے اس لحاظ سے مولانا عبدالرحمٰن نحوی کہلاتے۔ عمر کا زیادہ حصہ دہلی میں گزرا اور وہیں ۱۹۴۵ء میں فوت ہوئے۔

[2] سید احمد شہیدؒ مئی ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے، ۱۹۳۱ء میں حیدر آباد دکن سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے دعوتِ دین کا آغاز کیا۔

تھی تاکہ زندگی سُنت کے مطابق ڈھل سکے۔

واقعی اس مردِ خدا کی دُعائیں شاملِ حال نہ ہوتیں تو نوجوان شاید ضلالت کی وادیوں میں ہمیشہ بھٹکتا رہتا ـــــ آج وہ اپنے اسی محسن کی زیارت کے لیے اُس کے شہر میں آیا تھا۔ خیالات کی لامتناہی رَو جاری تھی کہ خاموش فضا کا سینہ چیرتی ہوئی آذان کی آواز گونجی ...... اَللّٰہ اکبر اَللّٰہ اکبر ... پکارنے والا اللہ کی کبریائی اور یکتائی اور محمد رسول اللہ کی عظمتِ قیادت کی شہادت دیتے ہوئے فلاح و سعادت کی طرف بلا رہا تھا اور نیند کے ماتوں سے کہہ رہا تھا کہ اُٹھو ...... اپنے رب کے حضور سجدہ ریز ہو جاؤ کہ یہی وہ سجدہ ہے جو انسان کو ہزاروں خداؤں کے آگے جھکنے سے نجات دلاتا ہے۔ اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم، اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم ......

نوجوان کو رَت جگے نے تھکا ڈالا تھا، لیکن اس زندگی بخش پکار سے ساری تھکن یُوں تحلیل ہو کر رہ گئی جیسے رات بھر کا فضا میں چھایا ہُوا کہرا سورج کی تمازت سے پگھل کر غائب ہو جاتا ہے۔

اور جب نوجوان اس مردِ خضر کے آستانے پر حاضر ہُوا تو خاصا دِن چڑھ آیا تھا۔ سات برس کے فاصلے نے جیسے کئی عشروں کی مسافتوں کے نقوش ثبت کر دِیے تھے۔ امیر المجاہدین سفید شفّاف بستر پر دراز تھے۔ ہڈیوں کی مالا بن کر رہ گئے تھے، ڈاڑھی، سر اور بھنویں برف کی طرح سفید ہو چکی تھیں۔ ضعیف و ناتواں چہرہ تابندہ اور اُجلی رُوح کی عکّاسی کر رہا تھا۔ ضعف و نقاہت کی وجہ سے آواز بالکل پست ہو گئی تھی اور بمشکل سُنائی دیتی تھی۔ جماعت کے ایک کارکن بھی موجود تھے۔ نوجوان کو کمرے میں قدم رکھتے دیکھا تو اُن کی مدد سے تکیوں کے سہارے بیٹھ گئے۔ ان کی شفقت و محبت میں وہی سات برس پہلے کی گرمی تھی، پیشانی کو بوسہ دیا، گھر کے ایک ایک فرد کے احوال دریافت کرتے رہے۔ اُن دنوں نوجوان کے خاندان کی کیفیت ایک ایسے پودے کی تھی جو اپنی جڑ بن وطن سے دُور جمانے کی کوشش میں تھا کہ تُند و تیز آندھی نے اُسے اُکھاڑ کر پھر سے وطن میں لا پھینکا اور اب وہ یہاں اپنے قدم جمانے

کی تگ و دَو کر رہا تھا۔ اس عمل میں پودے پر جو گزرتی ہے وہی اس پر بیت رہی تھی۔ رُوداد حزیں سُن کر وہ خاصے ملول ہُوئے۔ پھر ان کا رُوئے سُخن کشمیر، مغویہ خواتین اور پاکستان کے مستقبل کی طرف مُڑ گیا۔ کشمیر میں معاہدہ جنگ بندی کے صدمے نے انھیں توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ جہادِ کشمیر کے زمانے میں وہ راولپنڈی اور پچھلے مورچوں میں بیٹھ کر مجاہدین کی رہنمائی کرتے رہے تھے، مختلف علاقوں کے دَورے اس پر مستزاد ـــ لیکن اب ایک سال کے اندر اندر اُن کی قوت نچڑ کر رہ گئی تھی۔ ان کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ کشمیر ہاتھ سے نکل گیا ہے اور اب شاید کئی نسلوں کو اپنے بزرگوں کی کم حوصلگی، بے تدبیریوں اور اندھی بصیرت کا ـــ "کفّارہ" خُون کی صُورت میں دینا ہوگا۔ وہ مُسلم لیگی قیادت اور اُس کے پیدا کردہ حالات سے سخت دِل گرفتہ تھے اور مایوسی انھیں آلیا تھا۔ مایوسی جو کبھی انگریزوں کے ساتھ لمبے عرصے تک جنگ لڑتے رہنے کے باوجود اُن کے قریب نہ پھٹکی تھی۔ اُنھوں نے انتہائی تیرہ و تار اور ناساعد حالات میں اُمید کے چراغ دِلوں میں جلائے رکھے تھے، لیکن اب اپنوں کے درمیان جیسے یہ چراغ بجھ کر رہ گئے تھے۔

اُنھوں نے گزشتہ نو دس برس بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ، بڑی خوش آئند اُمیدیں دِل میں پالے تحریکِ پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی جدّوجہد میں سرگرم حِصّہ لیا تھا، لیکن اب محسوس کر رہے تھے کہ وہ منزل ابھی بہت دُور ہے جس تک پہنچنے کے لیے سیّد بادشاہ اور اُن کا کاروانِ حق پُوری صدی خُون میں ڈوبے، مصائب سے دوچار، سرگرمِ سفر رہا تھا۔ وہ آزاد اسلامی مملکت کو وجود میں لاکر منہاجِ نبوت پر حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ مملکت تو وجود میں آگئی تھی، لیکن اس کے مقصدِ وجود کو پُورا کرنا اب بھی باقی تھا۔ اس مقصد کے لیے اُن کا معاہدہ قائدِ اعظم سے ہُوا تھا اور وہ دُنیا سے رُخصت ہو چکے تھے۔ اور جو لوگ اُبھر کر سامنے آرہے تھے ان سے کوئی اُمید نہ تھی کہ وہ اس معاہدے کا احترام کریں گے۔ وہ دیر تک اپنی مایوسی کا اظہار مختلف پیرائے میں کرتے رہے۔ تحریکِ اسلامی کے مطالبۂ دستورِ اسلامی

کا راستہ روکنے کے لیے مسئلہ کشمیر کی آڑ میں جو پروپیگنڈہ کیا گیا تھا، مسلم لیگی لیڈروں کے قرب کی وجہ سے امیر المجاہدین بھی اس پروپیگنڈے میں آگئے تھے، مگر اب چہرے جیسے جیسے نکھر کر سامنے آتے گئے تھے انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اور اس احساس کی جھلک اُس تلخ تبصرے میں صاف نظر آتی تھی جو اُن کی زبان پر تھا۔ امیر المجاہدین باتیں کرتے کرتے نڈھال ہو گئے تھے۔ نوجوان نے رخصت کی اجازت چاہی تو "جہادِ کشمیر" نامی اپنی ایک کتاب اور "غلطیہائے عدیم المثالِ جہاں" کے نام سے ایک پمفلٹ بزبان فارسی اپنے دستخطوں سے عنایت کیا اور دعاؤں کے چھتر تلے رخصت فرمایا۔ نوجوان نے آخری نظر اُن پر ڈالی۔ وہ ایک ایسا چراغِ سحری تھے جو رات بھر طوفانی تاریکیوں میں نور پھیلاتا رہا تھا اور اب کسی وقت بھی فنا کا ایک جھونکا اُسے گُل کر سکتا تھا۔

○

ایک عہد کا خاتمہ

۵ رمئی ۱۹۵۱ء کو یہ چراغ گُل ہو گیا۔ سید بادشاہ کے قافلے کا آخری حدی خواں اپنی وصیت کے مطابق بالاکوٹ کی سرزمین میں اُس مقام کے قریب دفن کر دیا گیا جہاں سید بادشاہ کا جسد شہادت کے بعد چند روز تک مدفون رہا، پھر دریا میں طغیانی آئی اور اُس کی موجیں اس جسدِ بے سر کو بہا لے گئیں۔ اس مردِ شہید نے خود دعا کی تھی کہ اُن کی آخری آرام گاہ پوجا پاٹ کا مرکز نہ بن جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کی قوم مُردہ پرست ہے، بت پرستوں پر اُن کی زندگی میں پتھر برساتی ہے اور مرنے کے بعد انھیں پوجتی ہے۔

امیر المجاہدین کی وفات کے ساتھ برِصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا وہ عظیم الشان باب اختتام کو پہنچ گیا جس کا سرِ آغاز شاہ ولی اللہؒ نے اپنے قلب و فکر کے نور سے لکھا تھا اور جس کی تکمیل سید بادشاہؒ اور اُن کے ساتھی ایک صدی سے زائد عرصے تک اپنے خون سے کرتے رہے۔ امیر المجاہدین تحریک کے پیش رو ساتھیوں کی طرح ایک عظیم انسان تھے۔ مقصد کے ساتھ اخلاص اور لگن کا جذبہ ان کے خمیر میں گندھا تھا۔ ۵۲ برس کی مجاہدانہ زندگی میں ان پر کڑے سے کڑے وقت آئے،

لیکن وہ ہمیشہ ناقابلِ تسخیر ثابت ہوئے۔ ہر مصیبت اور کرب کا خندہ پیشانی سے سامنا کرتے ہوئے اس راہ پر گامزن رہے جو اُنھوں نے اٹھارہ برس کی عمر میں اپنے لیے منتخب کی تھی۔ دشمن تو اُن کی جان کے درپے تھا ہی کہ وہ تحریک کے دَورِ آخر میں اُس کے سب سے بڑے حریف تھے، اُنھیں اپنوں کے چرکے بھی سہنے پڑے، لیکن وہ ہر حال میں صابر و شاکر، جذبِ عشق میں ڈُوبے اپنے اس عہد پر کاربند رہے جو سید بادشاہ کے خلفا کے ہاتھ پر اپنے اللہ سے کیا تھا۔ آخری زمانے میں جب جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو گئی تھی اور قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو چلا تھا، اُنھیں برِصغیر کے دوستوں اور دُوسرے اصحاب نے لکھا کہ وہ وطن واپس آجائیں، حکومت سے اُن کی واپسی کی اجازت حاصل کر لی جائے گی۔ اُنھوں نے جواب میں تحریر فرمایا: "مَیں ان کی ہمدردی کا تہِ دل سے مشکور ہو کر ان سے بصد منت عرض کروں گا کہ وہ میرے اور میرے خاندان کی جُملہ تکالیف کو خُدائے کاشف الغم کے حوالے کر کے مجھے ہمیشہ کے واسطے ایسے بھُول جائیں جیسا کوئی مُردے کو قبر کے اندر دفن کرنے کے بعد بھُول جاتا ہے۔ میری واپسی کے لیے کوئی ایسی راہ نہ سوچیں جو میرے لیے اور میری موجودہ اور آئندہ نسل کے لیے موجبِ بدنامی، ضمیر کی ملامت اور خدا اور رسولؐ کی لعنت کا سبب ٹھہرے۔ ہمارے رسولِ خداؐ نے دشمنوں کی شماتت سے پناہ مانگی ہے، خدا مجھے ایسی واپسی سے پناہ دے، آمین ؎

آں لحظہ کہ روز و شب بہم پیوندند
یا رشتۂ مہر و سایہ برہم نبندند
مَن با تو نشینم دراں حالت نیز
اربابِ خرد تمام برمن خندند"

ایسی ہی ایک تجویز افغانستان کے وزیرِ اعظم محمد ہاشم خان نے پیش کی کہ حکومت افغانستان، برطانوی وزیرِ مختار مقیم کابل کی معرفت سے حکومتِ ہند سے آپ کی سفارش کرنے کو تیار ہے، وطن چلے جائیے اور باقی ماندہ عمر اپنے اہل و عیال

کے درمیان رہ کر خدا اور رسولؐ اور وطن کی خدمت انجام دیجیے ـــــ لیکن اس عظیم انسان نے معذرت کر دی۔ اس معذرت پر خود پادشاہِ افغانستان؛ نادر شاہ نے پیش کش کی کہ اہل و عیال سمیت کابل تشریف لے آئیے، میری حکومت تین سو روپے ماہوار اور ستر جریب زمین گزارے کے لیے انھیں دیتی رہے گی، لیکن انھوں نے اس پیش کش کو بھی بڑے ادب سے مسترد کر دیا۔ انھوں نے لکھا:

"بے شک میرے بڑھاپے اور ضعفِ پیری، جسمانی کمزوری اور میری سفید ڈاڑھی کا تقاضا یہی تھا کہ میں خدا کا بندہ غریب الوطنی کی زندگی کے باقی ایام خاندانِ شاہی کے زیرِ سایہ خدا کی یاد میں بسر کر دیتا، لیکن ایسی حالت میں کہ موت سر پر ہے، ایک رات رہ بھی جاؤں تو دوسری رات شاید نہ رہوں گا، فہم و دانش کا تقاضا یہ ہے کہ اس آخری عمر میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسولؐ اور خدمتِ قوم و وطن کے راستے سے منہ پھیر کر آسودگی اور لذت یابی کی طرف التفات نہ کروں۔ دنیا گزر جانے والی ہے اور اسے یقیناً چھوڑ کر چلے جانا ہے۔ اس دنیائے فانی کی آسائش پر میرا مائل ہو جانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا میرے لیے لائقِ صد حیف و افسوس ہے۔ یہ تو گویا خاک میں مدفون اپنے ساتھیوں کو دغا دینا ہے..... رہے مصائب و شدائد (جن سے چھٹکارا دلانے کے لیے پیش کشیں کی جا رہی تھیں) تو اگر میرے جسم کا ہر بال میرے سر پر تلوار بن کر کھڑا ہو جائے تو بھی میں اس راہ سے سر نہ پھیروں گا اور میرے پلکوں کا ہر بال برچھی بن کر میری آنکھوں میں گڑ جائے تو بھی کسی دوسری مہم کی طرف نہ دیکھوں گا...... اپنے اسلاف رحمہم اللہ کی روایات کے مطابق مجھے یہاں کے فقر و فاقہ اور تنگی ترشی سب قبول ہے ؎

آں کس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند
فرزند و عیال و خانماں راچہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو دو جہاں راچہ کند"

یہ تحریک دُنیا کی عظیم ترین تحریکوں میں سے ایک تھی۔ شاید انتہائی معاند اور حوصلہ شکن حالات سے بالکل بے نیاز ہو کر اتنی طویل جدّوجہد کسی اور تحریک کا سرمایہ نہیں۔ یہ تحریک اُس وقت اُٹھی جب مُسلم ہندوستان دَم توڑ رہا تھا، انحطاط اور ادبار نے ہر شعبۂ زندگی کو آ لیا تھا اور مُسلمان ہر محاذ پر تیزی سے پسپا ہو رہے تھے۔ اس تحریک نے ایسا صُور پھُونکا کہ ہر وہ شخص جس کے اندر زندگی کی رمق باقی تھی اور جو زندہ رہنا چاہتا تھا اُس کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ روز و شب کی گردش کے ساتھ حالات دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ یہ تحریک غیروں کے ہاتھوں بھی خاک و خوں میں لَوٹی اور اپنوں کی بے وفائیوں اَور غدّاریوں کا بھی شکار رہی، لیکن سیّد بادشاہؒ نے دِلوں میں زندگی کی جو آگ بھر دی تھی اُس کی چنگاریاں ایک عہد سے دوسرے عہد تک سلگتی، پھیلتی اور بھڑکتی رہیں۔ طُوفان اُمڈتے رہے، آندھیاں آتی رہیں مگر حق و صدق کے دیوانوں نے ان چنگاریوں کو کبھی بجھنے نہ دیا۔ اُنھیں کچلنے کے لیے اپنے عہد کی سب سے بڑی سُپر پاور نے ہندوستان میں مرکوز اپنی ساری طاقت جھونک دی، ظُلم و تشدد کے کوڑے برسے، زندانوں نے اربابِ صدق و صفا کو جکڑنے کے لیے اپنے جبڑے وا کر دیے، پھانسیوں کے سامان ہُوئے، انڈمان تک یہ داستانِ جور و ستم پھیلتی بکھرتی گئی، لیکن مردانِ حق نے پرچمِ جنوں بلند رکھا۔ جن لوگوں نے سیّد بادشاہؒ کی دعوت پر لبیک کہی اور خارزارِ [illegible] عشق میں قدم رکھ دیا اُنھوں نے کبھی واپسی یا پسپائی کا خیال دِل میں نہ آنے دیا۔ انگریز پولیس کے بہیمانہ جبر و تشدد اور نفسیاتی توڑ پھوڑ کے نتیجے میں بہت سے کارکن تحریک کے رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف گواہیاں دینے پر مجبور کر دیے گئے، لیکن خوف و دہشت کی لرزا دینے والی اِس فضا میں بھی بے لَوث اور سرفروش کارکن میسر آتے رہے۔

یہ لوگ طالع آزما نہ تھے اور نہ انھیں احتیاج ہر روپے پیسے کی ہوس اور دُنیوی فتوحات کی خواہش میدان میں کھینچ لائی تھی۔ ان میں سے اکثر کھاتے پیتے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے گھر [illegible]

بہت سے سماجی طور پر بھی مرتبہ و مقام کے حامل تھے اور ایسے طبقے کے افراد، راحت کوشی اور عشرت سامانی اور پُرسکون زندگی جس کی سب سے بڑی آرزو ہوتی ہے — دعوتِ حق سے فیض یاب ہونے کے بعد اُنھوں نے پُرتکلف اور آسائش بھری زندگی کولات ماردی اور راہِ محبت کی لذتوں سے یُوں سرشار ہوئے کہ صعوبت، صعوبت نہ رہی اور کوئی مصیبت، مصیبت نہ رہی، اِن صعوبتوں اور مصیبتوں کے آگے صرف مضبوط یقین و ایمان، بے لَوث حق پرستی اور آخرت میں رضائے الٰہی سے ہمکنار ہونے کی پرجوش خواہش ہی ثابت قدم رکھ سکتی ہے۔ دُنیا کی کامیابی و کامرانی جس کے لیے اغراض پرست اور دینوی مفاد کے بندے مصیبتیں برداشت کر لیتے ہیں اس کی کہیں دُور دُور تک روشنی نہ تھی۔ ناکامی کا بھیانک چہرہ صاف نظر آتا تھا۔ بلاشبہ یہ مردانِ حق یقین و ایمان کی پختگی، بے لَوث، حق پرستی اور آخرت کی زندگی پر ایقان کے مرتبۂ کمال پر فائز تھے اور حقیقت یہ ہے کہ حق کا راستہ ہے بھی کچھ ایسا ہی راستہ جس پر ثابت قدمی سے چلنے کے لیے اپنی ساری دُنیاوی اغراض، دلچسپیاں اور راحتیں قربان کرنا پڑتی ہیں۔ اس راہ میں متاعِ دُنیا کی مُحبت سے بھرا ہُوا بوجھل دِل لیے ایک قدم بھی نہیں چلا جا سکتا۔ اس راہ کے مسافر کے لیے دُنیا کے بوجھ سے پاک، ہلکا پُھلکا ہونا بنیادی شرط ہے۔ یہاں تو جو پُونجی پہلے سے اِنسان کے پاس موجود ہوتی ہے اُس سے بھی دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

ترکِ مال و ترکِ جان و ترکِ سر
در طریقِ عشق اوّل منزل است

اور اس باب میں یہ اہلِ جنوں یقیناً مثالی اِنسان تھے۔ رہنما اور کارکُن سب ایک ہی رنگ میں یکساں رنگے ہُوئے تھے۔ اُنھوں نے دُنیا اور اس کی دلچسپیوں اور عشرت سامانیوں کو اپنے اُوپر حرام قرار دے لیا تھا۔ جہاد کا صُور تو اُنھوں نے پھونکا ہی تھا اور اخلاقی و سیاسی زوال کی اُمڈتی ہُوئی یخ بستہ رات کے شکار افسردہ دِلوں میں زندہ و سربلند رہنے کی حرارت پیدا کی ہی تھی، ان کی جدّ و جہد کا ایک عظیم الشان پہلو یہ تھا کہ اُنھوں نے خود بھی اپنے ... اور غیر اسلامی رسم و رواج کی زنجیریں کاٹیں

اور بندگانِ خُدا کو بھی ان زنجیروں سے آزاد کیا، نیکی اور حُسنِ عمل کے نام پر دین میں جو بدعتیں راہ پا چکی تھیں اور حق کے چشمۂ صافی کو جن مُشرکانہ عقائد کی کدورتوں سے مکدّر کر دیا گیا تھا، ان سب کا قلع قمع کیا۔ ان رسوم و رواجات، بدعتوں اور مُشرکانہ عقائد کے پردے میں مذہبی استحصال پسندوں کا ایک بہت بڑا طبقہ پیدا ہو گیا تھا اور جو نکیں بنکر سادہ دِل مسلمانوں کا لہُو پی رہا تھا، ان اہلِ حق نے انگریزوں سے نبرد آزما ہو کر دارالکفر ہندوستان کو دارالاِسلام بنانے کی تگ و دَو کرنے کے ساتھ ساتھ اُمّت کے اندر کتاب و سُنّت کا نُور پھیلایا، جہالت و جاہلیّت کے اندھیرے دُور کیے اور اہلِ ایمان کو ان مذہبی مستحصلین (EXPLOITERS) سے نجات دلائی۔ اغراضِ دُنیا سے تہی، یقین و ایمان کے جذب و سوز سے معمور، کتاب و سُنّت پر عمل اور حق کی راہ میں جدّ و جہد کرنے اور قربان ہو جانے کے ولولوں سے سرشار ان اربابِ صِدق و وفا کو دیکھ کر قرنِ اوّل کے مردانِ حق کے روز و شب آنکھوں میں پھر جاتے تھے۔ دعوت و عزیمت کی اس عظیمُ الشّان تحریک اور اُس کے ساتھ وابستہ جلیل و جمیل کردار کے حامل رہروانِ حق پر اقبال کے یہ اشعار ٹھیک صادق آتے ہیں۔

تجھ سے ہُوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اُس کے دِنوں کی تپش اُس کی شبوں کا گداز
اُس کا مقام بلند، اُس کا خیالِ عظیم
اُس کا سرور، اُس کا شوق، اُس کا نیاز، اُس کا ناز
ہاتھ ہے اَللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز
خاکی و نُوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اُس کا دِل بے نیاز
اُس کی اُمیدیں قلیل، اُس کے مقاصد جلیل
اُس کی ادا دلفریب، اُس کی نگہ دلنواز

نرم دمِ گفت گو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دِل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خُدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق ہیں گرمئ محفل ہے وہ

کتابیات

۱۔ سیرت سید احمد شہید حصہ اوّل سید ابوالحسن علی ندوی
۲۔ 〃 〃 〃 〃 حصہ دوم 〃 〃 〃 〃
۳۔ سید احمد شہید حصہ اوّل و دوم غلام رسول مہر
۴۔ جماعتِ مجاہدین 〃 〃 〃
۵۔ سرگزشتِ مجاہدین 〃 〃 〃
۶۔ کالا پانی مولوی محمد جعفر تھانیسری
۷۔ الدر المنثور فی تراجم اہل الصادقپور مولانا عبدالرحیم
۸۔ ہندوستان کی وہابی تحریک ڈاکٹر قیام الدین احمد
۹۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک مولانا مسعود عالم ندوی
۱۰۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء محمد ایوب قادری
۱۱۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی حصہ دوم و سوم مولانا سید محمد میاں
۱۲۔ مولانا فضل الٰہی (مرحوم) خالد گرجاکھی
۱۳۔ قلمی یادداشتیں غازی عبدالغنی قصوری
۱۴۔ ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ لاہور ستمبر ۱۹۷۳ء
ہم انگریز سے لڑتے رہے عبدالکریم چمرکنڈی
۱۵۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۴ء
غازی عبدالغنی قصوری مولانا راغب احسن
۱۶۔ روزنامہ کوہستان ۱۴ فروری ۱۹۶۵ء
۱۷۔ SELECTIONS FROM BENGAL GOVERNMENT RECORDS WAHABI TRAILS OF 1863 – 1870
۱۸۔ W.W. HUNTER : The INDIAN MUSLIMS.
۱۹۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان: ولیم ولسن ہنٹر ترجمہ محمد صادق

(مصنف کی مختلف کتابوں پر تبصرے کے اقتباسات)

مصنّف کی دیگر کتابیں

رُوس میں مُسلمان قومیں

اپنے موضوع پر اُردُو میں منفرد کتاب جو مردِ عصرِ جدید، قائدِ تحریکِ اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودُودیؒ کے ارشاد پر لکھی گئی۔

پہاڑی کے چراغ

تاریخ اسلام کی چند نمایاں شخصیتوں کے خاکے جنھیں پڑھ کر علم و فضل کی عظمت و جلالت کے نقش ابھرتے ہیں، حق گوئی و بے باکی، صبر و عزیمت اور ایثار و قربانی کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

مجدّد الف ثانیؒ کے سیاسی مکتوب

اکبری دور کے ہندوستان میں اسلام اور لادینیت کے مابین کش مکش کی تاریخ۔

اسلامی زندگی کی کہکشاں

ایک دلکش و حسین کتاب جس میں اسلامی زندگی اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ زندگی جس میں پاکیزگی بھی ہے اور سادگی بھی۔ جمال بھی ہے اور عظمت و جلال اور جذب و شوق بھی ــ زندگی جو کتاب و سُنّت کو مطلوب ہے۔

اندھیارے اُجالے

انسان کے آس پاس دُور و نزدیک پھیلی ہُوئی سچی داستانوں کے لازوال نثر پارے جناب نعیم صدیقی نے تبصرہ کرتے ہُوئے لکھا: جیسے حسن نظامی مچھر یا جھینگر سے بات شروع کرتے اور قارئین کو تصوف اور سیاست کے دائروں میں جا پہنچاتے، اسی طرح آباد شاہ پوری نے چھوٹے مُنہ سے بڑی بات کہنے کے بجائے بڑے منہ سے کوئی چھوٹی بات بطورِ تمہید چھیڑی اور پھر مُنہ دیکھتے دیکھتے وہی چھوٹی بات بڑی بن کر دُور دُور تک چھا گئی ہے۔

ہماری مقبول مطبوعات

★ فضائل قرآن	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
★ کتاب الصوم	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
★ کتاب الذکر و دعا	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
★ کتاب الجنائز	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
★ شعور حیات	مولانا محمد یوسف اصلاحی
★ شمع حرم	مولانا محمد یوسف اصلاحی
★ گلدستہ حدیث	مولانا محمد یوسف اصلاحی
★ تیس پروانے رضی اللہ عنہم	طالب ہاشمی
★ چالیس جاں نثار رضی اللہ عنہم	طالب ہاشمی
★ ہمارے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم	طالب ہاشمی
★ تذکار صحابیات	طالب ہاشمی
★ سو شیدائی رضی اللہ عنہم	طالب ہاشمی
★ ستر ستارے رضی اللہ عنہم	طالب ہاشمی
★ پچاس صحابہ رضی اللہ عنہم	طالب ہاشمی
★ سیرت فاطمہ رضی اللہ عنہا	طالب ہاشمی

ISBN 969400079-3

البدر پبلی کیشنز
23 راحت مارکیٹ اُردو بازار لاہور
Ph:042-37225030 Cell: 03008485030